

تَعَالَى الْقُرْآنُ

پروف

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٠﴾

لُغَةُ الْقُرْآنِ

قرآنی مرطالرب کا انسا تریکلو پیدیا

جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی و مرطالرب
مستند کتب لغت کی بنیاد پر اس انداز سے متعین کئے گئے ہیں
کہ قرآن جو تصورات پیش کرتا ہے، ان کا مکمل نقشہ
سامنے آجائے اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھاؤ پیدا نہ ہو

پرویز

إِذَا رَأَوْهُ تَطَلَّعُوا عَلَيْهِمْ ﴿١١﴾

جلد دوم



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ


 اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ
 

صُغَى الْقُرْآنِ

قرآنی مطالعہ کا انسائیکلو پیڈیا

جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی و مطاب
 مستند کتب لغت کی بنیاد پر اس انداز سے متعین کئے گئے ہیں
 کہ قرآن جو تصویرات پیش کرتا ہے، اُن کا مکمل نقشہ
 سامنے آجائے اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھاؤ پیدا نہ ہو

اِذَا رَأَوْهُ تُلَّوٌّ عَلَيْهِمْ  جلد دوم  بِرَحْمَةِ رَبِّكَ الْكَرِيمِ



جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ

●
بار اول

اکتوبر ۱۹۶۰ء

●
قیمت :

مجلد پندرہ روپے

●
مؤلفہ :

غلام احمد پرویز

●
شائع کردہ :

ادارہ طلوع اسلام

۲۵- بی گلبرک - لاہور

●
طبع کردہ :

المیزان پرنٹنگ پریس

۲۷- بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

زیر نگرانی : نظر علی شاہ - مینیجر

●
ملنے کا پتہ :

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷- بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور



Masood Faisal Jhander Library

فہرست مشمولات

(جلد دوم)

پیش لفظ ۱-۵

مفردات

صفحہ

۴۶۳	ح
۵۷۳	خ
۶۳۲	د
۶۸۵	ذ
۷۱۱	ر
۷۹۹	ز
۸۲۹	س
۹۲۹ تا ۹۹۸	ش

کل صفحات (جلد دوم) ۵۴۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

لغات القرآن کی پہلی جلد اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی۔
 ﷻ الحمد کہ اب اسکی دوسری جلد شائع ہو رہی ہے، اور تیسری زیر طباعت ہے۔
 جلد اول میں، علاوہ مبادیات، ا سے ج تک کے مادے آ گئے تھے۔ اس جلد
 میں ح سے ش تک شامل ہو گئے ہیں۔

(۲) اس جلد میں، مفردات کے معانی کے علاوہ، قرآنی تعلیم کے بعض
 اہم گوشے بھی آ گئے ہیں جن کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلہ
 میں، علاوہ ان کتب لغت و تفاسیر کے جن کا ذکر جلد اول کے پیش لفظ میں
 کیا جا چکا ہے، حسب ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

لغات:—

جمہرة اللغة (ابن درید)۔ صحاح (جوہری)۔

تفاسیر:—

روح المعانی (آلوسی)۔ تفسیر القرآن (قرطبی)۔ تفسیر القرآن (تستری)۔
فتح القدیر (شوکانی)۔ مفردات القرآن (فراہی)۔
کتاب التسمیہ لعلوم التنزیل (محمد بن احمد ابن جزی الکلبی)۔

(۳) اس لغات کا تفصیلی تعارف، اور اس سے استفادہ کے لئے ضروری
 ہدایات، جلد اول میں آ چکی ہیں۔ ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔
 (۴) جلد اول کے مطالعہ کے بعد جن حضرات نے اظہار پسندیدگی
 فرمایا یا اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازا، میں ان سب کا بہ صمیم قلب
 شکر گزار ہوں۔

میری اس کوشش نا تمام کو جسقدر مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کے لئے
 میں بدرگاہ رب العزت سجدہ ریز ہوں جس کی عطا کردہ صلاحیتوں کے بغیر
 سفر زندگی کی کوئی منزل بھی طے نہیں ہو سکتی۔

پرویز

۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۶۰

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ح

ح اش (ح ش و)

الْحَاشِيَّةُ - کنارہ (کپڑے وغیرہ کا) - حَشْوَةُ النَّاسِ - رذیل لوگ* (یعنی وہ لوگ جنہیں کنارے پر دور دور رکھا جائے)۔ یہیں سے اسکے معنی دوری کے آتے ہیں۔ حَاشَ لِلَّهِ - خدا اس سے بہت دور ہے وہ منزہ ہے۔ یا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ (کیونکہ الْحَاشِيَّةُ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی حفاظت میں رہتے ہوں)*

قرآن کریم میں ہے وَقُلْنَا حَاشَ لِلَّهِ (۱۱۲)۔ ”انہوں نے کہا کہ خدا تمام عیوب سے پاک ہے۔ وہ نقائص سے مبرا ہے“۔ یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے**۔ یعنی عیوب اور نقائص سے منزہ ہونے کے معنوں میں۔

ح ب ب

الْحَبُّ - الْمَحَبَّةُ - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے پانچ معانی ہیں۔ (۱) سفیدی اور صفائی۔ یہاں سے حَبَبٌ اَلْاَسْنَانِ لیا گیا ہے یعنی دانتوں کی چمک (۲) بلند ہونا اور ظاہر و نمودار ہونا۔ یہاں سے حَبَابُ الْمَاءِ لیا گیا ہے۔ یعنی پانی کا بلبلہ (۳) کسی چیز کا اپنی جگہ ٹھہرے اور جمے رہنا۔ یہاں سے حَبٌّ اَلْبَعِيْرُ وَاَحَبُّ لیا گیا ہے۔ یعنی اونٹ اس طرح جم کر بیٹھ گیا کہ پھر نہ اٹھا۔ (۴) کسی چیز کا خالص ہونا یا اس کا لب لباب اور حقیقی جوہر۔ جیسے حَبَّةُ الْقَلْبِ سویدائے دل کو کہتے ہیں اور (۵) کسی کی حفاظت کرنا۔

اسے تھامے رکھنا۔ اسی سے حُبُّ الْمَاعِ مٹکا یا ٹھلیا یا مشک کو کہتے ہیں جسمیں پانی محفوظ رکھا جائے۔ یا گھڑونچی جس پر مٹکے رکھے جاتے ہیں۔ حُبُّ السَّرَجَل کے معنی ہیں آدمی ٹھہر گیا۔ أَحَبُّ السَّرْع کے معنی کھیتی میں دانے پڑ گئے۔ یعنی اسکی نشو و نما کے نتائج ابھر کر سامنے آ گئے*۔

راغب نے لکھا ہے کہ محبت کے معنی اس چیز کو چاہنا ہیں جسے اچھا اور مفید پایا جائے، اس کے تین پہلو ہیں، ایک تولذت کیلئے۔ جیسے مرد عورت سے محبت کرتا ہے، دوسری مفید اور نفع بخش (مادی) چیزوں کو چاہنا، تیسرا پہلو یہ ہے کہ فضل و شرف (معنوی امور) سے محبت رکھنا، جیسے اہل علم، علم و فضل کی بناء پر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کبھی محبت کے معنی ارادہ کے بھی کئے جاتے ہیں۔ لیکن محبت میں ارادہ سے زیادہ زور و قوت ہے**۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ الْحُبُّ اور الْمَحَبَّة کے معنی کسی کو لازم پکڑنا ہیں۔ اس مادہ کے بنیادی معنی لزوم اور ثبات کے ہیں۔ یعنی کسی شے کو لازم پکڑنا اور اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا۔

قرآن کریم میں حُبُّ کا لفظ کثرت کے مقابلہ میں آیا ہے۔ وہاں اس کے معنی پسندیدگی کے ہیں (مثلاً ۲/۱۶؛ ۳/۹)۔ یہ معانی کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں۔ لیکن جہاں قرآن میں اللہ کی محبت کا ذکر آیا ہے وہ مقامات تشریح طلب ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے وَمِنْ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (۱۶۵)۔ ”اور ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اسکا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت بہت بڑھ کر کرتے ہیں“۔ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳۱-۳۳)۔ ”ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کریگا۔ اور تمہارے قصوروں

کو معاف کر دیگا۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ان سے کہدو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے)۔

ان آیات سے اللہ سے محبت، اور اللہ کی محبت، کی سند لی جاتی ہے اور پھر اس پر تصوف کی پوری عمارت استوار کر لی جاتی ہے جس کا اصل الاصول خدا کی محبت ہے۔ اور محبت بھی ایسی شدت کی محبت کہ اس ذات میں اپنے آپ کو جذب کر دینا اسکا منتہی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سارا تصور لفظ محبت کو اُن معنوں میں لے لینے سے پیدا ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اسے انسانوں سے محبت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

خدا سے اس قسم کے تعلق کا تصور غیر قرآنی ہے۔ جہان تک خدا کی ذات کا تعلق ہے ہمارے حیطہ ادراک میں آہی نہیں سکتی۔ اسلئے اس سے اس قسم کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ کسی کی اولاد ہی کیوں نہ ہو)۔ کسی اُن دیکھی چیز سے اس قسم کی محبت کا پیدا ہونا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے۔ یہی وہ دشواری تھی جسکے پیش نظر لوگوں کو خدا کو بشکل انسان (اوتاروں کے روپ میں) ڈھالنا پڑا یا اسکی مورتیاں بنانی پڑیں۔

لفظ محبت کے ان معانی پر غور کیجئے جنہیں شروع میں درج کیا گیا ہے۔ ساری بات صاف ہو جائیگی۔ حُبُّ اللہ کے معنے ہیں کسی چیز پر ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ جمے رہنا۔ لہذا خدا کے ساتھ انسان کی محبت کے معنے ہیں، احکام خداوندی کی خلوص اور استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا۔ ان پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہنا۔ ان سے ذرا ادھر ادھر نہ ہٹنا۔ ان معانی کی تائید خود وہ آیات کر رہی ہیں جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی آیت (۱۶۵) میں دیکھئے۔ جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی صاحب اقتدار و اختیار مانتے ہیں (أَنۡدَادًا مِّنۡ دُونِ اللّٰهِ) وہ اُن کے قوانین اور فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور نہایت شدت سے اطاعت کرتے ہیں۔ لہذا اس آیت میں اللہ کی محبت کے معنے ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت۔ سورۃ آل عمران کی آیات (۳۱-۳۳) میں اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان میں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ كِی تَفۡسِرَ اَطِيعُوا اللّٰهَ نے کر دی ہے۔ اور

اسکے مقابل میں تَوَلَّوْا (روگردانی کرنے) کے لفظ نے اسکی مزید وضاحت کر دی ہے۔ لہذا ان آیات میں بھی خدا سے محبت سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے جو اُس نظام کے مرکز کی وساطت سے کی جاتی ہے جو اُسکے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے متشکل ہوتا ہے۔ اس کی تائید سورۃ المائدہ کی آیات (۵۶-۵۷) سے بھی ہوتی ہے۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر جائے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ خدا کا دین اس کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ یہ نہ خیال کرے کہ اس نے اس دین کو چھوڑ دیا تو اس دین کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رہیگا۔ اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیگا یُحِبُّهُمْ و یُحِبُّوْا نَہ جن سے خدا محبت رکھیگا اور وہ خدا سے محبت رکھیں گے۔ یعنی وہ لوگ اپنوں کے سامنے نہایت نرم اور مخالفین کے مقابلہ میں غالب آنے والے ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے اِنَّمَا وَلِیُّکُمْ اللّٰهُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔۔۔ (۵۵)۔ ”تمہارے دوست اللہ اور اس کا رسول اور مومنین ہیں“۔ اس سے واضح ہے کہ ”محبت“ سے مراد ”ولی ہونا“ ہیں۔ اس سے آگے مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم کفار کو اپنا ولی مت بناؤ (۵۶)۔ اس سے بھی ”خدا سے محبت“ کرنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اطاعت کرنا۔

اب رہا خدا کا بندے سے محبت کرنا، تو اس کے لئے اس لفظ کے دوسرے معانی کو سامنے لائیں یعنی حفاظت کرنا۔ تھامے رکھنا۔ مضمحل صلاحیتوں کا نمودار کرنا۔ اعمال کا نتیجہ خیز ہونا۔ لہذا خدا کی طرف سے محبت کے معنی ہیں اُن تمام ثمرات و نتائج کا حاصل ہو جانا جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری ماحصل ہیں۔

یہ ہے قرآنی مفہوم، انسان کے خدا سے محبت اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کا۔ یہی مفہوم اللہ کا انسان کے ولی (دوست) ہونے یا انسان کا اللہ کا ولی ہونے سے ہے۔ (دیکھئے عنوان و۔ ل۔ ی)

حَبَّ ۱۱۲ - دانہ - اناج - غلہ (۱۱۲) - حَبَّۃٌ (واحد) دانہ (۱۱۲) -

ح ب ر

الْحَبِیْرُ - روشنائی (جس سے لکھا جاتا ہے) - الْمِحْبَرَةُ - دوات - الْحَبِیْرِیُّ - روشنائی فروش - الْحَبِیْرُ - اہل کتاب کا عالم - بالخصوص یہود کا عالم - جمع أَحْبَارٌ (۱۱۳) - الْحَبِیْرُ - حسن اور حسن کی رونق -

الْحَبْرُ - سرور - خوشی - مسرت - حَبْرَةٌ - کامل نعمت و آسائش ، فراوانی عیش - الْحَبْرَةُ - جنت میں سماع - موسیقی - عمدہ نغمہ - چنانچہ قرآن میں جو ہے فَهَمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۳۰/۱۵) - یا اُدْ خُلُوْ الْجَنَّةِ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ (۳۳/۵۱) تو زجاج نے اسکی تفسیر موسیقی کے ساتھ ہی کی ہے - اس نے کہا ہے کہ لغت میں الْحَبْرَةُ عمدہ گلے کو کہتے ہیں* - درحقیقت اس میں حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی نیز خوشی اور مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں خواہ وہ جنت نگاہ ہوں یا فردوس گوش - آرٹ کے شاہکار ہوں یا حیات افروز موسیقی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسے نشانات کے ہیں جن سے اس چیز کا حسن اور رونق نمایاں ہوں -

حَبْرَ الْخَطِّ وَالشَّعْرِ - اسنے خط اور شعر کو عمدہ بنایا اور مزین کر دیا - تَحَبَّرَ الرَّجُلُ - آدمی حسین اور مزین بن گیا** - ثَوْبٌ حَبِيرٌ - عمدہ اور نیا کپڑا - اَلْيَحْبَرُ - نرم و نازک بدن والا آدمی* - راغب نے کہا ہے کہ الْحَبْرُ نہایت عمدہ اور حسین اثر (نشان) کو کہتے ہیں - الْحَبْرُ عالم کو اسلئے کہتے ہیں کہ اس کے علم کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی رہتا ہے اور اس کے عمدہ آثار قدم کی پیروی کی جاتی ہے*** -

قرآن ، کائنات کی ہر حسین شے کی تحسین (Appreciation) کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی تاکید کرتا ہے ، اس شرط کے ساتھ کہ انسان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے - ایک جنتی معاشرہ اس قسم کے حسن کا مظہر ہوتا ہے جس میں آرٹ - نغمہ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر وجہ شادابی قلب و نظر بنتے ہیں - اور چونکہ اسمیں حدود اللہ کا ہر وقت خیال رکھا جاتا ہے اسلئے اس سے مضر اثرات مرتب نہیں ہوئے پاتے - حسن و زیبائی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کا ذکر ، قرآن نے ، جنتی زندگی کے ضمن میں نہیں کیا ؟ لیکن زندگی ، جنتی بنتی اسوقت ہے جب وہ قوانین خداوندی کے تابع رہے -

ح ب س

الْحَبْسُ - روک لینا - قید کر لینا - اِحْتَبَسَهُ - اسے روک دیا - فَاحْتَبَسَ - پس وہ رک گیا - الْمَحْبَسُ جانوروں کے چارہ رکھنے کی جگہ* - چھٹلا جو انگلیوں میں پھنسا جاتا ہے** - حَبَسَهُ عَنْهُ کے معنی اسے کسی چیز سے روکنے کے ہوتے ہیں - اور حَبَسَهُ عَلَيْهِ کے معنی وقف کر دینے کے** -

قرآن کریم میں ہے - تَحْبِسُوْهُمْ نَهْمًا (۱۰۶) ”تم ان دونوں (گواہوں) کو روک لو،“۔

ح ب ط

الْحَبِطُ - زخم کا نشان جو زخم اچھا ہو جانے کے بعد رہ جائے۔
 الْحَبَاطُ - مسویشیوں کی ایک بیماری ہے جس میں ان کا پیٹ ابھر جاتا ہے اور وہ مر جاتے ہیں۔ زسخری اور ابن الاثیر نے کہا ہے کہ حَبِطَتِ السَّادَبَةُ حَبَطًا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی نہایت اچھی چراگاہ میں پہنچ کر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کر سکے۔ اس سے اسکا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باطل ہو جانا اور درد و الم کے ہیں۔

قرآن کریم نے حَبِطَ اَعْمَال (اعمال کے رائیگاں جانے) کی اصطلاح نہایت پر معنی طریق سے استعمال کی ہے۔ (۲۱۷)۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اسکا جزو بدن بن جائے تو اس سے اسکی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ و توانا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اسکا چارہ ہضم نہ ہو تو اسکا پیٹ پھول جاتا ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے لیکن یہ درحقیقت فربہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان بہت سے کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ درحقیقت اسکی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں۔ اسے قرآن حَبِطَ اَعْمَال سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو اُن نتائج کا مرتب نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کر سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اُولَئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲۱۷)۔ انہی کے لئے آیا ہے۔ یعنی وہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائیگاں جاتے ہیں۔ ان کے اعمال کے صرف نشانات رہ جاتے ہیں۔ نتائج کچھ نہیں نکلتے۔ اور وقت اور توانائی، سب ضائع ہو جاتے ہیں۔ لہذا اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصور یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں۔ اچھے اور برے اعمال کا معیار، اللہ کی کتاب

ہے۔ جو اعمال اس کی رو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ کریں۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلیگا تا کہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائیگاں جائیں گے۔ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (۱۰۵) ”سو ان کے اعمال بے نتیجہ رہ گئے۔ لہذا ہم ان کے لئے ظہور نتائج کے وقت میزان تک کھڑی نہیں کریں گے،“۔ ان کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ غور کیجئے کہ ہمارے کس قدر اعمال ہیں جو یوں بے نتیجہ چلے جا رہے ہیں اور ہم کبھی رک کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ خدا کی کتاب (اعمال کے نتائج کی زندہ کسوٹی) ہمارے پاس ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نہ صرف باطل ہونے کے ہیں بلکہ اس کے ساتھ الم و تکلیف کے بھی ہیں۔ یعنی اعمال کا محض رائیگاں جانا ہی نہیں بلکہ ان کا الم و تکلیف کا موجب بن جانا بھی۔ خود یہی احساس کیا کم الم و تکلیف کا موجب ہے کہ جن کاموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کے نتائج ایسے خوشگوار مرتب ہونگے، وہ آخر الامر بے نتیجہ ثابت ہوں؟

ح ب ک

الْحَبْكُ۔ کس کر باندھنا اور مضبوط کرنا۔ الْحَبْكَةُ۔ ازار باندھنے کی جگہ۔ تَحْبِكُكَ تَحْبِكًا۔ اسنے کمر پر ازار باندھ لیا۔ الْحَبْكَةُ۔ وہ رسی جو کمر پر باندھی جائے۔ الْحَبْكُ مِنَ السَّمَاءِ۔ ستاروں کے راستے۔ حَبْكُ الْقَرْمَلِ۔ ریت کی لہریں۔ فراء نے کہا ہے کہ حَبْكُ کسی چیز کے بل کہا کر مڑ جانے یا ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ الْحَبْكُ

مِنْ الشَّعْرِ ان گھونگھریالے بالوں کو کہتے ہیں جو بل کھا کر ٹوٹے پڑتے ہوں۔ اور الْحَبْكُ کے معنی کاٹ ڈالنے اور گردن اڑا دینے کے ہیں*۔
قرآن کریم میں وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُوكِ (۵۱) آیا ہے۔ یعنی راستوں والا آسمان۔ وہ بلند فضا جس میں مختلف اجرام فلکی اپنے اپنے راستوں میں چلتے اور مڑتے رہتے ہیں۔ اور اگر اس کے معنی مضبوطی کے لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا ایسی بلند فضا جسمیں تمام اجرام اپنے اپنے دوائر میں نہایت مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ الْحَبَاكُ لکڑیوں کے اس گٹھے کو کہتے ہیں جسے مضبوطی سے اس طرح باندھا جائے کہ کوئی لکڑی اپنی جگہ سے ہلے نہیں**۔ اور اگر اس کے معنی ٹوٹنے کے لئے جائیں تو مفہوم ہوگا ان اجرام فلکی والی فضا جسمیں مختلف اجرام اپنے اولین ہیولے سے ٹوٹ کر چکر کاٹ رہے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا تسلسل، درازی اور مضبوطی شامل ہیں۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُوكِ کے معنی ہونگے ایسی بلندی (فضا) جس میں اجرام فلکی کے لئے لمبے لمبے راستے ہوں۔

ح ب ل

الْحَبْلُ - باندھنے کی چیز - رسی - اسکی جمع حَبَالٌ ہے - حَبْلَكَ - اسے رسی سے باندھ دیا** - سورة طہ میں حَبَالُہُمْ آیا ہے (۲۶) جس کے معنی ”رسیاں“ ہیں - نیز الْحَبْلُ کے معنی عہد، ذمہ اور امان کے ہیں - سورة آل عمران میں ہے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا (۱۰۲) - ”تم سب کے سب حبل اللہ کو تھامے رکھو“، اس کے ساتھ متمسک رہو - اس میں، صاحب تاج العروس کے نزدیک، حَبْلٌ کے معنی عہد کے ہیں - صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اسکی تائید کی ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کی درازی پر دلالت کرتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے - اس لئے اس آیت میں حَبْلُ اللَّهِ کے معنی ہیں وہ چیز جو تمہیں خدا تک پہنچادے، یعنی قرآن کریم - ابو عبید نے کہا ہے کہ لَاِغْتِيصَامُ بِحَبْلِ اللَّهِ کے معنی اتباع قرآن کریم ہے - ابن مسعود نے حَبْلُ اللَّهِ کے معنی قرآن کریم

ہی لئے ہیں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے **إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّفَاسِ** (۱۱۱/۳) جسکے معنی ہیں خدا کی ذمہ داری یا لوگوں کی دی ہوئی ذمہ داری۔ اسلئے (۱۰۲/۳) میں بھی **حَبْلٌ** اللہ کے معنی خدا کی ذمہ داری کے ہیں*۔

لیکن اسکے معنی رسی لیں یا ذریعہ۔ ذمہ لیں یا عہد۔ بات ایک ہی ہے۔ خدا سے ہمارا تعلق قرآن کریم کی رو سے ہے۔ یہی وہ رسی ہے جو اسکی طرف سے ہم تک آئی ہے اور جس سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہ سکتے ہیں (کیونکہ آیت کا اگلا حصہ ہے **وَلَا تَفَرَّقُوا** اور اس سے آگے مومنین کو ایک امت بنکر رہنے کی تاکید کی گئی ہے دیکھئے ۱۰۳/۳؛ ۱۰۹/۳) لہذا **حَبْلٌ** اللہ کے معنی ہیں وہ نظام اجتماعی جو قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم ہو اور جسکا مقصد، وحدتِ ملت اور اطاعتِ قوانین الہیہ ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے **وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِّنْ حَبْلٍ** (۱۶/۵) ”ہم، انسان سے **حَبْلٌ** ”الْوَرِيدِ سے بھی زیادہ قریب ہیں“۔ فراء نے لکھا ہے کہ **حَبْلٌ** ”اور وَرِيدٌ“ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی رگِ جان۔ شدتِ قرب کی بنا پر دونوں الفاظ آئے ہیں*۔ اس ”قربِ خداوندی کی تشریح آیت کے پہلے حصہ میں یہ کہہ کر کر دی گئی ہے۔ **وَنَعْلَمُ مَا تُوسْوَسُ بِهِ نَفْسُهُ** (۱۶/۵) ”ہم اسکے وسوسہ نفس تک سے بھی واقف ہیں“۔ یعنی اس میں علم الہی کی طرف اشارہ ہے جس پر قانونِ مکافاتِ عمل کا مدار ہے۔ انسان کا کوئی عمل، حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال تک بھی خدا کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتا۔ **مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ** (۵۰/۱) نے اسکی مزید وضاحت کر دی ہے۔ یعنی انسان کی ہر بات پر ایک نگہبان (چوکیدار۔ محاسب) موجود ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کے رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات کو بھی محیط ہے۔

ح ت م

حَتَمَهُ و **حَتَمَ** بکذا۔ **يَحْتِمُ**۔ **حَتَمًا**۔ اس نے کسی بات کا فیصلہ کر دیا۔ اسے طے کر دیا۔ **حَتَمَ عَلَيْهِ الْأَمْرَ**۔ اس پر کوئی بات واجب اور لازم کر دی۔ **الْحَتَامِ**۔ فیصلہ کرنے والا۔ فیصلہ کو کسی پر واجب اور لازم کرنے والا***۔

قرآن کریم میں ہے کَانَ عَلٰی رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۱۹)
 ”یہ تیرے رب پر لازم ہے۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ کوئی بنیادی لفظ نہیں بلکہ اس میں تاء کاف سے بدلی ہوئی ہے۔ یعنی حَتَمَ اصل میں حَكَمَ تھا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

حتیٰ - (حرف)

حَتَّی - حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ”یہاں تک کہ“، - قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوسٰی (۲۱)۔ ”انہوں نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ چمٹے رہیں گے تا آنکہ موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آجائے“۔ یعنی اسوقت تک ہم ایسا کٹے جائیں گے جب تک.....

(۲) بعض اوقات اس کے معنی ”تا کہ“، بھی ہوتے ہیں۔ جیسے بعض کے نزدیک اس آیت میں آیا ہے۔ وَ لَا یَزَالُ النَّوْنُ یُقَاتِلُوْا نَکَمٌ حَتَّی یَرُدُّوْا کُمُ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنْ اَسْتَطَاعُوْا (۲۱)۔ ”اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے تا کہ اگر انہیں اسکی طاقت ہو تو تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں“۔ یعنی ان کے جنگ کرنے کا مقصد یہ ہے۔

(۳) بعض اوقات اللہ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ تاج العروس اور محیط المحيط میں ابن مالک کے حوالہ سے اسکی مثال میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے۔
 لَیْسَ الْعَطَاءُ مِنَ الْفُضُولِ سَمَاحَةً
 حَتَّی تَجْوُدَ وَ مَا لَدَیْكَ قَلِیْلٌ

ضرورت سے زیادہ مال میں سے کچھ دیدینا سخاوت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ تمہارے پاس جو کچھ مال ہو وہ تھوڑا ہو اور تم پھر بھی سخاوت کرو۔

بعض اوقات یہ وَ (اور) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثلاً اس آیت میں۔
 فَاذِذْ لِّلْقَیِّمَتِمْ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاَضْرَبِ السَّرَقَابَ حَتَّی اِذَا اَتْخَذْتُمْ مَوْتَهُمْ..... (۳۴)۔ ”سو جب تم کفار کے مقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارو۔ اور جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو.....“ (اس میں شبہ نہیں کہ یہاں حَتَّی کے معنی تا آنکہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن ”اور“ سے بھی معنی واضح ہو جاتے ہیں)۔

(۵) بعض اوقات یہ محض ابتدائے کلام (بات شروع کرنے) کے لئے آتا ہے۔ جیسے حَتَّىٰ إِذَا أَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ (۲۸)۔ ”بہر حال۔ غرض، جب وہ وادیٔ نمل میں آئے تو“ یعنی حَتَّىٰ سے ایک بالکل نئی بات شروع ہوئی ہے۔ سابقہ بات سے اسکا تعلق نہیں۔

ح ث ث

حَتَّىٰ يَخُوشَهُ ۖ حَتَّىٰ ۖ جلدی کرانا۔ جلدی کا تقاضا کرنا (لگاتار) حَتَّىٰ عَلَيَّہ ۖ۔ اسے کسی کام پر ابھارا، اکسایا، برانگیختہ کیا۔ الْحَثِيثُ۔ تیز رفتار۔ اپنے کام میں چست*۔ قرآن کریم میں لیل و نہار کے متعلق ہے يَطْلُبُهُ حَثِيثًا (۵۴)۔ یعنی وہ (دن) اس (رات) کے پیچھے نہایت تیزی سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ حریری نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حَثَّ اور حَضَّ مرادف الفاظ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حَثَّ چلنے میں جلدی کرانے اور برانگیختہ کرنے کو کہتے ہیں اور حَضَّ دوسرے کاموں پر ابھارنے اور جلدی کرانے کو*۔

ح ج ب

حَجَبَ ۖ۔ يَحْجِبُ ۖ۔ ڈھانپنا۔ چھپانا۔ الْحِجَابُ ۖ۔ وہ چیز جو بطور پردہ کے استعمال کی جائے**۔ وَ بَيَّنَّهٖمَا حِجَابٌ (۳۶)۔ ”ان دونوں کے درمیان پردہ ہوگا“۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ایسی روک کے ہیں جو ایک چیز کے دوسری چیز تک پہنچنے میں حائل ہو***۔ یعنی اہل جہنم کا عذاب، جنت والوں تک نہیں پہنچ سکتے گا اور اہل جنت کی لذات سے اہل جہنم محروم ہونگے۔ ”محروم“ کے معنوں میں سورۃ تطفیف میں ہے اِنَّہُمْ عَنْ رَبِّہِمۡ یَتَوُۡۤا مَسْیِدًا لِّمَۡحِجَّۡتُوۡبُوۡنَ (۸۳)۔ ”وہ اس دور میں خدا کے عطایا سے محروم ہونگے“، اپنے اعمال کی وجہ سے۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کا مفہوم منع کرنا اور روکنا ہوتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں۔

الْحٰجِبُ مِّنَ الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ ۖ چاند اور سورج کا کنارہ جو پہلے پہل نمودار ہو**۔

ح ج ح

الْحَجَّ - ارادہ کرنا - قصد کرنا - حَجَّجْتُ فُلَانًا - میں نے اسکا قصد کیا - بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی باعظمت شے کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ہیں* - اسی لئے مکہ معظمہ کا سفر کرنے کے قصد کو حَجَّجْتُ کہا جانے لگا - الْحَجَّجَّةُ ایک سال کو بھی کہتے ہیں* - اسکی جمع حَجَجٌ ہے - سورۃ قصص میں ہے ثَمَنِي حَجَجٍ (۲۸) یعنی آٹھ سال -

الْحَجَّجُ کے معنی روکنا بھی ہیں - حَجَّجْتُ عَنِ الشَّيْءِ - اس کو اس چیز سے روک دیا - منع کر دیا - اسی سے اس کے معنی جھگڑا کرنے کے آتے ہیں - الْمُحَاجَّةُ - آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا* - اسکی اصل یہ ہے کہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر فریق دوسرے کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے - فَإِنْ حَاجَّوْكَ (۱۹) ”اگر یہ تجھے تیسرے ارادے سے روکیں“ - نِيز (۸۱) - حُجَّةٌ - دلیل - محیط میں ہے کہ دلیل کو بَيِّنَةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے اور حُجَّةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے فریق مقابل پر فتح حاصل ہو جاتی ہے** -

سورۃ انعام میں قرآنی دلائل و احکام کو الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (۱۵۰) کہا گیا ہے - حَجَّ کعبہ کیلئے لفظ حَجَّ (۱۹۶) میں آیا ہے - اسی کو (۹۶) میں حَجَّ الْبَيْتِ کہا گیا ہے - الْحَاجُّ (۱۹) حج کرنے والا -

حج ، عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس اُمت کے مرکز محسوس (کعبہ) میں اس غرض کیلئے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی رو سے تلاش کیا جائے اور اس طرح یہ اُمت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے - لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲۸) ”تا کہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں“ - نظام کے قیام کے لئے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں - غور کیجئے - قرآن نے اُس زمانے میں مشاورتی نظام (۳۸) اور اس کے لئے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی اور بادشاہ کو ”ایشور کا اوتار“ اور

خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی۔ صلوة کے مقامی اجتماعات سے لیکر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ امت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوع انسان کی بہبود کے سامان و ذرائع پر غور کریں۔ (مزید تفصیل ”قبلہ“ کے عنوان میں ملیگی)

ح ج ر

حَجَرٌ۔ پتھر (جمع أَحْجَارٌ وَحِجَارَةٌ) الْحِجْرُ (حاء کی تینوں حرکات زیر زیر پیش کے ساتھ) منع کرنا۔ روکنا۔ حفاظت کرنا۔ حِجْرٌ أَسْحَجُوْهُ رَأً (۲۵) کے معنی روک کے ہیں۔ حِجْرَةٌ۔ اونٹوں کا باڑہ۔ کمرہ۔ جمع حِجْرَات (۳۹) الْحِجْرُ۔ عقل جو انسان کو روکتی ہے (۸۹)۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کے معنوں میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائے گا*۔

حِجْرٌ۔ قوم ثمود کی بستیوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ پہاڑوں میں پتھر تراش تراش کر بنائی گئی تھیں۔ حَنْجَرَةٌ۔ حلق۔ اسکی جمع حَنَاجِرٌ ہے۔ (۱۰/۳۳ ; ۱۸/۲) حَجَرٌ۔ سونے اور چاندی کو بھی کہتے ہیں۔ اور ایسے آدمی کو بھی جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو*۔

قرآن کریم میں النار کے متعلق ہے کہ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲۵)۔ ”جسکا ایندھن انسان اور پتھر ہیں“۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہوں جیسے پتھر۔ انہی کے متعلق ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (۲/۲۳)۔ ”پھر اسکے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے، سو وہ پتھر کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر“۔ یعنی جن میں سمجھنے سونچنے اور اثر پذیری کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ یا جن کی صلاحیتوں کی نشو و نما رک چکی ہے۔ یا، النَّاسُ کے معنی ہونگے عام لوگ (جو بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں) اور حِجَارَةٌ کے معنی ہونگے وہ چالاک اور ہوشیار لوگ جو لیڈر بن کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ غلط راستے پر چلنے والے عوام اور خواص (لیڈر اور ان کے متبعین) سب جہنم میں ہونگے۔ اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہو جاتی ہے (مثلاً ۱۳/۱۳ ; ۳۳/۶۰) اور اگر اسکے معنی سونے چاندی کے لئے جائیں تو اسکے معنی ہونگے سرمایہ

پرستی جو ایک جہنمی معاشرہ پیدا کر دیتی ہے ، کیونکہ سورۃ توبہ میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی ربوبیت کیلئے کھلا نہیں رکھتے تو اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے انکی پیشانیوں پر اور پشت پر داغ دیا جائیگا (۳۵-۳۴)۔ لہذا جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور انکی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں۔ لیکن اگر (۲۵) میں النَّارُ کے معنی جنگ کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ن۔ و۔ ر) تو الْحِجَارَةُ کے معنی ہونگے وہ پتھر اور جو اُس زمانہ میں مخالفین پر کیا جاتا تھا (جیسا کہ سورۃ فیل میں ۵ آیا ہے)۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ تم لوگ جب علم و بصیرت کی رو سے بات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تو اسکا نتیجہ جنگ ہوگی جو انسانوں کے ہاتھوں سے اور ان پتھروں کے ذریعوں سے بھڑکائی جائیگی جو فریق مخالف کی تباہی کیلئے برسائے جاتے ہیں۔ یہ جنگ ، نظام خداوندی کی حامل جماعت اور مخالفین کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور مخالفین کی باہمی جنگ بھی (جس کیلئے دیکھئے ۶۵؛ ۱۳۰؛ ۸۳-۸۲)۔ نظام خداوندی کی حامل جماعت کو جنگ اسلئے کرنی پڑتی ہے کہ دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ ہو جائے (۳۴)۔

سورۃ انعام میں ہے حِجْرٌ لَا يَطْعَمُہَا (۱۳۹)۔ یعنی ممنوع۔ جسکے کھانے کی عام اجازت نہ ہو۔

حِجْوَرٌ کے معنی ہیں حفاظت۔ (۲۳)۔ حِجْرٌ کے معنی گود بھی ہیں۔*

ح ج ز

حِجَزَہ - یَحِجُّہ - حِجَازَہ - منع کرنا - روک دینا - اصل میں حِجَزَہ البَعِیْر کے معنی ہوتے ہیں اونٹ کو بٹھا کر اس کی ٹانگوں کے نیچے جوڑوں کو رسی سے باندھ کر اس رسی سے اسکی کمر باندھ دینا تا کہ وہ ہل نہ سکے اور اسطرح اسکی پشت کے زخم کا علاج کیا جاسکے۔ الْحِجَازُ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کو اسطرح باندھا جائے۔ کمر بند کو بھی کہتے ہیں۔ حِجَازٌ کو اسلئے حِجَازٌ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ نجد اور تہامہ کے درمیان روک ہے۔**

الْحَجَزُ - دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان حائل ہونا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں حَاجِزاً (۲۶) کا لفظ روک کیلئے آیا ہے۔ دوسری جگہ حَاجِزِیْن (۲۹) آیا ہے جسکے معنی روکنے والے یا منع کرنے والے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائیگا۔

ح د ب

الْحَدَبُ - سینہ اور پیٹ کا اندر گھس جانا اور کمر کا کوہ نکل آنا۔ حَدَبٌ یَّحْدَبُ حَدَبًا کَبْرًا ہو جانا۔ الْحَدَبُ - بلند (مرتفع) زمین**۔ زمین کا سخت اور بلند حصہ***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بلند ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں یا جوج و ماجوج کے متعلق ہے وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَنْسِلُونَ (۲۱)۔ ”وہ سطح مرتفع (بلند زمین) سے نہایت تیزی سے اچھل کر نکل پڑیں گے“، اسکی تشریح کیلئے عنوان (ا-ج-ج) میں لفظ یَاجُوجُ دیکھئے۔

ح د ث

الْحَدِیْثُ - قدیم کی ضد ہے۔ نئی بات۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عدم سے وجود میں آنے کے ہیں۔ حَوَادِثُ - نئے نئے واقعات جو سامنے آتے رہیں۔ اَلْاَحْدَاثُ - شروع سال میں ہونے والی بارشیں۔ حَدِیْثُ السَّیْنِ - کم عمر نوجوان۔ اَحْدَثَہُ - اس نے کسی کام کو (جو پہلے نہیں تھا) پہلی بار کیا۔

اِحْدَاثٌ - وجود میں لانا۔ اَلْمُحَدَّثُ - صادق اور سچا آدمی۔ اَلْمُحَدَّثُ - حدیث بیان کرنے والا****۔ مُحَدَّثٌ - جو قائم بذاتہ نہو***۔ نئی رونما ہونے والی بات۔ جو بات پہلی بار وجود میں آئے۔ جس کی پہلی نظیر نہ ہو۔ نیز جس بات کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو۔ قرآن میں مُحَدَّثٌ کا لفظ انہی معنوں میں آیا ہے (۲۱؛ ۲۶)۔

سورة کہف میں ہے اُحْدِثْ لَكَ (۱۸)۔ ”میں خود ہی پہل کر کے تجھ سے بات کروں،“۔ سورة طہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے یُحْدِثْ لَہُمْ ذِکْرًا (۲۰/۱۳)۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ یہ قرآن کریم لوگوں کو رفعت و بلندی عطا کر دیگا۔ (دیکھئے عنوان ذ۔ ک۔ ر) اور یہ بھی کہ یہ ان کے سامنے نصیحت کی باتیں یا اقوام عالم کے تاریخی نوشتے لائیگا جس سے ان کی سمجھنے کی قوتیں بیدار ہو جائیں گی۔ دونوں صورتوں میں اُحْدِثْ کے معنی وجود میں لانے کے ہیں۔ سورة الضحیٰ میں ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (۹۳/۱)۔ یہاں تَحْدِیْث کے معنی ہیں عام چرچا کرنا۔ ”تو اپنے رب کی نعمتوں کا عام چرچا کرتا رہ،“۔ اَحَادِیْثُ۔ ** (واحد حدِ یث) قصے۔ داستانیں۔ باتیں۔ (۱۲/۱)۔ افسانے (۲۳/۳)۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ابن فارس نے کہا ہے حَدَث کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے موجود نہ تھی۔ اسی سے اَلْحَدِیْثُ ہے کیونکہ وہ ایسی بات ہوتی ہے جس سے ایک کے بعد دوسری بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے بات میں سے بات نکلتی جاتی ہے۔ افسانہ در افسانہ۔

شرعی اصطلاح میں اَلْحَدِیْثُ اس قول یا عمل کو کہتے ہیں جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔ (واضح رہے کہ حدیث کی تفصیلی تعریف طویل ہے۔ ہم نے اسے یہاں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے)۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا۔

ح د د

اَلْحَدُّ۔ اس مادہ میں اصلی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں*۔ حَدَّ الرَّجُلِ عَنِ الْاَمْرِ۔ آدمی کو اس معاملہ سے روکا۔ منع کیا۔ حَدَّتْ فُلَانًا عَنِ الشَّيْرِ۔ میں نے فلاں کو شر سے روکا۔ اَلْحَدُّ دُ۔ روک۔ رکاوٹ۔ ہذا اَمْرٌ حَدَّ دُ۔ یہ امر ممنوع ہے۔ اَلْحَدُّ۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے معیز کرنا۔ نیز وہ شے جو دو چیزوں کے درمیان فصل بن جائے تاکہ ایک چیز دوسری چیز سے مل نہ جائے۔ یا ایک چیز دوسری چیز تک پہنچ نہ جائے اَلْحَدُّ یُدُّ۔ لوہا۔ کیونکہ یہ اپنی سختی کی وجہ سے روک بن جاتا ہے (خصوصاً دشمن سے)۔ نیز تیز یا آرپار ہو جانے والی چیز کو بھی کہتے ہیں۔ حَدُّ۔ دھار تیز کرنا۔ الْمُحَادَّةُ۔ آپس میں دشمنی کرنا، اور ایک دوسرے کی مخالفت

* محیط۔ ** فراء کے نزدیک۔ احادیث در اصل اُحد و ثہ کی جمع ہے جو قیاس کے مطابق ہے لیکن بعد میں یہ حدیث کی جمع بن گئی۔

کرنا۔*۔ دراصل اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو روکنے اور باز رکھنے کی کوشش کرنا۔ سورۃ احزاب میں تیز زبانی (یا طعن و تشنیع) کیلئے **بِالْحَسَنِ حِدَادٍ** آیا ہے (۱۹/۳۳) اس میں **حِدَادٍ** کی جمع ہے یعنی تیز زبانوں سے۔ سورۃ ق میں ہے **فَبَصَّرُكَ الْيَتِيمَ حِدِيدٌ** (۲۴/۵۰)۔ جسکے معنی ایسی نگاہ کے ہیں جو حقیقت پر پڑے ہوئے پردوں سے آر پار گزر کر سب کچھ دیکھ لے۔ جسکے سامنے چھپی ہوئی چیزیں آجائیں۔ اس میں ظہور نتائج کے وقت کی کیفیت کا ذکر ہے جب نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی کہ وہ اعمال کے اندر چھپے ہوئے نتائج و عواقب کو بے نقاب دیکھ لیں گی۔ سورۃ الحديد میں کتاب (ضابطہ قوانین) کی عملی تنفیذ کیلئے **حَدِيدٌ** (فولاد) کے نازل کرنے کا ذکر ہے جسکے معنی قوت (یا شمشیر) کے ہیں۔ (۳۵/۵۰)۔ سورۃ مجادلہ میں ہے **إِنَّ الَّذِينَ يُجَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ** (۵۸/۵)۔ اسکے معنی مزاحمت کرنے کے ہیں۔ یعنی جو لوگ قانون مملکت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں قوانین خداوندی کیلئے متعدد مقامات پر آیا ہے **تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلاَ تَقْرَبُوهَا** (۲/۱۸۷)۔ ”یہ اللہ کی حدود ہیں جن کے قریب مت جاؤ“۔ قوانین الہیہ کو **حُدُودُ اللَّهِ** سے تعبیر کرنے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کریم نے (عام طور پر) صرف اصولی احکام دئے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں۔ قرآن کے اصول تو غیر متبدل رہینگے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی قوانین بنائے جائینگے وہ حالات کی تبدیلی کیساتھ بدلتے رہینگے۔ اس طرح انسان کو غیر متبدل حدود کے اندر سعی و عمل کی پوری آزادی رہتی ہے، جس طرح کھیل کے میدان میں چند لکیروں اور ضابطوں کے اندر ٹیم کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق کھیلے۔ لہذا قرآن ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسان، مستقل اقدار اور تبدیل ہونے والے تقاضے، دونوں کا ساتھ دیتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی آزادی کو قاطبۂ سلب کرتا ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت پر غیر متبدل پابندی عائد کر دے، اور نہ ہی اسے ایسا بے زمام چھوڑتا ہے کہ وہ مستقل اقدار کی پابندی سے بھی بے نیاز ہو جائے۔ یہ ہے مقصد **حُدُودُ اللَّهِ** کا۔ لیکن ہم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اپنے لئے ایسے جامد احکام وضع کر رکھے ہیں جس سے اسلام ایک زندہ حرکت بننے کے

بیجائے منجمد اور متحجر نظریات و رسمیات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا۔

چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین۔

ح د ق

الْحَدَقَةُ - آنکھ کی سیاہی جو پتلی کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی چیز کا احاطہ کرے، اُسے اپنے گھیرے میں لے لے۔ حَدَقُوا بَيْهٍ يَحْدِقُونَ - انہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنی گولائی کے ساتھ گھیرے میں لے لے، اس کے لئے أَحْدَقَ بَيْهٍ کہتے ہیں۔ آنکھ کی سیاہی کی نسبت سے حَدَرِ يُّقَّةٌ وادی کے اس گڑھے کو کہتے ہیں جو پانی کو اپنے اندر جمع کر لے۔ یا ہر نشیبی زمین کو جس میں پانی رک جائے۔ اسی طرح حَدَرِ يُّقَّةٌ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف دیوار ہو۔ جس کے گرد دیوار نہ ہو اسے حَدَرِ يُّقَّةٌ نہیں کہتے۔ نیز اس میں گھاس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر گھاس نہ ہو تو اسے رَوْضَةٌ کہینگے*۔ اس کی جمع حَدَائِقُ ہے۔ قرآن کریم میں حَدَائِقُ ذَاتِ بَهْجَةٍ (۲۶) آیا ہے۔ یعنی خوشنما باغات۔ یہاں اس سے مراد عام باغات ہیں۔

ح ذ ر

حَذَرٌ - حَذَرٌ - خوف زدہ کرنے والی چیز سے بچنا۔ محتاط رہنا۔ اجتناب کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بچاؤ اور چوکنا رہنے کے ہیں۔ چنانچہ رَجُلٌ حَذِرٌ، اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت احتیاط کی وجہ سے جاگتا رہے۔ ابْنُ أَحْذَرٍ، اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی محتاط ہو۔ حَذَرَ حَذَرَ کے معنی ہیں۔ بچو، بچو**۔ الْحَذَرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہتھیار لگا کر جنگ کیلئے بالکل مستعد ہو*۔ اس کی جمع حَذَارٌ رُونٌ ہے۔ وَ إِنَّا لَجَمِيعٌ حَذِرُونَ (۲۶) کے معنی اسلحہ بند لشکروں کے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا (۱۴) کے معنی ہیں خدا کا عذاب (یعنی انسان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ) فی الواقعہ ایک ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ سورۃ

* تاج و راغب و محیط ** تاج و محیط

بقرہ میں فَاحْذَرُوْهُ (۲/۳۵) کے معنی ہیں قانون خداوندی کی نگہداشت اور پاسداری رکھو۔ سورۃ زمر میں بندہ مومن کے متعلق ہے يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (۳۹/۱) وہ آخرت (مستقبل) کی زندگی کی نگہداشت رکھتا ہے۔ سورہ مائدہ میں فَخْذُوْهُ کے مقابلہ میں فَاحْذَرُوْا آیا ہے (۵/۳۱) جس کے معنی کسی شے سے محتراز رہنے کے ہونگے۔ سورۃ بقرہ میں حَذَرَ السُّمُوْتِ (۲/۱۹؛ ۲/۳۳) کے معنی ہیں موت سے بچنے کی خاطر۔ سورۃ نساء میں خُذُوْا حِذْرَكُمْ (۴/۲۱) میں تمام حفاظتی تدابیر آ جاتی ہیں، بیدار مغزی کے ساتھ۔

حَذَرَهُ تَحْذِيْرًا اسے چوکنا کیا، خبردار کیا۔ محتاط رہنے کے لئے کہا۔ حَذَرَهُ مِّنْ اَمْرٍ يَّا حَذَرَهُ الْاَمْرُ۔ اس نے اُسے اُس بات سے محتاط رہنے کے لئے کہا (یا تاکید کی)۔ قرآن کریم میں ہے يَحْذَرُكُمْ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۳۸/۳) ”خدا تمہیں اپنے (قانونِ مکافات کے عواقب سے) محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر یوں کہی گئی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۱/۵) ”یقیناً تیرے رب کا عذاب (غلط اعمال کے نتائج) ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

ح ر ب

الْحَرْبُ - صاحب محیط کے نزدیک اس مادہ میں اصل معنی ویرانی۔ تباہی و بربادی۔ تلف۔ سلب و نہب کے ہیں *۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے الْحَرْبُ - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھیننے کے ہیں۔ یہ لفظ سِلْمٌ (امن و صلح) کی ضد ہے۔ یعنی لڑائی **۔ حَارِبَهُ - اس سے لڑائی کی، نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے **۔ چنانچہ لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلَهٗ (۹۰/۱) - یا۔ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۹۰/۵) میں اس کے معنی سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں **۔ حَرْبٌ - جنگ (۲/۱۹) - الْمِحْرَابُ - بالا خانہ۔ بلند جگہ۔ صدر مکان۔ نیز محلات (بحوالہ کتاب الاشتقاق) کیونکہ ایسی اونچی جگہیں دراصل حرب ہی کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ جیسے قلعوں کی برجیاں وغیرہ۔ مَحَارِبُ بَنِي إِسْرَآئِيْلَ - بنی اسرائیل کی مساجد جن میں وہ امور حرب کے متعلق مشورے *** کیا کرتے تھے **۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے

* محیط۔ ** تاج۔ *** قرآن میں مسلمانوں کے متعلق بھی اقامت صلوات کے ساتھ و اسرہم شوریٰ بینہم آیا ہے (۲۲/۳۸) یعنی وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ اس سے مساجد اور مشاورت کا تعلق ظاہر ہے۔

کہ مِجْرَابِ ہیکل میں اس مقام کو کہتے تھے جہاں قربانیاں دی جاتی تھیں۔ یعنی قربانگاہ۔ حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے ھُوَ قَائِمٌ یُصَلِّیْ رَفِیْ الْمِجْرَابِ (۳۸/۳۸)۔ ”وہ قربانگاہ میں کھڑا مصروف صلوٰۃ تھا“۔

سورۃ سباؑ میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کیلئے مَحَارِیْبُ تیار ہوئے تھے (۳۳/۱۳) اس کے معنی مضبوط قلعے یا محلات بھی ہو سکتے ہیں اور ہیکل (مساجد) بھی۔

ح و ث

الْحَرْتُ کے بنیادی معنی ہیں کچھ کمانا۔ کسب و ہنر کرنا۔ اس کے بعد یہ لفظ زمین پر کام کرنے کیلئے عام ہو گیا۔ چنانچہ حَرْتُ کے معنی ہیں کھیتی باڑی کرنا۔ چونکہ کام کرنے اور کمانے کیلئے تگ و تازا اور فکر و تجسس کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے حَرْتُ الشَّیْءِ کے معنی ہیں اس نے اس بات میں تفرقہ حاصل کر لیا۔ الْحَرْتُ کے معنی ہیں آگ کو حرکت دینا تا کہ وہ زیادہ روشن ہو جائے۔ الْمِحْرَاتُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے آگ کریدی جائے*۔ قرآن کریم نے عورتوں کو حَرْتُ (کھیتی) سے تشبیہ دی ہے۔ (۲۳/۲۳) اس لئے کہ وہ افزائشِ نسلِ انسانی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے میاں بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصود کیا ہے۔ یعنی افزائشِ نسل۔ (مزید تفصیل ح۔ ص۔ ن۔ اور س۔ ف۔ ح کے عنوانات میں ملیگی)

سورۃ واقعہ میں تَحْرِتُونُ (۵۱/۵۱) کے معنی ہیں تخم ریزی (یعنی زمین میں بیج ڈالنا)۔ اور اس کے بعد تَزْرَعُونُ (۵۱/۵۱) کے معنی ہیں کھیتی کا زمین سے اگانا۔ حَرْتُ تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لیکن زَرْعُ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان زمین میں بیج ڈال سکتا ہے۔ اُس بیج کو زمین سے اگانا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ فرد متعلقہ کی محنت اور خدا کے وہی عطیہ دونوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں سے فرد متعلقہ صرف اپنی محنت کا حقدار ہو سکتا ہے۔ وہ موہبتِ خداوندی کا مالک نہیں بن سکتا۔ تفصیل کے لئے میری کتاب نظام ربوبیت دیکھئے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ حَرْتُ نَاقَتَہ کے معنی ہیں اس نے اپنی اونٹنی کو لاغر کر دیا۔ غالباً تگ و تازا اور محنت کی بنا پر یہ معنی لئے گئے ہیں۔

ح ر ج

الْحَرَجُ - در اصل چیزوں کو اس طرح جمع کرنے کو کہتے ہیں جس سے تنگی نظر آنے لگے۔ یعنی جگہ کم ہو اور چیزیں زیادہ ہوں تو وہ جگہ تنگ نظر آنے لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں بہت ہی گھنے درخت ہوں*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے یہ لفظ اضطراب بے اطمینانی اور شک کے معنوں میں استعمال ہونے لگا*۔ جو کام دل کی کشاد سے نہ کیا جائے اس کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ حَرَجَ الرَّجُلُ أَنْيَابَهُ کے معنی ہیں اس نے اپنے دانت پیسے*۔ لَا حَرَجَ عَلَيَّكَ - تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں**۔ اسی سے یہ لفظ گناہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے***۔

اصل یہ ہے کہ جن الفاظ میں حَاء اور رَاء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ حَرَجٌ میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے****۔

سورة نساء میں ہے کہ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کی اطاعت اس طرح کریں کہ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴/۶۵)۔ ”وہ اس اطاعت سے اپنے دل میں ذرا سی بھی کبیدگی محسوس نہ کریں“۔ سورة نور میں یہ لفظ قابل اعتراض بات کے معنوں میں آیا ہے (۲۴/۶۱)۔ سورة حج میں ہے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (۲/۱۸)۔ ”اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی“۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ دین زبردستی قبول نہیں کرایا جاسکتا۔ اسے بہ طیب خاطر اختیار کیا جائیگا۔ لَا اكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶)۔ اور یہ معنی بھی کہ دین میں جن قوانین کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ تم سے کوئی بیگاری جاتی ہے۔ بلکہ یہ اس لئے ہے کہ خود تمہاری ذات میں وسعت اور استحکام پیدا ہو۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ ”اللہ کسی نفس کو کسی کام کے لئے مکلف نہیں ٹھہراتا بجز اس کے کہ اس سے مقصد خود اس ذات (نفس) میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے“۔ یاد رکھئے۔ ”دین میں تنگی نہیں“ سے مراد یہ نہیں کہ آپ دین (نظام) کے اندر بھی رہیں اور اس کے بعد جن باتوں میں آسانی محسوس کریں انہیں مانیں اور جن میں کچھ گرانی نظر آئے انہیں یہ کہہ کر چھوڑ دیں کہ دین میں تنگی نہیں۔ جب تک آپ اس نظام کے اندر ہیں

اسکے تمام قوانین و ضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہوگا۔ جسوقت آپ اسمیں تنگی محسوس کریں اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائیں۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے نظام کے ہر حکم اور ضابطہ کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ جبر نہیں بلکہ ایسی پابندی ہے جسے انسان خوش دلانہ اور رضاکارانہ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ یعنی اس کا بہ طیب خاطر دین قبول کر لینا اس امر کا اقرار ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ پابندیوں کو اپنے اوپر لازم قرار دیگا۔ دین میں تنگی نہ ہونے سے یہ مراد ہے۔

ح ر د

حَرَدَہ - يَحْرُدُہ - حَرَدَاً اس نے اسکا قصد کیا۔ اس نے اسے روکا اور منع کیا۔ الْحَرُّوْدُ کے معنی الگ تھلگ رہنے کے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ارادہ کرنا (۲) غصہ ہونا اور (۳) ایک طرف کو ہو جانا، ہیں۔ رَجُلٌ حَرَارِدٌ - الگ رہنے والا آدمی - غضبناک آدمی کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن میں باغ والوں کی مثال کے ضمن میں کہا ہے وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِيْنَ (۶۸/۲۸) - اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل پر قادر تھے۔ اور یہ بھی کہ وہ اسکی قوت رکھتے تھے کہ غریبوں اور مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔ سباق عبارت کی رو سے دوسرے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں حَاء اور رَاء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوتا ہے۔ مثلاً الْحَرْدُ - غضب اور غصہ۔

ح ر ر

الْحَرَرُ - الْحَرُّوْرُ - الْحَرَارَةُ - گرمی - الْحَرُّوْرُ - (دھوپ کی) تپش (قرآن میں یہ لفظ ظیلؑ کے مقابلہ میں آیا ہے ۳۵/۳۱) - الْحَرَرُیْرُ ** - ریشمی کپڑا (۶۱/۶۱) - راغب نے لکھا ہے کہ ہر باریک کپڑے کو حَرَرُیْرُ کہتے ہیں۔ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس انداز سے خالص ہونا کہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو **۔

الْحَرَرُ - عِبْدٌ کی ضد ہے۔ - مرد آزاد بمقابلہ غلام۔ ہر چیز کا بہترین حصہ۔ عمدہ گھوڑا۔ عام زمین اور ریتیلی زمین میں سے بہترین زمین۔

* تاج و راغب - ** تاج -

”حَشْرٌ كُلٌّ اَرْضٍ - ہر زمین کا بہترین حصہ - مَا هَذَا مِنْكَ بِيَحْشُرٍ -

یہ بات تمہاری طرف سے اچھی نہیں ہے*

حَشْرٌ - يَحْشُرٌ - آزاد ہونا - اَلَّتَّحْشُرَ يَحْشُرُ - (باندی اور غلام کو) آزاد کرنا - تَحْشِيرُ الْكِتَابِ میں اگرچہ تحریر کے معنی اس اعتبار سے آزاد کرنا ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے خیالات کو ذہن کی قید سے آزاد کر کے صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے لیکن صاحبِ تاج کے خیال میں اس سے مراد کتاب کے حروف کو خوبصورت بنانا اور اس کے اغلاط کو درست کرنا ہیں - یعنی بہتر بنانا -*

تَحْشِيرُ الْوَلَدِ - کسی بچہ کو معبد یا خانقاہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینا - سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے کہا تھا اِنِّى نَذَرْتُ لَكَ مَا فِى بَطْنِى ”مَحْشَرًا“ (۳۳) - ”جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اسے میں نے معبد کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی منت مانی ہے“ - اس میں ”مَحْشَرًا“ کے یہی معنی ہیں - اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ بچہ اپنی ساری عمر اس خدمت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا - یعنی وہ عمر بھر کے لئے کنیسہ کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتا تھا* - چنانچہ اب بھی عیسائیوں کی (Nuns) کو عمر بھر غیر شادی شدہ رہ کر اپنے آپ کو کلیسا کی خدمت کے لئے وقف رکھنا پڑتا ہے - اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے وہ تمام مقامات واضح ہو جاتے ہیں جن میں یہودیوں نے حضرت مریم کو مورد طعن و تشنیع بنایا تھا - حضرت مریم کو کنیسہ کی خدمت کے لئے بطور (Nun) وقف کر دیا گیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت مریم کی والدہ نے انہیں ہیکل کی نذر کیا تھا اس وقت ابھی ہیکل کے دستور میں یہ چیز داخل نہیں تھی کہ ہیکل کی خدمت گار لڑکی کو عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کرنی ہوگی - یہودیوں نے بعد میں یہ قاعدہ وضع کر لیا (جو پھر عیسائیوں میں بھی جاری رہا - اور اب تک جاری ہے) حضرت مریم نے خدا کے حکم کے مطابق (انسانوں کے اس خود ساختہ مستبد) قاعدے کو ٹھکراتے ہوئے شادی کر لی اور خانقاہ کو چھوڑ کر تامل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی - یہودیوں کے خود ساختہ ضابطہ خانقاہیت کی رو سے ان کا یہ عمل بہت بڑا جرم تھا اور ”دین“ سے سرکشی کے مرادف - اس لئے یہودیوں کے احبار و رہبان ان کے پیچھے پڑ گئے - یہ تھا حضرت مریم کا جرم - (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”شعلہ“ مستور، میں ملے گی)

ح ر س

‘حَرَسَهُ’ - ‘يُحَرِّسُهُ’ وَ ‘يُحَرِّسُهُ’ - اس نے اس کی حفاظت کی -
 ‘لَحَرَسَتْ’ - سرکاری چوکیدار اور محافظ - ‘حَرَسَ الرَّجُلُ’ - اس آدمی نے
 چوری کی - ‘لَحَرِيسَتَهُ’ - مسروقہ شے * -

قرآن کریم میں ہے ‘حَرَسًا شَدِيدًا’ (۹۲/۸) یعنی سخت پہرے
 دار - ‘حَرَسٌ’ اور ‘حَرَسٌ’ - ‘حَرَسٌ’ کی جمع ہے جس کے معنی کسی
 جگہ کے محافظ کے ہیں - ‘حَرَزٌ’، سامان کی حفاظت کو کہتے ہیں اور ‘حَرَسٌ’
 جگہ کی حفاظت کو۔ **

اس میں سختی اور مشقت کا پہلو مضمر ہوگا کیونکہ اس لفظ میں
 حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں - اور یہ ان کا خاصہ ہے *** -

ح ر ص

‘الْحَرَصُ’ کے معنی ہیں کسی چیز میں چھید کر دینا - کسی چیز کو
 پھاڑ دینا یا چھیل دینا - جس طرح دھوبی کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اس
 میں سوراخ کر دیتا ہے یا پھاڑ دیتا ہے - چنانچہ ثَوْبٌ ‘حَرَصٌ’ اس طرح
 پھاڑے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں - ‘الْحَرَاَصَةُ’ - اس بادل کو کہتے
 ہیں جو اپنی بارش سے زمین میں سوراخ کر دے - یا اس کی بالائی سطح کو
 کھرچ دے - ‘الْحَرَصَةُ’ - تھنوں کا اس طرح پھٹ جانا کہ دودھ کی دھاریں
 منتشر ہو کر برتن میں گریں **** -

ان بنیادی معانی کے پیش نظر ‘حِرْصٌ’ ایسی شدید آرزو کو کہتے ہیں
 (خواہ وہ اچھی چیز کی ہو اور خواہ بری چیز کی) جو دل کے آر پار ہو جائے -
 دل میں نہ ٹھرے اور اس کا بار بار اظہار کیا جائے - یعنی نہایت شدید
 خواہش - * ابن فارس نے یہ دونوں اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے ‘وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ’
 (۹۶/۲) ”تو دیکھیگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہنے کی خواہش بہت
 زیادہ ہے“ - دوسری جگہ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے - ‘حَرِيصٌ عَلَىٰكُمْ’
 (۱۲۸/۹) - ازہری نے کہا ہے کہ ‘حَرِيصٌ عَلَىٰكَ’ کے معنی اہل عرب کے
 نزدیک ‘حَرِيصٌ عَلَىٰكَ’ ہوتے ہیں * - یعنی اس کے دل میں

تمہاری منفعت کی آرزو نہایت شدید ہے۔ یعنی عَزَّ يَزَّ عَلَيَّہِ مَا عَنِتُّمْ (۱۲۸) ”جو تمہیں دکھ پہنچتا ہے وہ اس پر شاق گزرتا ہے“ منفیانہ پہلو ہے، اور حَرَّ يَصَّ عَلَيَّكُمْ ”وہ تمہاری منفعت کی شدید آرزو رکھتا ہے“ اس کا مثبت پہلو۔

ح ر ض

الْحَرَضُ - بگاڑ - خواہ جسم میں ہو خواہ عقل میں* - تھکا ہوا کمزور آدمی جو بالکل تباہی کے قریب ہو نیز جسے غم و عشق نے گھلا ڈالا ہو (۱۲۵) - ناقابل اعتناء چیز جسمیں کوئی خوبی باقی نہ رہ گئی ہو*** - الْحَرَضُ - جو شخص بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نڈھال ہو چکا ہو۔ اور ازکار رفتہ*۔

راغب نے کہا ہے کہ تَحَرُّضٌ کے معنی اِزَالۃُ الْحَرَضِ کے ہیں۔ یعنی کسی کی کمزوری، لاغری یا خرابی کو دور کر دینا۔ جیسے مَرَضَتُّہُ کے معنی مرض دور کرنے کے ہوتے ہیں***۔ لہذا حَرَضٌ کے معنی ہیں کسی شخص کو ایسے کام کے لئے برانگیختہ کرنا جو اس کے لئے حیات بخش ہو اور اگر وہ اسے نہ کرے تو اسکی ہلاکت کا خوف ہو۔ قرآن میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے وَ حَرَضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (۸۴)۔ اسکے عام معنی ہیں ”تو انہیں جنگ کیلئے برانگیختہ کر،“۔ لیکن اسکے اصلی معنی ہونگے تو ان مومنین (یعنی اپنے رفقاء) کی تمام کمزوریوں اور کمیوں کو دور کر دے تاکہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں۔ اسی کا نام تَرْكِيہ ہے۔ وَ يَزْكِيہِم (۶۲) یعنی نشو و نما دینا۔ بالیدگی اور نمو پیدا کرنا۔ کمزوری اور کمی کو رفع کرنا اس پروگرام کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔

ح ر ف

حَرَفٌ - کسی چیز کا سرا، کنارہ یا حد۔ حَرَفُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا اوپر کا حصہ جو ایک طرف کو نکلا ہوا ہو۔ فُلَانٌ عَلَى حَرَفٍ مِّنْ أَمْرٍ - وہ شخص اپنے معاملہ میں ایک کنارہ پر کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ جس طرف جانے میں اسے فائدہ نظر آئے اسی طرف چلا جائے*۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَ مِّنَ النَّاسِ مَن يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرَفٍ (۲۲)۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کے معاملہ میں ایک

کنارہ پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت میں فائدہ ہو تو یوں کر لیا جائے اور اگر انہیں چھوڑنے میں فائدہ نظر آئے تو چھوڑ دیا جائے۔ حَرَافَ الشَّيْءِ عَنِ وَجْهِهِ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے پھیر دیا۔ بدل دیا۔ اَلْتَّحْرِيفُ - تغیر و تبدیل کر دینا۔ خواہ یہ لفظی ہو خواہ معنوی۔ قلم پر ڈیڑھا قط لگانا۔ اِنْ حَرَفْتَ - ایک کنارہ کی طرف جھک جانا، ڈیڑھا ہو جانا* - يَحْرِفُ فَوْنَهُ مِیْنُ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ (۲/۵)۔ ”کلام اللہ کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تغیر و تبدیل کر دیتے ہیں“۔

حَرَافَ لِعِیَالِهِم - اس نے اپنے اہل و عیال کیلئے کمائی کی*۔ اَلْحِرْفَةُ - صنعت اور پیشہ جس سے انسان اپنی معاش پیدا کرے۔ حَرَّ يَفْكُكَ تمہارا ہم پیشہ**۔ (ہم پیشہ لوگوں میں باہمی چشمک کی وجہ سے یہ لفظ ہمارے ہاں مد مقابل یا دشمن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)۔ اَلْمُحَارَفُ - وہ شخص جو حصول معاش کیلئے بڑی محنت کرے لیکن اس کے باوجود اس کی آمدنی اس کے اہل و عیال کے گزارہ کیلئے کافی نہ ہو**۔ اَلْمُحَرَّرُ - وہ شخص جس کا مال جاتا رہا ہو**۔ لہذا تحریف کے معنی اس طرح کی توجیہ و تاویل کرنا ہونگے جس سے اس کی وہ روح جاتی رہے جو دراصل اس کا رأس المال ہے۔ خواہ یہ تحریف، الفاظ کے رد و بدل سے ہو یا مفہوم کی تبدیلی سے۔ اہل کتاب نے اپنی آسانی کتابوں میں جو تحریف کی ہے اس کے متعلق سورۃ نسا، میں ہے يَحْرِفُ فَوْنُ الْكَلِمِ عَنِ مَقَوَّاضِيهِ (۴/۴۶) ”وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں“، - نیز (۵/۴) - اس سے تحریف لفظی بھی مراد ہو سکتی ہے اور تحریف معنوی بھی۔ اور سورۃ بقرہ میں ہے يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ... (۲/۹) ”یہ لوگ الکتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے“ اس سے تحریف لفظی مراد ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنی آسانی کتابوں میں جس بڑی طرح سے تحریف کی ہے اس کی تفصیل میری کتاب ”معراج انسانیت“ کے پہلے باب ”ظہر الفساد“ میں ملیگی۔ ان کی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

ح ر ق

حَرَقَ اَلْحَدِيدَ بِالْمِبرَدِ - لوہے کو ریتی سے گھسا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ چونکہ اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے

معنی آگ میں ڈال کر جلا دینے کے ہیں۔ اَلْجَارِقُ - آگ کا شعلہ یا آگ۔
 اَلْحَارِقَةُ - آگ۔ اَلْجَارِقُ مِّنَ السَّحَابِ - سخت بجلیوں والا بادل۔*
 اَلْجَارِقُ - آگ۔*** نیز جلنا۔****

سورۃ آل عمران میں ہے ذُو قُوَّةٍ اَعَذَابُ اَلْجَارِقِ (۱۸۰)۔ ”سب کچھ جلا کر تباہ کر دینے والا عذاب چکھو،،۔ سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے قَالُوا حَرِّقُوْهُ (۲۱)۔ ”انہوں نے کہا کہ اسے جلا ڈالو“۔ اَلْحَارِقُ - جل جانا (۲۱)۔

چونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں اس لئے اس کے مفہوم میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوگا۔ یہی اس کا خاصہ ہے۔**

ح رک

حَرَكَتٌ - يُحَرِّكُ - حَرٌّ كَأَوْحَرٍ كَسَّةٌ - ہِلا، حرکت کی (سکون کی ضد ہے)۔ حَرٌّ كَسَّةٌ فَتَحَرَّكَ - میں نے اسے حرکت دی۔ پس وہ متحرک ہو گیا۔ یہ صرف مادی چیزوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات تَحَرَّكَ كَذَا اس موقع پر بھی بولتے ہیں جب کسی چیز میں کچھ تغیر ہو جائے۔ یعنی اس کے اجزاء میں کمی بیشی ہو جائے۔*

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُحَرِّكْ كُفَّيْهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (۹۵)۔ ”اس کے لفظی معنی ہیں تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت مت دے، تاکہ اسے جلدی لے لے، اس کا مفہوم عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کریم کے متعلق ہے اس لئے کہ دوسرے مقام پر ہے، وَلَا تَعْجَلْ بِالنُّقُرِ اَنْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّقْضَىٰ اِلَيْكَ وَحْيُهُ (۲۱۳) یعنی جب تک (کسی ایک معاملہ کے متعلق) وحی کی پوری تعلیم سامنے نہ آجائے اس کے عملی پروگرام میں عجلت مت کرو۔ عملی قدم اس وقت اٹھاؤ جب سارا پروگرام واضح طور پر سامنے آجائے۔ لیکن (۹۵) سے پہلے قرآن کا ذکر نہیں۔ انسان اور اس کے اعمال کا ذکر ہے۔ اس صورت میں، اس آیت سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اگر ربط مضمون پیش نظر ہو تو یہ سمجھنا ہوگا کہ یہاں خطاب خود انسان سے ہے اور بات بھی اس کے اعمال نامہ سے متعلق ہے۔ (اس کی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں کی جائیگی کیونکہ وہی اس کا صحیح مقام ہے۔)

ح ۲۲

حَرَمَهُ الشَّيْءُ حَرِيْمًا وَ حَرِيْمَانًا - اس سے کسی شے کو روک لینا - اس شے کو اس تک پہنچنے نہ دینا - لہذا اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روک دینے یا ممانعت کر دینے کے ہیں - (ابن فارس) الْحَرَامُ - تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کردی گئی ہو - جنکے کرنے سے روک دیا گیا ہو - یہ الْحِلَالُ کی ضد ہے جسکے معنی ہیں رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کر دینا - أَحْرَامُ الْحَجَّاجِ - حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک ایسی چیزیں ممنوع ہو گئیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا - اسی کو حالت احْرَامُ کہتے ہیں - الْحَرِيْمُ - ہر حرام کی ہوئی ممنوع چیز - ہر جگہ جس کی حمایت و حفاظت لازمی ہو - نیز ایام جاسمیت میں ان کپڑوں کو کہتے تھے جنہیں وہ لوگ طواف کعبہ کے وقت اتار دیا کرتے تھے اور ننگے حج کیا کرتے تھے - یعنی ان کپڑوں کا پہننا ممنوع تھا - اسی طرح أَشْهُرُ الْحَرَمِ - وہ (چار) مہینے (رجب - ذوالقعدہ - ذوالحجۃ اور محرم) تھے جن میں جنگ کی ممانعت تھی *

روکنے کے اعتبار سے حَرِيْمٌ الدَّارِ ، مکان کے اس اندرونی حصہ کو کہتے ہیں جو حد بندی کر کے مکان میں داخل کر لیا گیا ہو *

الْمَحْرُومُ - وہ ہے جسکی ضروریات رک جائیں - جسکے پاس کچھ نہ رہے * - اصل میں اس میں مشقت کا پہلو مضمر ہے - اس لئے کہ حَرَامٌ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں - اور ان کا خاصہ ہے کہ جس لفظ میں یہ اکٹھے آئیں اس میں مشقت اور سختی پائی جائے ** - اسی لئے اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روکنے کے ہیں - الْحَرْمَةُ کے معنی ہیں وہ کام جس کا کرنا جائز نہ ہو - وہ پابندی جسکے توڑنے کی ممانعت ہو - نیز وہ ذمہ داری جس کی حفاظت لازمی ہو - وہ کام جسکا کرنا ضروری ہو * - قرآن میں جہاں ہے تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْهِ كُمْ إِلَّا تَشْرِكُوا بِهِ... (۱۵۲) - تو وہاں اسکے معنی یہی ہیں کہ یہ وہ باتیں ہیں جو اللہ نے تم پر واجب قرار دی ہیں - جنکی خلاف ورزی سے تمہیں روکا گیا ہے -

سورۃ انبیاء میں ہے وَ حَرَامٌ عَلٰی قَرْبَةٍ اٰهْلًا كُنْهًا اَنْتَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ - (۲۱) - جو قوم ہمارے قانون مکافات کے مطابق تباہ و برباد

ہو جاتی ہے اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ پھر زندہ نہ ہو سکے*۔ بمعنی اسکی باز آفرینی اسکے لئے ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ قوموں کی وہ آخری تباہی ہے جو مہلت کے وقفہ کے بعد عمل میں آجاتی ہے اور جس سے وہ قومیں پھر ابھر نہیں سکتیں۔ لیکن اگر اس آیت کو اس کے بعد کی آیت سے ملا یا جائے جو حَتَّٰی سے شروع ہوتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ انکی باز آفرینی اسوقت ممکن ہوتی ہے جب وہ صورت پیدا ہو جائے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ یا اس آیت کے معنی یہ ہونگے کہ جب ہم نے بستیوں کو ہلاک کیا تھا تو ان پر یہ سزا اس لئے واجب ہوئی تھی (حَرَامٌ عَلَیْہِ) کہ وہ کسی طرح بھی خدا کے قانون کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ یعنی کوئی قوم مستحق ہلاکت اسوقت ہوتی ہے جب اس میں ”رجعت الی اللہ“ کی صلاحیت نہیں رہتی۔ (اس صورت میں اگلی آیت میں حَتَّٰی زائد ہوگا)

حَرْمٌ^۵۔ حالت احرام میں (۱/۵)۔ اَلْحَرْمَاتُ^۶۔ جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے (۱/۶)۔

مُحَرَّمٌ^۷۔ جو کسی چیز سے روک دیا گیا ہو۔ حَتَّٰکَ اپنی محنت کے ماحصل سے بھی۔ (۱/۷)۔ جسکی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں (۱/۸)۔ مَحَرَّمٌ^۸۔ جو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہو (۱/۸)۔ جسے واجب التحريم یا واجب الاحترام بنایا گیا ہو (۱/۹)۔

حرام و حلال۔ چونکہ حرام اور حلال کے سوال کو مذہب (اور دین) میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایسی اہمیت کہ بعض اوقات یہی شے ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم۔ ہر انسان۔ محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِيَّ آدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے (۱/۳) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔

* ابن قتیبہ نے بھی لکھا ہے کہ لا یرجعون میں لا زائد ہے۔ یہاں حرام کے معنی واجب کے ہیں۔ (الترطین ج/۱ ص ۱۳۴ ج/۲ ص ۲۶) دوسرے معنی صحیح ہیں۔ لا زائد نہیں مانا جاسکتا۔

اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُشْوَ تِيَّهَ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۸) ”کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اسے ضابطہ قوانین۔ یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو،۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑھا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی امت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے ”حرام“ کا لفظ استعمال کیا ہے جو ”حلال“ کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں، رسیاں کھول کر آزاد کر

دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا۔ اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ
وَأَشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ - إِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ الْفَاحِشَةَ وَاللَّسْمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا
أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ..... (۲-۱۳۰)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور خون* اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ
وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ..... (۳۲)

(ان سے) کہہ دو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
وَمَا بَاطِنٌ..... (۳۳)

ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

* سورہ انعام میں دمماً مسفوحاً کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶-۱۶)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

- (i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔
- (ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔
- (iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔
- (iv) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دئیے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ سورۃ انعام میں ہے۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِيْ مَا أُوحِيَ اِلَيَّ مَحْرُومًا عَلٰى
طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ اِلَّا... (۱۶۶)

(اے رسول ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اس میں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے (مردار، بہتے خون، لحم خنزیر اور اسکے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو)

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رو سے کر دیا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۃ حج میں ہے۔

وَاُحِلَّتْ لَكُمْ اِلَّا نَعَامٌ اِلَّا مَا يُنْتَلٰى عَلَيْهِ كُمْ
..... (۲۲)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رو سے بتا دیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنائی) جاتی ہے۔

یہ ”مَآیُتُلٰی“ وہ وحی تھی جو ”الکتاب“ میں تھی۔ سورۃ عنکبوت میں ہے اُتِلْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (۲۹) ”اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے“۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۃ آل عمران کی اس آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے

کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳۸)۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو۔ سورۃ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنْشَاءً اُمِرْتُ اَنْ اَتْلُوَ الْقُرْآنَ . . . (۲۴/۹۲) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت* کروں۔“

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

- (i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور
(ii) اسے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۃ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۲۴/۳۴) ”ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟“ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ اس بارے میں ، اور تو اور ، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (۲۱/۱)

اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے ،
تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے ؟

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یابات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ ، دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف ، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

*تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

اس مقام پر ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَیِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے یَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا۔۔۔۔۔ (۲/۱۶۸) ”اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے۔ اسے طیب انداز سے کھاؤ“ طیب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق، میلان طبع، طبی ضرورت اور دیگر تضمینات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف، یا عقیدتمندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح، بالواسطہ (Indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ پہلی قوموں میں ایسا ہو چکا تھا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) ”خدا نے حرام قرار دیا تھا، اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ ”كُلُّ الشَّيْءِ حَلَالٌ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ“ (۹۳) ”یہ تمام کھانے (جواب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے

اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے، (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہو سکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی امت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کر لیں۔ اسلئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث نہ اتمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۃ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیات کبریٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وَ يَحِلُّ لَهُمْ الطَّيِّبَاتُ وَ يَحَرَّمَ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثُ (۱۵۷) ”وہ ان کے لئے طہیات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھہرائے گا“۔ اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(i) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حَلَلْتُ وَ

حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(ii) خود نبی اکرمؐ سے یہ نص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تَحَرِّمُ مَا

أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (۶۶) ”جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال

قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے“۔

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حَلَلْتُ وَ حرمت کا اختیار

نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے

ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور

کبھی رسول کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے ، سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ..... (۸۹) ”جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دیکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں“۔ اور دوسری جگہ ہے وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (۱۰۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے ، خدا ، وحی ، کتاب ، رسول۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد ، اب آیت زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ يُحِلُّ لَّهُمْ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۱۵۰) یعنی رسول ان کے لئے طہیبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورہٴ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرِّمُوا مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ (۸۷) ”اے ایمان والو! جن طہیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔“ یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طہیبات کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ (اسی) سورہٴ اعراف میں ہے قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ... (۳۳) ”اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے تو صرف فواحش حرام کئے ہیں ،، یہاں خود رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورہٴ بقرہ میں ہے وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الْبَيْعَ (۲۷۵) اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربو کو حرام ،،

لہذا ، قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

اس سلسلہ میں سورہٴ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَلَا
بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ
وَرَسُولُهُ..... (۲۹)

(اہل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے۔ ان سے جنگ کرو۔

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ اس آیت میں ،، یَجِزُّ مَوْنٌ مَّا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ،، سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ حرام کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضا مند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھہرایا) انہیں حرام قرار دیدیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرِّمُوا طَيِّبَاتٍ مَّا
أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کا اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ
هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا
عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ..... (۱۶۶)

اور جو تمہاری زبانیں یونہی جھوٹ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تا کہ اللہ پر محض بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن کریم نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (یا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں) اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ”شریعت خداوندی“ کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افتراء ہے۔ کذب ہے۔ بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ
فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ اللَّهُ أَذِنَ
لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ (۱۶۹)

ان سے کہو کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے، تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو) یا تم اللہ پر افتراء باندھتے ہو۔

قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افتراء باندھتا ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے، کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْيِرٍ...
ذَٰلِكَ جَزَايُهُمْ بِبَغْيِهِمْ... (۱۳۷)

اور ہم نے یہودیوں پر سب نساخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دیدئے تھے۔ اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔

سورہ نساء میں ہے

فَبَيَّضُوكُم مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ
طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ... (۱۶۰)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام قرار دیدیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ سورہ نحل میں کہا گیا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے (۱۶۸)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دیدینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے

وَلَا حِيلَ لَكُم بَعْضُ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ...
(۳۹)

تا کہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دیدی گئی ہیں ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہ بتایا کہ

وَ يُحِلُّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْكُمْ
الْخَبَائِثَ..... (۱۵۱)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کریگا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ماسخوذ ہیں۔

اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب، مسو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں، جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مسویشیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۱۳۹)۔ فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۱۴۰)۔ اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں (۱۴۳)۔ ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ اجداد کی مرتب کردہ ہیں (۱۳۹)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کر رہے ہو۔ (۱۴۱)۔ اس کے بعد انہیں چیلنج دیا گیا اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (۱۵۱)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورہ نسا کی آیات ۲۴-۱۲ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کریم کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال

عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے۔ مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلتھ اوفیسر حکم دیدیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے۔ یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے۔ وقس علی ذالک۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے، اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان ح-ل-ل اور ن-ع-م)

ح ر ی

التَّحَرُّیُّ - قصد کرنا۔ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا۔ کسی کام کو کرنے کا خصوصیت کے ساتھ ارادہ کرنا۔ تَحَرَّاهُ - اس نے اس کا ارادہ کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ بہتر اور حق چیز کی طلب میں کوشش کرنے کو کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے فَأُولَئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۲۱/۲۱)۔ ”یہ لوگ ہیں جنہوں نے رشد و سعادت کے حصول کے لئے عزیمت مندانہ قصد کر لیا،“۔

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) قرب و ارادہ (۲) حرارت اور (۳) لوٹ جانا یا کم ہو جانا لکھے ہیں۔ حِرَاءُ مَکَہ میں ایک پہاڑ تھا جس کے غار میں (کہا جاتا ہے کہ) حضورؐ قبل از نبوت (رشد و ہدایت کی طلب صادق میں) جایا کرتے تھے* یہ صرف تاریخ کا بیان ہے۔ قرآن کریم میں اس کی صراحت نہیں۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ قبل از نبوت حضورؐ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے۔ دیکھئے عنوان ض-ل-ل ()

ح ز ب

الْحِزْبُ - پانی پر اترنے کی باری۔ لوگوں کی جماعت، فریق، گروہ (اسکی جمع احْزَاب ہے) اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان کے دل اور اعمال ایک دوسرے سے ملتے ہوں۔ خواہ ویسے وہ ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں یا نہ ملے ہوں**۔ راغِب

نے کہا ہے کہ اسکی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان میں سختی اور شدت پائی جائے*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حِزْبُ اللّٰہِ (۵۸/۲۲) اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ (۵۸/۱۹) دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ حِزْبُ اللّٰہِ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی پر نہایت سختی سے کاربند ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں، اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ وہ ہیں جو غیر خدائی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں، خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے متعلق ہوں۔ قرآن کریم، قوموں کی تشکیل، نظریہٴ زیست یا نصب العین حیات کی بنیادوں پر کرتا ہے نہ کہ وطن، نسل یا زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ سورۃ مومن میں أَحْزَاب (۱۰۶/۱) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے خدا کے رسولوں کی مخالفت کی تھی۔ سورۃ احزاب میں آ لَحْزَاب (۳۳/۲۲) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی تھی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْہِمُ فَرِحُوْنَ (۳۳/۲۲)۔ ہر فرقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ حق پر ہے (اور باقی سب فرقے باطل پر ہیں)۔ قرآن کریم نے ”کُلُّ حِزْبٍ“ (تمام فرقے) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں تو پھر یہ سمجھنا غلط ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اور باقی باطل پر۔ فرقوں کا وجود ہی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ (۳۳/۲۲)۔ جب تک الدین کا نظام (یعنی اسلامی مملکت کا نظام) قائم رہے، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو دین، انفرادی چیز بن جاتا ہے جس میں فرقے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ جب فرقے پیدا ہو جائیں تو انہیں مٹانے کی ایک ہی شکل ہے۔ یعنی اسلامی نظام مملکت کا قیام۔ اس کے سوا اس ”شرک“ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

ح ز ن

حُزْنٌ۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ہر اس غم و فکر اور پریشانی کے لئے بولا جاتا ہے جو انسان کو کسی وجہ سے لاحق ہو۔ اس میں معاشی پریشانی خاص طور پر شامل ہے چنانچہ حَزَانَةُ الرَّجُلِ۔ انسان کے وہ متعلقین (اہل و عیال) ہیں جن کی تکلیف سے اسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے سامانِ زیست کا

اہتمام کرے*۔ تاج العروس میں ہے کہ سورۃ فاطر کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اٰذْهَبَ عَنْنَا الْحَزْنَ (۱۳۵)۔ میں حَزْنُ کے معنی ہیں صبح اور شام کے کھانے کی فکر۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں لَا تَحْزَنْ یا لَا تَحْزَنْوُا کہا گیا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ تم فکر مت کرو، اس لئے کہ فکر پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم ان اسباب کو مت پیدا ہونے دو جن سے حُزْنُ پیدا ہوتا ہے*۔ یہ چیز معاشی فارغ البالی اور مرفہ الحالی سے پیدا ہوگی کیونکہ حُزْنُ کے معنی فکر معاش سے پیدا ہونے والی پریشانی کے ہیں۔ نیز اَلْحَزْنُ۔ سخت پتھریلی زمین کو کہتے اس کی ضد ”سَهْلٌ“ ہے*۔ (غالباً اس لئے کہ اس میں انساج وغیرہ پیدا نہیں ہو سکتا)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں سختی۔ شدت اور کھردرے پن کا پہلو ہوتا ہے۔

خَافَتْ کے عنوان میں آپ دیکھینگے کہ خَوْفٌ اس پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہو (یعنی اس کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے حادثہ سے ہوتا ہے)۔ جب ان معانی کے مقابل میں حُزْنُ کا استعمال ہو تو اس سے مراد وہ غم ہوتا ہے جو اس حادثہ کی وجہ سے ہو جو گزر چکا ہے۔ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خَوْفٌ ہے۔ اس نقصان (یا حادثہ کے واقع ہو جانے) کے بعد خوف ختم ہو جاتا ہے اور غم یا حُزْنُ شروع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنْوُا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۸)۔ یہاں وَهْنٌ اور حُزْنٌ۔ عظمت اور بلندی۔ عروج و اقبال اور غلبہ و تمکّن (علو) کے مقابلہ میں آیا ہے۔

قصہ آدم میں ہے کہ جب آدم سے جنت کی زندگی چھن گئی تو اسکی بازیابی کیلئے اس سے کہا گیا کہ اگر تم وحی کے تابع زندگی بسر کرو گے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِنَّ وَلَا حُزْنٌ (۲)۔ اس سے خوف اور حُزْن نہیں رہیگا۔ جب یہ جنتی معاشرہ اس دنیا میں قائم ہوگا تو اس میں (منجملہ دیگر اسباب اطمینان و آسائش) سامانِ معاش کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ یہ حُزْنُ کے بنیادی معنی ہیں۔ نیز جس جنت سے آدم نکلا تھا اس کی خصوصیت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں بھوک۔ پیاس۔ لباس اور مکان کیلئے کسی کو جگر پاش مشقت نہیں اٹھانی پڑتی

تھی اور نہ ہی کوئی اس سے محروم رہتا تھا۔ (۱۸۰-۱۹)۔ اس سے بھی حُزْن کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ (ان امور کی تفصیل کیلئے ا۔ د۔ م، ش۔ ج۔ ر، ج۔ ن۔ ن، کے عنوانات دیکھئے)۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ جو قوم خوف۔ بھوک۔ حزن وغیرہ کی پریشانیوں میں مبتلا ہو اُسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی کا اتباع نہیں کر رہی۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی یہاں کی زندگی بھی مرفہ الحالی اور مسرفرازی کی ہو اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی۔

سورۃ یوسف میں حُزْن کے معنی اس غم کے آئے ہیں جو کسی گزرے ہوئے واقعہ سے پیدا ہو (۱۲/۸۳)۔ اور لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ (۱۵/۸۸) کے معنی ہیں ان پر غم نہ کھا۔ تَحْزَنْ عَلَیْہِ کے معنی ہیں وہ اس پر درد مند ہوا*۔

ح س ب

حَسَبَ یَحْسُبُ حُسْبَانًا وَحِسَابًا۔ گننا۔ شمار کرنا۔ حَسِيبٌ یَحْسِبُ مَحْسَبَةً وَحِسْبَانًا۔ خیال کرنا۔ گمان کرنا۔ حَسِبُ۔ وہ جو کافی ہو۔ جو کفایت کرے۔ جسکے بعد کچھ اور ضرورت نہ رہے۔ حَسِيبٌ۔ حساب کرنے والا۔ حُسْبَانٌ۔ (حِسَابٌ کی جمع)۔ گنتی۔ شمار۔ حَسْبُكَ دِرْہَمٌ۔ تمہیں ایک درہم کافی ہے۔ حَسْبُنَا اللہ (۹/۵۹)۔ ہمارے لئے اللہ (کا قانون) کافی ہے۔ اسکے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ہماری تمام ضروریات کو پورا کر دینے کیلئے کافی ہے۔ ہَذَا بِحَسَبِ ذَا۔ یہ اسکے مطابق یا اسکے بقدر ہے**۔

حَسِيبٌ۔ حساب کرنے والا۔ نگرانی کرنے والا۔ کَفَى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِيبًا (۱۳/۱۳)۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب شدہ نتائج کے ظہور کے وقت کسی خارجی شاہد اور محاسب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان کی اپنی ذات خود اپنے خلاف زندہ شاہد ہوتی ہے۔ بَلْ اِلَّا نُنْصَنُ عَلٰی نَفْسِہِ بِصِیْرَةٍ (۱۳/۵۵) اعمال کے جو اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں وہ اپنے منہ سے خود بول اٹھتے ہیں کہ اس نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ظہورِ نتائج کے وقت کو یَوْمُ الْحِسَابِ یا یَوْمُ یَقُومُ الْحِسَابُ (۱۳/۱۳) کہا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا

شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اسکی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے۔ جیسے درخت میں پھل تو اسوقت سے بننا شروع ہو جاتا ہے جب اس میں پہلا شگوفہ (بلکہ کونپل) پھوٹتی ہے لیکن وہ پھل کی شکل میں کچھ عرصہ بعد سامنے آتا ہے۔ اسے ظہور نتائج کا وقت کہتے ہیں۔

سورة انعام میں ہے وَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا (۶/۶) اسی کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی۔ لِيَتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ (۱۵/۱۶) چاند اور سورج کو اسلئے بنایا تا کہ ان سے ماہ و سال وغیرہ کا حساب رکھا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیلنڈر، سورج کے حساب سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ قمری اور شمسی میں سے جو زیادہ آسان اور ملی مفاد کے مطابق ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سورة کہف میں ہے وَ يَرْسِلْ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ (۱۸/۱۸)۔ وہ کھیتی پر آسمان سے حُسْبَان بھیج دے۔ یہاں حُسْبَان کے معنی عام طور پر بلا کے لئے جاتے ہیں۔ یعنی کوئی آفت سماوی جس سے کھیتی تباہ و برباد ہو جائے۔ مثلاً بارش کا طوفان۔ آندھی۔ جھکڑ۔ یا ژالہ باری۔ یا ٹڈی دل وغیرہ*۔ لیکن (لغت حمیر میں) اسکے معنی سخت سردی کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے اس کے معنی ٹڈی اور اولے دونوں لکھے ہیں۔

احْتِسَابُ کے معنی گمان کرنا یا خیال کرنا ہیں***۔ سورة طلاق میں ہے۔ وَ يَرْزُقْهُ مِّنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵/۳)۔ خدا کا قانون اسے ایسے مقامات سے رزق پہنچاتا ہے جو اسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں۔

سورة بقرہ میں ہے وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲/۲۱۲)۔ ”جو ایسا چاہتا ہے اسے اللہ بغیر حساب رزق دیتا ہے“۔ راغب نے اسکے مختلف معانی لکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہیں کہ وہ اُسے دیتا ہے لیکن اُس سے لیتا نہیں۔ یا لوگوں کے عام اندازے اور شمار کے مطابق نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے****۔ جب معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں رزق کی فراوانیاں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔

ح س د

حَسَدٌ کے اصلی معنی چھیلنے کے ہیں۔ الحَسَدُ۔ وہ ذہنیت جسکی رو سے تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے چھن کر

مجھے مل جائے، اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے۔ غِبْطَةٌ یہ ہے کہ ایسی چیز اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مل جائے (اسے رشک کہتے ہیں) *۔ راغب نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس میں اس مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔

سورۃ بقرۃ میں ہے کہ یہ مخالفین حسد کی وجہ سے اسکی انتقامی آرزو کرتے ہیں کہ تم ایمان کو چھوڑ کر پھر سے کفر اختیار کر لو۔ یعنی ایمان کے خوشگوار نتائج تم سے ضرور چھن جائیں خواہ اس سے ان کا اپنا کچھ بھلا ہو یا نہ ہو (۱۲۹)۔

قرآن کریم نے حسد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور اس سے، اور ایسی ذہنیت رکھنے والوں کی تخریبی کوششوں سے بچنے کی تاکید کی ہے (۱۱۳) یہ بچاؤ، قانون خداوندی کے ساتھ گہرے تمسک (تَعَوُّذٌ) سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ح س ر

حَسَرَ - يَحْسِرُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ چھیل دینا۔ کھال اتار دینا۔ اَلْيَحْسِرُ کے معنی ہیں پرندے کے بال و پر گرجانا *۔ یہاں سے اس کے معنی عاجز و درماندہ ہو جانے کے آتے ہیں۔ حَسَرَ اَلْبَعِیْرُ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک کر عاجز و درماندہ ہو گیا۔ اسی بنا پر اَلْحَسْرَةُ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی حالت تھکے ماندے اونٹ کی سی ہو جائے۔ اس میں عجز و ندامت دونوں پائے جاتے ہیں۔ نیز غم و تاسف بھی *۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْحَسْرَةُ کے معنی ہیں کسی چیز کے فوت ہو جانے پر غم اور شرمندگی کی حالت۔ گویا اس شخص سے اب وہ جہالت دور ہو گئی ہے جسکی وجہ سے اس نے یہ کام کیا تھا، اب انکشاف حقیقت ہو گیا ہے **۔ اسی لئے صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس مسادہ کے اصلی معنی کَشَفٌ کے ہیں ***۔ (یعنی کھول دینا)۔ حَسَرَ اَلْبَحْرُ عَنْ السَّاحِلِ کے معنی ہیں دریا ساحل سے پیچھے ہٹ گیا اور پانی کے نیچے جو زمین تھی وہ کھل کر سامنے آگئی *۔ اس میں عجز اور کشف کے دونوں پہلو ہیں۔ سورۃ بقرۃ میں ہے یُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَیْهِمْ (۱۶۷)۔ اللہ ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے انہیں دکھا دیگا اور اس انکشاف حقیقت سے ان پر بری طرح عجز و درماندگی چھا جائیگی۔ حَسَرْتُ اَلْبَیْتِ کے معنی ہیں

مینے گھر میں جھاڑو دی اور اَلْمِجْسِرَةُ - جھاڑو کو کہتے ہیں **۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال یکسر بے نتیجہ ہو کر رہ گئے۔ ان کے کئے کرائے پر جھاڑو پھر گئی۔

سورة انبیاء میں لَا یَسْتَحْسِرُونَ (۲۱) آیا ہے جس کے معنی تھک جانے کے ہیں۔ سورة بنی اسرائیل میں مَلُّوْماً مَحْسُوراً (۱۶) آیا ہے۔ یعنی درماندہ۔ ایسی حالت جس میں تمہارے پاس کچھ باقی نہ رہے، سب کچھ صاف ہو جائے اور تم کو اپنے کئے پر پشیمانی ہو۔ اور (۱۶) میں حَسِیرٌ آیا ہے۔ یعنی تھکی ماندی۔

اَلْحَاسِرُ - بلاؤں اور مصیبتوں کو کہتے ہیں۔ حَسْرَةُ کے معنی سخت افسوس و ندامت اور ہاتھ سے نکل جانے والی چیز پر غم کرنے کے ہیں **۔ یَا حَسْرَتِی (۲۹) - وائے افسوس۔

ح س س

اَلْحَسَّ - حرکت۔ خفی آواز (اس چیز کی جسے تم دیکھ نہ رہے ہو)۔ اَلْحَوَاسُ اسی سے ہے۔ اَلْحَسَّ - محسوس کرنا۔ آگاہ ہونا *۔ راغب نے کہا ہے کہ جب کوئی چیز اس طرح نمایاں اور آشکارا ہو جائے کہ وہ با آسانی محسوس کی جاسکے تو اس وقت اَحَسَّ بولا جاتا ہے۔ فَلَمَّا اَحَسَّ (۳۱) - جب اس نے محسوس کیا۔ تَحَسَّسَ - کسی کا پتہ لگانا (۱۲)۔

حَسِيسٌ - ہلکی سی آواز۔ آہٹ۔ لَا یَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا (۲۱)۔ اَلْحِيسُ - سردی جو گھاس کو جلا دے۔ حَوَاسُ اَلْاَرْضِ - سردی۔ اولہ - ہوا۔ ٹڈی اور مویشی جو کھیتی پر تباہی لے آئیں۔ اس سے اس کے معنی تباہی اور بربادی کے آتے ہیں۔ چنانچہ اَلْحَاسُوسُ قحط سالی کو کہتے ہیں *۔ سورة آل عمران میں ہے اِذْ تَحْسُسُوْنَهُمْ (۳۱) - ”جب تم نہیں ہلاک اور برباد کر رہے تھے“۔ ابن فارس نے اَلْحِيسُ کے معنی قتل کرنے کے بھی لکھے ہیں۔

ح س م

حَسَمَهُ - بِحَسَمِهِ - اس نے اسے قطع کر دیا۔ حَسَمَ الثَّعِیْرُقَ - اس نے رگ کو کاٹ دیا۔ اور اس پر لوہے سے داغ لگا دیا تاکہ اس کا خون نہ

بھی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اسکی جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں۔ الْحُسَامُ۔ تیز کاٹنے والی تلوار۔ الْحُسُومُ۔ بدبختی۔ ازہری نے کہا ہے کہ ہر اس چیز کو جو دوسری چیز کے بعد فوراً آجاتی ہو حَسَمٌ کہتے ہیں، جسکی جمع حُسُومٌ ہے۔ لہذا اسکی معنی ہیں پے در پے اور مسلسل آنے والی چیزیں*۔ راغب نے کہا ہے کہ الْحَسَمُ کے معنی کسی چیز کے اثر کو مٹا دینے کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو اس طرح تباہ کرنا کہ اس کا نشان تک مٹ جائے**۔

قرآن کریم میں ہے کہ قوم عاد پر جو آندھی کا عذاب آیا تھا مَسْخَرَهُمَا عَلَيْهِمُ سَبْعَ لَيَالٍ وَ ثَمَنِيَّةَ أَيَّامٍ حُسُومًا (۶۹)۔ ”اس نے اس (آندھی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا“ (حُسُومًا کا ترجمہ نہیں کیا گیا)۔ اس میں حُسُومًا کے معنی مسلسل کے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن عذاب کی شدت کے اعتبار سے یہ معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کہ وہ ایسی آندھی تھی جس نے اس قوم کے نسام و نشان تک کو مٹا دیا۔ یا ان کی جڑوں تک کو کاٹ کر رکھ دیا۔

ح س ن

الْحُسْنُ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ حسن سے مراد ہوتا ہے اعضاء کا صحیح صحیح تناسب اور توازن۔ اور عرف عام میں حسین ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو نگاہ کو بھلی معلوم ہوں***۔ لہذا حُسْنُ کے بنیادی معنی ہیں تناسب و توازن کا قائم رہنا اور یہ سُوء کی ضد ہے۔ نیز اس کے مقابلہ میں فَسَادٌ کا لفظ آیا ہے (۲۸) جس کے معنی بگڑے ہوئے توازن کے ہیں۔ لہذا اَلْاِحْسَانُ کے معنی ہوئے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا۔ یعنی اگر کسی وجہ سے افراد معاشرہ میں سے کسی کی قوت و صلاحیت میں کمی واقع ہو گئی ہے تو اس کمی کے پورا کر دینے کا نام اِحْسَانٌ ہے۔ (دیکھئے عنوان ع۔ د۔ ل جسمیں عَدْلٌ و اِحْسَانٌ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے)۔ راغب نے کہا ہے کہ احسان دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا (یعنی اسکی کمی کو پورا کر کے اسکا توازن درست کر دینا)۔ اور دوسرے خود اپنے کاموں (سیرت و کردار) میں توازن پیدا کرنا۔ اس میں حسن پیدا کرنا***۔

نیز راغب نے کہا ہے کہ عَدْلٌ^۵ تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ذمہ ہو وہ دیدو اور جتنا تمہارا حق ہے وہ لے لو۔ اور اِحْسَانٌ^۶ یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمہارے ذمہ ہے اور اس سے کم لو جتنا تمہارا حق ہے*۔ یعنی اِحْسَانٌ^۶ میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد، توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ جب وہ جوانی کو پہنچے وَاسْتَوٰی اور اسمیں ہر طرح کا اعتدال پیدا ہو گیا۔ تو ہم نے انہیں علم و حکم (قوت فیصلہ) عطا کیا۔ اسکے بعد ہے کَذٰلِکَ نَجْزِیُّ الْمُحْسِنِیْنَ^(۲۸/۱۱)۔ ہم اس طرح محسنین کو ان کے اعمال کا ثمرہ دیا کرتے ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ مُحْسِنِیْنَ سے مراد اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

هُوَ یُحْسِنُ الشَّیْءَ اِحْسَانًا کے معنی ہیں وہ اس چیز کو اچھی طرح سے جانتا ہے*۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ جب قید خانہ میں ان دو نوجوانوں نے حضرت یوسفؑ سے اپنا اپنا خواب بیان کیا اور آپ سے کہا کہ ان خوابوں کی تاویل بتائیے تو اسکے بعد ہے اِنَّا نَرٰکَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ^(۱۲/۱۳)۔ یہاں مُحْسِنِیْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہوں*۔

قرآن کریم میں حَسَنَاتٌ^۷ (بمقابلہ سَیِّئَاتٌ^۸) زندگی کی خوشگوار یوں کیلئے آیا ہے (مثلاً ۱۱۹/۳۰ : ۱۳۱/۱۳) سورۃ توبہ میں حَسَنَةٌ^۹ کے مقابلہ میں مُصِیْبَةٌ^{۱۰} آیا ہے (۹/۱)۔ لہذا حَسَنَةٌ^۹ ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کو آرام ملے۔ راحت و آسائش کا سامان۔ اور چونکہ سامان راحت و آسائش کی تکمیل مملکت و حکومت میں جا کر ہوتی ہے اسلئے بنی اسرائیل کی داستان کے سلسلہ میں کہا کہ ہم نے انہیں ارض فلسطین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا اور اس طرح تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی (۱۳۶/۱)۔ ”تیرے نشو و نما دینے والے کے توازن بدوش قانون کی تکمیل (حسن کارانہ انداز سے) ہو گئی“۔ (حُسْنٰی مونث ہے اِحْسَنٌ کا)۔ خدا کے اَسْمَاء کو الِاسْمَاءُ الْحُسْنٰی (۵۹/۲۴) کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جسمیں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کو لئے، انتہائی حسن کارانہ انداز سے یک جا جمع ہیں۔ جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب۔ یہ ہے خدا کا تصور قرآن کریم کی رو سے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا

گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔ (۱۳۸/۲)۔ اسلئے خدا کا ”مقرب“ وہ ہے جسکی ذات (Personality) کی مختلف صلاحیتیں نشوونما حاصل کرتی جائیں، بایں نمط کہ ان میں پورا پورا توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ لِّلّٰہِ اِلٰہٌ سَمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْهُ بِہَا۔ (اَسْمَاۓِ خِداوندی۔ صفاتِ الہیہ۔ پورا پورا توازن لئے ہوتی ہیں اسلئے خدا کو انہی کے مطابق پکارو۔ یعنی خدا کے متعلق وہی تصور درست ہے جو ان صفات کے مطابق قائم ہو۔ تو اسکے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وَذَرُوْا الَّذِیْنَ یُلٰحِذُوْنَ فِیْ اَسْمَآئِہِ۔ (۱۸۰/۲) جو لوگ ان صفات میں سے کسی ایک میں بھی (توازن کی راہ چھوڑ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لہذا خدا کی صفات کا اپنے اندر منعکس کرنا (یعنی انسانی ذات کے مضمحل جوہروں کی نمود اور بسالیدگی) ہی مقصود نہیں بلکہ ان میں حسن و توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس زندگی میں حسن نہیں سمجھ لیجئے کہ وہ قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اندر کسقدر حسن پیدا کرتے ہو اور کائنات میں کسقدر حسن کا اضافہ کرتے ہو۔ خارجی دنیا میں اس احسان (حسن پیدا کرنے) کی ابتدا اپنے رفقاء سفر (دوسرے افرادِ معاشرہ) کے ساتھ حسنِ معاملہ سے ہوتی ہے۔ اسکے لئے کہا ہے کہ وَ قُوْلُوْا لِّلنَّاسِ حُسْنًا (۸۳/۲)۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرو جن سے حسن پیدا ہو۔ اور اسکا عملی طریقہ یہ ہے کہ اَنْفِیْقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیتِ عامہ کیلئے کھلا رکھو اور اسطرح اَحْسِنُوْا (۱۹۵/۲) معاشرہ میں حسن پیدا کرتے رہو۔ اسی کا دوسرا نام احسان ہے (۸۳/۲)۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم سے جو حسن پیدا کرنے (احسان) کی تاکید کی گئی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ چیز کسی معاوضہ کی خاطر نہیں کی جائیگی۔ اس لئے کہ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ* (۵۱/۲)۔ حسن پیدا کرنے (احسان) کا بدلہ (یعنی نتیجہ) یہ ہے

* (ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے یعنی کسی آدمی پر کوئی وقت آ پڑا۔ وہ دوسرے کے پاس مدد کے لئے گیا۔ اس نے اسکی مدد کی۔ یہ اسکا احسان ہوا۔ اب یہ دوسرا شخص اس انتظار میں رہے کہ کب اس پہلے شخص پر کوئی مصیبت پڑے اور یہ اس کے احسان کا بدلہ اتارے۔ اور جب تک اس کا بدلہ نہ اتارے اس کا بے دام غلام بنا رہے۔ اگر اس نے اسکی کسی بات سے بھی اختلاف کیا تو اس نے جھٹ کہہ دیا کہ یہ کسقدر احسان فراہوش ہے؟ یہ ہے احسان سے مراد ہمارے معاشرے میں۔ اور وہ ہے احسان کا مفہوم قرآن کی رو سے یہی تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!۔

کہ اس سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی مقصود بالذات ہے۔ یعنی احسان کا بدلہ یہ ہے کہ تم احسان کرتے جاؤ اور اس کے معاوضہ کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو ان سے بر ملا کہہ دیتے ہیں کہ "لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا" (۹۶)۔ "ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔ لہذا قرآنی تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ انسان حسن پیدا کرے۔ خود اپنی ذات میں۔ دوسرے انسانوں میں اور خارجی کائنات میں۔ (Make it more Beautiful)۔ یہ چیز اپنا بدلہ آپ ہوگی امی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہاں دیکھو کہ توازن بگڑ گیا ہے، اُسے درست کر دو۔ اس کے درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہاں حسن پیدا کر دو (توازن قائم کر دو) اس سے بگاڑ خود بخود دور ہو جائیگا۔ اِدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ الْحَسَنَ السَّيِّئَةُ (۲۳/۹۶)۔ پہلے خود اپنا جائزہ لو۔ اگر تمہاری ذات متوازن (Balanced Personality) نہیں تو اس میں احسان (توازن پیدا کرنے) کی کوشش کرو۔ اس کے بعد جب کسی دوسرے شخص کو دیکھو کہ وہ اپنا توازن کھو رہا ہے تو اس سے احسان کرو۔ یعنی اس کا توازن قائم کرنے کی کوشش کرو۔ جب معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو معاشرے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح خارجی کائنات میں علم و تحقیق کی رو سے حسین اضافے کرتے جاؤ۔ تمہاری یہ کوششیں اپنا بدلہ آپ ہونگی۔ حسن پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسن پیدا ہو جائیگا۔ یعنی بگڑا ہوا توازن قائم ہو جائیگا۔ زندگی کا یہی مقصود ہے۔ یعنی تخلیقِ حسن۔ اور خدا کی ذات وہ ہے جس میں حسن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ (الْأَمَمَاءُ الْحُسْنَى)۔ اس لئے انسانی ذات کی صحیح نشوونما اور تکمیل کے لئے خارجی معیار (Objective Standard) خدا کی ذات ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔

ح ش ر

الْحَشْرُ۔ (لوگوں کو) جمع کر کے ہانک کر کسی طرف لیجانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنا، اٹھانا۔ اٹھ کھڑا ہونا اور چل پڑنا ہیں، اہل لغت الْحَشْرُ کے معنی اکٹھا کرنا اور ہانکنا کرتے ہیں۔ الْمَحْشَرُ (ش کو زیر اور زہر کے ساتھ) جمع ہونے کی جگہ*۔ محیط

میں ہے کہ عوام اس لفظ کو ہجوم اور ایک دوسرے کے لئے تنگی پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں**۔ یعنی ایسا ہجوم (اجتماع) جو دوسروں کیلئے مشکل اور تنگی پیدا کرنے کیلئے کیا جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جنگ کے اجتماع کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَ حُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ ﴿٢٤٠﴾ ”سلیمان کے حکم کے مطابق اس کے لشکر جمع کر کے لیجائے گئے“۔ اور یہودیوں کے متعلق سورۃ حشر میں ہے هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ ﴿٥٩﴾ ”اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی، پہلے حشر، کے لئے ان کے گھروں سے نکالا“۔ اس سے بھی مراد جنگ کا اجتماع ہے۔ یا جلاوطنی جو اسکا نتیجہ تھی۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان مخالفین سے کہدو کہ سَتَغْلَبُونَ وَ تَحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ ﴿١١٣﴾ ”تم بہت جلد مغلوب ہو گے اور تباہی کے میدان میں جمع کر کے جہنم کی طرف لے جائے جاؤ گے۔ اس سے اگلی آیت میں اس جنگ کی تفصیل درج ہے۔ سورۃ شعراء میں فرعون کے متعلق ہے کہ اس نے مختلف شہروں میں حاشِرِ یُنْ بھیجے (۲۶)۔ یعنی ہر کارے جو لوگوں کو جمع کر کے لائیں۔

الْحَشْرُ کے معنی دھار تیز کرنے نیز جمع کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے قحط سالی لوگوں کو دیہات سے نکال کر شہروں کی طرف لے آتی ہے*۔ الْحَشْرَةُ کے معنی ہیں شکار یا کھایا جانے والا شکار نیز کیڑا مکوڑا اس سے جمع حَشَرَاتٌ کیڑوں مکوڑوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے*۔ لغت یمن میں اس کے معنی بھوسی کے بھی ہیں*۔

الْحَشْرُ - موت کو کہتے ہیں۔ نیز کان کا لطیف اور باریک حصہ*۔ سورۃ طہ میں ہے وَ نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰی ﴿٢٢٠﴾ ”اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے“۔ اس کے معنی اعمال کا بدلہ دینے کے ہیں جو نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی اعمال کے اثرات و نتائج نہایت لطیف انداز سے مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

مَحْشُورَةٌ - اکٹھا کئے ہوئے۔ (۳۸) - ذَالِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٥٠﴾ - ”یہ اکٹھا کرنا ہمارے لئے آسان ہے“۔ وَ اِذَا حَشَرَ النَّاسُ ﴿٢٦١﴾ ”جب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے“۔ ان مقامات میں جمع کرنے کے ساتھ، آگے لے جانے کا مفہوم بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ہمارے ہاں حَشْرٌ سے مراد صرف مرنے کے بعد (قیامت کے دن) حساب کتاب کے لئے جمع ہونا لیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ آخرت۔ قیامت۔ ساعت۔ بعث وغیرہ کے تحت لکھا گیا ہے)۔ یہ قرآن کریم کی جامع اصطلاحات ہیں جن سے مفہوم صرف مرنے کے بعد جی اٹھنا نہیں بلکہ اس دنیا میں قوموں کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہے۔ چنانچہ حَشْرٌ کے متعلق شاہ ولی اللہؒ (حجۃ اللہ البالغہ۔ کتاب الفتن میں) کہتے ہیں کہ ”زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک لوگوں کا ملک شام میں جمع ہونا، قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اُس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (غالباً جنگ سے مراد ہے) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد زندہ ہونا۔“

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئیں متن کے اعتبار سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے یا اس دنیا میں انقلاب آفرینی۔

ح ص ب

الْحَصْبَةُ۔ کنکری۔ پتھر۔ الْحَصَبُ۔ ایندھن۔ ہر وہ چیز جس سے آگ بھڑکائی جائے۔ لکڑی کو بھی حَصَبٌ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب اس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیا جائے۔ الْحَاصِبُ۔ وہ تیز ہوا (آندھی کا جھکڑ) جو مٹی۔ غبار اور کنکریاں اڑائے*۔ قرآن کریم میں ہے یُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (۱۶/۱۸)۔ تم پر کنکر برسائے والی آندھی بھیج دے۔ سورۃ انبیاء میں ہے اِنْتُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱/۹۹) ”تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں“۔ یہاں حَصَبُ کے معنی ایندھن کے ہیں۔ قوم لوط پر آتش فشاں پہاڑ سے جو شعلہ آمیز آندھی چلی تھی اسے بھی حَاصِبًا کہا گیا ہے (۵۳/۳۳)۔ اس میں پتھروں کی کنکریاں اور آگ کی حرارت دونوں کا امتزاج ہے۔

ح ص د

حَصَدٌ۔ کھیتی یا پودوں کی ودرانتی سے کاٹنا**۔ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهِ (۱۲/۱۲)۔ ”جو کھیتی تم کاٹو اسے اس کے خوشوں ہی

میں رہنے دو۔“ - حَصَادٌ - کھیتی کاٹنا ($\frac{6}{132}$) یا کھیتی کاٹنے کا وقت۔
 الْحَصِيدُ - کاٹی ہوئی کھیتی ($\frac{1}{13}$) - قرآن کریم نے ہلاک شدہ قوموں
 کے متعلق کہا ہے کہ جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ($\frac{21}{15}$) ”انہیں ہم
 نے کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے شعلے کی طرح کر دیا۔“ - بربادی اور زندگی
 کی حرارت سے محرومی کا کیسا عبرت انگیز نقشہ ہے!

ح ص ر

الْحَصْرُ - روک دینا - قید کرنا - تنگی پیدا کر دینا* - راغب نے لکھا
 ہے حَصْرٌ اور احْصَارٌ اُس وقت بولتے ہیں جب رکاوٹ کی وجہ کوئی ظاہری
 سبب ہو (جیسے دشمن نے روک دیا ہو) یا باطنی سبب ہو (جیسے بیماری
 رکاوٹ پیدا کر دے) لیکن جب رکاوٹ صرف باطنی سبب سے ہو تو اس موقع پر
 حَصْرٌ ہی کہتے ہیں**۔ سورة نساء میں ہے اَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ
 صُدُورُهُمْ ($\frac{9}{9}$) - ”یا وہ تمہارے پاس آئیں اس حالت میں کہ ان کے
 سینے بھنچے ہوئے اور دل تنگ ہوں۔“ - حَصِيرٌ ($\frac{1}{8}$) قید خانہ کو بھی
 کہتے ہیں اور تنگدل شخص کو بھی - نیز وہ بخیل آدمی جو بخل کی وجہ سے
 شراب نہ پیے*۔

الْحَصُورُ ($\frac{3}{8}$) رکنے والا - بالخصوص وہ شخص جو عورتوں کے
 پاس جانے سے رکا رہے* - نیز حَصُورٌ اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو
 اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور اپنی نفسانی خواہشات کو لگام دے سکتا ہو۔
 مُحَاصِرَةٌ - دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر روک لینا - حَصَرَ الْقَوْمَ
 بِفُلَانٍ - قوم نے فلان کو گھیر لیا*۔

سورة بقرہ میں اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ کی تفسیر لَا يَسْتَطِيعُونَ
 ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ($\frac{2}{3}$) - نے کر دی - یعنی جو اس طرح روک لئے جائیں
 کہ نقل و حرکت کی استطاعت نہ رکھیں - ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگا
 دی جائے۔

سورة بنی اسرائیل میں جَهَنَّمَ کو حَصِيرًا کہا گیا ہے - ($\frac{1}{8}$) -
 یعنی وہ مقام جہاں کسی کی نشو و نما (Development) رک جائے - جہاں کسی
 کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے - (جہنم کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے
 عنوان جَهَنَّمَ اور ج - ح - م)

ح ص ص (ح ص ح ص)

الْحَصَّاءُ - بالوں کو مسونڈ دینا - (تاکہ سر صاف ہو جائے) -
 الْحَصَّاءُ مِّنَ السَّيْرِ يَاح - صاف ہوا جس میں گرد و غبار نہ ہو -
 حَصَّ الشَّيْءُ تَحْصِيْصاً وَحَصَّ حَصَّ *** - چیز ظاہر ہو گئی -
 واضح ہو گئی (جو چیز پہلے چھپی ہوئی ہو اور پھر واضح ہو جائے اس کے
 متعلق کہتے ہیں) *

سورہ یوسف میں ہے اَلْثَّنَّ حَصَّ الْحَقُّ (۱۲/۵۱) - ”اب حقیقت
 واضح ہو گئی“، - اب اصل بات بے نقاب ہو کر سامنے آگئی - لیکن صاحب
 محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حَصَّ حَصَّ اَلْبَعِيْرُ سے
 ہے جس کے معنی ہوتے ہیں اونٹ نے بیٹھنے کے لئے اپنے سینہ اور گھٹنوں کو
 اچھی طرح زمین پر جمایا - اس لئے حَصَّ حَصَّ الْحَقُّ کے معنی ہونگے حق
 ثابت اور برقرار ہو گیا *** - حِصَّةٌ - (حصہ) جو چیز اصل میں سے کاٹ کر الگ
 کر لی جائے - مجموعہ کا ایک ٹکڑا * - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں
 (۱) حصہ اور (۲) واضح اور متمکن ہو جانا لکھا ہے - نیز کسی چیز کا ختم
 یا کم ہو جانا -

ح ص ل

الْحَصِيلُ مِّنْ كُلِّ شَيْءٍ - کسی چیز میں سے جو کچھ باقی رہ
 جائے - اَلْتَّحْصِيْلُ - جو کچھ حاصل ہو جائے اسے الگ الگ کر دینا -
 دراصل تَحْصِيْلُ کے معنی چھلکے سے مغز نکالنا ہوتا ہے - مثلاً بھوسے سے
 گیہوں کے دانوں کو یا مٹی پتھر کو، الگ کرنا - تَحْصِيْلُ الشَّيْءِ -
 چیز جمع اور ثابت ہو گئی - اس سے اَلْحَوْصَلَةُ - پرندے کے پوئے کو
 کہتے ہیں * -

قرآن کریم میں ہے وَ حَصِيْلٌ مَّا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰۰/۱) جو کچھ
 سینوں میں (یا کہیں اور پوشیدہ) ہے اسے یوں الگ کر کے باہر نکال لیا
 جائے گا جیسے چھلکے سے مغز الگ کر لیتے ہیں - ابن فارس نے لکھا ہے کہ
 تَحْصِيْلُ کے معنی سونے یا چاندی کو کان کی مٹی سے نکالنے کے ہیں -

* تاج و راغب - ** محیط - *** حصص رباعی ہے لیکن ہم نے اسے الگ لکھنے کی
 بجائے یہیں (ثلاثی میں) لکھ دینا مناسب سمجھا ہے -

ح ص ن

”لَا حِصَانٌ“ کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اسے محفوظ رکھنا۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ حَصْنٌ اَلْمَكَانُ يَحْصِنُ۔ جگہ کا محفوظ ہونا اس طرح کہ اس تک پہنچنے کی راہ نہ ہو، ایسی محفوظ جگہ حَصِينٌ کہلائیگی۔ حَصْنَتُهُ وَ اَحْصَنَتْهُ اس نے اسے محفوظ کر دیا۔ اَلْحِصْنُ ہر محفوظ مقام جسکے اندر تک رسائی نہ ہو سکے۔ جمع حَصُونٌ۔ (۵۹) مُحَصَّنَةٌ۔ محفوظ کی ہوئی (۵۹)۔ اَلْمُحْصِنُ۔ قفل۔ حفاظت کرنے کے معنوں میں سورۃ انبیاء میں ہے لِيُحْصِنَكُمْ (۲۱) ”تا کہ وہ تمہیں محفوظ رکھے“۔

سورۃ یوسف میں بحفاظت ذخیرہ کی ہوئی گندم کیلئے ہے مِمَّا تَحْصِنُونُ (۱۲/۸)۔ حفاظت کے اعتبار سے، حِصَانٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو پا کدامن ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھتی ہو*۔ (موتی کو بھی کہتے ہیں کہ وہ سیپ میں محفوظ ہوتا ہے)۔ عورت کی پا کدامنی دو طریق پر ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ شادی کر کے (صرف ایک کی ہو جائے) اور اس طرح اسکی عصمت (غیروں کے ہاتھوں سے) محفوظ ہو جائے۔ اس اعتبار سے پا کدامن عورت کو مُحْصِنٌ بھی کہتے ہیں اور مُحْصِنٌ بھی۔ (یعنی بصیغہ فاعل اور بصیغہ مفعول دونوں طرح)۔ راغب نے کہا ہے کہ مُحْصِنٌ (حفاظت کرنے والی) اسوقت کہتے ہیں جب وہ (غیر شادی شدہ حالت میں) اپنی عفت کی حفاظت آپ کرے۔ اور مُحْصِنٌ۔ (جس کی حفاظت کی جائے) جب اسکی عصمت کی حفاظت شادی کے ذریعہ سے ہو جائے۔ چنانچہ اَلْمُحْصِنَاتُ۔ شادی شدہ عورتوں کو کہتے ہیں۔ اَحْصَنُ۔ کے معنی ہیں شادی کرنا۔ لیکن تاج العروس میں (جوہری اور ثعلب کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ پا کدامن عورت کے لئے مُحْصِنَةٌ اور مُحْصِنَةٌ۔ دونوں الفاظ آتے ہیں، لیکن شادی شدہ کیلئے صرف مُحْصِنَةٌ آتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں پا کدامن عورتوں کیلئے اَلْمُحْصِنَاتُ آیا ہے (۲۴)۔ جسمیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں شامل ہیں۔ لہذا جہاں مُحْصِنَةٌ آئیگا، وہاں سیاق و سباق کی رو سے دیکھنا ہوگا کہ اس سے مطلب غیر شادی شدہ پا کدامن عورت ہے یا شادی شدہ عورت۔

قرآن کریم میں یہ لفظ پا کدامن کے معنوں میں (۵/۲۳۳ ; ۲۳/۲۳۳) میں آیا ہے۔ سورۃ نسا (۴/۳۵) میں یہ لفظ فَتَيَات کے مقابلہ میں آیا ہے جہاں اس کے معنی آزاد عورتوں کے ہیں (بمقابلہ لونڈیوں کے)۔ اسی سورۃ کی چوبیسویں آیت (۴/۳۴) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اس کے معنی ”پا کدامن“، بھی ہو سکتے ہیں اور ”شوہر دار“، بھی۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر تمام پا کدامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں ہوں۔ اور دوسرے معانی کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر شوہر دار عورتیں حرام ہیں، بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آچکی ہوں (دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک)۔ یا بجز شوہر دار عورتوں کے جن کا استثناء (۱/۶۱) میں کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں شوہر دار کا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کیلئے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ مُحْصِنَاتٌ غَيْرُ مُسَافِحَاتٍ (۲۴/۲۴)۔ (سَفْح کے تفصیلی معنی عنوان س۔ ف۔ ح کے تحت دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اس کے معنی ہیں اپنے مادہ کو یوں ہی بہا دینا یا گرا دینا) یعنی اگر یہ اختلاط محض سادہ کو نکالنے کیلئے ہے (جسے شہوت رانی کہتے ہیں۔ یعنی جنسی اشتعال کی تسکین۔ زنا کا مقصد یہی ہوتا ہے) تو یہ ناجائز ہے۔ اور اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ اس طرح مادہ (استقرارِ حمل کی رو سے) محفوظ ہو جائے اور یونہی بہہ کر ضائع نہ چلا جائے۔ تو یہ اختلاط جائز ہے۔ اسے نکاح کہتے ہیں۔ چنانچہ عربوں میں نِكَاح کے مقابلہ میں لفظ سِفَاح آتا تھا۔ نیز ان کے ہاں تیروں سے جو کھیلا کرتے تھے۔ ہر تیر کسی خاص حصہ کیلئے ہوتا تھا۔ لیکن ان میں ایک تیر خالی رکھا جاتا تھا جو محض خاناہ پری کیلئے ہوتا تھا۔ اسکا نہ کوئی حصہ ہوتا تھا نہ نتیجہ۔ اس تیر کو السَفِیْح کہتے تھے*۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مُحْصِنَاتٌ غَيْرُ مُسَافِحَاتٍ کے معنی کیا ہیں۔ اَلْمَسْفُوحُ مِّنَ الزَّرْعِ۔ اس کھیتی کو کہتے تھے جس کے پتے شدت سردی سے زرد پڑ جائیں۔ دانے مرجھا کر پتلے ہو جائیں۔ بالیں سیاہ پڑ جائیں۔ اور ان کے پرت گر پڑیں**۔ اس طرح ساری کھیتی ضائع ہو جائے۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کا منشا کیا ہے۔ اسی لئے اس نے عورتوں کو حَرْتُ (کھیتی) کہا ہے۔ (۲۴/۲۴)۔ یعنی مرد اور عورت کا جنسی اختلاط بطریق

مُحْصِنِينَ ہونا چاہئے۔ یعنی ذمہ داریوں کی حفاظت کی غرض سے جو نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں اور جسکا منشا تحفظ اور بقائے نسل انسانی ہے، نہ کہ محض جنسی تسکین کی خاطر۔ ”خالی تیر چلانے،“ کیلئے۔ ”وقتی نکاح،“ بھی سَفْحٌ ہی ہوتا ہے نہ کہ احْصَانٌ۔ (نیز دیکھئے عنوان خ۔ د۔ ن)

(مردوں اور عورتوں کے جنسی اختلاط کے حدود و ضوابط کا قوموں کے تمدن اور کلچر سے کسقدر گہرا تعلق ہے، اس کے لئے میری کتاب ”طاہرہ کے نام خطوط،“ ملاحظہ کیجئے)۔

ح ص ی

الْحَصَى۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ سنگریزے۔ چونکہ عرب ابتداءً چیزوں کی گنتی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے کرتے تھے (جیسا کہ ہم انگلیوں سے گنتے ہیں) اس لئے احْصَاءٌ کے معنی گنتی کرنے (۱۳/۳۳)۔ یا گنتی کر کے کسی چیز کو حاصل کر لینے اور احاطہ میں لے لینے کے ہو گئے*۔

قرآن کریم میں ہے وَأَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۲۸/۲۸)۔ ”اس نے ہر چیز کو گن کر احاطہ میں لے رکھا ہے،“ یعنی اس میں گنتی اور اس کے بعد حفاظت سے حاصل کر لینے کے دونوں گوشے آ جاتے ہیں۔ جیسے سورۃ مزمل میں ہے عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصَوْهُ (۳۰/۳۰)۔ ”وہ جانتا ہے کہ تم ہابندی کے ساتھ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے،“۔ سورۃ کہف میں ہے آيَ الْيَحْزُبَيْنِ أَحْصَى لِمَالِهِمَا أَمْ دَأً (۱۸/۱۸) ”ان دونوں گروہوں میں سے کس نے اس عرصہ کا احاطہ کیا ہے،“ اور اس مدت کو شمار کر لیا ہے یا اسے اپنے ضبط اور کنٹرول میں رکھا ہے۔ عموماً اس آیت میں أَحْصَى اَفْعَلُ التَّفْصِيلِ سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ اسے فعل ماضی سمجھا جائے۔ کشاف نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں، نیز شمار کرنا اور بدقت کسی کام کی طاقت رکھنا۔ اس سے بھی مطلب احاطہ کرنا اور ضبط کرنا ہیں۔

ح ض ر

حَاضِرٌ۔ يَحْضُرُ۔ حُضُورًا۔ حاضر ہونا۔ موجود ہونا۔ (غائب کی ضد ہے)۔ نیز حَاضِرٌ۔ موجود۔ أَحْضَرَ الشَّيْءَ۔ چیز کو حاضر کر دیا**۔

حَضَرَةٌ وَاِحْتَضَرَهُ - اُسے حاضر و موجود کیا ، نیز اس کے پاس آیا اور پہنچا* ابن فارس نے اس سادہ کے معانی پہنچنا ، پہنچانا ، موجود ہونا بتائے ہیں ۔ اس اعتبار سے الْاِحْتِضَارُ دم مرگ کو کہتے ہیں جب موت حاضر ہو جاتی ہے ۔ آیت (۲۳/۹۸) میں يَحْضُرُونَ کے معنی بتاتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی ایذا پہنچانا اور برا کرنا بھی بتائے ہیں ۔ الْحَضَارَةُ - شہر میں اقامت کرنا ۔ برخلاف بَدَاوَةٌ کے ، جس کے معنی دیہات میں سکونت اختیار کرنا ہیں ۔ الْحَاضِرَةُ - شہر ، بستیاں ، سرسبز آباد علاقے** ۔

قرآن کریم میں ہے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ (۲/۱۳۳) ”جب یعقوبؑ کے سامنے موت آگئی“ ۔ یعنی ان کے مرنے کا وقت آ گیا ۔

حَاضِرَةُ الْبَحْرِ (۱۶/۱۳) دریا کے کنارے واقع ہونے والی ۔ تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ (۲/۸۲) نقد تجارت ۔ نقد سودا ۔ مُحَضَّرُونَ (۳۰/۱۶) حاضر کئے ہوئے ، مبتلائے عذاب ۔ مُحْتَضَرٌ (۵۳/۴۸) حاضر کیا ہوا ۔ یعنی جس کی باری ہوگی اس کے لئے گھاٹ موجود ہوگا ۔ کسی دوسرے نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہوگا ۔

ح ض ض

الْحَضُّ - کسی کام پر برانگیختہ کرنا ، ابھارنا ۔ خلیل کے نزدیک الْحَضُّ ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے آتا ہے ۔ (بحوالہ ابن فارس) حَضَّهٗ - يَحْضُضُّہٗ عَلٰی اَمْرِ - کسی کو کسی کام پر ابھارنا ۔ برانگیختہ کرنا ۔ حَضِيضٌ - نشیبی زمین کو کہتے ہیں*** ۔ (کیونکہ اس طرف انسان تیزی سے چلا جاتا ہے) ۔ اصل میں حَضُّ کے معنی ہی جانور کو نشیب کی طرف ہانکنے کے ہوتے ہیں**** ۔ پھر اس کے معنی ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے آنے لگے ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا يُحْضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۶۹/۳۳) ”وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا“ ۔ سورۃ فجر میں وَلَا تَحْضُّوْا (۸۹/۱۸) آیا ہے ۔ ”وہ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے“ ۔ ایسا کرنے والے دین کی تکذیب کرتے ہیں ۔ (۱۰۴/۱) ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے دین اور معاشیات کا کتنا گہرا تعلق ہے !

ح ط ب

الْحَطَبُ - وہ لکڑیاں جو آگ جلانے کے لئے درختوں سے کاٹی جاتی ہیں۔ ایندھن (جب ان لکڑیوں میں آگ لگائی جائے تو پھر اس ایندھن کو وَقُودٌ کہا جائیگا) *** - حَطَبٌ يَحْطِبُ - لکڑیاں جمع کرنا۔ مَكَانٌ حَطِيبٌ - وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں۔ هُوَ حَطِيبٌ لَيْلٍ - وہ بری بھلی، کار آمد و بیکار، ہر قسم کی باتیں بیان کرتا ہے۔ جیسے رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والا کبھی سانپ کو بھی لکڑی سمجھ کر اٹھا لیتا ہے * - فُلَانٌ يَحْطِبُ عَمَلِي فُلَانٍ - فلان آدمی فلان کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے۔ حَطِيبٌ فُلَانٌ بِصَاحِبِهِ - فلان نے اپنے ساتھی کے خلاف چغلی کھائی **۔

قرآن کریم میں حَطَبًا (۲/۱۵) ایندھن کے لئے آیا ہے۔ اور ابولہب کی بیوی کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱/۱) کہا گیا ہے۔ اس کے معنی چغلخور کے بھی ہو سکتے ہیں اور دشمنی کی آگ بھڑکانے کے بھی۔ اس کا مفہوم ”لگائی بجھائی کرنے والی“ زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یا اسباب مخالفت میں اضافہ کرنے والی۔

ح ط ط

الْحَطَّ - اس مادہ کے اصلی معنی اوپر سے اتارنا اور نیچے رکھنا ہیں ****۔ الْحَطُّ وَالْإِحْطَاطُ کے معنی ہیں سواری وغیرہ سے سامان اتار دینا۔ حَطٌّ فِي مَكَانٍ - وہ کسی جگہ اتر گیا۔ الْمَحَطُّ - منزل، قیام گاہ۔ حَطَّ الرَّجُلُ يَحْطُ - وہ آدمی اوپر سے نیچے کی طرف اترا۔ الْإِحْطَاطُ - چھوٹے قد کا آدمی *۔

سورۃ بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ تم اب اس شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو جاؤ، وہاں ہے وَقُولُوا حِطَّةٌ (۲/۵۸)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس شہر میں جا بسو، اور پھر یہ دعا کرو کہ اب ہماری دشت نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم ہو جائے۔ ہمارا رختِ سفر ہماری سواریوں سے اتر جائے اور ہم اس قیامگاہ میں آرام سے زندگی بسر کریں۔

راغب نے کہا ہے کہ حِطَّة کے معنی ہیں حُطَّ عَنَّا ذُنُوبُنَا۔
یعنی ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے۔ دُور کر دے*۔ اسکا بھی مطلب یہی
ہے کہ اب ہماری خطا معاف ہو اور صحرا نوردی اور دشت پیمائی کی زندگی کا
خاتمہ ہو جائے۔

ح ط م

الْحِطْمُ - توڑ دینا۔ خواہ کسی طریق سے بھی ہو۔ خشک چیز جیسے
ہڈی وغیرہ کو توڑ دینا۔ اِنْحِطَمَ وہ چیز ٹوٹ گئی۔ اَلْحِطْمَةُ - اَلْحِطَامَةُ
جو کچھ کسی چیز میں سے ٹوٹ جائے۔ اَلْحِطْيَمُ - وہ حصہ جو خانہ کعبہ
کی عمارت سے الگ چھوڑا ہوا ہے۔ اَلْحِطْمَةُ - سخت قحط کا سال۔ اَلْحِطْمَةُ -
کثیر تعداد میں اونٹ یا بکریاں جو زمین کے بالائی حصہ یا پودوں کو پامال
کر دیں۔ سخت آگ جو ہر اس چیز کو جو اس میں ڈالی جائے بھسم کر کے
رکھ دے۔ ایسا چرواہا جو اپنے جانوروں پر سخت ظلم کرے۔

سورۃ نمل میں ہے لَا يَحْطِمَنَّكُمْ (۲۸) ”وہ کہیں تمہیں کچل نہ
ڈالیں“۔

سورۃ زمر میں ہے ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (۳۹) پھر وہ اسے چورا چورا
کر دیتا ہے۔ کچلی ہوئی چیز کی طرح کر دیتا ہے۔ سورۃ الہُمَزَةُ میں
جہنم کیلئے اَلْحِطْمَةُ آیا ہے (۱۰۳)۔ یعنی جس میں انسانیت کچلی جائے۔

ح ظ ر

حَظَرَهُ الشَّيْءُ يَحْظُرُهُ - اس سے کسی چیز کو روک دینا، بند
کر دینا، منع کر دینا۔ جب کوئی شے تمہارے اور کسی دوسرے کے درمیان
روک بن کر حائل ہو جائے تو کہتے ہیں حَظَرَهُ عَلَيْهِكَ - اَلْحَظِيْرَةُ -
باڑ جو کھیت کے گرد لگادی جائے۔ احاطہ۔ کھجور کی شاخوں اور پٹھوں سے
ایک دائرہ سا بنا لیتے ہیں جس میں کجھوڑیں توڑ توڑ کر اکٹھی کرتے جاتے
ہیں۔ نیز اونٹوں وغیرہ کا باڑہ۔ اَلْحِظَارُ - دیوار کو بھی کہتے ہیں۔

اَلْحَظِيْرُ - بخیل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مال کو اپنے لئے روک
رکھتا ہے اور نوع انسانی کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔ اَلْمَحْظُوْرُ - روکا
ہوا۔ محروم۔ جسے کسی چیز کے لینے سے روک دیا ہو*۔

* راغب - * تاج و محیط و راغب -

قرآن کریم میں ہے کہ جہانتک خدا کے قانون طبعی کے ذریعہ دنیا کے مال و متاع ملنے کا تعلق ہے یہ ہر شخص کو اسکی کوشش کے مطابق مل سکتا ہے۔ اس میں کافر و سومن، کسی کی تمیز نہیں۔ مَّا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۰۰) ”خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں پر کوئی احاطہ بندی نہیں کر رکھی،“۔ اسے تمام نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھا ہے۔ لہذا انہیں اسی طرح کھلا رہنا چاہئے۔ جو نظام، خدا کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیتوں میں دیکر انہیں محظور کر دیتا ہے وہ خدا کے نظام رب العالمین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی کو يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۱) کہا گیا ہے۔ یعنی جس رزق کو پسائی کی طرح بہتا رہنا چاہئے تھا اسے بند لگا کر روک رکھنا۔

سورۃ قمر میں قوم ثمود کی تباہی کے ضمن میں ہے فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُتَغْطِرِ (۵۳)۔ وہ ایسے ہو گئے جیسے پرانی بار کا فرسودہ چورہ ہوتا ہے۔ (ابن فارس) یا اس بھوسہ کی طرح ہو گئے جس کو رکھنے کیلئے بار بنانے والا بار بناتا ہے۔

ح ظ ظ

الْحَظُّ - نصیب - مقررہ حصہ - بخت - أَحَظَّ فُلَانٌ - فلاں شخص خوش بخت اور مالدار ہو گیا۔ الْحَظِيظُ - خوش نصیب و آسودہ حال *۔
قرآن کریم میں بہت بڑے نصیب والے (خوش بخت) کو ذُوْ حَظٍّ عَظِيمٍ کہا گیا ہے (۳۱)۔ یہ وہ ہے جو برائی کو حسن کارانہ انداز سے دور کرتا اور جادہ حق پر استقامت سے چلے جاتا ہے (۳۳-۳۵)۔

ح ف د

حَفَدٌ - يَحْفِدُ - کام میں پھرتی اور جلدی کرنا - خدمت کرنا۔ الْحَفْدُ و الْحَفْدَةُ - خدام و اعوان (حافید کی جمع ہے) جو شخص کوئی کام کرے اور اس میں اطاعت اور تیزی دکھائے تو اسے حَفِيدٌ کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَ حَفَدَةً (۱۶) ”اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے اولاد (بیٹے) پیدا کی۔ اور خدمتگار بھی،“۔ بعض نے کہا ہے کہ حِفَادُ الشَّجَلِ - آدمی کی اولاد اور

اولاد در اولاد کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نسبتی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ بعض نے پوتے مراد لئے ہیں ***۔ لیکن اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ اس سے مراد خدمتگار ہی ہیں۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں سے تمہاری اولاد پیدا کی۔ نیز تمہارے لئے خدمتگار بنائے۔ پوتے وغیرہ بھی اسلئے مراد لئے جاتے ہیں کہ ان کی خدمت زیادہ صداقت آمیز ہوتی ہے **۔ واضح رہے کہ ”خدمتگار“ سے مراد کام کاج میں معاون اور مددگار ہیں۔ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق ”نوکر“ نہیں جنہیں انسانیت کا درجہ ہی نہیں دیا جاتا۔

ح ف ر

حَفَرَ الشَّيْءَ يَحْفِرُهُ - کسی چیز کو کھودنا۔ جو جگہ کھودی جائے اسے حَفْرَةٌ کہتے ہیں اور جس چیز سے کھودا جائے اسے مِحْفَارٌ*۔ الْحَفْرَةُ - گڑھا * (۱۳۰/۲) الْحَافِرُ - جانور کے سم کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ چلنے میں مٹی کھودتا چلا جاتا ہے۔ اسی سے حَافِرَةٌ اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر کوئی نشان بناتا گیا ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعْتُ عَلَى حَافِرَتِي - میں اپنے اس راستہ پر لوٹ آیا جس پر میں گیا تھا۔ یعنی اپنی پہلی حالت پر واپس آجانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھودنے کے علاوہ، اوّل امر کے بھی ہیں۔

سورة نَارِ عِلَّتْ میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آنے والے انقلاب میں ان سے وہ سب قوت و دولت چھن جائیگی جو انہوں نے اس طرح سلب و نہب سے حاصل کر رکھی ہے اور اس طرح وہ اُسی حالت پر لوٹ جائینگے جس پر وہ اس دولت و قوت کے حصول سے پہلے تھے، تو یہ اسکا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، ذرا ان کی سننا! یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری پھر وہی پہلی سی حالت ہو جائیگی۔ يَقُولُونَ ءَاِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ (۹۰/۱)۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ حَافِرَةٌ اس طرح لوٹنے کو کہتے ہیں کہ آخری حصہ بالکل پہلے حصہ پر پلٹ جائے****۔ (As you were) ہو جانا۔ یا مرنے کے بعد جب ہڈیاں تک کھوکھلی ہو جائیں، پھر زندگی کی حالت کی طرف لوٹ آنا۔ یعنی دوبارہ زندہ ہو جانا۔

ح ف ظ

حَفِظَہ - حَفِظًا - نگہبانی کرنا - حفاظت کرنا - بچانا * - اَلْحَفِظُ
 کے بھی یہی معنی ہیں (۳۷) - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن
 الفاظ میں حاء اور فاء اکٹھے آئیں اُن میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے -
 محفوظ کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس شے کو منتشر نہ ہونے دیا جائے - جمع
 رکھا جائے - حَافِظٌ - حَفِیْظٌ - وہ شخص جو کسی چیز کی نگہبانی کیلئے مقرر کیا گیا
 ہو - محافظ - نگہبان * - اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لِّلّٰہِ عَآلِیُّہَا حَافِیْظٌ (۸۶) - ”ہر
 شخص پر نگہبان مقرر ہے“ - اور اِنْ رَّبِّیْ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ
 (۱۱) - ”میرا رب ہر شے کا نگہبان ہے“ - سورۃ ق میں مومن کو بھی
 حَفِیْظٌ (۵۴) کہا گیا ہے - اس کے معنی ہونگے قانون خداوندی کی نگہداشت
 کرنے والا - حَافِظٌ کی جمع حَفَظَۃً ہے -

قرآن کریم میں یہ لفظ اُن کائناتی قوتوں (ملائکہ) کیلئے بھی آیا ہے
 جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہر شے پر کنٹرول رکھتی ہیں - (۶۱) -
 اَسْتَحْفِظُ حَفَاطَتِیْ خَوَاصِّہَا کرنا - سورۃ مائدہ میں ہے بِمَا اَسْتَحْفِظُوْا
 مِیْنَ کِتَابِ اللّٰہِ (۵۴) یعنی جو کتاب اللہ انکی حفاظت میں دی گئی تھی -
 جس کی حفاظت کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا - مَحْفُوْظٌ - حفاظت میں رکھا
 ہوا - سورۃ انبیاء میں ہے وَ جَعَلْنَا السَّمٰوٰتِ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱) - ”ہم
 نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا“ - فتح القدیر میں ہے کہ اس کے معنی مَرْفُوْعًا
 اونچا ہیں ** - لیکن ہمیں لغت سے اسکی تائید نہیں ملی شاید یہ معنی اس
 اعتبار سے لئے گئے ہوں کہ حفاظت کی غرض سے کسی شے کو اتنی بلندی پر
 رکھ دیا جائے جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہو - لیکن یہ معنی قیاسی ہونگے -
 (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان س - م - و) -

نصر نے کہا ہے کہ اَلْحَافِیْظُ سیدھے اور واضح راستے کو بھی کہتے
 ہیں * -

ح ف ف

اَلْحِفَافُ - گنجے کے سر کے ارد گرد کے بال - اس سے اس کے معنی
 ہوتے ہیں ہر وہ چیز جو کیسی چیز کے گردا گرد واقع ہو اور اسے اپنے گھیرے
 میں لئے ہو - حَفَفَہ بِالشَّیْءِ - اس نے اسے کسی چیز کے ذریعہ گھیر لیا -

* تاج - ** بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل -

حَفَّيْفَ حَوْلَه - اس نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا * - اصل میں ، جس لفظ میں حَاء اور فَاء اکٹھے ہوں اس میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ** -

سورة کہف میں دو باغوں کے متعلق ہے - حَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ (۱۸/۳۴) ”ہم نے ان کے گردا گرد کھجوریں لگائیں“ ، - سورة زمر میں ہے وَ تَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۷۵) - ”تو ملائکہ کو دیکھیگا کہ وہ عرش کے ارد گرد گھیرا ڈالے ہیں“ ، - عرش ، کائنات کے کنٹرول کا مرکز ہے - اور ملائکہ ، عالم امر و خلق کی وہ قوتیں جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لاتی ہیں - یہ سب قوتیں خدا کے کائناتی کنٹرول کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں -

ح ف ی (ح ف و)

الْحَفَا - آدمی یا اونٹ کے پاؤں اور جانوروں کے ستم یا کھر کا زیادہ چلنے سے چھل جانا - ننگے پاؤں ، بغیر جوتے یا موزے کے چلنا - احْتَفَى - وہ ننگے پاؤں چلا **** - چونکہ انسان ننگے پاؤں اس کام کے لئے اٹھ کر چل دیتا ہے جس کے متعلق اسے بڑی کاوش اور اضطراب ہو ، اس لئے اس لفظ کا استعمال شدت اور مبالغہ کے لئے ہوتا ہے - حَفِيَّ بِيہ : اس کے ساتھ مہربانی و لطف سے پیش آیا ، اس کا انتہائی اکرام و احترام کیا ، اسے دیکھ کر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا **** - حَفِيَّ عَنْہُ - کسی کا حال بار بار ، اکثر بار بار صرار پوچھتے رہنا - احْفَی السُّؤَالَ - اس نے بار بار سوال دہرایا - یا صرار مانگا - الْحَفِيَّ - اس عالم کو کہتے ہیں جو نہایت کاوش کے ساتھ علم حاصل کرے - جو بات کی تہہ تک پہنچ جائے - اسْتَحْفَى الرَّجُلُ - آدمی نے بڑی کوشش اور کاوش سے بات معلوم کی **** - الْحَافِي - قاضی کو کہتے ہیں جو مقدمہ کی تہہ تک پہنچ کر فیصلہ دیتا ہے **** - الْحَفِيَّ - بات کو اچھی طرح جاننے والا **** - وسیع معلومات اور ہمہ گیر علم رکھنے والا - سورة اعراف میں ہے يَسْأَلُونَكَ كَاُنَّكَ حَفِيَّ عَنْہُمْ (۱۸/۷۵) یہ تجھ سے (السَّاعَةِ) کے متعلق اس طرح پوچھتے ہیں گویا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی مسئلہ کی تحقیق کے پیچھے لگا ہوا ہے - سورة مریم میں خدا کے متعلق ہے اِنَّہُ كَانَ رَبِيْ حَفِيَّ (۱۹/۱) - وہ مجھ پر بہت مہربان ہے میری حاجت روا کرنے والا ہے - کیونکہ حَفِيَّ بِيہ کے معنی ہیں کسی کے

اکرام میں مبالغہ سے کام لینا۔ اصمعی نے حَفِیْ بِسْمِہ کے معنی کسی کی ضرورت پر اس کے کام آنا اور اسکو عزت سے ٹھیرانا کئے ہیں*۔ سورۃ محمد میں ہے اِنْ یَسْئَلْکُمْ وَہَا فِیْہِ حَفِیْکُمْ (۳۷) اگر وہ تم سے (مال و دولت) مانگے اور اس مانگنے میں اصرار کرے تمہارا پیچھا لے اور چمٹ جائے۔ ننگے پاؤں تمہارے پیچھے پیچھے پھرے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی (۱) روکنا۔ (۲) سوال کرنے میں حد کر دینا۔ اور (۳) ننگے پاؤں ہونا ہیں۔ اس سادہ میں کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سے اِحْفَاءُ الشَّوَارِبِ ہے (یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹ لینا)۔ صاحب محیط نے اس کی تائید میں ابو فراس بن حمدان عدوی کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

اَغَايَةَ الدِّیْنِ اَنْ تَحْفُوْا شَوَارِبَکُمْ

یَا اُمَّةً ضَحِیْکَتْ مِیْنِ جَہْلِہَا الْاُمَمِ

کیا تمہارے نزدیک دین کی غایت یہی رہ گئی ہے کہ مونچھوں کو جڑ سے مونڈا جائے؟ اے وہ قوم کہ تیری جہالت پر دنیا کی قومیں ہنس رہی ہیں۔

ح ق ب

اَلْحَقَبُ - وہ بند جو اونٹ کے پیٹ کے نیچے سے کھینچ کر کجاوہ یا کاٹھی کے ساتھ کس کر باندھا جائے۔ (اسے ہمارے ہاں ”تنگ“ کہتے ہیں) اس کے بنیادی معنی روکنے اور قید کرنے کے ہوتے ہیں (ابن فارس)۔ اَلْحَقِیْبَةُ - تھیلا، بالخصوص وہ تھیلا جو پالان کے پچھلے حصہ میں لٹکا رہتا ہے۔ اَلْمُحْقِبُ - وہ شخص جو اپنے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو سواری پر بٹھائے۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ - فلاں آدمی نے اپنے کجاوہ یا کاٹھی کے پچھلے حصہ میں کچھ باندھ کر لٹکا لیا۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ الْاِثْمَ - فلاں آدمی نے گناہوں کا پشتارہ اپنے پیچھے باندھ لیا۔ اَلْحَقِیْبَةُ مِیْنِ الدَّہْرِ - زمانہ کی ایک مدت جسکی مقدار مقرر نہیں۔ اَلْحَقَبُ وَالْحَقِیْبُ - زمانہ۔ اسی (۸۰) سال کا زمانہ۔ سال۔ سالہا سال، (جمع اَحْقَابٌ)*۔ یہ لفظ غیر متعین مدت کے لئے بولا جاتا ہے** سورۃ کہف میں ہے اَوْ اَمْضِیْ حَقْبًا

* تاج۔ ** راغب، لطائف اللغة میں اس کے معنی الدَّہْر لکھے ہیں۔ یعنی زمانہ۔

(۱۸)۔ ”سالہا سال تک چلتا رہوں“۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لَبِثِينَ فِيْهَا أَحْقَابًا (۳۸)۔ ”وہ اس میں زمانہ دراز تک رہیں گے“۔ مَادَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ (۱۱) تک۔ یعنی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔

ح ق ف

الْحَقِيفُ۔ لمبا بلند یا بڑا گول ریتیل ٹیلہ۔ جمع أَحْقَافٌ ہے۔ نیز بل کھائی ہوئی ریتیلی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ أَحْقَافٌ (۳۶)۔ یمن میں، عمان اور حضرموت کے درمیان ٹیلے اور پہاڑ ہیں جہاں قوم عاد رہتی تھی*۔

ح ق ق

حَقٌّ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے*۔ یعنی کسی چیز کا ٹھوس شکل (Concrete Form) میں سامنے آ جانا۔ یا ثابت (Establish) ہو جانا۔ جن الفاظ میں حاء اور قاف اکٹھے آئیں ان میں اثبات (ثابت ہونے) کا مفہوم مضمر ہوتا ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں صحت (صحیح ہونا) اور استحکام و ثبات دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں عِنْدَ حَقٍّ لِقَاحِيهَا۔ یعنی اونٹنی کا حمل ثابت ہونے پر۔ رَجُلٌ حَقٌّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس شخص کی مردانگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ رَمَى فَأَحَقَّ الرَّمِيَّةُ کے معنی ہیں اس نے تیر چلایا اور اس کے ساتھ ہی جانور مر گیا۔ لہذا یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اس کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ یعنی یہ بات محض قیاسی اور نظری نہیں کہ تیر نشانہ پر لگا ہے یا نہیں۔ مرے ہوئے شکار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تیر نشانہ پر لگا تھا۔ احْتَقَّتْ بِهِ الطَّعْنَةُ کے معنی ہیں نیزے کے وار نے اسے قتل کر دیا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ وار کاری تھا۔ طَعْنَةُ مُحَقَّقَةٌ۔ یا مُحْتَقَّةٌ نیزے کی اس مار کو کہتے ہیں جو سیدھی آر پار ہو جائے اور اس طرح اس کے ٹھکانے پر لگنے میں کوئی شبہ نہ رہے*۔ لہذا حَقٌّ کے معنی ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بن کر سامنے آ جانا۔ چنانچہ سورۃ احقاف میں ہے کہ مجرمین کو عذاب کے سامنے کھڑا کر کے ان سے پوچھا جائیگا کہ اَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ (۳۶)۔ ”کہو! مکافاتِ عمل ایک ٹھوس حقیقت ہے یا

نہیں؟“ اسی طرح جب حضرت یوسفؑ کو مصر میں تمکن حاصل ہو گیا تو انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ هَذَا تَأْوِيلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ۔ ”یہ ہے مآل اس خواب کا جو میں نے بہت پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا“۔ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (۱۲۰)۔ ”میرے نشو و نما دینے والے نے اسے ایسک ٹھوس واقعہ کی صورت میں سامنے لا کر دکھا دیا ہے“۔ اسی طرح سورۃ حجر میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے سہانوں نے انہیں انکی کبرسنی کے زمانہ میں بیٹے کی خوشخبری دی اور حضرت ابراہیمؑ کو اس پر تعجب سا ہوا تو انہوں نے کہا بَشِّرْ نَاكَ بِالْحَقِّ (۱۵۵) ”ہم جو تجھے خوشخبری دے رہے ہیں وہ ایک ٹھوس واقعہ بن کر سامنے آ جائیگی“۔

لہذا حَقَّ کے اولین معنی ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بن کر سامنے آ جانا۔

(۲) چونکہ کوئی شے ٹھوس واقعہ میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتی ہے جب اسکی نشو و نما تعمیری (Constructive) ہو۔ اس لئے حَقَّ، اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو کہتے ہیں۔ چنانچہ تَحْقِيقُ کے معنی ہیں کپڑے کو نہایت مضبوط کر کے بٹنا* ثَوْبٌ مَحْقُوقٌ اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو پختہ بٹا ہوا ہو (محیط)۔ الْحَقُّ۔ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں لگ گئے ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے باربرداری کا کام لیا جاسکے۔ نیز وہ اس قابل ہوں کہ وہ اونٹنیوں کو حاملہ کر کے ٹھوس نتائج مرتب کر سکیں**۔ اِحْتَقَّ الْفَرَسُ کے معنی ہیں گھوڑے کے موٹاپے کو خاص ترکیب سے دور کر کے اسکی طاقت کو نہایت عمدگی سے محفوظ کر لینا**۔ اِنْ حَقَّتِ الْعُقْدَةُ۔ کے معنی ہیں گرہ نہایت مضبوطی سے لگ گئی**۔ لہذا حَقَّ کے معنی ہوئے ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو۔ امٹ ہو۔ اسلئے قرآن کریم میں يُحَقِّقُ بِمَقَابِلِهِ يَمْحُ (يمحو) آیا ہے۔ وَ يَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَ يَحَقُّ الْحَقُّ بِكَلِمَاتِهِ (۳۲)۔ خدا کا قانون کائنات، تخریبی قوتوں کے نتائج کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری قوتوں کے نتائج کو برقرار رکھتا ہے، جو ٹھوس شکل میں موجود رہتے ہیں۔

(۳) کوئی چیز اسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانونِ حفظ و بقا کے عین مطابق ہو۔ جو زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ جو اپنی جگہ

پر بھی فیٹ ہو اور بدلنے والے حالات سے بھی موافق رہے۔ چنانچہ حَقَّ کے تیسرے معنی ہیں علم و عقل، عدل و انصاف اور واقعات و مصالح کے عین مطابق ہونا۔ راغب نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ آجکل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوتے ہیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گِلّی کی طرح لکڑی بڑھی ہوئی ہوتی تھی اور وہ لکڑی ساکٹ (Socket) میں اس طرح فیٹ آجاتی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر قائم بھی رہتی تھی اور دروازے کے ساتھ گھومتی بھی تھی۔ راغب کے نزدیک حَقَّ کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ حَقَّ اس موجد کو کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اس لئے خدا کو الْحَقَّ کہا گیا ہے۔ نیز ہر اس موجود چیز کو حَقَّ کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ آ لَا حَقَّ مِّنَ الْفَرَسِ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنا پچھلا پاؤں ٹھیک اس جگہ رکھے جہاں اسکا اگلا پاؤں پڑا تھا۔

ان معانی کی روشنی میں حَقَّ اور بَاطِل کی قرآنی اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائیگا۔

حَقَّ الْأَمْرُ یَحِقُّ اور یَحِقُّ کے معنی ہیں وہ امر واجب ہو گیا۔ یعنی کسی بات کا واجب ہونا۔ حَقِیقَتَہ۔ اس چیز کو کہتے ہیں جسکی حفاظت تم پر واجب ہو جائے۔ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (۱۸۰) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی متقین کے ذمہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس قانون (وصیت) پر خود ہی عمل پیرا ہوں بلکہ ان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اسکی حفاظت کریں۔ نیز کسی ملک کے جھنڈے کو بھی حَقِیقَتَہ کہتے ہیں کیونکہ اس سے اس ملک کے وجود کا اثبات ہوتا ہے اور اسکی حفاظت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے۔

حَقَّ اللَّطِیْقُ کے معنی ہیں وہ سوار ہو کر راستہ کے درمیان چلا۔ اور اس طرح نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔

سورۃ یونس میں حَقَّ کا لفظ ظَنَّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶) جہاں کہا گیا ہے کہ ظَنَّ، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیتا۔ اس لئے اتباع، حق کی کرنی چاہئے نہ کہ ظن کی۔ دین یکسر حق ہے۔ اس میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ خدا خود حق ہے (۱۶)۔ اس کا رسول حق ہے (۸۵)۔ اسکی طرف سے بھیجا ہوا قرآن کریم حق ہے (۳۳)۔ اس کے وعدے (قوانین) حق

ہیں (۱/۵)۔ اس کا دین حق ہے (۹/۳۳)۔ اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (۳۹/۵)۔ چونکہ حَقُّ ۳۳۔ ظن و شکوک سے بلند ہوتا ہے۔ اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ہوتا ہے، اس لئے ظہور نتائج کو بھی اَلْحَقَّۃً کہا گیا ہے۔ (۶۱/۱)۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ حَقُّ ۳۳ کوئی ذہنی، نظری، تصوراتی، یا محض عقیدہ کی چیز نہیں۔ یہ عقائد اور نظریات حیات کے تعمیری نتائج کا نام ہے جو ٹھوس شکل میں سامنے آجائیں اور جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلے جائیں اور اپنی صداقتوں کیلئے خارجی دلائل کے محتاج نہ ہوں بلکہ سورج کی طرح اپنی دلیل آپ ہوں۔ اس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق ثابت نہیں کہلا سکتا جب تک اسکے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے نہ آجائیں۔

قرآن کریم میں سَمَاءٌ کے متعلق ہے کہ وہ پھٹ جائیگا اور زمین کے متعلق ہے کہ وہ خالی ہو جائیگی (ان امور کی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں ملیگی) اسکے بعد فرمایا کہ وَ اَذِنْتَ لِرَبِّہَا وَ حَقَّقْتَ (۸۳/۳)۔ ”وہ اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون پر عمل کریگی اور اسے بنایا ہی اسکے مطابق گیا ہے“۔ اسی طرح اعمال کے نتائج واجب ہو جانے کیلئے حَقُّ ۳۳ عَلَیْہِمُ السَّضَالٰۃُ (۳۰/۳)۔ اور فَحَقَّ عَلَیْہَا الْقَوْلُ (۱۶/۱)۔ فَحَقَّ ۳۳ وَ عِیْدِ (۵۰/۱۲)۔ اور فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸/۱۲) آیا ہے۔ یا حَقَّقْنَا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۰۳/۱)۔ ”مومنین کو مخالفین کی تدابیر سے محفوظ رکھنا ہم پر واجب ہوتا ہے“۔ حَقِّیْقٌ (۱۰۵/۱)۔ مناسب۔ ضروری۔ واجب۔ لازم۔

اِسْتَحَقَّۃً اِثْمًا (۱۰۵/۱)۔ انہوں نے ارتکاب جرم کیا ہے۔ (دیکھئے ! یہاں بھی واقعہ کے سرزد ہونے، یعنی اس کے امر واقعہ بن جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ یہ حَقُّ ۳۳ کے بنیادی معنی ہیں)۔

(حَقُّ ۳۳ کے ساتھ باطیل کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ دونوں کے تقابل سے مفہوم اور نکھر جائے)۔

ح ک م

اَلْحَکَمَۃُ۔ گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں**۔ بلکہ منہ میں لگام دیکر جس چمڑے سے اسے باندھ دیا جائے کہ وہ اسکے دونوں جبڑوں کو کس لئے اور

ادھر ادھر نہ ہونے دے۔ اسے حَکَمَۃً کہتے تھے۔ اَحْکَمَ الْفَرَسَ کے معنی ہیں گھوڑے کو اس طرح کی لگام دینا*۔ چونکہ اس لگام کا کام یہ ہے کہ گھوڑے کو سرکش اور بے راہرو ہونے سے روک دے اسلئے حَکَمَتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں میں نے گھوڑے کو روکا اور (لگام کے ذریعہ) قابو میں لیا۔ اَحْکَمَہُ عَنِ الْاَمْرِ کے معنی ہیں، اسے اس بات سے روک دیا۔ منع کر دیا۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کی آخری حد کونسی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ اسی کو اختلافی امور میں فیصلہ کرنا کہتے ہیں۔ یعنی ہر ایک کے حقوق و واجبات کی حدیں متعین کر دینا اور کسی کو ان سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ اسی کو حَکَمَ کہتے ہیں۔ یعنی فیصلہ*۔ حَاکِمَ کے معنی ہیں فیصلہ کرنے والا۔ اس قسم کا حکم دینے والا جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ حَکَمَ بَيْنَهُمُ کَذَالِکَ کے معنی ہیں اس نے ان کے درمیان اس طرح کا فیصلہ کیا*۔ اَلْحُکْمُۃُ اسی سے اسم ہے*۔ اَلْحَکَمُ۔ صاحب اختیار ثالث یا پنچ۔ ایسا فیصلہ کرنے والا جسے موافقت یا مخالفت میں فیصلے کا پورا پورا اختیار ہو۔ قانون نافذ کرنے والا۔ (۳۵ و ۱۱۵)۔

اَلْحَکَمَۃُ کے معنی ہیں فیصلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا*۔ یعنی ہر ایک کے حقوق کی حدیں مقرر کر کے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا۔ اسی لئے حَاکِمٌ اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ، ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نہایت حسن و اتقان کے ساتھ بنائے، یا معاملات کو اس طرح سر انجام دے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ حَکَمَۃً کو حکمت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے۔ اقبال کی اصطلاح میں حَکَمَۃً، ”رائے با قوت“، کو کہہینگے۔ یعنی فیصلہ دینے کی صلاحیت اور پھر اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت۔ اسی کو آجکل کی زبان میں حکومت کہتے ہیں۔

چونکہ حَکَمَ کے معنی کسی چیز کو (ایک مقام پر) روک دینے کے ہیں۔ اور جو چیز ایک مقام پر جم کر کھڑی ہو جائے وہ مستحکم ہو جاتی ہے۔ اسلئے اَحْکَمَہُ کے معنی ہیں اسکو مستحکم کر دیا**۔ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے۔

قرآن کریم کو حَاکِمٌ کہا گیا ہے۔ (۳۶) کیونکہ وہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ وہ

تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔ خدا کو بھی حکیمؑ کہا گیا ہے (۳۲)۔ کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک ٹھیک راستہ پر چلاتا ہے۔ ہر شے کو صحیح صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اپنے قانون کی لگام سے ہر شے کو مسخر کئے ہوئے ہے یَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۱۳) وہ انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اسکی آیات مُحْكَمَاتٌ اور مُتَشَابِهَاتٌ ہیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسکا اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ الْمَثَابَهُ كُلُّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۳)۔

عام الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

اللہ وہ ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس میں ایک قسم تو ایسی آیتوں کی ہے جو ”محکم“ ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم ”متشابهات“ کی ہے۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو ”متشابه“ ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور انکی تاویل نکالیں۔ حالانکہ اسکی تاویل اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں۔

ہم نے اس ترجمہ میں ”محکم“۔ ”متشابه“۔ ”تاویل“۔ وغیرہ الفاظ کو اسی طرح لکھ دیا ہے۔ اس لئے کہ انہی کے مفہوم کی وضاحت سے اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، مُحْكَمٌ کے معنی ہیں اپنی جگہ پر قائم۔ اٹل۔ صاف صاف فیصلہ کرنے والا۔ مستحکم۔ لیکن یہاں اس کے مقابل میں مُتَشَابِهَاتٌ کا لفظ آیا ہے اس لئے مُحْكَمٌ کے معنی ہونگے وہ جو مُتَشَابِه نہ ہو۔ اور مُتَشَابِه کے معنی ہونگے وہ جو محکم نہ ہو۔ یعنی مُحْكَمٌ اور مُتَشَابِه۔ مختلف قسم کی آیات ہیں۔ یا آیات کی دو قسمیں ہیں۔

مُتَشَابِهہ کے تفصیلی معنی ش - ب - ہ کے عنوان میں دیکھئے۔
مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہوتے ہیں ، ملتی جلتی ہوئی چیزیں جن میں باہمی
مشابہت اور موافقت ہو۔ تشبیہ کو اسی لئے تشبیہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک
چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز کے ساتھ مثال دیکر سمجھایا جاتا ہے۔

ان معانی کے اعتبار سے مُحْكَم کے اولین معنی ہونگے ایسی آیات جن
کے الفاظ سے وہی مفہوم ہو جو ان الفاظ کے معنی ہیں۔ مثلاً نکاح کے ضمن
میں ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ (۲۳)۔ تمہاری مائیں تم
پر حرام ہیں۔ اس میں اُمُّ کے معنی ماں کے ہیں۔ یعنی وہ عورت جس کے بطن
سے کوئی پیدا ہو۔ لیکن مُحْكَم و مُتَشَابِهَات کی جس آیت کو اوپر نقل
کیا گیا ہے۔ یعنی (۲۴)۔ اس میں هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ میں اُمُّ کے معنی اس
قسم کی ماں نہیں۔ اس میں اُمُّ کا لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے اور اس سے
مفہوم ہے ”اصل و بنیاد“۔ یہ اس لفظ کی تاویل ہے۔ تَاوِیْل کے معنی
ہیں آخری نتیجہ۔ جو کچھ مآل کار ہو۔ کسی شے کی آخری حقیقت (Ultimate)
(Reality)۔ قرآن میں انسانی راہنمائی کیلئے قوانین و ضوابط دئے گئے ہیں۔ ظاہر
ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ
سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو۔ جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ
اُمَّهَاتُكُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے۔ اس قسم کی آیات مُحْكَمَات ہیں۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اُس عالم
سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات اور اسکی صفات۔
مرنے کے بعد کی زندگی اور اُس میں اعمال کے نتائج۔ وہاں کی جنت اور
جہنم۔ یا انسانی زندگی کا منتہی اور مآل۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد
حقائق (Abstract Truths) کو جب بھی بیان کیا جائیگا تو تشبیہ و استعارہ
اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائیگا۔ یعنی اُن کا بیان (Symbolically)
ممکن ہوگا۔ مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ
(۵۳)۔ وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ اور كَانَ عَرْشُهُ عَلٰی الْمَآءِ (۱۱)
اسکا عرش پانی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْش سے مراد لکڑی (یا
کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں۔ نہ ہی مَآء سے مراد پانی ہے۔
یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے۔ یعنی ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعے
بیان کیا گیا ہے۔ لہذا یہ آیات مُتَشَابِهَات ہیں۔ ایسی آیات جن میں
حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالم محسوسات سے باہر کے ہیں، اُن کی حقیقت، کنہ، ماہیت، یعنی ان کی تَأْوِیْلٌ (What they Actually are) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غور و فکر کرنے سے ہم انکے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے۔ مثلاً لفظ عَرَّشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا مفہوم قوت و اقتدار (Authority or Control) ہے۔ یا كَانَ عَرَّشُهُ عَلٰی الْمَاءِ میں مَاءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَیٍّ (۲۱)۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کس طرح عمل میں لاتا (Exercise کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (Life) کو کس طرح پیدا کیا۔ ان باتوں کی کنہ و حقیقت کو ہم نہیں پاسکتے۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہمیں علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔ وَمَا أَوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِیلًا (۱۸۵)۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے۔ البتہ جہانتک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے، ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔ وَمَا یَذَّکَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۳۶)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے پیش نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا۔ یہ لوگ ان ماوراء العقل حقائق کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کیلئے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو پست معاملات قرار دیکر ہمیشہ آسمان کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم ”رَاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ“، اور ”أُولِی الْأَلْبَابِ“، کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی وہ جو عقل و فکر سے کام لیکر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم

رکھتا ہے اسلئے ان کے حقائق (Truths) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن ہم انکی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے۔ یعنی ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ بھی۔ لیکن خدا انکی کنہ و حقیقت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے (۲۶/۲۷) یا (۲۵/۲۶))۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ”ایمان والوں“ میں دو قسم کے لوگ ہونگے۔ ایک وہ عوام جو وحی پر ویسے ہی ایمان رکھتے ہیں۔ اور دوسرے صاحبان علم و بصیرت جو عقل و فکر کی رو سے وحی کے حقائق پر غور و خوض کرتے ہیں۔ سورۃ مدثر میں اس دوسرے گروہ کو اَلَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ، کہہ کر پکارا گیا ہے اور ان کے برعکس عام لوگوں کو ”الْمُؤْمِنُونَ“، (۲۴/۲۵)۔

جن دو ذہنیتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق سورۃ مدثر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں سَقَرٌ (جہنم) کے متعلق کہا ہے کہ عَلَيْهِمَا تِسْعَةُ عَشْرَ (۱۹) اس پر انیس (ملائکہ) مقرر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیلی بیان ہے۔ اس کے بعد فرمایا وَمَا جَعَلْنَاهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا (۲۴/۲۵)۔ انکی یہ گنتی (یعنی انیس کی تعداد) ان لوگوں کے لئے وجہ ”فتنہ“ ہے جو قرآن کے حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے برعکس لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّ اَدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اِيْمَانًا۔ جن لوگوں کو اَلْكِتَابُ (کا علم) دیا گیا ہے ان کے دل میں اس سے یقین پیدا ہو جاتا ہے اور (عام مومنین) کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ وَلَا يَسِرُّ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ بہر حال مومنین کی جماعت کے خواص ہوں یا عوام ان میں سے کسی کے لئے بھی اس قسم کا تمثیلی بیان وجہ اضطراب و شکوک نہیں ہوتا۔ لیکن وَلِيَقُولَ الَّذِيْنَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (۲۴/۲۵) جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے، نیز وہ لوگ جو قرآن پر سرے سے ایمان نہیں رکھتے۔ یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کا حقیقی منشا کیا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ (قرآن میں یہ حقائق تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں)۔ ان بیانات سے

جو چاہتا ہے صحیح راہنمائی حاصل کر لیتا ہے اور جو چاہتا ہے ان سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (۳۱)۔ یہ خدا کے لشکر میں جنکی کنہ و حقیقت کا علم صرف اسی کو ہے۔ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْبَشَرِ (۳۱)۔ لیکن ان کے تمثیلی بیان سے انسانوں کی راہنمائی مقصود ہے۔ لہذا جو ”رَاسِيخُونَ فِي الْعِلْمِ“، ہیں وہ ان کی کنہ و حقیقت کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ غور و فکر سے اس راہنمائی (ذکر) تک پہنچ جاتے ہیں جو ان سے مقصود ہے۔

یہ ہے آیات مُحْكَمَاتٌ وَ مُتَشَابِهَاتٌ کا پہلا مفہوم۔

مُتَشَابِهَاتٌ میں ایسے حقائق بھی شامل ہیں جنہیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا ہر زمانہ کا انسان اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ہر سطح کے انسانوں کیلئے راہنمائی کا ضابطہ ہے اور ہر زمانہ کے انسانوں کیلئے بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی زمانہ میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھ کر ہی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ہو سکتا تھا نہ ابدی۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کیلئے یا ایک سطح کے انسانوں کیلئے ہی مفید ہو سکتا تھا۔ باقی انسانوں کیلئے بیکار ہوتا۔ اس قسم کی کتاب کیلئے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت اور لچک ہوتا کہ ہر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وہ خاصہ ہے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے اندر ایسی لچک رکھتے ہیں کہ اس سے ہر انسان اپنی اپنی سطح، علم و عقل کے مطابق مستفید ہو سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کہ ”كُلٌّ فِيْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ“ (۳۶)۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رہا ہے۔ اور سورج کے متعلق ہے وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۸)۔ سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم) بطلموسی تصور رائج تھا، اجرام فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذہن انسانی میں آ نہیں سکتا تھا۔ جب بعد میں کوپرنیکس کا

نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کس طرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرم گردش ہیں۔ اسی طرح جب تک ہر شے کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کسی مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ جب تک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات مُتَشَابِهَات^۴ کی فہرست میں شامل تھیں۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات مُحْكَمَات^۵ کے زمرے میں شامل ہو گئیں۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کیلئے مُحْكَمَات^۶ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کیلئے یہ مُتَشَابِهَات^۷ ہی میں داخل ہیں۔ جب تک یہ آیات مُتَشَابِهَات^۸ کے زمرے میں تھیں انکی حقیقت (تَاوِیْل^۹) کا علم خدا کو تھا۔ جب یہ مُحْكَمَات^{۱۰} کے ذیل میں آ گئیں تو انکی حقیقت ”رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ“ پر بھی منکشف ہو گئی۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۵)۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو فَسْئَلْ بِہِمْ خَبِيرًا (۲۵)۔ اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے۔ جب تک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جس نے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کر دیا ہے۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائیگا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خیر ہو جائیں گے۔

لہذا مُحْكَمَات^{۱۱} و مُتَشَابِهَات^{۱۲} کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ یہ ہیں قرآنی آیات کے مُحْكَمَات^{۱۳} و مُتَشَابِهَات^{۱۴} ہونے کے مختلف مفہوم۔ لیکن مُحْكَمَات^{۱۵} ہوں یا مُتَشَابِهَات^{۱۶} تمام آیات اپنی اپنی جگہ پر یکسر مستحکم ہیں۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم ہے۔ اسی لئے سورۃ ہود میں ہے کِتَابٌ اُحْکِمَاتُ آيَاتُہُ (۱۱)۔ یہ وہ کتاب ہے جسکی تمام آیات کو محکم بنایا گیا ہے۔ یہ کتاب مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل ہے۔ اس کے حقائق غیر متبدل اور اس کے اصول تغیر نہ آشنا ہیں۔ جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے انکی بھی حقیقت غیر متبدل (مُحْكَمَات^{۱۷}) ہے۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات مُحْكَمَات^{۱۸} ہیں۔

اس کے برعکس سورۃ زمر میں پوری کتاب کو مُتَشَابِهَات^{۱۹} کہا گیا ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِی (۳۹)۔

لیکن یہاں مُتَشَابِهًا کا لفظ مُجَرَّمًا کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مَثَانِي کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ مَثَانِي کے مفہوم کیلئے ث۔ن۔ی کا عنوان دیکھئے۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ مَثَانِي ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی کر دی جائیں۔ یعنی ایک دوسرے کی ضد (Juxtaposition) ہوں۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اسکی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں (نور و ظلمت) باہم دگر مَثَانِي ہیں۔ اس طریق بیان سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفرز کا تو خیال ہے کہ اشیاء پہچانی ہی اپنے تضاد سے جاتی ہیں)۔ لیکن اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم میں متضاد باتوں کا بیان ہے۔ اس کے متعلق اللہ نے کہہ دیا کہ نہیں۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں (۱۳۸)۔ اس کی تمام آیات باہم دگر ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں۔ مَثَانِي (متضاد اشیاء کو آمنے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔ لہذا قرآن کریم کی آیات مَثَانِي ہونے کے باوجود مُتَشَابِهًا ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِي ہے۔ یا یوں کہئے کہ متشابہ وہ اسلوب بیان ہے جس میں حقائق کو ملتے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نُورٌ و ہُدًی) اور مَثَانِي وہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اسکی ضد لا کر بات واضح کی گئی ہے۔

(سَبْعًا مِّنَ الْمُثَانِي (۱۵۸) کے لئے دیکھئے عنوان ث۔ن۔ی)

قرآن کریم میں کِتَابٌ کے ساتھ حِکْمَةٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱۵۱)۔ ایک چیز ہوتی ہے قانون (Law) اور ایک ہوتی ہے اس قانون کی مصلحت یا غایت و علت (The why of it) قانون کو کہتے ہیں کِتَابٌ (دیکھئے عنوان ک۔ت۔ب) اور اسکی مصلحت یا علت اور غایت کو کہتے ہیں حکمت۔ اس لئے کہ یہ حِکْمَةٌ ہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قانون کی غایت کیا ہے۔ اس کا متعین راستہ کونسا ہے۔ وہ کس روش پر انسانوں کو چلانا چاہتا ہے۔ اگر قرآن کریم کا مقصود یہ ہوتا کہ اس کے قانون کو مستبدانہ انداز سے (ڈنڈے کے زور پر) اندھا دھند منوایا جائے تو پھر خالی قانون (کتاب) کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ اسکا مقصود یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت علی وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی کے ساتھ) ہو اسلئے ضروری تھا کہ ان قوانین کی حکمت

(مقصد - غایت - مصلحت) بھی ساتھ ہی واضح کر دی جائے۔ لہذا کتاب کے ساتھ حکمت بھی دی گئی۔ یہ دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ سورۃ نساء میں ہے وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱۱۳)۔ خدا نے تیری طرف کتاب اور حکمت کو نازل کیا۔ کہیں قرآن کریم کو صرف الْحِكْمَةُ کہا گیا ہے (۱۶)۔ کہیں اسے الْكِتَابُ اور الْحِكْمَةُ کہہ کر ضمیر دونوں کے لئے واحد کی استعمال کی گئی (۲۳۱) تاکہ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس سے مراد ایک ہی چیز (قرآن کریم) ہے۔ سورۃ احزاب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ الْحِكْمَةُ کی بھی تلاوت ہوتی ہے (۳۵)۔ اس لئے حکمت وحی غیر متلو نہیں۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ حِكْمَتِ قرآن کریم کے اندر ہے۔ قرآن کریم سے باہر نہیں۔

حِكْمَتِ کو وحی کے ذریعہ نازل کرنے میں ایک بہت بڑا مقصد تھا۔ قرآن کریم نے احکام و قوانین اس لئے دیے ہیں تاکہ ان کا نتیجہ مرتب ہو۔ یعنی اسکے قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک نتیجہ پیدا کرنے (ایک مقصد حاصل کرنے) کا ذریعہ ہیں۔ اگر اللہ کی طرف سے صرف قوانین مل جاتے اور یہ نہ بتایا جاتا کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا نکلیگا تو ہو سکتا تھا کہ ہم ان قوانین پر اپنے طور پر عمل کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے کہ خدا کا منشا پورا ہو گیا ہے۔ خدا نے یہ نہیں کیا۔ اس لئے قوانین دیے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لہذا ہمیں ہر وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان قوانین سے وہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے یا نہیں جو خدا نے متعین کیا ہے۔ اگر ہو رہا ہے تو پھر ان قوانین پر عمل بھی ٹھیک ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ان سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو پھر ہمیں رک کر اپنا جائزہ لینا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے جسکی وجہ سے ان قوانین سے ان کا متعین کردہ نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔ مثلاً قرآن کریم میں صَلَوة کے متعلق ہے کہ أَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹)۔ اسمیں أَقِمِ الصَّلَاةَ (صَلَاة قائم کرو) حکم (کِتَاب) ہے۔ اور دوسرا حصہ (کہ صَلَاة سے فحشاء اور منکر کی روک تھام ہو جائیگی) اس کی حِكْمَتِ ہے۔ اگر صَلَاة سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا تو ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ کیونکہ جب خود خدا نے کہا ہے کہ اقامت صَلَاة سے ایسا ہوگا (تو اگر اقامت صَلَاة قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ہو رہا ہے) تو اس

سے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ نتیجہ بھی خود خدا ہی کا بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ مقصد تھا کِتَابٌ کے ساتھ حکمت کے مُنَزَّلَ مِّنَ اللّٰهِ ہونے کا (نیز دیکھئے عنوان ک۔ ت۔ ب) حُكْمًا سے مراد وہ قوت فیصلہ (یا فہم) بھی ہے جو عام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی وحی کے بغیر۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وَ لَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ اسْتَوٰی اَتَيْنٰهُ حُكْمًا وَ عِلْمًا (۲۸) جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور اس کے قویٰ میں اعتدال آ گیا تو ہم نے اسے حکم (فہم۔ قوت فیصلہ) اور علم عطا کیا۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملنے سے پہلے کی ہے۔ اس لئے اس سے مراد وہ حِکْمَةٌ نہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کو، کب، کس طرح اور کہاں، زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق، منطبق کیا جائے اور اس کے اصولی حکم کو جزئیات پر چسپاں کرنے کے لئے کیا اندازِ تعبیر اختیار کیا جائے۔ یہ مختلف احکام میں سے کس کو مقدم اور کس کو موخر کیا جائے، یہ ساری حکمتیں عقل، فہم، فراست سے تعلق رکھتی ہیں اور اس الْحِکْمَةِ سے الگ ہیں جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے يَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَكِّیْہُمْ وَ یُعَلِّمُہُمْ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ (۶۲)۔ اس میں تلاوتِ آیات۔ تزکیہ۔ تعلیم۔ کتاب اور تعلیم۔ حکمت، چاروں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول ایک تو ان قوانین اور ان کی حکمت کی تعلیم دیتا ہے جو قرآن کریم کے اندر ہیں۔ اور (اس نظام کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں) بہت سی حکمتیں اس کے علاوہ بتاتا ہے اور اس طرح احکام خداوندی کے مناسب انطباق یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے فیصلے کرتا ہے۔ اس تعلیم حکمت سے اُمت کو یہ سکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی مختلف ادوار و حالات میں اسی طرح کی حکمتیں (سمجھ کی باتیں) کام میں لائے۔ قرآن کریم کی بیان کردہ حکمت تو (اس کے قوانین کی طرح) غیر متبدل ہوگی لیکن یہ حکمت (عقل و فراست پر مبنی فیصلے) تغیرِ حالات سے بدلتی رہیگی۔

حکومت۔ قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے، خواہ اسے ضابطہ

قوانین ، قوت فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (۳/۸)۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲/۱)۔ خدا کی یہ حکومت ، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (۱۱۵/۱)۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لاینفک ہے۔ اسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہہینگے جسے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا تھا۔ اس نظام کے مرکز کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت تھی کیونکہ وہ مرکز خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا۔ اپنے فیصلوں کی نہیں (۱۵/۳۸)۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ نظام علیٰ حالہ آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ہیں۔ (۳۳/۱۳) الدین ، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر سامنے آسکتا ہے۔ یہ انفرادی چیز نہیں۔ ”خدا کی حکومت“ سے یہی مراد ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔ جو ایسا نہیں کرتے ، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (۵/۳۳)۔ اس قسم کی حکومت ہر زمانے میں قائم ہو سکتی ہے۔

ح ل ف

الْحَلْفُ وَالْحَلِيفُ۔ دراصل اس قسم کو کہتے ہیں جسکے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان کیا جائے۔ اس کے بعد اس کا استعمال عام قَسَم کے لئے بھی ہونے لگا*۔ الْحَلِيفُ۔ معاہدہ جو لوگوں کے درمیان ہو۔ دوستی نیز دوست۔ الْحَلِيفُ۔ معاہدہ۔ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو۔ حَلَّافٌ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا** (۶۸/۱) حَلَفَ۔ يَحْلِفُ۔ قَسَمَ کھانا** (۴۳/۶)۔ دراصل اس کے بنیادی معنی لزوم کے ہیں۔ یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگے رہنا***۔ اس سے اس کا مفہوم پابندی کرنا ہو گیا۔

ح ل ق

حَلْقَةٌ۔ ہر گول گھیرے یا دائرہ کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ انسانوں کا ہو یا لوہے ، چاندی ، سونے وغیرہ کا۔ الْحَلْقَةُ۔ زرہ۔ ہتھیار۔ رمی۔ گول نشان جو اونٹ پر بنایا جاتا ہے**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں بال صاف کرنا ، سر کے بال مونڈنا بھی بتائے ہیں۔ اس سے فعل حَلَقَ يَحْلِقُ کے معنی بال مونڈنے کے ہو گئے**۔ راغب نے بھی حَلَقَ کے اصلی

معنی بال کاٹ دینے کے کئے ہیں ***۔ اَلْحَلَقُ - اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے *۔ اس کے اندرونی حصہ کو حَلَقُوم کہتے ہیں۔
قرآن کریم میں مُحَلِّقِیْن رُءُوفًا وَرَحِیْمًا (۲۸) آیا ہے۔ یعنی سر منڈانے والے۔ اور حَلَقُوم کا لفظ (۵۶) میں بمعنی حلق آیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ ”سیدنا ابراہیمؑ کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں میں کیس، اور ہندوؤں کے ہاں ”بودی“، (چوٹی) رکھنی۔ اہل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے ان کی پرورش کرتے تھے اور پھر ان کو حج کے ایام میں مقام منیٰ میں منڈوانے تھے۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا“ ***۔

ح ل ل

حَلَّ - کے اصلی معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔ وَاَحْلَلْ عَقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰)۔ ”میری زبان کی گرہ کھول دے“۔ اسی طرح جب کسی جمی ہوئی چیز کو پگھلا دیا جائے تو اسے بھی حَلَّ کہتے ہیں۔ یعنی اس کی گرہ کھل گئی۔ اور وہ حل ہو گئی۔ اس کے بعد حَلَّ اَلْمَكَانِ کے معنی ہو گئے کسی جگہ اترنا اور قیام کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ دراصل حَلَّ اَلْاَحْمَالِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں سامان کی رسیوں کی گرہ کھول کر اسے اونٹوں پر سے اتار لینا۔ حَالَّہ کسی کے ساتھ اترنا۔ قیام کرنا۔ اس سے حَلَّیْلَہ ہے جس کے معنی خاوند کے ہیں اور حَلَّیْلَتَہ کے معنی بیوی۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ (ایک ہی مکان میں) رہتے ہیں۔ یا ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں۔ قرآن کریم میں حَلَّائِلُ اَبْنَائِکُمْ آیا ہے (۳۳)۔ حَلَّائِلُ جمع ہے حَلَّیْلَتَہ کی۔ یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔ اَلْحَلَّاتَہ - محلہ - قوم کی منزل۔ اَلْحَلَّاتَہ - اتری ہوئی قوم۔ نیز محلہ۔ اَلْحَلَّاتَہ جوڑا (کپڑوں کا) جس میں عموماً قمیص، ازار، چادر یا عمامہ ہوتا ہے (یہ لفظ کنایۃ بیوی کے لئے بھی بولا جاتا ہے)۔ اَلْحَلَّ - حرم کے حدود سے باہر کی جگہ۔ اَلتَّحِلَّاتَہ - وہ چیز جس سے قسموں کا کفارہ ادا کیا جائے (اور اس طرح قسموں کی گرہ کشائی کر لی جائے) حَلَّ اَمْرُ اللہ عَلَیْہ - اس پر خدا کا امر واجب ہو گیا۔ عباب میں ہے کہ یَحِلُّ کے معنی واجب ہو جانے کے ہوتے ہیں اور یَحِلُّ کے معنی نازل ہونے (اترنے) کے *۔

الْحِلَالُ (وَالْحِلَالُ) حرام کی ضد ہے۔ یعنی جس پر رکاوٹ کی گرہ نہ ہو۔ کھلی ہوئی چیزیں، جنکی حدود بندی نہ کی گئی ہو۔ الْحِلَّیْلُ وَالْحِلَّیْلُ کے بھی یہی معنی ہیں*۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ (۵/۲۴)۔ یعنی شعائر اللہ کے احترام اور تعظیم کی جو گرہیں باندھی گئی ہیں انہیں مت کھولو۔ انکا احترام کرو۔

واجب ہونے کے معنوں میں (۲/۱۸۱) میں ہے فَيَحِلُّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي "تم پر میرا غضب واجب ہو جائیگا" حج میں جانوروں کے ذبح ہونے کے مقام کے متعلق ہے ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (۲۲/۳۳) "ان کے ذبح ہونے کا مقام کعبہ ہے"۔ سورۃ البلد میں ہے وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ (۹۰/۶)۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تو اس شہر میں مقیم ہے۔ لیکن اس میں حِلٌّ سے مراد حِلَالٌ بھی لی جاسکتی ہے (راغب) یعنی انہوں نے تیرے معاملہ میں اس بلد امین کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور یہاں بھی تجھے تکالیف بہم پہنچائی ہیں اور تیری جان تک کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مولانا محمود الحسنؒ نے اس کے معنی لکھے ہیں "اور تجھ پر قید نہیں رہیگی اس شہر کی"۔

جہاں تک حرام و حلال کا تعلق ہے، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جنہیں قرآن کریم میں حرام قرار دیدیا گیا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ ر۔ م) کھانے پینے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ ان پر ممانعت کی کوئی گرہ نہیں باندھی گئی۔ نہ ہی کسی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ (دیکھئے ۵/۸۷؛ ۶/۱۳۶؛ ۲۰/۱۱۹؛ ۱۰/۵۹؛ ۱۱۶/۱۱۶؛ ۲۲/۳۳) حَتَّىٰ رَسُلٌ كُوْبِهِ اسکا اختیار نہیں دیا گیا (۶۶/۱)۔ سورۃ اعراف میں رسول اللہؐ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۱۵۷/۱)۔ وہ طہات کو حلال اور خبائث کو لوگوں کے لئے حرام قرار دیگا۔ تو اس سے مراد وحی کے ذریعے ایسا کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے (۱۳۶/۶؛ ۵/۱)۔

لیکن قرآن کریم نے حِلَالاً کے ساتھ طَيِّباً بھی کہا ہے (۲/۱۶۸)۔ یعنی جتنی حلال چیزیں ہیں ان میں سے جو تمہیں مرغوب ہوں وہ کھاؤ۔ ناخوشگوار چیزیں یا مضر چیزیں مت کھاؤ۔ (حلال) کھانے کی چیزیں دیدہ زیب بھی ہوں۔

خوش ذائقہ بھی اور صحت کیلئے مفید بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے خوشگوار۔
اس میں ہر فرد کے اپنے ذوق اور پسند کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔ نیز اجتماعی
مصالح اور مفاد کی گنجائش بھی۔

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم
کی رو سے طہیات، حلال ہیں اور خبیثات حرام۔ اس کے معنی یہ
ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ سب فی ذاتہ طیب
ہیں۔ یعنی پاکیزہ۔ مفید۔ منفعت بخش۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر
حلال چیز کو بالضرور کھایا جائیگا۔ اگر کوئی چیز کسی کو نا پسند ہو، یا
مضرت رساں، تو اسے اجازت ہے کہ وہ شے نہ کھائے۔ لیکن اسے حرام نہ
سمجھے۔ اسی طرح اجتماعی مصالح کے پیش نظر، اسلامی معاشرہ، وقتی طور
پر بعض چیزوں کے استعمال کو ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ جیسے آجکل پاکستان
میں ہفتہ میں دو دن گوشت کھانا ممنوع قرار دیدیا گیا ہے کیونکہ ملک
میں جانوروں کی قلت ہے۔ ایسی پابندیاں عائد کرنے میں بھی کوئی حرج
نہیں۔ لیکن کسی حلال چیز کو حرام سمجھ لینا یا اسے حرام قرار دیدینا قطعاً
جائز نہیں۔ اسی طرح کسی حرام شے کو حلال قرار دیدینے کا حق کسی کو
حاصل نہیں۔

خدا کے نظام ربوبیت کے پیش نظر حلال و حرام کے معنی یہ بھی ہونگے
کہ عام اشیائے فطرت جنہیں اللہ نے نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا
ہے۔ یعنی رزق کے سرچشمے۔ انہیں کھلا (حلال) رہنے دو اور انہیں روک کر
لوگوں کو اس کے استفادہ سے محروم نہ کرو۔ یہ بھی خدا کے حلال کو حرام
کر دینا ہے۔ یہ قرآنی نظام معیشت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Free Goods) کو
(Economic Goods) میں تبدیل کرنا کبھی جائز نہیں قرار پاسکتا۔

(حرام و حلال کی مزید تفصیل کے لئے عنوان ح۔ ر۔ م بھی دیکھئے۔
اور عنوان ن۔ ع۔ م میں اَنْعَامٌ بھی۔ صَيِّدُ الْبَحْرِ کے حلال ہونے کے لئے
دیکھئے عنوان ب۔ ح۔ ر۔ آیت ۹۶)۔

مُحِلٌّ۔ وہ جو حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھے۔ غَيْرَ مُحِلٍّ۔
الصَّيِّدُ (۵۱) شکار کو حلال نہ قرار دینے والے۔ حِلٌّ۔ بمعنی حَلَالٌ (۵۵)۔
تَحِلَّتْ۔ قسم کا کفارہ۔ جس سے قسم کی پابندی سے رہائی مل جائے (۶۱)۔

ح ل م

الْحُلُمُ۔ الْحُلْمُ۔ خواب*۔ جمع أَحْلَامٌ (۱۲)۔ خواب میں جماع۔
اور چونکہ یہ کیفیت بالغ ہونے کی دلیل ہے اس لئے سن تمیز و بلوغت کو بھی

الْحَلِيمُ کہتے ہیں*۔ (۲۴/۵۹)۔ چونکہ سن تمیز کے ساتھ عقل و تمیز بھی آ جاتی ہے اس لئے الْحَلِيمُ متانت ، وقار و سکون ، عقل و تدبیر اور ضبط نفس کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ آم تَأْمُرُهُمْ أَحْلَا مَهُمْ بِهَذَا (۵۲/۳۲) کیا ان کا فہم و تدبیر ، ان کی متانت و سنجیدگی ، ان کی فرزانگی اور وقار انہیں اسی کا حکم دیتے ہیں۔ الْحَلِيمُ کے معنے ہیں طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھی انسان بھڑک نہ اٹھے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں جلدی نہ کرنا۔ یعنی ذرا سی بات پر جھٹ سے بھڑک نہ اٹھنا۔ چنانچہ تَحَلَّمَ الْمَالُ۔ اس وقت کہتے ہیں جب مویشی قربہ ہو جائیں۔ (اور ان میں قوت برداشت پیدا ہو جائے)۔ الْحَلِيمُ خدا کی صفت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ اسے نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکاتی ہیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوجھے پن پر اکساتا ہے۔ بلکہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک پیمانہ (قانون) مقرر کر رکھا ہے جس تک وہ چیز بہر حال پہنچ جاتی ہے*۔ (یعنی ہر عمل کا نتیجہ)۔ لہذا حَلِيمٌ کے معنے ہیں مسجھدار۔ ثقہ۔ بھاری بھرکم۔ پروقار۔ ہمیشہ اصول اور قانون کے مطابق کام کرنے والا۔ جو یونہی جذبات سے بھڑک نہ اٹھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے إِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوْاهٌ سُنِيْبٌ (۱۱/۱)۔ ”یقیناً ابراہیم بردبار، غمگسار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا“۔ اور حضرت اسمعیلؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے فَبَشِّرْهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ (۱۳۹/۱)۔ ”ہم نے ابراہیم کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی۔

ہمارے ہاں حَلِيم (حلیم الطبع) سے مراد انکسار۔ فروتنی۔ نرم مزاجی لی جاتی ہے۔ یہ ہمارے اپنے لغت کے معنے ہیں۔ محض فروتنی تو ضعف اور کمزوری کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہے لیکن حَلِيم قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کوئی بات بے سمجھی کی نہیں کرتا۔ جس میں مقابلہ کی قوت نہ ہو اس کا جھکنا شکست اور ذلت ہے۔ سرکشی کی قوت رکھتے ہوئے، قانون و ضوابط کے سامنے جھکنا، شرفِ انسانیت ہے۔

ح ل ی

الْحَلِيٌّ۔ زیور، سامانِ آرائش ، جو معدنیات ڈھال کر یا قیمتی پتھر وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے*۔ جمع حَلِيٌّ۔ مِّنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا (۱۳۸/۱) ”ان کے

زیورات سے بچھڑا (بنایا)۔ ”الْحِلْيَةُ“ آرائش کی چیز۔ تَسْتَخْرِجُونَ مِنْهُ حِلْيَةً (۱۶)۔ تم سمندر سے آرائش کی چیزیں (موتی وغیرہ) نکالتے ہو۔ حَلَّاهَا تَحْلِيَةً۔ اس نے عورت کو زیور پہنایا*۔ يَحْلَتُونَ فِيهَا... (۱۸)۔ ”انہیں وہاں آرائش و زیبائش کی چیزیں پہنائی جائیں گی“۔ اس کے بنیادی معنی ”تحسین و آرائش کے ہیں (ابن فارس)۔

ح م ا

الْحَمَاءُ وَالْحَمَامُ۔ سیاہ بدبودار کیچڑ۔ خراب بگڑی ہوئی مٹی۔ حَمِيءُ الْمَاءِ۔ پانی سیاہ بدبودار کیچڑ کے میلنے کی وجہ سے گدلا اور بدبودار ہوا ایسا پانی یا ایسے پانی والی جگہ حَمِيءٌ کہلائیگی، مسؤنث حَمِيَّةٌ*۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَءٍ مَّسْنُونٍ (۱۵)۔ سیاہ متغیر شدہ مٹی کے اوپر جو پیڑی سی جم جائے، تخلیق انسانی کی ابتدا خدا نے اس سے کی۔ اسی کو طِينٍ تَلَازِبٍ (۳۷) کہا گیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود پانی اور مٹی کے امتزاج سے ہوئی۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم نے بحر اسود کو عَيْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸) کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔

نوٹ: عنوان ح۔ م۔ ی کا آخری حصہ بھی دیکھئے۔

ح م د

حَمْدٌ۔ کسی نہایت حسین۔ متناسب۔ نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں تحسین و ستائش (Appreciation) کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام حمد ہے جس سے مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت و برتری کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں جنہیں صاحبِ محیط نے یوں بیان کیا ہے۔

(۱) جس حسن و رعنائی اور شاہکاری کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہئے (جیسے افعالِ محمودہ۔ مقامِ محمود۔ صفاتِ محمودہ وغیرہ)۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے

* تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اسکی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آ جائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ **يُحِبُّونَ أَنْ يُّحْمَدُوا*** **بِمَالِهِمْ يَفْعَلُوا** (۱۳۸)۔ ”وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں۔“

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی تعریف کی جا رہی ہے وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہئے (تاکہ اس کی انفرادی خودی کے زندہ و بیدار ہونے کا اندازہ کیا جاسکے)۔ اضطراری طور پر (خود بخود یونہی میکانیکی انداز سے) کسی فعل کا سرزد ہو جانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا۔ **حَتَّىٰ كُنَّ** وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اسکے لئے بھی حمد کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (**مَدَحَ الْجَمَالَ**) اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بنا رہی ہے تو وہ مشین قابل حمد نہیں۔ بلکہ قابل مدح ہوگی اور اسکا بنانے والا مستحق حمد۔ یہی صورت رقص طاؤس کی ہے۔ طاؤس مستحق مدح ہے اور اس کا خالق (خدا) سزاوار حمد۔

(۳) **حَمْدٌ** کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی حمد (ستائش) کی جا رہی ہے اسے ستائش کرنے والے کا دل بھی پسند کرتا ہو۔ کسی کے دباؤ سے اسکی تعریف کرنا حمد نہیں۔ مدح ہے۔ نہ ہی حمد میں ملمع کاری، نمائش، منافقت، یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ حمد میں جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آ جاتے ہیں۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جا رہی ہے اسکا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے نقوش، اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ حمد، فریب، تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اسکا سرچشمہ یقین، محکم اور ایمان مکمل ہوتا ہے۔ (مدح ظنی چیزوں کی بھی کی جا سکتی ہے مگر حمد نہیں)۔

(۵) جن نفع بخش، کشش انگیز باتوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمال کے درجہ تک پہنچ

* ہو سکتا ہے کہ یہاں حمد مجازاً بمعنی مدح استعمال ہوگا۔

چکے ہوں اور انکی نفع بخشیاں محسوس* ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو آرٹ انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔ (جیب کترے کی ہاتھ کی صفائی وجہ حمد نہیں ہو سکتی)

ان شرائط کے ساتھ جذباتِ تحسین و ستائش کے اظہار کا نام حمد^۵ ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو اس کے لئے حمد^۵ نہیں بلکہ مدح^۶ کا لفظ بولا جائیگا۔ (قرآن کریم میں خدائی شاہکاروں کیلئے ہر جگہ حمد^۵ کا لفظ آیا ہے۔ مدح^۶ کا لفظ ایک جگہ بھی نہیں آیا)۔
(واضح رہے کہ ثناء کا لفظ مدح اور ذم دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے)**

لہذا جہاں قرآن کریم میں ہے کہہ "وَيُسَبِّحُ" الشَّعَدُ بِحَمْدِهِ (۱۳۱/۱۳۲)۔ "گرج، اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے ***"۔ "یا وَلَہُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۸/۱۸)" کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں حمد اسی کے لئے ہے۔ "یاوَاٰنِ رَمٰنُ شَیْءٌ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (۱۴۰/۱۴۱)" کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائناتی قوتیں، اس قسم کے تعمیری اور منفعت بخش نتائج پیدا کرنے میں مصروف عمل ہیں جو خدا کی حمد و تحسین کے زندہ پیکر ہیں۔ حتّٰی کہ اس مقصد کیلئے جب تخریبی قوتوں کو راستہ سے ہٹایا جاتا ہے تو یہ کام بجائے خویش وجہ ستائش ہوتا ہے۔ چنانچہ ظالم قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں کہا۔ فَقَطَّعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۵۱/۱۵۲)۔ "ظلم کرنے والی قوموں کی جڑ کٹ گئی۔ اور اللہ رب العالمین کے لئے حمد ہے۔" اسی لئے خدا کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ عَزِیْزٌ بھی ہے اور حَمِیدٌ بھی (۱۴۱/۱۴۲)۔ یعنی اپنے غلبہ و اقتدار سے تخریبی قوتوں کو راستے سے ہٹا کر، تعمیری پروگرام کو اس طرح کامیاب بنانے والا کہ اس کے منفعت بخش نتائج خدا کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر بن جائیں۔ دوسری جگہ ہے وَلَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ (۱۴۱/۱۴۲)۔ ہر طرح کا اقتدار و ستائش اس کے لئے ہے۔ جلال و جمال کا سرچشمہ وہی ہے۔ مومنین کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ حَامِدٌ وَنَ (۱۱۲/۱۱۳) حمد کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسان کو علم الاسماء، یعنی اشیائے کائنات کا علم۔ (علم الفطرت) دیا گیا ہے (۲۱/۲۲) کیونکہ

* (محیط) ** (المنار)۔ *** تسبیح کے معنی ہیں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل رہنا۔ دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح۔

جب ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے کہا کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (۳۰)۔ ”ہم تیری حمد و ستائش کی نمود کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں“ تو اس کے جواب میں یہی کہا گیا کہ وَعَلَيْكُمْ أَدَمُ الْأَسْمَاءُ كَلَّمَهَا (۳۱) آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا گیا۔ لیکن اس کا یہ علم اُسی صورت میں کائنات کو وجہ ستائش خداوندی بنا سکتا ہے جب وہ اپنے علم کے ماحصل کو وحی کے تابع رکھے۔ اس لئے اس سے کہہ دیا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۳۸) جو قوم خدا کی راہنمائی کے پیچھے چلے گی وہی خوف و حزن سے محفوظ رہے گی۔ یہ وہ مقاماً مَحْمُودٌ ا ہے۔ (۱۹)۔ ایسی پوزیشن جو سراپا وجہ حمد و ستائش ہو جس پر نبی اکرمؐ فائز ہوئے۔ وہ خود اَحْمَدُ (۶۱) (بہت زیادہ حمد و ستائش کرنے والے) تھے۔ اس لئے (جیسا آپ کا دوسرا نام تھا ویسے ہی عملاً) مُحَمَّدٌ (۳۸) ہو گئے۔ یعنی وہ جو مسلسل و پیہم وجہ حمد و ستائش ہو* (جسکی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے) رسول اللہؐ کا نام اَحْمَدُ بھی تھا اور مُحَمَّدٌ بھی۔ اِسْمُهُ اَحْمَدُ (۶۱)۔ اور مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ (۳۸)۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ مُحَمَّدٌ (مُفْعَلٌ) کے معنی ہیں وہ جس کی یکے بعد دیگرے حمد کی جائے اور مُحَمَّدٌ وہ ہے جس کی ایک بار حمد کی جائے۔ اقرب الموارد میں مُحَمَّدٌ کے معنی ہیں الذی کثرت خصاله المحمودۃ۔ جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو۔

حمد کے جو معانی اوپر دیئے گئے ہیں ان کی روشنی میں قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت (الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ - ۱) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چار لفظوں سے قرآن کریم نے کس طرح اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ اور منفعت بخش پہلو خدا کے اس عالمگیر قانون ربوبیت کے وجہ حمد و ستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے جو ہر شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج اوج کمال تک لے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حمدیت محض ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ جذبہ تحسین ہے جس کا اظہار نظام کائنات پر غور و فکر سے بیساختہ ہو جاتا ہے۔ جو قوم نظام کائنات پر غور نہیں کرتی وہ اس کے خالق کے کمال کو کس طرح (Appreciate) کر سکتی ہے؟ نیز جو اس کے نظام ربوبیت کو عملاً متشکل نہیں کرتی وہ کیسے سمجھ سکتی ہے کہ اس کے نتائج کس درجہ مستحق حمد و ستائش

* تاج۔ ** بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاعلی معنی نہیں بلکہ مفعولی معنی ہی ہیں۔ یعنی جو سب سے زیادہ مستحق ستائش ہو۔

ہیں۔ ”خدا کی حمد کرنا“ ایک عملی پروگرام ہے۔ یعنی نظام خداوندی کو عملاً متشکل کر کے ایسے مجیر العقول اور درخشنده نتائج پیدا کرنا جنہیں دیکھ کر دنیا کی ہر قوم ہکا بکا اٹھے کہ جس خدا نے ایسے قوانین عطا کئے ہیں وہ واقعی مستحق حمد و ستائش ہے۔

ح م ر

أَلَا حُمْرٌ - سرخ - اسکی جمع حُمُرٌ ہے *۔

جُدَدٌ بَيْضٌ وَ حُمْرٌ (۳۵/۳) - سفید اور سرخ رنگ کی تہیں یا دھاریاں۔

الْحِمَارُ - گدھا - (۲۹/۲) - اس کی جمع حُمُرٌ ہے - سورۃ مدثر میں ہے حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۵۰/۴) - گھبرا کر بدکنے والے گدھے۔

ح م ل

حَمَلَ - يَحْمِلُ - حَمْلًا - بار اٹھانا - اپنے اوپر لادنا - اِحْتَمَلَ - اٹھانا - اَلْحَمْلَةُ - جنگ میں پلٹ کر ہلہ بول دینا * - حَمَلٌ - کسی پر لادنا، بار اٹھوانا، کسی کے ذمہ کوئی کام لگا دینا - مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ (۱۲/۶) جن لوگوں پر احکام تورات کی بجائوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی - اِحْتَمَلَ - اپنے اوپر بار لینا - (۱۱۲/۲) - حَمُولَةٌ - بار برداری کا جانور * - حَمُولَةٌ وَ فَرَشًا (۱۳۱/۶) - حَمَالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱/۱) - چغلخور * - لگائی بجھائی کرنے والی - مخالفت کے سامان جمع کرنے والی - حَمَلَ - کسی کو اپنی جگہ سے اٹھا دینا ** - یعنی تباہ و برباد کر دینا - وَ حُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ (۶۹/۱۳) - ”اور ارض و جبال تباہ کر دئے جائینگے“۔

حَمَلَ الْأَمَانَةَ - امانت میں خیانت کرنا *** - سورۃ احزاب میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳/۷) - ”ہم نے امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا - اور اس (خیانت) سے ڈر گئے - لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے۔

* تاج - ** محیط - *** تاج و محیط -

یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے۔“ یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی۔ تمام اشیائے کائنات اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہیں۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اس میں خیانت کرتا ہے۔ اسکی اطاعت نہیں کرتا۔ یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے۔

سورة عنكبوت میں ہے وَكَابِیِّنٌ مِّنْ دَابَّةٍ ۚ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا (۲۹)۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ یہاں حمل رزق کے معنی ذخیرہ اندوزی کرنے کے ہیں*۔ قرآن کریم نے یہاں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ رزق کو سمیٹ کر رکھنے کا جذبہ انسان ہی میں ہے۔ حیوانات میں نہیں (یہ جو ہم چیونٹیوں، چوہوں وغیرہ کو ذخیرہ اندوزی کرتے دیکھتے ہیں تو تحقیقات نے بتایا ہے کہ یہ محض عادتاً ایسا کرتے ہیں۔ کسی مقصد کے ماتحت نہیں۔) علاوہ ازیں ان کا جمع کردہ ذخیرہ ان کی قوم کے تمام افراد کے کام آتا ہے۔ وہ گراں فروشی یا نفع اندوزی کے لئے ایسا نہیں کرتے۔ جب ایک گائے اپنا پیٹ بھر لیتی ہے تو باقی ماندہ چارے کو سنبھال کر شام کے لئے نہیں رکھ لیتی۔ یہ انسان ہی کرتا ہے۔ اور مقصد اس سے گراں فروشی اور نفع اندوزی ہوتا ہے۔ اس کی یہی ہوس ہے جو تقسیم رزق میں اس قدر فساد کا موجب بنی ہوئی ہے۔ جس کے پاس قوت ہوتی ہے وہ سب کچھ سمیٹ کر ذخیرہ کر لیتا ہے اور کمزور اور غریب بھوکے مرتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاکُمْ (۲۹)۔ اللہ ان حیوانات کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ حیوان صرف ضروریات پورا کرتے ہیں اور تم ذخیرہ اندوزی شروع کر دیتے ہو۔ یہ روش فسادِ آدمیت کا موجب ہے۔ (تفصیل میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی۔)

سورة اعراف کی ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ اپنے جذبات کا اتباع کرنے والوں کی مثال كَمَثَلِ الْكُذِّبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۱۷) ہے۔ حَمَلَ عَلٰی کے معنی کسی کو چلا کر تھکا دینے کے ہیں*۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ اگر تو اسے چلا چلا کر (دوڑا دوڑا کر) تھکا مارے تب بھی وہ ہانپتا رہے اور اگر اسے ویسے ہی چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا رہے۔ اسے کسی شکل میں بھی سکون اور اطمینان نہیں ملتا۔ یا پھر یہ حَمَلَتْهُ عَلٰی الْاُمُرِ

سے ہو سکتا ہے جسکے معنی ہیں اسے کسی کام پر اکسایا*۔ جیسے کتے کو شکار پر لپکایا جاتا ہے، یعنی تم خواہ کتے کو شکار پر لپکا کر دوڑاؤ یا اسے بیٹھا رہنے دو، وہ بہر حال ہانپتا ہی رہے گا۔ بیشتر اہل تفاسیر نے یہاں حَمَلَ عَلَيْهِ کے معنی حملہ کرنے، ٹوٹ پڑنے اور اس کو مار کر بھگانے اور دھتکارنے کے کئے ہیں۔

ح م م

حَمَّ التَّنُّورُ حَمًّا۔ اس نے تنور میں ایندھن ڈال کر اسے گرم کیا۔ حَمَّ الشَّجْمَةِ۔ اس نے چربی کو پگھلایا۔ حَمَّ الْمَاءُ حَمًّا۔ اس نے پانی گرم کیا۔ الْحَمَامُ۔ اونٹوں یا تمام جانوروں کا بخار۔ حَمَّ فِكْرٌ۔ غم۔ اِحْتَمَّ لَهُ۔ وہ اس کے لئے فکر مند ہوا***۔ اِحْتَمَّ الرَّجُلُ۔ آدمی فکر کی وجہ سے سو نہیں سکا۔ اِحْتَمَّتِ الْعَيْنُ۔ بغیر کسی درد کے آنکھ نہیں لگ سکی یعنی نیند نہ آئی***۔ اهل جہنم کے متعلق ہے لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۰)۔ وہ پینے کی چیز جو راحت جان ہونے کے بجائے سخت اذیت کا موجب بن جائے۔ یعنی عذاب الیم۔ لطائف اللغة میں ہے کہ اس کے معنی گرم پانی اور سرد پانی دونوں کے ہیں۔ سورة واقعة میں ہے وَظِلٌّ مِّنْ يَّتَحُمُّونَ (۵۶)۔ اس کے معنی ہیں گرم سیاہ دھوئیں کا سایہ۔

الْحَمِيمُ۔ قریبی رشتہ دار جس کی خاطر فکر مند رہا جائے، یا جس کے دل میں تمہاری محبت ہو اور تمہارے دل میں اسکی محبت ہو، یا وہ جو اپنے متعلقین کی حمایت کا جوش دل میں رکھتا ہو۔ اور ان کے لئے گرمجوشی اور تپاک کا اظہار کرتا ہو*۔ قرآن کریم نے اسے دلسوز دوست اور غمخوار رفیق کے معنوں میں استعمال کیا ہے (۱۰)۔ نیز حَمَّ الْأَمْرُ کے معنی ہیں اس امر کا فیصلہ ہو گیا۔ حَمَّ حَمًّا۔ حَمَّہُ۔ اس نے اس کا ارادہ کیا۔ حَمَّ اللَّهُ كَذَا وَآحَمَّہُ۔ خدا نے اس کے لئے ایسا فیصلہ کر دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں گرم ہونا اور ارادہ کرنا شامل ہیں۔

ح م ی

حَمَى الشَّيْءَ۔ چیز کی حفاظت کی۔ كَلَّ حَمِيًّا۔ حفاظت کی ہوئی گھاس۔ الْحَمِيُّ۔ وہ بیمار جسے نقصان دہ چیزوں سے روک دیا گیا ہو۔ لہذا الْحَمِيَّةُ۔ وہ ہے جو کسی کی حفاظت کرے یا اسے نقصان دہ امور سے روکے*۔ حمایت میں یہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔

* تاج و محیط۔ ** حَمَّ در اصل حَمَّ سے اور اِحْتَمَّ لَہُ اِحْتَمَّ لَہُ سے بدل کر آئے ہیں۔ *** تاج و محیط و راغب۔

حَمَام۔ ایام جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ نر اونٹ جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ہو اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ (جیسے ہندؤں میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) اس سے بار برداری کا کام نہیں لیتے تھے۔ اور وہ سانڈوں کی طرح آزاد پھرتا تھا جہاں جی چاہے جائے اور جہاں سے جی چاہے کھائے پیئے۔ اس میں ایک قسم کا توہم پرستانہ تقدس آجاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس سے روکا ہے (۱۰۳)۔

حَمِيَّتِ الشَّمْسُ وَالنَّارُ تَحْمِي۔ سورج اور آگ کی گرمی سخت ہو گئی۔ قرآن کریم میں ہے نَارٌ حَامِيَّةٌ (۱۰۱) سخت گرم آگ۔ ویسے حَمِيَّتٌ عَلَى فُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں میں فلاں پر غصہ ہوا۔ **۔ الْحَمِيَّةُ۔ جوش یا شدت غضب کو کہتے ہیں *۔ حَمِيَّ الْمِسْمَارِ۔ میخ گرم ہو گئی *۔ قرآن کریم میں سرمایہ پرستوں کی دولت کے متعلق ہے يَوْمَ يُّحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارٍ جَهَنَّمَ (۹۵)۔ ”جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا“۔ اسی (گرمی) سے الْحَمِيَّةُ ہے جسکے معنی غیرت اور ضد کے ہیں *۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کو عزیز رکھتا ہے اس کی حفاظت کے لئے وہ گرمجوشی دکھائے۔ اگر وہ شر فی الواقعہ اچھی ہے تو یہ جذبہ قابل ستائش قرار پائیگا۔ اور اگر وہ شر مذموم ہے تو یہ جذبہ بھی مذمت کے قابل ہو جائیگا۔ زمانہ قبل از اسلام میں عرب اپنے معاشرہ کے رسوم و رواج کے تحفظ میں بڑی گرمجوشی دکھاتے تھے۔ چونکہ ان رسوم و رواج میں بیشتر مذموم تھے اس لئے قرآن کریم نے اُس جذبہ کو حَمِيَّةُ الْجَاهِلِيَّةِ (۲۹) کہہ کر پکارا ہے۔

اِحْمَوْمَى الشَّيْءُ۔ چیز سیاہ ہو گئی۔ جیسے رات اور بادل *۔

ح ن ث

الْحَيْنُثُ۔ گناہ، معصیت، نافرمانی ***۔ (خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنا)۔ سورۃ واقعہ میں ہے وَكَانُوا يَصْبِرُونَ عَلَى الْحَيْنُثِ الْعَظِيمِ (۵۶) ”یہ لوگ بڑے بڑے سخت جرائم پر مصر رہا کرتے تھے۔“ الْحَيْنُثُ۔ عمدہ آجھوٹی قسم کھانے یا قسم کھا کر اسے پورا نہ کرنے کو بھی کہتے ہیں ***۔ نیز حق سے باطل کی طرف رجوع کرنے کو بھی **** حَنِثَ فُلَانٌ فِي كَذَا۔ اس نے کسی بارے میں گناہ اور کوتاہی کی، اسی سے جب بچہ جوان ہو جائے یعنی اس میں گناہ کرنے کی قوت آجائے تو کہتے بَلَغَ الْغُلَامُ الْحَيْنُثُ

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و راغب۔ **** اقرب الموارد۔

یہ اس لئے کہ سن شعور کے بعد بچہ اپنے اچھے اور برے کاموں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس سے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے تو وہ مجرم گردانا جاتا ہے۔ (ابن فارس)۔ اور تَحَنُّث کے معنی گناہوں سے باز رکھنے کے ہیں*۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت ایوبؑ میں ہے وَلَا تَحْنُثُ (۳۸/۳۳) (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہو کر) حق سے باطل کی طرف مسائل نہ ہو۔ (اس کے لئے عنوان ض غ ث۔ بھی دیکھئے)

ح ن ج ر

الْحَنْجَرَةُ - حلق۔ *** سانس کی نالی** جمع حَنَاجِرُ (۳۳/۱۰)۔ حَنْجَرَةٌ اس نے اسے ذبح کر دیا***۔

ح ن ذ

الْحَنْذُ - گرم پتھروں کے درمیان گوشت بھون کر کباب بنا لینا*۔ حَنْيُذٌ - اس گرم گرم گوشت کو کہتے ہیں جس سے، بٹھننے کے بعد ابھی پانی ٹپک رہا ہو***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پکا دینا۔

سورة هود میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے مہمانوں کے لئے عِجْلٌ حَنْيُذٌ (۱۱/۱۹) لیکر آگئے۔ یعنی بٹھنا ہوا بچھڑا (مسلم)۔

ح ن ف

الْحَنْفُ - پاؤں کا ٹیڑھا اور مڑا ہوا ہونا۔ رَجُلٌ حَنْفَاءٌ - مڑا ہوا پاؤں۔ اسی سے حَنْيُفٌ اسے کہتے ہیں جو غلط راستے سے ہٹ کر (مڑ کر) سیدھی راہ پر آجائے۔ راغب نے کہا ہے کہ حَنْفٌ، گمراہی سے ہٹ کر استقامت (صراط مستقیم) کی طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں****۔ اس میں یکسو ہونے کا مفہوم غالب ہے۔ تفسیر المنار میں ہے کہ حَنْيُفٌ لغت میں مسائل کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ پر اس لفظ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگ طریقہ کفر کی پیروی کرتے تھے۔ انہوں نے ان سب کی مخالفت کی اور ان کے طریقہ سے ہٹ کر دین مستقیم اختیار کر لیا*****۔

* تاج و راغب - ** محیط - *** تاج - **** تاج و محیط و راغب - ***** المنار

قرآن کریم میں رَجُسٌ اور قَوْلُ الزَّوْرِ کے اجتناب کے بعد کہا ہے حَنْفَاءَ لِلَّهِ (۳۰-۳۱)۔ اس سے حَنِيفٌ کا صحیح مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی قانون و روش زندگی سے منہ موڑ کر خدا کے قوانین کی طرف آ جانے والا۔ غَيْرَ مُشْرِ كَيْنَ بِهِ (۳۱) اور ان قوانین کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو نہ شامل کرنے والا۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنی پہلے ہر غیر خدائی طاقت سے منہ موڑا جائے (يَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ) اور اس کے بعد اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے (يُؤْمِنُ بِاللَّهِ) (۳۶)۔

یہی مطلب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا ہے۔ ”یعنی کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں بجز اللہ کے“۔ لہذا ہر مومن حَنِيفٌ ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ کی روش تھی جنہیں قرآن کریم نے حَنِيفٌ کہہ کر پکارا ہے (۳۵)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے والا۔

ح ن ک

الْحَنَكُ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ منہ کے اندرونی حصہ (تالو) کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسروں نے کہا ہے کہ یہ منہ کے نچلے حصے، یعنی ٹھوڑی کے نچلے حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کہتے ہیں تَحَنَكَ فُلَانٌ۔ وہ اپنی پگڑی کا بل ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اوپر لے گیا۔ الْحِنَاكُ۔ وہ بندھن جس سے قیدی کو اس طرح باندھا جاتا تھا کہ اگر وہ اسے ذرا بھی کھینچے تو اسکی ٹھوڑی کے نچلے حصہ میں تکلیف محسوس ہو۔**

جانور (گھوڑے گدھے وغیرہ) کے منہ میں ایک تو لگام دی جاتی ہے اور جب لگام نہ ملے تو ایک رسی لے کر اسے نچلے جبڑے میں دے کر ٹھوڑی کے نیچے بل دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے پکڑ کر لے چلتے ہیں۔ اسے احْتِنَاكُ کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں لَمْ أَجِدْ لِحِمَامًا فَاحْتَنَكْتُ دَابَّتِي۔ مجھے لگام نہیں ملی تو میں نے اپنی سواری کے منہ میں رسی ڈال دی اور اس طرح اسے لے چلا۔ اسی سے اس کے معنی کسی پر غالب آ جانے کے آتے ہیں۔ احْتَنَكَ الْجَرَادُ الْأَرْضَ۔ ٹڈیاں زمین پر چھا گئیں اور جو کچھ پیداوار تھی اسے صفا چٹ کر دیا۔ اسْتَحَنَكَ الْعِضَاهُ۔ جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی۔**

قرآن کریم میں ہے کہ ابلیس نے یہ چیلنج دیا کہ لَا احْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ (۱۴) میں بالضرور ابن آدم کی ٹھوڑی میں رسی باندھوں گا اور

اس طرح اسے جدھر جی چاہے لٹے لٹے پھرونگا۔ اس میں نہ صرف یہی ہے کہ ابلیس اسے جدھر جی چاہے لٹے لٹے پھرتا ہے بلکہ اَحْتِنَاک^۳ میں جو ذلت کا پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہے۔ انفرادی مفاد پرستیاں جس طرح انسان کو اپنی گرفت میں لے کر ذلیل و خوار کرتی ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ جس طرح کتے کے پاؤں اُسکی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، اسی طرح انسان اپنے جذبات کے پیچھے لگا پھرتا ہے اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اگر اُسکی بجائے وہ انہی جذبات کو وحی کی روشنی میں چلائے تو کونین کی سرفرازیوں اس کے حصہ میں آجائیں۔

جو کچھ انفرادی جذبات پرستیاں ایک فرد کے ساتھ کرتی ہیں، وہی کچھ طاقتور قومیں کمزور قوموں کے ساتھ کرتی ہیں۔ یعنی ان کے جبرے میں رسی ڈال کر انہیں جدھر جی چاہے لٹے لٹے پھرتی ہیں۔ یہ بھی ابلیسی قوتیں ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت (۱۶۴) کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم نے ان طاقتور قوموں کے اُن حربوں کا کس طرح ذکر کیا ہے جنہیں وہ کمزور قوموں کو پھانسنے کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ (اسکی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں ملیگی)

ح ن ن

اَلْحَنِیْنُ^۴۔ کسی چیز کی طرف مشتاقانہ کہنچنا۔ شدت سے رونا یا خوش ہونا۔ بے تابانہ اشتیاق کی آواز خواہ غم سے ہو یا خوشی سے۔ صاحب مصباح نے لکھا ہے کہ حَنِیْنُ کا لفظ صرف ماں کی مامتا کیلئے بولا جاتا ہے۔ اَلْحَانَنَۃُ^۵۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور اپنے بچے کیلئے بیحد مضطرب و مشتاق ہو رہی ہو۔ اَلْحَنَانِۃُ^۶۔ وہ عورت جسے اس کے شوہر نے چھوڑ دیا ہو اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے غم میں بیحد اداس اور پریشان رہتی ہو*۔

قرآن کریم میں حضرت یحییٰ^۷ کے متعلق ہے کہ اَتَّیْنٰہُ^۸..... حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا^۹ (۱۳۱-۱۳۲)۔ ہم نے اُسے اپنے ہاں سے رقت قلب۔ سوز و گداز۔ ماں کی سی محبت رکھنے والا دل عطا کیا۔ اسی اعتبار سے ہمارے ہاں خدا کے اسماء میں ایک نام اَلْحَنَنَانُ^{۱۰} بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ عیسائیت کے خدا کے تصور (رقت و سوز و گداز) کی جھلک پائی جاتی ہے۔

حُنَيْنٌ (۲۵) مکہ کے قریب ایک وادی ہے جہاں نبی اکرمؐ کی مخالفین سے جنگ ہوئی تھی۔

ح و ب

حُوبٌ - حَابٌ - یہ لفظ اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے *۔
 الْحَوْبَةُ - حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکاب جرم پر آمادہ کر دے **۔ اس کے بعد گناہ کیلئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ نیز اس کے معنی ہلاکت - غم و فکر - اور درد مند ہونا بھی ہیں *۔
 جو گناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گناہ - حاجت یا مسکنت کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یتیم کا مال کھا جانے کو حُوبًا کَبِيرًا کہا گیا ہے (۴) - یعنی جرم عظیم - بڑی حق تلفی - حُوبٌ کے معنی گناہ، وحشت، تباہی بربادی، آفت اور بیماری بھی ہیں ***۔

ح و ت

الْحَوْتُ - مچھلی، لیکن بیشتر بڑی مچھلی کے لئے بولا جاتا ہے۔
 جمع أَحْوَاتٌ وَ حَيَّاتَانِ * - حَاوَاتٍ - اس نے اسے ایسا دھوکا دیا جیسے مچھلی دھوکا دیتی ہے **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تڑپنے اور چلتے وقت رخ بدلنے کے ہوتے ہیں۔ مچھلی کو اسی اعتبار سے حَوْتُ کہتے ہیں۔ حَاتٌ عَلَيَّ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر لگانا ****۔
 قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے فَالْتَقَمَهُ الْحَوْتُ (۳۷)۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں ”سو بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا“۔
 سورة اعراف میں حَيَّاتَانِھُمْ (۱۶۳) آیا ہے۔ یعنی ان کی مچھلیاں۔

ح و ج

الْحَاجَةُ - الْحَائِجَةُ - ضرورت - اصل میں اس کے معنی ہوتے ہیں اپنے مطلوب و مقصود تک عدم رسائی - جس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش ہو اس تک نہ پہنچ سکتا - پھر اس کا استعمال عام احتیاج (ضرورت مندی) کے لئے ہونے لگا *۔ الْحَاجَةُ دراصل کانٹے کو کہتے ہیں۔ لہذا الْحَاجَةُ اس ضرورت کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ جائے اور

اٹک جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کے (حصول) کے لئے مضطرب اور مجبور ہو جانا۔

سورۃ یوسف میں ہے اِلَّا حَاجَةًۭ فِیْ نَفْسٍ یَّعْقُوبَ (۱۲/۱۸)۔ یہ محض یعقوب کے دل میں ایک خلش تھی (جو اس نے پوری کر لی)۔ سورۃ مؤمن میں یہ لفظ مطلوب (جس چیز کی طلب ہو) کیلئے آیا ہے۔ حَاجَةًۭ فِیْ صُدُورِکُمْ (۲۰/۸) تمہارا دلی مطلوب و مقصود۔

ح و ذ

الْحَوْذُ۔ کسی چیز کو گھیرے میں لے لینا* نیز اس کے معنی جانور کو سختی اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے بھی ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، پھرتی۔ تیزی۔ کسی معاملہ میں چستی کرنا۔ اِسْتَحْوَذَ عَلٰی كَذَا۔ کسی چیز پر تسلط جمالیا، مستولی ہو گیا۔ حَاذُوا الْمَتْنِ۔ اس لکیر کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پشت پر دُم سے گردن تک بنتی جاتی ہے۔ (یعنی ریڑھ کی ہڈی کی لکیر) یا پشت پر نمدہ رکھنے کی جگہ یا دُم کے قریب کولھے کا وہ مقام جس پر اسکی دم اکثر پڑتی رہتی ہے۔ ایسے دونوں کنارے حَاذَاۤنِ کہلائیے گئے*۔ اسی لئے الْحَوْذُ کے معنی ہیں ہانکنے والے کا جانور کے پیچھے اس طرح چلنا کہ وہ اسکی دونوں ٹانگوں کے عین پیچ میں رہے اور وہاں سے سختی سے اسے ہانکے جائے***۔ اس نقشہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطلب سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْہِمْ الشَّیْطٰنُ (۵۸/۱۹)۔ یعنی مفاد پرستیوں کے سرکش جذبات ان پر غالب آ گئے اور انہیں نہایت سختی سے ہانکتے رہے اور وہ انہی کے ڈنڈے سے عمر بھر چلتے رہے۔ یا کمزور قوم جو بالادست اقوام کے ڈنڈے سے ہانکی جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ح۔ ن۔ ک)۔

سورۃ نساء میں ہے قَالُوۡا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْکُمْۡ عَلَیْکُمْۡ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیۡنَ... (۴/۱۳)۔ اس میں نَمْنَعْکُمْ کے معنی ہیں تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کی۔ اور نَسْتَحْوِذْکُمْ کے معنی ہیں ہم تم پر غالب تھے۔ یعنی جب تم حملہ کرنے کے لئے آئے تو ہم ہی نے تمہیں اسکی جرأت دلائی اور تمہیں اُن کے خلاف چڑھا لائے۔ یعنی ہم نے جماعت مومنین سے تمہاری حفاظت بھی کی اور یہ بھی ہماری جرأت افزائی کا نتیجہ تھا کہ تم ان کے خلاف آگے بڑھے۔

ح و ر

حَار - يَحْجُورٌ - حَوْرًا - لوٹنا - واپس ہونا - ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا - نیز زیادتی کے بعد پھر سے کم ہو جانا (۸۳/۱۳) ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا رنگ - (۲) پلٹنا (۳) گھومنا لکھے ہیں - اَلْمَحَاوِرَةُ وَالْتَحَاوِرُ - ایک دوسرے کو لوٹا کر جواب دینا - تبادلہ گفتگو (جس میں بات لوٹائی جاتی ہے) (۱۸/۳۳ و ۵۸/۱) - اَلْمَحْجُورُ - وہ لکڑی یا لوہا جسکے گرد کوئی چیز گردش کرتی ہے - اَلْحَوْرُ کے معنی تحیر اور حیرت کے بھی آتے ہیں - (دیکھئے عنوان ح - ی - ر) - اَلْحَوْرُ - ایک لکڑی ہوتی ہے جسے اس کی سفیدی کی وجہ سے بَيْضَاءُ بھی کہتے ہیں - صاغانی نے تصریح کی ہے کہ اس لفظ (حَوْرٌ) کی بنیاد سفید ہونے پر ہے - یعنی اس کے مادہ میں سفید ہونے کا مفہوم ہے - اس لئے اَلْحَوَارِیَّاتُ شہر کی عورتوں کو کہتے ہیں جن کا رنگ بھی سفید ہوتا ہے اور وہ ویسے بھی اجلی رہتی ہیں - اَلْحَوَّارِیُّ مِدے کو کہتے ہیں جو آئے کا لب لباب ہوتا ہے - نیز کھانے کی ہر اس چیز کو جسے صاف اور سفید کر لیا گیا ہو* - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اَلْحَوَّارِیُّوْنَ (۶۱/۱۳) - کہتے تھے بعض کا خیال ہے کہ وہ چونکہ دھوبی تھے اس لئے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - دوسروں کا خیال ہے کہ ان کی اپنی صفائی کی وجہ سے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - اکثریت اس طرف گئی ہے کہ ان کی نیت کی صفائی اور عمل کے خلوص کی بنا پر انہیں ایسا کہا گیا ہے - شمر کا قول ہے کہ اَلْحَوَّارِیُّ خیر خواہ کو کہتے ہیں** - بہر حال ، یہ لفظ ان کی پاکیزگی خیال - خلوص عمل اور حسن رفاقت ، سب کا آئینہ دار ہے - صاحب المنار کا خیال ہے کہ حَوَّارِیُّ مِدے کو کہتے ہیں جو آئے کا خلاصہ ہوتا ہے - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اس لئے حَوَّارِیُّوْنَ کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ قوم کے منتخب اور مخصوص افراد تھے*** -

حَوْرٌ - یہ لفظ جمع ہے - اس کا واحد أَحْوَرٌ بھی ہے ، جو مذکر ہے اور حَوْرَاءُ بھی ، جو مؤنث ہے - اَلْحَوْرُ کے معنی ہوتے ہیں آنکھ کی سفیدی کا بہت سفید اور سیاہی کا بہت سیاہ ہونا اور جلد کا رنگ صاف ہونا - یا آنکھ کی سیاہی کا اتنا زیادہ ہونا کہ آنکھ اس سے بھری ہوئی معلوم ہو - ایسے مرد اور عورتیں جن میں یہ خصوصیات پائی جائیں - حَوْرٌ کہلائیں گے -

قرآن کریم میں متقیوں کے متعلق ہے وَ زَوْجُهُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ (۵۳ و ۵۴)۔ جس طرح حُورٌ مذکور اور مسونث دونوں کے لئے آتا ہے اسی طرح عِیْنٌ بھی، اَعِیْنٌ (مذکر) اور عِیْنَاءُ (مونث) دونوں کی جمع ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَوْجُهُمْ بِحُورٍ عِیْنٍ کے معنی ہم نشین بنانا ہیں۔ (دیکھئے عنوان ز۔ و۔ ج)۔ اسلئے ان الفاظ کے معنی صرف میاں بیوی بننے کے نہیں بلکہ ہم نشین اور باہمہد گر رفقاء بننے کے بھی ہیں*۔ میاں بیوی بھی باہمی رفاقت کی وجہ سے ایک دوسرے کے زَوْجٌ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں، جنتی معاشرہ کی پاکیزہ صفات عورتوں کو بھی حُورٌ کہا گیا ہے۔ (۵۵ و ۵۶)۔ نیز لین نے (متعدد اسناد کی تائید سے) لکھا ہے کہ أَحْصُورٌ۔ جسکی جمع حُورٌ ہے۔ کے معنی پاکیزہ عقل (Pure or clean Intellect) کے ہیں۔ یعنی چالاک اور مسکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل۔ چنانچہ مَایَعِیْشٌ بِأَحْصُورٍ اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو معاملات کا صاف نہ ہو۔ جو پاکیزہ عقل کے مطابق زندگی بسر نہ کرے۔ لہذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُورٌ عِیْنٌ) خواہ وہ عام ہمنشین ہوں یا بیویاں۔ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے کام میں نہیں لائی جائیگی۔ وہ عقل ادب خوردہ دل ہوگی۔ یعنی پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار۔

ح و ط

حِیْطَۃٌ کے معنی ہیں حفاظت کرنا۔ محفوظ رکھنا۔ نگہبانی کرنا۔ مدافعت کرنا۔ کسی کی ضروریات کو پورا کرنا۔ لَا زِلْتُ فِی حِیْطَۃِ اللہ کے معنی ہیں تو ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہے۔ رَجُلٌ یَّتَحَوَّطُ أَخَاهُ۔ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے بھائی کی خبرگیری کرتا ہے۔ الْحَائِطُ۔ دیوار کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اندر کی چیزوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے۔ الْمُحِیْطُ۔ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سال مویشی رکھے جائیں اور وہ چاروں طرف سے محفوظ ہو**۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ حُطَّتِ الشَّیْءُ کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں۔ اور أَحَاطَۃٌ میں شدت حفاظت پائی جاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لینا۔ الْحِیْطَۃُ۔ عقیف اور شریف عورت کو کہتے ہیں۔ یعنی جو بہت زیادہ محتاط ہو***۔

أُحِيطَ بِالتَّوْمِ کے معنی ہیں ساری کی ساری قوم ہلاکت کے گھیرے میں آگئی **۔ تباہیوں میں گھر گئی۔

قرآن کریم میں وَاللَّهُ مُّحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ (۲۹) اکثر مقامات پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم، جو کچھ ہمارے جی میں آئے کرتے رہیں، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تو یہ خیال غلط ہے۔ ان کے اعمال کبھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتے۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے اور ان کے نتائج، تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں، انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ضرور ہلاک ہو کر رہینگے۔ اس طرح، مُّحِيطٌ میں حفاظتِ اعمال اور انکے نتائج کی وجہ سے ہلاکت کے دونوں پہلو آجاتے ہیں۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ہے وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ (۲۹) ”یقیناً جہنم ان انکار کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے“۔ دوسری جگہ ہے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۸۲) ”وہ اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں“۔

سورۃ کہف میں ہے وَأُحِيطَ بِشَمْرِهِ (۱۸) جسکے معنی ہیں اسکا مال و متاع۔ باغ کے پھل وغیرہ سب تباہی کی لپیٹ میں آگئے۔ سورۃ نمل میں ہے فَقَالَ أَحَاطَتْ بِمَالِهِمُ تُحِيطُ بِهِ (۲۴) ”اسنے کہا کہ میں نے ایسی بات معلوم کی ہے جسکی تجھے خبر نہیں“۔ یہاں احاطہ کے معنی ہیں کسی چیز کی معلومات فراہم کر لینا۔ اسے حیطہ علم میں لے لینا۔ سورۃ البروج میں ہے وَاللَّهُ مِّنْ وَرَائِهِمْ مُّحِيطٌ (۸۵) ”اللہ انکے گرد اگرڈ غیر مرئی طور پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے“۔ اسکا مطلب وہی ہے جو مُّحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (۲۵۵) ”وہ اللہ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے“۔ انکے حیطہ ادراک میں نہیں آ سکتا۔ وہ سمجھ نہیں سکتے۔

ح و ل

حَوَّلَ کے بنیادی معنی کسی چیز کا تغیر پذیر ہونا، ایک حالت سے دوسری میں جانا اور دوسری چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں۔ چنانچہ جو چیز

اپنی پہلی حالت پر نہ رہے بلکہ اس میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اسے حَالُ الشَّيْءِ یا اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ کہتے ہیں کیونکہ اسکی حالت میں تغیر آجاتا ہے۔ مُسْتَحَالَةً اور مُسْتَحْيِلَةً۔ ٹیڑھی کمان کو کہتے ہیں۔ نیز اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس میں کئی سال فصل نہ بوئی گئی ہو (اور وہ اسطرح اونچی نیچی ہو جائے۔ یعنی اپنی پہلی حالت پر نہ رہے۔) راغب نے کہا ہے کہ حَوَّلْتُ الشَّيْءَ فَتَحَوَّلَ کے معنی ہیں غَيَّرْتُ الشَّيْءَ فَتَغَيَّرَ۔ اس سے حَوَّلَ کے معنی تغیر و تبدل کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی آیت لَا يَبْغُؤْنَ عَنْهَا حِوَلًا (۱۰۸/۱) میں، حِوَلًا کے معنی تبدیلی اور تغیر کے ہیں۔ حَوَالُ الدَّهْرِ۔ زمانے کے تغیرات کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ انسان کے سال، بدن یا خود اسکے نفس میں جو بدلنے والی کیفیات ہوتی ہیں وہ اسکا حَالُ کہلاتی ہیں۔ نیز اَلْحَالُ۔ زمانہ حاضر کو بھی کہتے ہیں۔ حَوَّلَ۔ بھینگا ہونے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آنکھ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہوتی۔ حَوَّلَ کے معنی زوال یا انتقال کے بھی ہیں*۔ (اس میں بھی حالت کے بدلنے کا پہلو موجود ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوری حرکت کے ہیں۔

گردش کے اعتبار سے حَوَّلَ۔ سال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کی گردش سے واقع ہوتا ہے (۲۴/۲)۔ اَحَالَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز پر ایک سال گزر گیا۔ اَلْحَوْلِيُّ۔ اس چار پائے کو کہتے جو ایک سال کا ہو جائے۔

حَوَّلَ کے معنی ارد گرد کے بھی آتے ہیں۔ حَوَّلَ الشَّيْءَ کے معنی چیز کا کنارہ یا طرف میں۔ حَوَّالِيكَ اور حَوَّوْ لِيكَ سے مراد وہ اطراف ہیں جو تجھے گھیرے ہوئے ہوں۔ احاطہ کئے ہوں۔ مَحَوَّلُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کا ارد گرد*۔ جدا ہونے کے اعتبار سے، جو چیز دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے اسے حَالٌ بَيْنَهُمَا کہتے ہیں (۵۳/۳)۔ اس چیز کو جو درمیان حائل ہو جاتی ہے حِوَالٌ یا حَوَّلٌ یا حَوَّلَ کہتے ہیں۔ الگ کر دینے کی نسبت سے کسی چیز کا رخ تبدیل کر دینے نیز اسے دگرگوں کر دینے، زائل کر دینے کو تَحْوِيلٌ کہتے ہیں (۱۶/۵)۔ یہ لازم بھی ہے۔ اور اس طرح اس کے معنی دگرگوں ہو جانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا بھی ہیں۔ ** اَلْحَوَالَةُ

کے معنی ہیں ایک نہر کو دوسری نہر کی طرف موڑ دینا۔ مَحَالٌ کے معنی ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا۔ (جو نا ممکن ہے) * نیز باطل اور اپنے صحیح رخ سے ہٹا ہوا۔

حَوْلَةٌ کے معنی قوت تصرف، غلبہ اور اقتدار کے بھی ہیں۔ نیز گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ جانے کو بھی کہتے ہیں۔ اپنی پیٹھ پر جو گٹھڑی وغیرہ اٹھائی جائے اسے حَالٌ کہتے ہیں۔ نیز اس گڈیلنے کو بھی جس کے سہارے بچہ بتدریج چلنا سیکھتا ہے *۔

حِیْلَةٌ۔ مہارت۔ نگاہ اور نظر کی تیزی نیز معاملات میں تصرف پر قابو اور تدبیر امور پر قدرت حاصل ہونے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ حِیْلَةٌ وہ طریقہ ہے جس سے کسی بات تک پوشیدہ طور پر پہنچا جائے *۔ ہمارے ہاں یہ لفظ عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ حالات میں تبدیلی کرنے پر قدرت اور معاملات میں تصرف کرنے کی طاقت، کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً۔ (۹۸)۔

حَوِیْلٌ۔ گواہ اور شاہد کو بھی کہتے ہیں۔ نیز کفیل کو بھی۔ حَاوَلْتُ لَهُ بِبَصَرِی کے معنی ہیں، میں نے اس کی طرف تیز نظر سے دیکھا *۔

ح و و

الْحَوَّاءُ۔ سبزی مائل سیاہی۔ ”گہری سبزی۔ لوہے کے رنگ جیسا رنگ۔ یعنی سرخی جو مائل بہ سیاہی ہو۔ اِحْوَاوَتْ اِلَآ رُضٌ۔ زمین مر سبز ہو گئی *۔

قرآن کریم میں ہے وَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَمَرَّ عَلٰی۔ فَجَعَلَتْهُ غُشَاءً اَحْوٰی (۸۷)۔ ”خدا (کا قانون) زمین سے چارہ نکالتا ہے۔ پھر اسے خشک کر کے بالکل سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے“۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے ***۔ فرما نے کہا ہے کہ جب گھاس خشک ہو جائے تو اسے غُشَاءٌ کہتے ہیں اور جب وہ پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے تو اسے اَحْوٰی کہتے ہیں *۔ (اس کا مؤنث حَوَّاءٌ ہے)

(غُشَاءٌ کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (غ۔ ث۔ و) (ی)

ح و ی

الْحَوَیَّةُ - ہر چیز کی گولائی کو کہتے ہیں۔ (گول لپٹی ہوئی)
 آنت - جمع حَوَايَا یعنی انتڑیاں * - (۱۳۷)
 حَوَاهُ - يَحْوِيهِ - کسی چیز کو جمع کرنا، اپنے اندر لے لینا، مالک ہونا۔ اس کا احاطہ کر لینا۔ اسے نگاہ میں رکھنا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں۔

ح ی ث

حَيْثُ - جس طرح حَيْثُ زمانہ پر دلالت کرتا ہے (یعنی ”جب“)۔
 اسی طری حَيْثُ مکان پر دلالت کرتا ہے۔ (یعنی ”جہاں“)۔ لیکن اخفش کا قول ہے کہ حَيْثُ کا استعمال زمانہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے **۔ یعنی حَيْثُ کے معنی ”جب“ بھی ہو سکتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ (۲/۵۸)۔ تم جب چاہو یا جہاں سے چاہو۔ کھاؤ۔ ”جنتِ آدم“ کے ضمن میں ہے وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵)۔ ”تم جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ“۔ جنتی معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس میں ہر فرد کو سامانِ زیست ہر جگہ میسر ہوگا اور با فراغت میسر ہوگا۔

ح ی د

حَادَّ عَنِ الطَّارِ يُقِي - يَحْيِيْدُ - وہ راستہ سے (ایک طرف کو) ہٹ گیا۔ الرَّجُلُ يَحْيِيْدُ عَنِ الشَّيْءِ - آدمی خوف اور نفرت کی وجہ سے کسی چیز سے رکتا اور باز رہتا ہے۔ حِمَارٌ حَيْدِي وہ گدھا جو اپنے سایہ سے بدکتا ہو۔ حَيْدُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا اٹھا ہوا کنارہ جو بلند اور آگے کو نکلا ہوا ہو۔ سخت ٹیڑھی پسلی **۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی راستے سے ہٹ جانا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے ذَالِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۱/۱۹)۔
 ”یہ وہ ہے جس سے تم بدکتے اور کنارہ کشی اختیار کرتے تھے“۔

* تاج ** تاج - صاحب محیط نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

ح ی ر

حَارَ بَصَرُهُ - يَحَارُ - کسی چیز کی طرف دیکھنے سے نگاہ کا چندھیا جانا۔ حَارَ فِي أَمْرِهِ : وہ اپنے معاملہ کا صحیح حل نہ پاسکا۔ حَيْرَةٌ کے اصلی معنی ہیں چمک سے آنکھوں کا چندھیا جانا (اور اس طرح نگاہ کو ادھر سے پھیر لینا) حَارَ وَاسْتَحَارَ راستہ نہ پانا۔ فَهُوَ حَيْرَانٌ - سو وہ متحیر رہ گیا۔ یعنی صحیح راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے مضطرب اور پریشان ہو جانے والا۔ حَارَ السَّمَاءُ فِي الْمَمَكَانِ - اس وقت بولتے ہیں جب پانی کو آگے جانے کا راستہ نہ ملے اور وہ ایک ہی جگہ رک کر گردش کرتا رہے*۔ الْمُسْتَحِيرُ - لق و دق بیابان کے عرض میں جانے والا راستہ جس کا پتہ ہی نہ چلے کہ کس طرف لے جائیگا*۔ اس کے معنی راستہ نہ پاسکنے کی وجہ سے پریشان اور مضبوط الحواس ہو جانے والا بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے كَاذِبٌ اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانٌ (۱/۶) ”اس شخص کی مانند جس کے جذبات پر شیاطین قبضہ کر کے اسے زمین میں بھٹکاتے پھریں اور وہ حیران و پریشان ہو۔ یعنی جو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا جائے اور اس طرح یوں راہ گم کر دے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلے کہ اب کدھر جانا ہے۔“

ح ی ز (ح و ز)

حَارَ الشَّيْءُ يَحْوِزُهُ - کسی چیز کو جمع کرنا اور اپنی جانب یا اپنے اندر لے لینا۔ انْحَارَ عَنْهُ - وہ اس سے ہٹ گیا۔ انْحَارَ إِلَيْهِ - وہ اس کی طرف مائل ہو گیا۔ تَحَوَّزَ وَ تَحَيَّزَ - سانپ کی طرح بل کھانا۔ مڑ جانا۔ ایک طرف کو ہٹ جانا*۔ قرآن کریم میں ہے أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ (۸/۶) - اپنی جماعت کی طرف پہنچنے کے لئے مڑ جانے والا۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں حَيَّزٌ (خالی جگہ، کنارہ، گوشہ) کی طرف ہونے والا۔ اس کی اصل واو سے ہے جس کے معنی ہیں ہر وہ مجموعہ جس کے اجزا ایک دوسرے سے پیوست ہوں**۔ لہذا مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ کے معنی ہونگے اپنی (یا کسی) جماعت کے ساتھ مجتمع ہو جانے کی غرض سے۔

ح ی ص

حَاصَ عَنْهُ - يَحِيصُ - کسی چیز سے ہٹ جانا۔ الگ ہو جانا کسی سے بچنے کے لئے ایک طرف کو بھاگ جانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ہٹنے کے

ساتھ تحیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اَلْمَحْيُصُ*۔ ہٹنے کی جگہ۔ ایک طرف کو ہو جانے اور بھاگ جانے کی جگہ*۔ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحْيَصًا (۱۲۱)۔ ”وہ اس سے بچکر جانے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے“ وہ فرار ہو کر پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔

ایک طرف کو ہٹ جانے کے اعتبار سے اَلْأَحْيَصُ* اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی ہو۔ (حْيَصَ بَيْصَ کے معنی ہیں کسی بات کا نہایت شدت سے مبہم ہو جانا**۔ سخت الجھاؤ*)۔

ح ی ض

حَاضُ السَّيْلِ*۔ سیلاب خوب بڑھ گیا اور اس کا پانی چڑھا اور بہہ نکلا،۔ دراصل اس لفظ کے معنی بہنے اور جاری ہونے کے ہیں۔ حَاضَتِ اَلْمَرْأَةُ*۔ عورت کے ماہواری خون کا جاری ہونا***۔ اَلْمَحِيضُ* (۲۲۲)۔ حیض کا جاری ہونا، حیض کا خون، حیض کے ایام یا موضع حیض (جہاں سے حیض کا خون برآمد ہوتا ہے) لیکن یہ لفظ خود حیض کے لئے بھی آتا ہے (۶۵)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ بیول کے درخت سے جو سرخ رنگ کا پانی نکلتا ہے اس کے لئے حَاضَتِ السَّمَرَةِ* کہتے ہیں۔ تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ حَاضَتٌ، تَحْيِضٌ*۔ حَائِضٌ ہونا۔ وَالشَّيْءُ لَمْ يَحْيِضْ (۶۵)۔ وہ عورتیں جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو (یعنی عمر کے لحاظ سے انہیں حیض آنا چاہیئے تھا لیکن کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آسکا)۔

ح ی ف

اَلْحَائِفُ*۔ ٹیڑھی چیز۔ نیز راستی سے ہٹنے والے کو کہتے ہیں۔ اَلْحَائِفُ مِّنْ اَلْجَبَلِ*۔ پہاڑ کا ایک طرف نکلا ہوا کنارہ۔ اَلْحَيْفَةُ*۔ کنارہ۔ جانب۔ پہلو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھکاؤ اور میلان کے ہیں۔ اَلْحَيْفُ*۔ فیصلہ کرنے میں ایک طرف کو جھک جانا۔ انصاف نہ کرنا، ظلم و زیادتی۔ حَافَ عَلَيْهِ*۔ اس پر ظلم و زیادتی کی***۔ قرآن کریم میں ہے اَمْ يَخَافُونَ اَنْ يَّحْيِفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ* وَرَسُولُهُ (۲۳)۔ ”کیا انہیں اس کا ڈر ہے کہ خدا اور اس کا رسول فیصلہ کرنے میں فریق مخالف کی طرف جھک جائیگا اور ان سے انصاف نہیں برتیگا،،! (کس قدر غلط ہے ان کا یہ اندیشہ)۔

ح ی ق

حَقَّ بِهِ الشَّيْءُ يَحْيِيقُ - کسی چیز نے اسے گھیر لیا - * وَحَقَّ بِأَلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ (۳۵) - ”بدترین عذاب نے قوم فرعون کو گھیر لیا“ - انسانی اعمال کے نتائج جس طرح اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور وہ ان کے اثر سے بچ نہیں سکتا، اُسکے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ فَحَقَّ بِاللَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۶۰) - ”جو لوگ ان میں سے پیغامِ خداوندی کا تمسخر اڑاتے تھے، انہیں اُس چیز نے گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے“ - یعنی ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز پر چھا جانا۔ اس کے اوپر آ کر بیٹھ جانا اور چپک جانا۔

ح ی ن

أَلَحِيْنٌ - مطلقاً زمانہ اور وقت کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ وقت طویل ہو یا قصیر۔ (کم ہو یا زیادہ)۔ عربی زبان میں حِيْنٌ کا اطلاق ایک لمحہ سے لے کر لامتناہی حد تک ہوتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ حِيْنٌ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو جائے۔ یہ وقت مبہم ہوتا ہے اور اُس وقت معین و مخصوص ہو جاتا ہے جب اس کے بعد مضاف الیہ آ جائے۔ حَانَ الْقَوْمُ کے معنی ہیں قوم جو کچھ چاہتی تھی اس کے حاصل ہونے کا وقت آ گیا۔ حِيْنٌ کے معنی مدت کے بھی آتے ہیں۔ اور جب دو وقتوں کا بعد بتانا ہو، یعنی یہ بتانا ہو کہ ایک کام کے بعد دوسرا ہوا، تو اس کے بعد اِذْ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے حِيْنَيْئِذٍ - مثلاً أَنْتُمْ حِيْنَيْئِذٍ تَنْظُرُونَ (۵۶) یعنی جس وقت جان نکلنے کے لئے حلق تک پہنچتی ہے اس وقت، اس حالت کے بعد، تم اسے دیکھ رہے ہوتے ہو*۔

قرآن کریم میں ہے لَا تَحِيْنٌ مِّنَا (۳۸) - یہاں لَا ت کے بعد مبتدا محذوف ہے۔ آیت کے معنی ہیں یہ وقت بھاگ نکلنے کا وقت نہیں ہے۔ حِيْنَيْئَهُ - اس کے لئے وقت مقرر کیا*۔

سورہ بقرہ میں ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِيْنٍ (۲۶) اس کے یہ معنی ہونگے کہ تمہیں زمین پر ٹھہرنا ہے اور اس سے

فائدہ حاصل کرنا ہے ایک وقت تک کے لئے جس کی مدت معین نہیں۔ یہ مدت مختلف افراد اور مختلف اقوام کے لئے مختلف ہوگی۔ جس قسم کے اعمال کسی قوم سے سرزد ہونگے اس کے مطابق اسکی مدت حیات کا تعین ہو جائیگا۔ باقی رہا نوع انسان کا اس ارض پر قیام، سو اس کی مدت کے متعلق علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آلَحِیْنُ - ہلاکت اور موت کو بھی کہتے ہیں۔ آحَانَتِہُ اللہ - خدا نے اسے ہلاک کر دیا۔ آلَحَائِنُ - احمق کو کہتے ہیں اور آلَحَانِیَّتِہُ شراب کو*۔

ح ی ی

حَیِّی (حی) - یَحْیِی (یَحْیِی) - وہ زندہ رہا۔ یا زندہ ہوا۔ حَیَاۃٌ (حَیَاۃ) زندگی۔ آحِیَاہُ - اس نے اسے زندہ کیا۔ اَحْیَاۃٌ - زندگی بخشنا۔ تَحْیِیَاتِہُ - وہ اس سے سمٹا سکڑا۔ (Shrank) - علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زندگی کی ایک علامت سکڑنا ہے۔ آپ کسی جاندار چیز (مثلاً کیڑے وغیرہ) کو چھیڑئیے، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سکیر لیگا۔ سمٹ جائیگا۔ اگر وہ زندہ نہیں تو علیٰ حالہ رہیگا۔ اس کا یہ سمٹنا درحقیقت اس کے جذبہ تحفظ خویش (Preservation of Self) کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی سے عربوں نے اس مادہ سے سمٹنے اور سکڑنے کا مفہوم بھی لیا۔ یہیں سے حَیَاۃٌ (شرم) ہے کیونکہ حیاء کا مظاہرہ بھی سمٹنے سے ہوتا ہے۔ سانپ کو بھی حَیَّتۃً اس کے سکڑنے اور سمٹنے کی وجہ سے کہتے ہیں*۔

راغب نے حَیَاۃٌ کے معنی قوتِ حاسہ (Faculty of sensation) لئے ہیں۔ مَوْتُ اس کی نقیض ہے۔ (دیکھئے عنوان م - و - ت) راغب کے نزدیک حَیَاۃٌ کا استعمال مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ مثلاً (۱) بڑھنے کی قوت (قوتِ نامیہ) جو نباتات اور حیوانات میں ہوتی ہے۔ (۲) قوتِ احساس (۳) قوتِ عقل و عمل (۴) رنج و غم سے آزادی (۵) حیاتِ اخروی و ابدی جس تک انسان محض اُس حیات سے پہنچ سکتا ہے جو عقل و علم کی حیات ہوتی ہے۔ اور (۶) وہ حیات جس سے صرف خدا کی ذات متصف ہوتی ہے اور جس میں موت نہیں۔ (آلَحِیُّ الْقَیُّوْمُ)**۔

اَحْیَاۃٌ - زندہ کرنا۔ اِسْتَحْیَاۃٌ - زندہ رکھنا نیز حیا کرنا۔ لیکن اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَحْیِی اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا (۲۶) میں لَا یَسْتَحْیِی کے معنی

ہیں ، اللہ کو اس میں کسی قسم کا بیاک یا رکاوٹ نہیں کہ وہ اس قسم کی مثال دے۔ **۔ لَا حَيَّ عَنَّهُ کے معنی ہیں اس سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ **۔ الْحَيَاءُ کے معنی سرسبزی اور بارش کے بھی آتے ہیں کیونکہ ان سے زمین کی حیات وابستہ ہوتی ہے۔ حَيَّ عَلَيَّ یا حَيَّ هَلَّ کے معنی ہیں اس کام کے لئے جلدی کرو۔ ***۔

حَيَّاهُ تَحْيِيَّةٌ کے معنی ہیں اس کے لئے خوشگوار زندگی ، درازی عمر کی آرزو کرنا یا دعا دینا۔ **۔ سلام کرنا۔ **** (۲/۸۶) تَحْيِيَّاتٌ کا لفظ درحقیقت حیاتِ جاوید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ***۔ نیز ہر قسم کی سلامتی اور آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے۔ **۔ الْحَيَا کے معنی زندگی ہیں۔ جس طرح موت کے مقابلہ میں حیات کا لفظ آتا ہے (۶/۶۴) اسی طرح مَمَات کے مقابلہ میں مَحْيَا آتا ہے۔ (۱۶/۱۳) الْحَيَاةُ بعض اوقات منفعت (نفع بخشی) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ *۔ الْحَيَاةُ السَّاطِيَّةُ رزقِ حلال یا جنت کو کہتے ہیں۔ ****۔ حَيَّ السَّاطِرِيقُ کے معنی ہیں راستہ ظاہر یا واضح ہو گیا۔ اور طَرِيقُ حَيَّ کے معنی ہیں واضح راستہ۔ ****۔

قرآن کریم میں حیاتِ اخروی کے لئے ہے وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ (۲۹/۱۳)۔ اس آیت میں حَيَاة کے بجائے حَيَوَان کا لفظ آیا ہے جس کا وزن فَعْلَان ہے۔ یہ فرق بڑا معنی خیز ہے۔ عربی زبان میں فَعْلَان کے وزن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شدت ، غلبہ ، ہنگامی طور پر کچھ نمودار ہونا اور حرکت و اضطراب کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ اخروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی نہیں جو اس دنیا میں طبعی قوانین کی رو سے قائم ہے۔ اس میں زندگی اچانک ایک نئی صورت اختیار کریگی۔ ****۔ اور جمود و سکون کے بجائے حرکتِ پیہم اور سعی مسلسل ہوگی۔ ****۔ (اس فرق کے لئے آخِرَۃ اور قِيَامَۃ کے الفاظ بھی دیکھئے جو، ا۔ خ۔ ر اور ق۔ و۔ م کے عنوانات میں ملیں گے۔ نیز رَحْمٰن کا لفظ جو ر۔ ح۔ م کے تحت ملیگا)۔ حَيَوٰۃ کے مختلف مفہوم جن کا ذکر اوپر آیا ہے قرآن کریم کی متعدد آیات میں مذکور ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ

* تاج۔ ** راغب بحوالہ تاج۔ *** لین۔ لین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سانپ کو حیات اس کی درازی عمر کی وجہ سے کہتے ہیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ سانپ صرف کسی حادثہ سے مرتا ہے۔ طبعی موت مرتا ہی نہیں۔ **** محیط۔ **** اس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتِ اخروی دنیا کی زندگی کے تسلسل میں تو ہوگی لیکن جن طبعی قوانین کے ماتحت اس دنیا میں زندگی کی نمود اور بقا ہوتی ہے ، آخری حیات ان قوانین کے تابع نہیں ہوگی۔ وہاں اس کے لئے اور قوانین ہوں گے۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم ان کی محض طبیعی زندگی (Physi- cal life) کو حیات نہیں قرار دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جو شرفِ انسانیت کو لئے ہو۔ جس میں انسان قوانینِ خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے کر اپنی ذات کی نشو و نما کرتا چلا جائے۔ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا سے مراد ہے مفادِ عاجلہ۔ پیش پا افتادہ مفاد۔ فوری عیش و عشرت۔ محض قریبی فائدے۔ یعنی وہ زندگی جس میں مستقبل پر کوئی نگاہ نہ ہو۔ طبعی زندگی جس میں انسان حیوانی سطح (Animal Level) پر دن بسر کرتا ہے۔ نہ اس زندگی میں مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد تسلسلِ حیات پر یقین رکھتا ہے، الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ہے۔ قرآن کریم میں الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اور حیاتِ آخرت کی اہم اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان معانی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ نیز اس حقیقت کو بھی کہ جس طرح ہمارے ہاں (اردو میں۔ اور اسی طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں) زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا (سانس لینا) اور موت سے مراد محض مرجانا (نفس کی آمدوشد کا بند ہو جانا) نہیں بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) بھی یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر (نفسِ مضمون کے اعتبار سے) دیکھنا چاہئے کہ وہاں کونسے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے افراد قبروں میں دفن ہو چکے ہیں۔ اور جب کہتے ہیں کہ اس قوم کا شمار زندہ قوموں میں ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے افراد سانس لیتے ہیں۔ مردہ اقوام اور زندہ اقوام کا مفہوم واضح ہے۔ اسی طرح یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے اَوْ مِّنْ كَانَ مَيِّتًا فَآحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَاهُ نَوْرًا يَّمْشِي بِهٖ فِي النَّاسِ..... (۱۶۳)۔ ”اور کیا وہ جو مردہ ہو۔ پھر اسے ہم زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس سے وہ لوگوں میں چلے۔۔۔۔۔“۔ ظاہر ہے کہ یہاں موت اور حیات سے مراد طبعی موت اور زندگی نہیں بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ موت اور حیات کے معانی کے اس فرق کو ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ حضراتِ انبیاء کرام اقوامِ مردہ کو ایسی زندگی عطا کرنے کے لئے آتے تھے جو انہیں دنیا بھر کی سرفرازیاں عطا کر دے۔ (۲۴)۔ یہ زندگی اب قرآن کریم کی رو سے مل سکتی ہے لیکن صرف اُسے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو (۱۶۳)۔ اور جو تباہیوں سے بچنا چاہے (۲)۔

خ

خ ب ا

خَبَّأَهُ - يَخْبِئُوهُ - خَبَأَ - چھپانا - پردہ میں رکھنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں - اَمْرًاۃٌ خُبَّاءَةٌ - خانہ نشین عورت جو گھر سے باہر نہ نکلتی ہو - اَلْخَبِيْثَةُ - بیچ کے وہ دانے جنہیں کسان زمین کے اندر چھپا دیتا ہے - قدرت کے خزانے جو اس نے زمین میں چھپا رکھے ہیں - اَلْخَبْ - ذخیرہ کی ہوئی اور چھپائی ہوئی چیز* -

قرآن کریم میں اَلْخَبْ "فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (۲۴) آیا ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اندر چھپے ہوئے خزانے - ان کی مستور قوتیں اور مضمحل صلاحیتیں - ان کے اندر پوشیدہ رزق کے خزانے۔

خ ب ت

اَلْخَبْتُ - نشیبی زمین جو وسیع بھی ہو** - وسیع میدان جس میں کچھ آگا ہوا نہ ہو - (ابن فارس) اَخْبَتَ - وہ نشیبی زمین میں پھنچا، اس کے بعد یہ لفظ نرمی خشوع، تواضع اور جھک جانے، اطاعت کرنے نیز مطمئن ہونے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا**۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے "وَاَخْبَتُوا اِلٰی رَبِّهِمْ" (۱۱) - "وہ خدا کے (قانون ربوبیت کے) سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں"، - یعنی فَتَخَبَّتْ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ (۲۲) - "اس کے سامنے ان کے دل جھک جائیں یا نرم ہو جائیں"، - انہی کو دوسری جگہ مُخْبِتِيْمُنَ (۲۲) کہا گیا ہے - دل کی نرمی اور جھکاؤ والے - اس سے پہلے فَلَهٗ اَسْلَمُوْا (۲۲) نے مفہوم واضح کر دیا ہے - قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جانے والے - اسے بطیبِ خاطر تسلیم کر لینے والے -

خ ب ث

الْخَبِيثَاتُ - طَيِّبٌ کی ضد ہے اس لئے اس کے مفہوم کیلئے ط - ی - ب کا عنوان دیکھنا ضروری ہے - خُبُثٌ کے معنی گندے، گھناؤنے اور مکروہ کے ہیں خواہ وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ہو یا کلام میں - یا افعال میں - یا عقائد و خیالات میں * - الْخَبِيثَاتُ - طَيِّبٌ کی ضد ہے ناپسندیدہ، ناگوار، خراب نیز دھوکا دینے والا - الْخَبَاثَةُ - مکار آدمی - یا ردی شے * - خَبَثٌ الْحَدِيدِ وَالْفِضَّةِ - لوہے اور چاندی وغیرہ کا میل جو انہیں بھٹی میں پگھلانے سے الگ ہو جاتا ہے * - ملاوٹ - کھوٹ - الْخُبُثُ - زنا کو بھی کہتے ہیں * -

سورة اعراف میں خَبَثٌ - اس زمین کے لئے آیا ہے جو شور ہو اور وہاں کچھ پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو بہت تھوڑا (۵۸) اسی طرح سورة ابراہیم میں کَلِمَةً طَيِّبَةً کے مقابلہ میں کَلِمَةً خَبِيثَةً آیا ہے جسے شَجَرَةٌ خَبِيثَةٌ سے تشبیہ دی گئی ہے (۲۶-۲۷) - اس کے معنی ہیں ایسا درخت جو پھل نہ دے - غلط نظریہ حیات دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا - ساری محنت اکارت جاتی ہے - حالانکہ غلط نظریہ حیات کی چمک دمک بھی بہت ہوتی ہے اور پھیلتا بھی بڑی کثرت سے ہے (۱۰۰) - لیکن اسے ثبات و قرار کبھی نہیں ہو سکتا - اسکی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوتی ہیں (۱۲) -

خَبَائِثٌ - خَبِيثَةٌ کی جمع ہے چنانچہ (۱۵۷) میں ہے کہ رسول طہیات کو حلال قرار دیتا ہے اور خبائث کو حرام - یعنی قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ خبائث ہیں اور جو چیزیں حلال ہیں وہ طہیات ہیں - (تفصیل کے لئے عنوان ح - ر - م اور ح - ل - ل دیکھئے)

قرآن کریم میں فحش کاری یا فحش کار لوگوں کے لئے بھی خبیث کا لفظ آیا ہے - مثلاً سورة نور میں ہے الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ (۲۴) - یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خبیث باتیں خبیث لوگوں کے شایان شان ہیں - اور یہ بھی کہ خبیث عورتیں مردوں کے لئے ہیں - ثانی الذکر مفہوم کی تائید اسی سورة کی دوسری آیت سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً (۲۳) زانی مرد صرف زانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے (اسکی تشریح ”مفہوم القرآن“ میں ملیگی)

خ ب ر

الْخَبَرُ - جمع أَخْبَارٌ ہے (۱۹) خَبَرَ اور نَبَأٌ میں فرق یہ ہے کہ نَبَأٌ کسی بہت بڑے واقعہ کے متعلق ہوتی ہے اور خَبَرَ عام واقعات کے متعلق۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ خَبَرَ عرف اور لغت میں اس بات کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے نقل کی جائے *۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اس تخصیص کے ساتھ نہیں آیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے سَأْتِيْكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ (۲۷) ”میں اس سے تمہارے پاس خبر لاؤنگا“۔

الْخَبِيرُ - خبر کو جاننے یا رکھنے والا۔ یا خبر دینے والا *۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۱)۔ ”جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے“۔

خَبْرٌ کے معنی بھی کسی چیز کے جاننے کے ہیں *۔ (۱۸)۔ محیط میں ہے کہ یہ اُس واقفیت کو کہینگرے جو تجربہ کی بنا پر ہو۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی علم بتائے ہیں۔ اس اعتبار سے خَبَرَ کے لئے علم اور واقفیت ضروری ہے۔

خ ب ز

الْخَبْزُ - روٹی *۔ (۱۲)۔ اصلی معنی اس مادہ میں مارنے اور دفع کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ الْخَبْزُ کے معنی ہوتے ہیں اونٹ کا زمین پر ہاتھ مارنا۔ چونکہ روٹی بھی اس طرح ہاتھ مارنے سے بنتی ہے اسلئے اسے خَبْزُ کہتے ہیں۔ یا اس لئے کہ روٹی سے بھوک مرقی اور دفع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق ہر اس چیز پر کر دیا جاتا ہے جسے انسان کھائے یا معیشت کیلئے اختیار کرے **۔ جیسے ہمارے ہاں بھی جب کہا جائے کہ ”اصل سوال تو روٹی کا ہے“ تو اس کے معنی رزق یا معیشت ہی کے ہوتے ہیں۔

خ ب ط

خَبَطَ - کسی چیز کو زور سے مارنا۔ پاؤں کو زور سے مار کر کسی چیز کو روندنا۔ درخت کو لکڑی سے مار کر اس کے پتے جھاڑنا۔ خَبَطَ اللَّيْلُ - رات

* تاج۔ ** محیط نیز ابن فارس۔

کو سمت معلوم کئے بغیر یوں ہی منہ اٹھا کر چل دینا۔ تَخَبَّطَهُ الشَّيْطَانُ۔ اسے شیطان نے پاگل بنا دیا*۔ راغب نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے تشدد اور ظلم کو بھی خَبَطٌ کہتے ہیں۔ اور اخْتَبَاطُ الْمُعَرِّفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا**۔

سورة بقرہ میں سود خوار لوگوں کی حالت کا نقشہ یہ کہہ کر کھینچا گیا ہے کہ لَا يَتَّقُونَ إِلَّا كَمَا يَقْتُومُ الذِّي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَيْسِ (۲/۲۵)۔ ”یہ لوگ یوں کھڑے ہوتے ہیں جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو“۔ اسمیں ذہنی جنون اور قلبی اضطراب کی شدت سب کی سب آجاتی ہے جو اس شخص کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی جسکے دل میں ہوس زرنے آگ لگا رکھی ہو۔ اگر اس آیت میں الشَّيْطَانُ سے مراد انسان کے سرکش جذبات لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا وہ شخص جو اپنے جذبات کے ہاتھوں پاگل ہو رہا ہو۔ لیکن اس میں کمزور پہلو یہ ہوگا کہ اس شخص کی محسوس حرکات کی تشبیہ غیر محسوس شے سے ہوگی۔

خ ب ل

الْخَبْلُ۔ الْخَبَلُ۔ اس کے بنیادی معنی کسی خرابی کے پیدا ہو جانے کے ہیں۔ مثلاً انسان کے اعضاء میں کوئی خرابی پیدا ہو جانا۔ فالج گر جانا۔ جنون ہو جانا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کا جاتے رہنا ہیں۔ اسکے بعد اسکے عام معنی ہلاکت یا نقصان کے آتے ہیں۔ * رَجُلٌ مَّخْبَلٌ۔ اس شخص کو کہتے جس کے ہاتھ پیر (اعضاء) کٹ گئے ہوں***۔ قرآن کریم میں ہے لَا يَأْتِيَنَّكُمْ خَبَالًا (۱۱/۳)۔ ”تمہارے دشمن، تمہاری تخریب، میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھینگے“، اس میں ہر قسم کے نقصانات، شر، فساد آ جاتے ہیں۔

خ ب و

خَبَّتِ النَّارُ وَالْحَرُّ۔ آگ اور جنگ کی تیزی و تندہی ماند پڑ گئی۔ پر سکون ہو گئی۔ اس کا شعلہ افسردہ ہو گیا*۔ سورة بنی اسرائیل میں ہے ”كَذَٰلِكَ خَبَّتْ“ (۱۶/۱) ”جب وہ آگ بجھنے لگے گی“۔ اس کے بعد زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا (ہم ان کے لئے اسے اور زیادہ بھڑکا دینگے) نے مفہوم واضح کر دیا ہے۔

خَبَاءٌ - در اصل اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ نیز بالی میں دانہ کے اوپر کا خول**۔ خاکستر کا پردہ جو شعلہ پر پڑ کر اسے دبا دیتا ہے۔

(خَبٌ (۲۵) کے لئے دیکھئے عنوان خ - ب - ا - ابن فارس نے کہا ہے کہ خَبُوٌّ اور خَبٌ - دونوں کے معنی چھپانے کے آتے ہیں)۔

خ ت ر

الْخَتَرُ - بدترین عہد شکنی - عہد شکنی کرنا اور فریب دینا*۔ در اصل یہ اس عہد شکنی اور غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان تھک کر چور چور ہو جائے۔ وہ تکان سے کمزور ہو جائے اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں**۔ اس لئے کہ الْخَتَرُ، الْخَدَرُ کے ہم معنی ہے۔ یعنی ایسی غنودگی و بے حسی جو کسی زہر یا دوا کے پینے سے پیدا ہو جائے اور اعضاء میں کمزوری و اضمحلال کا باعث بنے۔ رَجُلٌ مُخْتَرٌ - وہ آدمی جس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں - خَتَرَهُ الشَّرَابُ - شراب نے اس کے قسوی کو مضمحل کر دیا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سستی اور فتور کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں خَتَارٌ كَفُّورٌ (۳۱) آیا ہے۔ اس کے معنی دغا باز، فریب کار کے بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے آدمی کے بھی جو محنت نہ کرنے کی وجہ سے سست ہو چکا ہو۔ یا وہ آدمی جو احکام خداوندی کی بجائے آوری میں سستی برتے۔ (یعنی اَثِيمٌ - دیکھئے عنوان ا - ث - م)

خ ت م

خَتَمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو چھپا دینا اور ڈھانک دینا۔ اس طرح بند کر کے محفوظ کر دینا کہ اس کا کوئی حصہ باہر نہ نکل سکے۔ چنانچہ زمین میں هل چلا کر اور بیج ڈال کر جو پہلی مرتبہ پانی دیتے ہیں اسے اہل عرب خَتَمَ الزَّرْعَ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ پانی دینے کے بعد مٹی جم جاتی ہے اور بیج مٹی کے اندر بند ہو کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چہتہ کے خانوں میں شہد جمع کر کے موم کا نہایت باریک سا پردہ خانوں کے منہ پر بنا دیتی ہیں جس سے شہد اندر بند اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسے بھی عرب خَتَمٌ سے تعبیر کرتے ہیں (اس کے بعد خود شہد، اور ان خانوں کے منہ کو بھی خَتَمٌ کہنے لگ گئے)***۔

خَتَمَ الشَّيْءُ خَتْمًا - کے معنی کسی چیز کے آخری سرے تک پہنچ جانے کے بھی ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ خَتَمٌ اور طَبَعَ کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز پر لا کھ وغیرہ لگا کر مہر سے اس پر نشان لگا دینا۔ اور (۲) وہ نقش یا نشان جو اس طرح مہر لگانے سے بن جائے۔ پھر قدرے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کسی چیز کو بند کرنے اور روک دینے کے لئے بولا جانے لگا۔ اس لئے کہ مہر لگا کر خط یا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے اندر کی چیز باہر نہیں نکالی جاتی**۔ خِتَامٌ اس لا کھ یا موم وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو بند کر کے اس پر مہر لگائی جاتی ہے۔ اور خَاتَمٌ وہ چیز ہے (انگوٹھی وغیرہ) جس سے اس لا کھ پر مہر لگائی جاتی ہے۔ ہر چیز کا انجام اور آخر خَاتَمٌ کہلاتا ہے۔ چنانچہ خَاتَمُ الْقَوْمِ کے معنی ہیں قوم کا آخری فرد۔ ایسے ہی ہر پینے کی چیز کا خِتَامٌ اس کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ (ابن فارس)۔ فراء کا قول ہے کہ خَاتَمٌ اور خِتَامٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔ فَلَانٌ خَتَمَ عَلَيْهِ كَتَبًا یہ کے معنی ہیں ”وہ شخص تجھ سے اعراض برتتا ہے اور اپنا دروازہ تجھ پر بند کر لیتا ہے*۔

قرآن کریم میں خَتَمَ اللَّهُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ (یا طَبَعَ اللَّهُ...) متعدد بار آیا ہے (۲)۔ دلوں پر مہر لگ جانے سے مطلب یہ ہے کہ ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ سورۃ انعام میں أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ نے خَتَمَ عَلٰی قُلُوبِكُمْ (۱۶) کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی علم حاصل کرنے کے دروازے ہی اس پر مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ حالت ان لوگوں کی ہو جاتی ہے جو اپنے دل کی مرضی سے (برضا و رغبت) غلط روش اختیار کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ مستقبل کی خوشگوار یوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ہیں (۱۰۸-۱۰۶)۔ اسی طرح وہ لوگ ہیں جو صحیح بات کے سننے سے انکار کر دیتے ہیں اور جب ان کے سامنے اسکا ذکر آئے تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں (۳۶-۳۵)۔ جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تمہاری مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری باتیں نہایت غور سے سن رہے ہیں لیکن وہ اس وقت سوچ کچھ اور ہی رہے ہوتے ہیں۔ یہ صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں۔ (۱۶-۱۷)۔ اور قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے (۳۴)۔ ان لوگوں کے اپنے اعمال خود زنگ بن کر ان کے دلوں

پر مہر لگا دیتے ہیں (۸۳/۱۳)*۔ ان مقامات سے خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوبِہِم کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ مہر نہیں لگاتا۔ ان کے اپنے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق مہر بن جاتے ہیں۔

سورۃ تطفیف میں ”جنت میں پینے کی شے“، کـو رَحِیقٍ مَسْخُومٍ (۸۳/۲۵) کہا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ خِتَامُہٗ مِیْسُکٍ (۸۳/۲۶) اس کی مہر (یا وہ ذائقہ جو منہ میں باقی رہ جائے) مشک کا ہوگا۔ اس لئے کہ مِزَاجُہٗ مِیْنٌ تَسْنِیْمٍ (۸۳/۲۷)۔ اس میں وہ پانی ملا ہوگا جو بڑی بلندیوں سے آرہا ہے۔ جس سے زندگی کو بلند ترین منازل تک پہنچنے کی قوت حاصل ہو جائیگی۔

سورۃ احزاب میں نبی اکرمؐ کو خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ (۳۳/۳۴) کہا گیا ہے۔ خَاتَمَ کے معنی اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی رو سے اس کے معنی آخری نبی ہیں۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد نبوت کو جاری سمجھنا قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے۔ جب قرآن کریم آخری کتاب ہے تو جس نبی پر قرآن کریم نازل ہوا وہ آخری نبی ہے (نَبِیِّیُّ کے معنی ن۔ ب۔ ا کے عنوان میں دیکھئے جہاں اس امر کی بھی تصریح کی گئی ہے کہ کوئی نبی بغیر کتاب کے آ نہیں سکتا)۔ لہذا نہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب اور نہ ہی نبی اکرمؐ کے بعد کوئی اور نبی۔ یہ تصور کہ نبی اکرمؐ کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے ہیں، نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ نبوت خدا کی طرف سے ایک وہبی خصوصیت تھی جو بلا کسب و ہنر عطا ہوتی تھی۔ اسے نہ کوئی اپنی محنت سے حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی نبی، اسے دوسرے کو عطا کر سکتا تھا (تفصیل ن۔ ب۔ ا میں ملیگی) لہذا نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ یکسر باطل ہے۔

لیکن ”دعوائے نبوت“، کی ایک اور شکل بھی ہے جو بڑی دقیق فلہذا بڑی غور طلب ہے۔ ”نبوت“، سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرے۔ یعنی اُس علم میں اس کی اپنی عقل و خرد کا کوئی دخل نہ ہو۔ وہ علم اسے خدا سے براہ راست ملے۔ ہمارے ہاں (تصوف میں) یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ ”اولیاء اللہ“، یا صوفیائے کرام، خدا سے براہ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے۔ بادلے تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائیگی کہ یہ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ ورنہ کشف و الہام اور وحی میں، حقیقت کے اعتبار سے، کوئی فرق نہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ بجائے خویش باب نبوت کو کھول دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے

* (دیکھئے قلب - سمع - بصر -)

صحیح بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو علم براہ راست دینا تھا وہ آخری نبیؐ کو دیدیا۔ یہ علم اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ کشف و الہام، انسان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر ہوتے ہیں، خدا کی طرف سے کشف حقائق نہیں ہوتا۔

خ د د

اَلْخَدَّ - رخسار۔ (۳۱/۱۸) اَلْخَدَّ - زمین میں کھودا ہوا مستطیل گڑھا۔
اَلَاْ خَدُّوْ دُ - کھائی یا خندق *۔

قرآن کریم میں ہے قُتِلَ اَصْحَابُ اَلَاْ خَدُّوْ دِ (۸۵)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ذونواس، شاہِ یمن نے اہل نجران (عیسائیوں) کو مجبور کیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ دیں۔ وہ جب اس پر آمادہ نہ ہوئے تو اسنے خندق کھدوا کر اس میں آگ جلائی اور انھیں اس میں ڈلوا کر جلا دیا **۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے خدا پرست یہودیوں کو اسی طرح آگ میں جلایا تھا * لیکن قرآن کریم کے سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام مخالفین اسلام ہیں جو رسول اللہؐ سے برسرِ پیکار تھے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ قرآن کریم نے انہی کی تباہی کی خبر دی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحابُ اَلَاْ خَدُّوْ دِ اور تَبَّع)۔

خ د ع

خَدُّ ع کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اسکے خلاف ظاہر کرنا۔ کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھپانے اور مخفی رکھنے کے ہیں۔ اصل میں خَدُّوْ ع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو کبھی تو بہت سا دودھ دیدے اور کبھی بالکل چڑھا جائے۔ (کچھ نہ دے) ***۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار انکی مہمان نوازی پر تھا۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے۔ ان کے جانوروں کا دودھ (یا گوشت) ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان آجائیں۔ وہ ان کے لئے اونٹنی کا دودھ دوہنے کیلئے جائیں اور اونٹنی دودھ چڑھا جائے۔ تو اس وقت میزبان کی حالت کیا ہوگی؟ اس قسم کی اونٹنی جسپر

بھروسہ ہی نہ کیا جا سکے خَدُّوْ عٌ کہلاتی ہے۔ اس سے خَدَّ عٌ کا مفہوم اچھی طرح ذہن میں آسکتا ہے۔ چنانچہ خَيِّدَ عٌ سراب کو کہتے ہیں*۔ نیز غول بیابانی کو۔ اور اس راستے کو بھی جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ہو*۔ نیز کسی بڑے کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لیتے تھے جس میں گھر کی قیمتی چیزیں بغرض حفاظت رکھتے تھے۔ اسے بھی خَادِعَةٌ کہتے تھے*۔ لطائف اللغة میں ہے کہ الْخَادِعُ اور الْخَدُّوْ عٌ اُس راستے کو کہتے ہیں جو کبھی نکھر کر سامنے آجائے اور کبھی گم ہو جائے۔ لہذا خَدُّ عٌ زندگی کی وہ روش ہے جس میں بظاہر تو کچھ بتایا جائے اور بیاطن کچھ اور۔ یا جس میں توقع کے مطابق امکان تو زیادہ کا ہو اور نکلے کم۔ یا جو ایک حالت پر نہ رہے۔ یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ چنانچہ خَدَّ عٌ الْكَرَرِیْمُ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی سخی آدمی خلاف توقع بخل کا برتاؤ کرنے لگ جائے۔ خَدَّ عٌ الْعَطَرُ اسوقت کہتے ہیں جب بارش خلاف توقع بہت کم ہو۔ سَوُوقٌ خَادِعَةٌ اس بازار کو کہتے ہیں جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ اور خَدَّ عَتِ الْاَلَامُورُ اسوقت کہتے ہیں جب حالات دگرگوں ہوتے چلے جائیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ*۔ خَدَّ عٌ کے معنی کم ہو جانے کے بھی آتے ہیں*۔ اَلْسَيْنُوْنُ الْخَوَادِعُ ان سالوں کو کہتے ہیں جن میں کبھی فراوانی ہو اور کبھی قحط۔ یا جن میں بارش تو بہت ہو لیکن پیداوار کم ہو* دِينَارٌ خَادِعٌ اُس دینار کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں کھرا معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو۔ (ابن فارس)۔ لہذا خَادِعٌ سے مراد یا تو وہ جذباتی شخص ہے جو معاملات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں محض جذبات کی رو سے کرتا ہے۔ ذرا جذبات ابھر آئے تو بڑے بڑے وعدے اور دعوے کر دے۔ ذرا ان میں کمی اور افسردگی آگئی تو سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ یا ایسا مفاد پرست جو اپنی مصلحت کی خاطر، اپنے آپ کو ایسا بنا کر دکھائے جیسا (یا جتنا) وہ درحقیقت نہیں اور اس طرح معاشرہ کو دھوکے میں رکھے۔ معاشرہ کے استحکام کیلئے ایسے لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا وجود معاشرہ کے لئے سخت نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ صاحب محیط کے الفاظ میں خَدَّ عٌ کے بنیادی معنی اس اخفاء اور پوشیدگی کے ہیں جسکا قبل ازوقت اندازہ نہ لگایا جاسکے***۔ یہ مفاد پرستانہ ذہنیت کا شیوہ ہوتا ہے، یا سطحی جذبات پرستوں کا۔

قرآن کریم نے اس قسم کی فریب دینے والی ذہنیت کو ”دل کا مرض“ (۱۰) ”قُلُوْا بِرِیْمٍ مَّرَضٌ“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا یہ فریب درحقیقت غیر شعوری طور پر خود ان کی اپنی ذات سے فریب ہوتا ہے۔ (وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ) (۱۱)۔ چونکہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں اسلئے سورہ نساء میں اسے ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ يُخَدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۱۲)۔ ”منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن (اس کے قانون مکافات سے ہوتا یہ ہے کہ) وہ اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں“۔ یعنی وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ (۱۱)۔ ”خدا فریبی“ خود فریبی (Self Deception) کا دوسرا نام ہے، لیکن لوگ اسے سمجھتے نہیں۔ مَا يَشْعُرُوْنَ (۱۱)۔ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ویسے بھی جو شخص جذبات میں اندھا ہو جائے اس کا شعور بیکار ہو جاتا ہے۔

خ د ن

اَلْخِيْدُنُ۔ ساتھی۔ بات چیت کرنے والا۔ دوست*۔ راغب نے لکھا ہے کہ بیشتر یہ ایسے ساتھی کے لئے بولا جاتا ہے جو شہوت نفسانیہ کی وجہ سے کسی کے ساتھ رہے۔ * جن الفاظ میں خاء اور دال اکھٹے آئیں ان میں اثر اندازی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے کے ہیں۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کیلئے کہا ہے۔ مُخْصِنَاتٍ غَيْرِ مُسَافِحَاتٍ وَلَا مَتَخِذَاتٍ اَخْدَانٍ (۳۵)۔ مُخْصِنَاتٍ اور مُسَافِحَاتٍ کے معانی ح۔ ص۔ ن اور س۔ ف۔ ح کے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ بالخصوص ح۔ ص۔ ن کے ماتحت۔ وہاں سے معلوم ہو جائیگا کہ سَفْحٌ کے معنی ہیں محض شہوت رانی کی غرض سے جنسی اختلاط۔ یہاں اس کے ساتھ اِتِّخَاذٍ اَخْدَانٍ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسَافِحَةٌ ”کھلی ہوئی بد کاری تھی“، جس کے لئے عرب جاہلیتہ عورتوں کو پیغام بھیجا کرتے تھے۔ یعنی وہ ان کے معاشرہ کا عام رواج تھا۔ اور خِيْدُنٌ۔ چوری چھپے کی آشنائی کو کہتے تھے۔ منتہا دونوں کا ایک ہی ہے۔ انہیں الگ الگ بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کے

زمانے میں (نکاح کے علاوہ) جنسی اختلاط کی جتنی صورتیں بھی مروج تھیں ان سب کی تردید ہو جائے، اور اس کی ایک ہی شکل باقی رہ جائے۔ یعنی مُحْصِنَاتٌ۔ قلعہ بند اور حصار عفت میں محفوظ۔ نیز مُحْصِنَاتٌ سے مطلب ہے محض شہوت رانی کی خاطر۔ اس میں زنا کاری بھی آجاتی ہے اور وقتی طور پر یا ویسے ہی نکاح کی رسم پوری کر لینے کے بعد، نکاح کی ذمہ داریوں کو (Avoid) کرتے ہوئے جنسی تعلقات بھی۔ اور مُحْصِنَاتٌ أَخْذَانِ کے معنی صرف زنا کاری ہونگے۔ اگرچہ قرآن کریم نے یہ الفاظ لونڈیوں کے ضمن میں کہے ہیں (جو اُس زمانے میں عربوں کے ہاں ہوتی تھیں۔ دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک میں مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ) لیکن اس کا اطلاق عام ہے کیونکہ قرآن کریم کی رو سے زنا کی بہر حال ممانعت ہے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔

بالفاظ دیگر، سَفَحٌ، جنسی جذبات کی تسکین کی (قرآنی نکاح کے علاوہ) ایسی شکل ہوگی جو کسی معاشرہ میں معیوب نہ سمجھی جائے اور خِذْنٌ وہ شکل جسے وہ معاشرہ معیوب سمجھے۔ قرآن کریم کی رو سے جنسی جذبات کی تسکین کی ہر وہ شکل ناجائز ہوگی جو قرآن کریم کی رو سے نکاح اور اس کے مقصد کے خلاف ہو، خواہ کوئی معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ سمجھے۔ جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائش نسل ہے۔

خ ذ ل

خَذَلْتَ الظُّبْيَةَ۔ ہرنی اپنے گلہ سے پیچھے تنہا رہ گئی ایسی ہرنی کو خَذَلٌ اور خَذُولٌ کہتے ہیں۔ زیادہ تر ایسی ہرنی (یا گائے) اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہے*۔ تَخَذَلْتُ رَجُلًا۔ اس کے پاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اس طرح پیچھے رہ گیا۔ ایسے شخص کو رَجُلٌ خَذُولٌ کہتے ہیں*۔ الْخِذْلَانُ۔ ایسے شخص کا وقت پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جس کے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ چھوڑ دینے اور مدد نہ کرنے کے ہیں۔

سورة آل عمران میں ہے اِنْ يَخْذَلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهِ ۚ (۱۵۹) ”اگر وہ تمہیں بے مدد چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا“۔ جس قوم کا ساتھ خدا کا قانون چھوڑ دے (بمقابلہ

يَنْصُرُ (۱۵۹) اور وہ اس طرح باقی قوموں سے پیچھے رہ جائے تو اس کی مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا، خواہ ایک فرد اپنی جماعت سے پیچھے رہ جائے اور خواہ ایک قوم دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے، زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جاتا ہے (۱۶۰)۔ اسلام کے معنی ہیں تمام رفقاء سفر کا کامل ہم آہنگی سے ملکر ساتھ ساتھ چلنا۔ (دیکھئے عنوان س۔ ل۔ م میں تَسَالَمَ)۔ اور آثِم کے معنی ہیں اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانا (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م)۔ لیکن اگر کوئی شخص مختلف قسم کی کششوں سے، جن میں اولاد کے مفاد کی کشش سب سے زیادہ ہوتی ہے ***، جماعت سے پیچھے رہ جائے تو یہ خَذَل ہوگا۔ بہر حال اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ یعنی اپنے انفرادی مفاد اور ذاتی جذبات کی وجہ سے جماعتِ مومنین سے پیچھے رہ جانا۔ یا قرآن کریم کے نظام کو چھوڑ دینے سے اقوامِ عالم کی صف میں پیچھے رہ جانا۔ یہ دونوں خَذَل ہونگے۔

سورة الفرقان میں ہے وَ كَانَ الشَّيْطَانُ لِيْلًا نَسَانٍ خَذُوْلًا (۲۵۹)۔ یعنی انسان کے سرکش جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ انسان کا آخری وقت تک ساتھ دینگے لیکن وہ عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی ایسے جذبات ہمیشہ ہنگامی ہوتے ہیں۔

خ ر ب

الْخَرَابُ۔ ویرانی۔ آبادی یعنی عُمُرَان کی ضد ہے۔ غیر آباد ہونا۔ خَرَبَ۔ غیر آباد ہو جانا۔ اَخْرَبَ۔ غیر آباد کر دینا۔ ویران کر دینا۔ الْخَرَبَةُ۔ ویرانہ، غیر آباد جگہ۔ الْخَرَبَةُ۔ چھلنی۔ عیب۔ دینی خرابی۔ شک و تہمت۔ ابن فارس نے اس سادہ کے اصل معنی کنارہ ٹوٹ کر خراب ہو جانا اور سوراخ ہو جانا بتائے ہیں، جیسے چاقو وغیرہ کی دھار یا کسی چیز کا کنارہ خراب ہو جانے سے دندائے پڑ جاتے ہیں۔ (ابن فارس) الْخَرَبَةُ۔ سوراخ کو کہتے ہیں۔ الْخَرَبَةُ۔ سوئی کے نسا کے کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں ہے يَخْرِبُوْنَ بَيْوتَهُمْ بِاَيْدِيهِمْ (۵۶)۔ ”وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کرتے ہیں“۔ سورة بقرہ میں مساجد کے متعلق ہے کہ جو شخص ان میں ذکر اللہ کے لئے رکاوٹ کا موجب

*** یہ اس جہت سے کہا گیا ہے کہ خِذْل اس ہرنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے۔ * تاج۔ نیز ابن فارس

بنتا ہے ، سَعَىٰ فِي خَرَابِهَا (۱۱۳) ”وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرتا ہے۔“
 لہذا مساجد کی ویرانی یہی نہیں کہ ان میں لوگوں کا اجتماع نہ ہو۔ ان کی
 ویرانی یہ ہے کہ ان میں قوانین خداوندی کا ذکر اذکار اور صفات الہیہ کے
 متعلق بات چیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآمُرُہُمْ
 شُورَىٰ بَيْنَہُمْ (۲۲/۸) اکٹھا آیا ہے۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور باہمی
 مشورہ ، لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری جگہ ہے مشرکین مساجد کو آباد نہیں کر
 سکتے (۱/۹)۔ اس لئے کہ وہ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔

خ ر ج

خُرُوج کے معنی ہیں ابھرنا ، نکلنا۔ باہر آنا۔ الْخُرُجُ۔ خرچ۔ (بمقابلہ
 آمدنی)۔ خَارَجٌ كُلُّ شَيْءٍ۔ ہر چیز کے نکلے ہوئے بیرونی اور ظاہری حصہ
 کو کہتے ہیں۔ الْخَارِجِيُّ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ
 سے عمدگی میں بازی لے جائے اور آگے نکل جائے۔ نیز ہر وہ چیز جو اپنی جنس
 کی چیزوں سے آگے نکل جائے*۔ خَرَجَ فُلَانٌ فِي الصَّنَاعَةِ کے معنی ہیں
 فلاں شخص اپنی کاریگری میں بہت ماہر ہو گیا**۔ نَاقَةُ مُخْتَرَجَةٍ۔
 وہ اونٹنی جو اونٹنیوں کی صفات سے نکل کر اونٹ کی ہم صفت ہو*۔ یَوْمَ
 الْخُرُوجِ۔ عید اور میلے کے دن کو کہتے ہیں جب لوگ زینت و زیبائش
 کے ساتھ باہر نکلیں*۔ خَرَجَتِ الرَّعِیْقَةُ عَلَی التَّوَالِیِ۔ اس وقت کہتے
 ہیں جب رعیت اپنے امیر سے باغی ہو جائے اور اطاعت چھوڑ دے**۔

قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ بارش سے کس طرح زمینِ مرده از سر نو
 زندگی حاصل کر لیتی ہے، کہا کَذَٰلِکَ الْخُرُوجُ (۵/۱۲)۔ اسی طرح
 ”خروج“ ہوگا۔ یہاں خُرُوج کے معنی حیاتِ نو کے ہیں۔ اسی کو ذرا آگے
 چل کر یَوْمَ الْخُرُوجِ (۵/۱۲) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں قیامت۔
 ساعت۔ بعث۔ خروج وغیرہ الفاظ اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب
 میں حیاتِ نو کا پہلو مضمحل ہوتا ہے۔ یہ حیاتِ نو خواہ کسی قوم کے زوال کے
 بعد اس کا عروج ہو، یا پوری انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا، یا
 انسان کی موت کے بعد حیاتِ اخروی۔ یہ تمام تصورات ان اصطلاحات میں شامل
 ہیں اور سیاق و سباق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں مقام پر کونسا مفہوم
 مراد لیا جائیگا۔

خُرُجٌ اور خَرَجٌ کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے (مثلاً ۱۸/۹۱؛
 ۲۳/۱)۔ اس کے معنی ہیں وہ رقم جو اپنی دولت میں سے نکال کر دوسرے کو

دیدنی جائے۔ (ہم نے خَرَج کی فقہی اصطلاح سے بحث نہیں کی کیونکہ اس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآن کے-ریم میں نہیں آیا)۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عربوں کے ہاں خَرَج وہ معینہ مقدار ہوتی تھی جو آقا اپنے غلام پر روزانہ یا ماہوار مقرر کر دیتا تھا کہ وہ اس قدر اسے ادا کر دیا کرے۔ اس کے بعد خَرَج کا لفظ اس ٹیکس کے لئے بولا جانے لگا جو زمین پر لگایا جاتا تھا (جو ٹیکس زمینوں پر لگایا جاتا تھا۔ یعنی جِزْیۃ سے خَرَج۔ کہتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات اسے خَرَج بھی کہہ دیتے تھے)۔ اب ہر اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو گورنمنٹ لوگوں کے اموال سے وصول کرے۔ دراصل شروع میں خَرَج زمین کی پیدوار کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جائیدادوں سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کے لئے بھی یہی لفظ بولا جانے لگا*۔

خَارَج - وہ جو نکل پڑے۔ مَخْرَج - نکلنے کی جگہ۔ اخْرَج - نکالنا۔ پیدا کرنا۔ اخْرَج - نکال باہر کرنا۔ پیدا کرنا۔ مَخْرَج - وہ جو پیدا کرے۔ نکالے۔ مَخْرَج - وہ جو پیدا کیا گیا ہو۔ یا وہ جگہ یا وقت جہاں سے یا جس میں کوئی چیز نکالی گئی ہو (۱/۸۰)۔ اسْتَخْرَج - نکال لینا۔ سورۃ بقرہ میں اخْرَجَ بِمَقَابِلِہِ کِتْمَانَ آیا ہے (۲/۲۲)۔ یعنی ظاہر کرنا۔ اسی سورہ میں قصہ آدم کے ضمن میں پہلے آیا ہے فَاسْتَخْرَجْنَاهُمَا - اس نے ان دونوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اور اس کے بعد ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوا - (۲/۳۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ خُرُوج اور هَبْطٌ الگ الگ ہیں۔ خُرُوج محض نکلنا ہے اور هَبْطٌ میں گراوٹ بھی شامل ہے۔ یعنی اپنے مقام سے نیچے گر جانا۔ (تفصیل میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی)۔

خ ر د ل

الْخِرْدَلُ - رائی۔ خِرْدَلُ التَّدْحِیم - اس نے گوشت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے*۔ قرآن کریم میں ہے مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خِرْدَلٍ (۲۱/۲۱)۔ ”رائی کے ایک دانے کے برابر“۔

خ ر ر

الْخَرِيرُ - پانی یا ہوا کے چلنے کی سرسراہٹ۔ اڑنے میں عقاب کے پروں کی آواز۔ سونے میں خراٹوں کی آواز۔ الْخَرَرُ - دراصل یہ بلندی سے اس طرح گرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی گرنے کی آواز بھی سنائی دے

پھر ہر گرنے کے لئے استعمال ہونے لگا *۔ خَقَرُمُوسٰی صَعِقًا (۱۳۴) ”موسٰی کڑک سے بیہوش ہو کر گر پڑے“۔ یا فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ (۲۲) ”گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے گرا ہو“۔ (یہ مشرک کی حالت بیان کی گئی ہے)۔

سورۃ فرقان میں مومنین کی بہت سی صفات گنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اِذَاذُ كَسِرُ وَاِبْيَاسٍ رَّبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلٰیهَا صُمًّا وَاَعْمٰیَانَا (۲۵) ”جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھرے اور اندھے بن کر گر نہیں پڑتے“، (بلکہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ خَرَّ عَلٰی الشَّیْءِ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز پر قائم رہنا **۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسمی طور پر تو ایک طرف رہا، جذباتی طور پر، بلا غور و فکر تمسک بالقرآن بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عمل بالقرآن غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ تمسک بالکتاب سے مقصد کیا ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو خدا اپنی آیات کو بھی بہروں اور اندھوں کی طرح بلا سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے ماننے اور ان پر قائم رہنے کی اجازت نہ دیتا ہو وہ غیر خداوندی باتوں کو بلا غور و فکر تسلیم کر لینے کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہ مومن کی صفت ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جاتا۔ اُسے اس کا حکم ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۶)۔ ”جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یقیناً سماعت۔ بصارت اور قلب، ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت پوچھا جائیگا۔ علم کے لئے سمع، بصر (یعنی حواس) اور قلب (Mind) کی شہادت ضروری ہے۔ اور مومن وہ ہے جو احکام الہیہ اور قوانین خداوندی کو علی وجہ البصیرت مانتا ہے۔

خ ر ص

اَلْخِرُّصُ۔ اندازہ کرنا۔ تخمینہ لگانا۔ یعنی غیر یقینی چیزوں میں محض ظن و گمان سے کچھ کہنا۔ خَرُّصُ التَّنْخِلِ۔ کھجور کے درخت پر اندازہ کرنا کہ اسمیں کسقدر پھل ہوگا۔ کَمْ خِرُّصُ اَرْضِکَ۔ تمہاری زمین کی پیداوار اندازاً کتنی ہوگی؟ اس اعتبار سے ہر ظنی و تخمینی بات، بلکہ جھوٹی

بات، کو **الْخَرَصُ** کہتے ہیں *۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے **إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَأِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ** (۱۱۷) ”یہ لوگ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں“۔ سورۃ ذاریت میں ہے **قَتِيلَ الْخَرَصِ** (۱۱۷) ”محض ظن و قیاس کی اتباع کرنے والے تباہ و برباد ہو جائیں گے“۔ حقائق کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے۔ اسلئے دین کا سارا مدار یقین پر ہے۔ کوئی ظنی اور قیاسی بات دین نہیں بن سکتی۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے (خود قرآن کریم کی داخلی اور تاریخ کی خارجی شہادت اس پر دلالت کرتی ہے) اسلئے یہ یقینی طور پر دین ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا حقیقی معیار۔ راغب نے کہا ہے کہ ظن و تخمین سے کوئی بات کہنا، خواہ وہ حق کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، کذب (جھوٹ) ہے۔ اس اعتبار سے **خَرَصَ** کے معنی **كَذَّبَ** (جھوٹا) ہوتے ہیں۔ ** **خَرَصَ**۔ اس نے جھوٹ بولا ***۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ظن و تخمین کا اتباع کرنے والے تباہ ہوں گے۔ لہذا دین میں ظنیات کا اتباع کرنے والے (قرآن کریم کے دعوے کی رو سے) کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ خود ہماری اپنی حالت اسکی زندہ شہادت ہے۔

خ ر ط م

الْخُرْطُومُ۔ ناک * یا ناک کا اگلا حصہ۔ ہاتھی کی سونڈ کو بھی کہتے ہیں ***۔ ثعلب نے کہا ہے کہ عام طور پر درندوں کی تھوٹھنی کو **خَطْمٌ** اور **خُرْطُومٌ** کہتے ہیں۔ **خَرَّاطِيْمٌ الْقَوْمُ**۔ قوم کے سردار جو ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں *۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ”فلاں شخص قوم کی ناک ہے“۔ یہ باشرف ہونے سے کنایہ ہے۔ یا کہتے ہیں ”ناک کٹ گئی“۔ یعنی وہ بے عزت ہو گیا۔

قرآن کریم میں ہے **سَنَسِيْمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ** (۶۸) ”ہم اسکی ناک پر داغ لگائیں گے“۔ مطلب ذلیل کرنے سے ہے کیونکہ چہرہ یا ناک کا داغ کر دینا انتہائی ذلت کی بات ہوتی تھی ***۔ اس میں توہین و ذلت کا ایسا پہلو ہے جو چھپائے نہ چھپے۔

خ ر ق

الْخَرْقُ۔ کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بے قاعدہ پھاڑ ڈالنا۔ یہ **الْمَخْلُقُ** کی ضد ہے جسکے معنی کسی چیز کو اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی

سے بنانے کے ہیں *۔ خَرَقَ السَّوْبَ - اسنے بغیر اندازے کے کپڑے کو پھاڑ ڈالا **۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ (۱۷۰)۔ اس کے معنی پھاڑ ڈالنے یا سوراخ کر دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک (مسافت) قطع کرنے کے ہیں **۔ سورۃ کہف میں کشتی میں سوراخ کر دینے کے لئے خَرَقَهَا (۱۸۱) آیا ہے۔

خَرَقَ - اس نے جھوٹ بولا۔ خَرَقَ الْكَذِبَ - اس نے جھوٹ تراشا۔ اَلتَّخْرِقُ - جھوٹ بنانا۔ اَلتَّخْرِيقُ - کثرت سے جھوٹ بولنا **۔ سورۃ انعام میں ہے وَخَرَقُوا اللّٰهَ بَنِيْنَ (۱۶۱) وہ خدا کے لئے اولاد کا عقیدہ رکھتے ہیں جو یکسر جھوٹ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ غور و فکر اور قاعدے اور قانون سب کے خلاف ہے۔ اس سے حقیقت کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔

خ ز ن

اَلْخَزْنُ کے بنیادی معنی کسی چیز کے ذخیرہ کرنے کے ہیں ***۔ اَلْخِزَانَةُ وَالْخِزْيَنَةُ وَالْمَخْزَنُ وہ جگہ جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جائے ***۔ اَلْخِزْيَنَةُ - وہ چیز جس کو حفاظت سے چھپا کر، بچا کر رکھا گیا ہو۔ اسکی جمع خَزَائِنُ ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَا اَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللّٰهِ (۷۰)۔ ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں،“۔ خَاَزَنٌ - جمع کرنے والا۔ یا محافظ (اسکی جمع خَاَزِنُوْنَ اور خَزَنَةٌ ہے) قرآن کریم میں ہے وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا (۳۹) ”جنت کے محافظ اُن سے کہہینگے،“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ (خَزْنٌ) کے بنیادی معنی بچا کر حفاظت سے رکھنے کے ہیں۔ خَزَائِنُ اللّٰهِ کائنات کی وہ قوتیں اور ذخائر ہیں جو ہنوز انسان کے علم میں نہ آئے ہوں۔

خ ز ی

خِزْيٌ کے معنی ایسی ذلت ہے جس سے شرم آجائے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ذلت اور شرم دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اسکے معنی ہونگے ذلت آمیز رسوائی۔ یا ان عیوب کو بطور مزا ظاہر کرنا جن کا اظہار باعث شرم ہو **۔

قرآن کریم میں ضابطہ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۵) بتایا گیا ہے۔ یعنی اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز رسوائیاں۔ سورۃ طہ میں نَذِلَّ وَنَخْزِيْ (۲۳۳) ساتھ ساتھ آئے ہیں

جہاں اسکے معنی شرم و ندامت ہے۔ یعنی خفیف اور شرمسار ہونا۔ سورۃ الحجرات میں یہ لفظ تَفْضُحُوْنَ (۱۹) کے ساتھ آیا ہے۔ فضیحت و رسوائی۔ مَخْزِی الْكَافِرِیْنَ۔ کافروں کو ذلت آمیز رسوائیاں دینے والا (۲)۔ دنیا میں عزت و شرف کی زندگی مومن کا شعار ہے۔ ذلت و رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ لہذا جو قوم دنیا میں ذلیل و رسوا ہو وہ مومنین کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی دور کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی قوم زندگی کی خوشگوار یوں سے دور (محروم) کر دی جاتی ہے۔ اور یہ انتہائی ذلت ہے۔

اگر کسی قوم کے متعلق یہ دیکھنا ہو کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے یا نہیں، تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط اور عزت و شرف کی حامل ہے یا اقوام عالم کے مقابلہ میں ذلیل و خوار ہے۔ اگر وہ ذلیل و خوار ہے تو وہ قوانین خداوندی کے مطابق نہیں چل رہی۔ اس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جو قوم ان قوانین کے مطابق تو زندگی بسر کرتی ہے جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں (یعنی تسخیر فطرت کرتی ہے) لیکن اپنی تمدنی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع رکھتی ہے، اسے مفساد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ اقوام مغرب کا شمار انہیں میں ہے۔

(۲) جو قوم تسخیر فطرت بھی کرتی ہے اور اپنی تمدنی زندگی بھی قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق بسر کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی بھی عزت و شرف کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت بھی درخشندہ و تابناک۔ یہ جماعت مومنین کی خصوصیت ہے۔ لیکن

(۳) جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے اور نہ اپنی تمدنی زندگی قرآن کریم کے مطابق رکھتی ہے، اسکی دنیا بھی خراب ہوتی ہے اور آخرت بھی تباہ۔ ہم اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ خِزْیٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) ”دنیاوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹنا“۔

خ س ا

الْخَسِیْسُ۔ ردی اُون کو کہتے ہیں جسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس جہت سے اس سادہ میں حقارت و نفرت کے معنی پیدا ہو گئے

ہو گئے۔ چنانچہ خَسَاً الْكَلْبُ کے معنی ہیں اس نے کتے کو دھتکار دیا اور خَسَاً الْكَلْبُ۔ کتا راندہ ہوا (یہ لازم و متعدی ہے)۔ الْخَسَاةُ۔ ذلیل۔ کمینہ۔ دھتکارا ہوا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دور کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں قِرْدَةً خَاسِيَةً آیا ہے (۲/۲۵)۔ ”ذلیل بندر“۔ اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ق۔ ر۔ د) خَسَاً الْبَصَرُ۔ نگاہ حیران ہو کر تھک گئی*۔ سورة الملک میں ہے يَتَّقِلِبُ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِيَةً (۹۶/۱) ”نگاہ درماندہ ہو کر کاشانہ چشم میں لوٹ آئیگی“۔ سورة المومنون میں اهل جہنم کے متعلق ہے اخْسِئُوا فِيْهَا (۲۳/۱۸) ”اس میں ذلت و خواری کے ساتھ رہو“۔ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم اور دور رہو۔

خ س ر

خَسِرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں وہ شخص راستہ سے گم ہو گیا**۔ ہلاک ہو گیا***۔ الْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ کے معنی ہیں کمی کرنا۔ نقص۔ خَسِرَ الْوِزْنَ وَالْكَيْلَ وَالْأَخْسَرُ۔ اس نے ماپ تول میں کمی کی۔ بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ الْخَسِيرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرے، اور لیتے وقت زیادہ لے**۔ قرآن کریم میں ہے أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ (۲۶/۱۸۱) ”ماپ کو پورا کیا کرو اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ سورة تطفیف میں ہے۔ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوفُونَ وَإِذَا كَالُواهُمْ أَوْ زَنَوْهُمْ يَخْسِرُونَ (۸۳/۳)۔ ”جب لوگوں سے لیتے ہیں تو ماپ تول پورا کرتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ماپ تول میں کمی کر دیتے ہیں“۔ (یہ آیت معاشیات کا بہت بڑا اصول بیان کرتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان، ب۔ ی۔ ع) سورة الرحمن میں ہے وَأَقِيمُوا الْوِزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَخْسِرُوا الْمِيزَانَ (۹۵/۹)۔ ”وزن کو عدل کے ساتھ پورا رکھو اور تول میں کمی نہ کرو“۔ نیز معاشرہ کے توازن کو مت بگاڑو۔

صَفْقَةً خَاسِرَةً کے معنی ہیں غیر نفع بخش سودا جس میں نقصان ہو**۔ الْخَيْسَرِ کے معنی ہیں دھوکہ۔ فریب۔ عہد شکنی۔ کمینگی، خسارہ۔ خَسِرَهُ تَخْسِيرًا۔ اسکو ہلاک کر دیا**۔

الْخَسِيرُ - راستے سے گم ہو جانے والا - ہلاک ہو جانے والا - جو شخص کامیاب نہ ہو سکے** - جو تجارت میں گھائے میں رہے - راغب نے کہا ہے کہ خَسِيرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہیں - یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان، صحت و عزت میں کمی دونوں کے لئے خَسِيرٌ بولا جاتا ہے*** - ابن الاعرابی نے الخَسِيرُ کے معنی اس شخص کے کئے ہیں جو عقل و مال دونوں کھو چکا ہو* -

خَسِيرٌ - نقصان - تباہی* - اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ خَسِيرٌ (۱۰۳) - اگر انسان (کو بلا وحی کے تنہا چھوڑ دیا جائے تو) یہ نقصان ہی نقصان میں رہے گا - ”اس نقصان میں ہر قسم کا زیاں شامل ہے - خَسَارٌ - ہلاکت - نقصان - نقصان اٹھانے والا - اَخْسَرُ - سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والا - تَخْسِيرٌ - نقصان دینا - گھائے میں رکھنا - خیر سے دور کر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نقصان اور کمی کے ہیں -

خ س ف

خَسَفَ الْمَكَانُ - يَخْسِفُ - خُسُوفًا - وہ جگہ زمین کے اندر دھنس گئی**** - ابن فارس نے اس کے معنی اندر گہرائی میں جا کر چھپ جانا اور دھنس جانا بتائے ہیں - قرآن کریم میں ہے فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِءَاْرِهِمُ الْاَرْضَ (۲۸/۱) ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا - نیست و نابود کر دیا - خَسَفَ کے ایک بنیادی معنی جانور کو بلا چارہ اور گھاس کے باندھے رکھنا بھی ہیں - اسی سے اس کے معنی کسی پر جور و ظلم اور زیادتی کرنا ہونگے، پھر یہ لفظ، ذلت، توہین اور جبر کرنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا - الْخَسِيفُ - لاغر - کمزور - بَاتَ الْقَوْمُ عَلٰى الْخَسِيفِ - لوگوں نے بھوکے رات گزار دی - سَامَهُ خَسِيفًا اس نے اسے ذلیل و خوار کیا - الْخَسِيفُ - اندر کو دھنسا ہوا - اَخْسَفَتِ الْعَيْنُ - آنکھ اندھی ہو گئی**** -

قرآن کریم میں يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهٖمُ الْاَرْضَ (۱۶/۱) تباہی اور بربادی کے معنوں میں آیا ہے (یعنی اللہ انہیں زمین میں دھنسا دیگا - تباہ و برباد کر دیگا - خُسُوفٌ - چاند گہن کو کہتے ہیں**** - بَشُرٌ مَخْسُوفَةٌ - وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو*** - قرآن کریم میں (نبی اکرمؐ کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے سلسلہ میں ہے) خَسَفَتِ الْقَمَرَ (۵۵/۸) -

جس کا مطلب یہ ہے کہ عرب جاہلیت (جن کا نشان قمر تھا) کا زور ٹوٹ جائیگا۔ وہ کمزور اور مساند پڑ جائیں گے۔ ان کی مخالفت اور سرکشی ختم ہو جائیگی۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ لیکن اگر اس کے حقیقی معنی لئے جائیں تو ترجمہ ہوگا ”چاند کو گہن لگ گیا۔ مساند پڑ گیا“۔

خ ش ب

خَشَبٌ - موٹی لکڑی۔ جمع خَشَبٌ*۔ قرآن کریم نے منافقین کو خَشَبٌ مَسْنَدَةٌ (۶۳) سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ایسی لکڑیاں جو دیوار کے آسرے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ خَشَبَةٌ خَشْبَاءُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اندر سے گہن نے کھا لیا ہو**۔ یعنی نہ ان میں عقل و فکر ہے نہ زندگی کی کوئی تازگی۔ نہ دماغ صحیح نہ قلب زندہ۔ نرے کندہ نا تراش ہیں۔ چنانچہ خَشَبُ الشَّيْعَرِ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یونہی روانی سے شعر کہہ دے اور اسے کاٹ چھانٹ کر خوبصورت نہ بنائے۔ اور فَحْلٌ خَشِيبٌ - اس نئے اونٹ کو کہتے ہیں جو سدھایا نہ جا سکا ہو۔ جَبْمَةٌ خَشْبَاءٌ - کٹھری پیشانی***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سخت اور کھردرا ہونے کے ہیں۔ اَلْخَشَبُ پتھریلے اور سخت پہاڑ کو کہتے ہیں۔ نیز اس تلوار کو جو تازہ بننے کی وجہ سے ہموار اور چکنی نہ ہو۔

ان معانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کو خَشَبٌ کہہ کر کیوں پکارا ہے۔

خ ش ع

خَشَعَ کے معنی ہیں نگاہ یا آواز کا پست ہو جانا*۔ خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ (۱۰۸) ”آوازیں پست ہو جائیں گی“، اور خَاشِعَةٌ أَبْصَارُهُمْ (۶۸) ”ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی“، اس کے بعد ہے تَرَوْهُمْ ذِلَّةً () (انہیں ذلت آئے گی)۔ اس سے خَاشِعَةٌ أَبْصَارُهُمْ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ذلت و خواری کی وجہ سے نگاہوں کا جھک جانا۔ خَشَعَتِ الْأَرْضُ - زمین خشک ہوئی اور اس پر پانی نہ برسنا* خُشُوعُ الْكُتُبِ کے معنی ہیں ستارہ کا غروب ہوتے وقت جھک جانا۔ خَشَعَتِ الشَّمْسُ - سورج کو گہن لگ گیا۔ اِخْتَشَعَ - سر جھکا کر نگاہ

نیچسی کرنا *۔ اَلْخَشْعَةُ۔ زمین کے سخت اور سنگلاخ قطعہ کو کہتے ہیں جس میں سبزہ نہ اُگے۔ نیز اَلْخَاشِعُ۔ گرد و غبار سے بھری ہوئی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پڑاؤ نہ کیا جاسکے *۔ قرآن کریم میں زمینِ مردہ کے لئے خَاشِعَةً (۳۹) آیا ہے۔ سورۃ غاشیہ میں نَاعِمَةً کے مقابلہ میں خَاشِعَةً آیا ہے (۸۸)۔ نَاعِمَةً کے معنی شگفتہ و شاداب اور تر و تازہ ہیں اس لئے خَاشِعَةً کے معنی افسردہ و پژمردہ ہونگے۔ قرآن کریم نے اس کے بعد عَامِلَةً نَاصِبَةً (۸۸) کہہ کر اس کی وضاحت کردی۔ یعنی تھکے ماندے۔ بے رونق۔ خَاشِعِیْنِ۔ ان لوگوں کے لئے بھی آیا ہے جو قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائیں۔ قرآن کریم نے اس کے معنی کئے ہیں اَلَّذِیْنَ یُظْلَمُونَ اَنْتَهُمْ مُّسْلِقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنْتَهُمْ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (۲۶)۔ یعنی وہ لوگ جو اس کا گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کا سامنا کرنا ہے۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے بارے میں خدا کے قانون سکافات کے سامنے جواب دہ ہیں اس لئے وہ ہر معاملہ میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے خَشْوَعٌ سے مقصود۔ قلب سلیم سے قوانین خداوندی کے سامنے جھک جانا۔ سر تسلیم خم کر دینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ خَشْعٌ کے معنی ہیں سر کو جھکا دیا۔

خ ش ی

اَلْخِشْيٰی۔ خشک پودے کو کہتے ہیں۔ اَلْخِشَاعُ۔ خشک پتھریلی زمین جہاں کچھ پیدا نہ ہو *۔ عربوں کے نزدیک پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے سبزی کا خشک ہو جانا سخت خطرہ کا موجب ہوتا تھا۔ اس لئے خَشِیَّةٌ کا لفظ کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ہو جانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ خَشِیَّةٌ۔ خَوْفٌ سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اہل عرب کے قول شَجَرَةٌ خَاشِیَّةٌ سے ماخوذ ہے، یعنی بالکل خشک درخت جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہے۔ اس کے برعکس خَوْفٌ کا لفظ صرف نقصان کے لئے آتا ہے کیونکہ وہ نَاقَۃٌ خَوْفَاءٌ سے ماخوذ ہے یعنی بیمار اونٹنی جو مر نہیں گئی بلکہ اس کی زندگی کی آس باقی ہے *۔ نیز خَشِیَّةٌ میں احتمال، امید اور توقع کے معنی بھی پائے جاتے ہیں جیسے خَشِیَّتٌ اَنْ یَّکُوْنَ ذٰلِکَ اَسْهَلٌ لَّکَ۔ مجھے امید یا توقع تھی کہ یہ تمہارے لئے زیادہ آسان ہوگا۔ اسی طرح اس میں عَلِیْمٌ (جاننے) کے معنی بھی پائے گئے ہیں (۲۰) (خَوْفٌ

کا لفظ بھی جاننے کے معنوں میں آتا ہے دیکھئے عنوان (خ - و - ف)۔ جب اس کے معنی خوف کے ہوں تو اس سے مراد ہوتا ہے اس قسم کا خوف جو کسی کی عظمت سے دل پر طاری ہو جائے*۔ خَشْيَةً کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کے انجام کا علم ہونے کی وجہ سے اس سے اندیشہ کرنا (۱۸/۸)۔ یا اسے ناپسند کرنا*۔ خشیت الہی سے عام طور پر مراد لی جاتی ہے خدا کا ڈر۔ لیکن اس ڈر کا صحیح مفہوم خشیت کے بنیادی معنوں سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی کوششوں کی کھیتی سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ (ہم المفلحون ۲/۵)۔ ان کی محنتوں کا بیج ایک شجر طیب بن جاتا ہے جسکی جڑیں زمین میں مستحکم ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی۔ اور وہ ہر موسم میں مسلسل پھل دیتا رہتا ہے (۱۳/۲)۔ یہ نتیجہ ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس اگر قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کی جائے تو انسان کی کوششوں کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں۔ اور اس کی محنتوں کے پودے خشک ہو جاتے ہیں۔ اس امر کا احساس کہ اگر ہم قانون خداوندی کے مطابق نہ چلے تو ہماری کھیتی جھلس کر رہ جائیگی، خَشْيَةَ اللَّهِ (خدا کا ڈر) کہلاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج و عواقب کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احتمال، توقع، اندیشہ، اور علم کا پہلو مضمحل ہوتا ہے، اور ان قوانین کے غیر متبادل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی۔ یہ ہے اصل مفہوم خَشْيَةَ اللَّهِ (خدا کے ڈر) کا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے خ - و - ف کا عنوان)۔

سورة توبہ میں ہے اَتَخْشَوْنَہُمْ فَاِنَّ لِلّٰہٗ اَحَقَّ اَنْ تَخْشَوْہُ (۹/۱۳)۔ تم اس سے تو ڈرتے ہو کہ ان لوگوں کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا حالانکہ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہئے کہ اگر قانون خداوندی کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ”نتائج کا ڈر“، یہ ہے خَشْيَت کا صحیح مفہوم۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا (۲۴/۱) ”وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو“۔

خ ص ص

الْخَصَاصُ کے بنیادی معنی ہیں خلل یا شگاف جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جائے اور اس طرح انہیں الگ الگ کر دے۔ چونکہ شگاف

سے چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَصَاصَةٌ کے معنی تنگی - بد حالی - فقر و فاقہ - ضرورت اور حاجت کے ہو گئے (۵۹)۔ انگور کی بیل سے پھل توڑ لینے کے بعد کہیں کہیں جو ا کا د کا دانے باقی رہ جائیں انہیں اَلْخَصَاصَةُ کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں شکستگی اور خلاء (کھلی جگہ) کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس طرح اَلْخَصَاصَةُ کے معنی ہوئے فقر اور حالت میں شکستگی۔

یہ اس کے اولین معنی ہیں۔ چونکہ جن دو چیزوں کے درمیان شگاف آجائے وہ ایک دوسری سے الگ ہو جاتی ہیں، اس لئے خَصُوصٌ کے معنی ہیں کسی کو دوسروں سے الگ کر کے اس کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا۔ لہذا خاصٌّ - عامٌّ کی ضد ہے۔ یعنی عمومی کے مقابلہ میں خصوصی آئے گا۔ خَصَّصَہُ وَاخْتَصَّصَہُ۔ اس کو باقیوں سے الگ کر کے اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا۔ یعنی ایسا برتاؤ جس میں دوسرے لوگ شریک نہ تھے*۔ (۲۵)۔ خَصَّ الشَّيْءُ - کوئی چیز عام نہ ہوئی۔ خَصَّ الرَّجُلُ خَصَاصَةً وہ ضرورت مند اور محتاج ہوا**۔

دوسروں سے الگ کر کے، خصوصی برتاؤ کے سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی یہ آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ (۱۰۵)۔ ”اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے“ یہاں رحمت کے معنی وحی خداوندی ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ عام انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب (الگ) کر کے اسے وحی عطا کر دیتا ہے۔ وحی چونکہ وہی عطیہ ہے جو اکتسابی طور پر نہیں مل سکتی، اس لئے وحی کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ملتی۔ یہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُسے ملتی ہے (بلکہ یوں کہئے کہ اُسے ملتی تھی۔ کیونکہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے) جسے خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق دینا چاہے۔

خ ص ف

اَلْخَصْفُ - وہ جوتا جس میں اوپر تلے برابر کے چمڑے ہوں۔ اسکا ہر چمڑا خَصْفَةٌ کہلاتا ہے۔ خَصَفَ السَّعْلُ يَخْصِفُہَا - جوتے پر دو برابر کے چمڑوں کو اوپر تلے رکھ کر سی دیا۔ خَصَفَ کے معنی ملانے اور جمع کرنے نیز جوڑنے، پیوند لگانے اور گانٹھنے کے بھی آتے ہیں۔ خَصَفَ الْعُرْيَانُ الْوَرَقَ عَلٰی بَدَنِہِ - ننگے آدمی نے اپنے بدن پر پتوں کو چپکا لیا

لیا اور انہیں تو برتور رکھ لیا تاکہ مقرر ڈھانپا جا سکے *۔ قرآن کریم میں قصہ آدم کے ضمن میں ہے وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ رَقِ الْجَنَّةِ (۲۲)۔ ”وہ باغ کے پتوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے،“۔ جنسی شعور کی بیداری، یعنی حیا کے احساس سے مراد ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”ابلیس و آدم،“ میں ملیگی)۔

الْخَصِيفُ کے معنی ہوتے ہیں جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کے لئے بہ تکلف کوشش کرنا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا۔

خ ص م

الْخَصْوْمَةُ۔ جھگڑا۔ الْخَصْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ (یہ واحد۔ جمع۔ تشبیہ۔ سب کیلئے آتا ہے)۔ الْخَصِيمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ الْخَصْمُ۔ ہر چیز کا کنارہ، گوشہ۔ الْخَصْوْمُ۔ وادیوں کے دھانے *۔

قرآن کریم میں ہے اَلَدِّ الْخِصَامِ (۲۰۳) ”سخت جھگڑالو،“۔ سورۃ حج میں ہے هٰذَا اِنْ خَصِمْنَا (۲۲)۔ ”یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں،“۔

سورۃ نحل میں انسان کے متعلق ہے هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (۱۶)۔ یعنی اگر اسے وحی کی روشنی کے بغیر علی حالہ رہنے دیا جائے تو یہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا نظر آئیگا۔ (نیز دیکھئے عنوان ج۔ د۔ ل)۔ سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَّ بُوهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۸-۵۹)۔ ”یہ لوگ (ان باتوں کو) تجھ سے صرف جھگڑنے کی خاطر بیان کرتے ہیں۔ یہ ہیں ہی جھگڑالو،“۔ سورہ آل عمران میں (ہیکل کے پجاریوں کے ضمن میں) ہے وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ (۳۳) ”تو ان کے پاس نہیں تھا جب وہ آپس میں جھگڑتے تھے،“۔

خ ض د

خَضَدٌ۔ کسی گیلی یا سوکھی چیز کو موڑنا یا اس طرح توڑنا کہ وہ ٹوٹ تو جائے لیکن الگ نہ ہو۔ کبھی یہ کاٹنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خَضَدَ الشَّجَرُ۔ اسنے درخت کے کانٹے توڑ ڈالے (اور اس طرح

اس میں جو ایذا رساں عنصر تھا اسے ختم کر دیا)۔ اِنْخَضَتْ
الْثَّمَارُ۔ پھل پچک گئے اور رس نکل جانے سے ان کی ترو تازگی ختم ہو
گئی۔ رَجُلٌ مَخْضُودٌ۔ وہ آدمی جس کے پاس کوئی حجت نہ رہے یا جو
چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے۔ *۔ اخْتَضَدَ الْبَعِيرُ۔ اس نے قابو پانے
کے لئے اونٹ کے نکیل ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا **۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے فِي سِدْرٍ مَخْضُودٍ
(۵۶/۲۸) ایسی بیریاں جن کی شاخیں پھل کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہوں۔ یا ایسی
لذتیں جن سے ہر قسم کی خلش اور کانٹا نکال دیا گیا ہو۔ اور اگر اسے استعارۃً
لیا جائے (دیکھئے عنوان س۔ د۔ ر) تو اسکا مطلب ہوگا، حیرت کی فراوانی
لیکن اُس میں شکوک و اضطراب کی کوئی خلش نہ ہو (۵۳/۱۳)۔

خ ض ر

الْخَضِرَةُ۔ سبز رنگ۔ جمع خَضِرٌ اور خَضِرٌ۔ قرآن کریم میں ثِيَابٌ
سُنْدُسٌ خَضِرٌ (۲۱/۶۱) آیا ہے۔ یعنی سبز رنگ کے ریشمی کپڑے۔ یہاں
خَضِرٌ، أَخْضَرٌ کی جمع ہے۔ الْخَضِيرُ۔ سبزہ (۱۱/۶۱)۔ سبز کھیتی۔ الْخَضِرُ۔
نرم و نازک اور سبز ہونا۔ الْخَضِرَاءُ۔ بھلائی۔ فراخی۔ نعمت۔ سرسبزی و
شادابی *۔ چونکہ سبز رنگ زیادہ گہرا ہو کر مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے
اسلئے عربوں کے ہاں اَسْوَدٌ کو أَخْضَرٌ اور أَخْضَرٌ کو اَسْوَدٌ بھی
بولتے ہیں ***۔ بلکہ ابن فارس نے تو کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جو رنگ
سفید رنگ سے مختلف ہو اس میں سیاہ رنگ کا شائبہ ہوتا ہے۔ مَخْضَرَةٌ
(۲۲/۶۳) جو سبز ہو۔

الْخَضِرُ۔ الْخَضِيرُ۔ ”آبِ حیات والے خواجہ خضر، جن کے
متعلق مشہور ہے کہ وہ پانیوں کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔
لیکن یہ محض ”شاعری“ ہے۔ قرآن کریم میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔

خ ض ع

الْخَضُوعُ۔ جھکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ خَضَعَ النَّجْمُ۔
ستارہ غروب ہونے کی طرف مائل ہو گیا۔ اَلَا خَضَعَ۔ وہ شخص جس کی
گردن میں پیدائشی طور پر پستی اور جھکاؤ ہو۔ جو بے دست و پا ہو چکا ہو۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

خَضَعَهُ الْكِبَرُ - بڑھاپے نے اسے جھکا دیا - الْخَضِيعَةُ - سیلاب کی (نرم نرم) آواز - اخضع الرّجل - آدمی نے گفتگو میں سوچ پیدا کی - الْخَضِيعَةُ - وہ آدمی جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری کرتا ہو - خضع - وہ ساکن اور مطیع ہو گیا* -

قرآن کریم میں امہات المومنین رضی (نبی اکرم کی ازواج مطہرات) سے کہا گیا ہے فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (۳۳) ”اپنی گفتگو میں نرمی اور لوچ نہ پیدا کرو“ - تمکنت اور وقار سے باتیں کرو -

گردنیں جھک جانے، یعنی مطیع و فرمانبردار ہوجانے کے لئے خاضع کا لفظ (۲۶) میں آیا ہے - اَعْنَاقَهُمْ لَهَا خاضِعِينَ - ”ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں“ -

خ ط ا

الْخَطْءُ - الْخَطَا - الْخَطَاةُ - غلط - نادرست** - اس کے معنی نشانہ خطا (Miss) کر جانا ہیں*** - کہتے ہیں کہ الْخَطَاةُ اس قصور کو کہتے ہیں جو عمداً نہ کیا جائے اور الْخَطِيئَةُ وہ قصور ہے جو عمداً سرزد ہو** - لیکن صاحب محیط کے نزدیک الْخَطِيئَةُ - بلا ارادہ اور بلا عمد بھی ہو سکتا ہے - لیکن ائیم ہمیشہ عمداً ہوتا ہے*** - خَطِيئَةُ کی جمع خَطَايَا اور خَطِيئَاتٌ ہے - دراصل اس سے مراد ایسا کام ہے جو اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب نہ کرے - چنانچہ عَلَي النَّخْلِ خَطِيئَةُ مِّن رُّطَبٍ - کے معنی ہیں کھجور کے درخت پر تھوڑی سی رطب (کھجوریں) ہیں** - قرآن کریم میں ہے بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَ آحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ (۲۱) - جو ناہمواریوں کے کام کرتا ہے اور (اس طرح) اسکی خطائیں اسے گھیر لیتی ہیں“ - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَيِّئَاتٌ کا نتیجہ خطاؤں میں گہر جانا ہوتا ہے - یعنی اس کے بعد انسان اپنے نشانے خطا کرتا جاتا ہے - اسے کوئی بات صحیح طور پر سوجھتی نہیں - اس کی کھجوریں پورا پھل نہیں لاتیں - لیکن اگر اس آیت میں واو کو تفسیری مانا جائے تو كَسَبَ سَيِّئَةً کے معنی ہونگے آحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ - آیت (۲۶) میں نسیان اور خطا کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے - لَا تَوَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا - ”اگر ہم سے بھول یا خطا ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا“ - لیکن (۳۳) میں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا اَخْطَاْتُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ - ”تم پر اس بارے میں گناہ نہیں جو تم سے

خطا ہو جائے۔ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل کے ارادے سے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ خَطَاً اس غلطی کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جائے اور اس میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ اسی قسم کی بلا عمد خطائیں (سہو) تھیں جن کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ خدا انہیں ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھیگا۔ وَ الَّذِي اٰطَمَعَ اَنْ يَغْفِرَ لِيْ خَطِيئَتِيْ يَوْمَ الدِّينِ (۲۶/۸۲) ”وہ ذات جس سے مجھے توقع ہے کہ وہ ظہور نتائج کے وقت میری خطاؤں کے اثرات سے مجھے محفوظ رکھیگا۔“

سورة الحاقة میں خَاطِئُوْنَ کا لفظ اہل جہنم کے لئے آیا ہے (۶۹/۱۳۹) اور خَاطِئَةً کا لفظ ظلم و سرکشی کے لئے بھی (۶۹/۱۴۱)۔ سورة علق میں ہے نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۹۶/۱۶)۔ ”جھوٹی، خطا کار پیشانی“۔ ان مقامات میں خَطَاً کے معنی جرم ہیں جس میں قصد و ارادہ شامل ہے۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں قتلِ اولاد کے سلسلہ میں ہے اِنْ قَتَلْتَهُمْ كَانْ خَطَاً كَبِيْرًا (۱۲۹/۱۶)۔ ”ان کا قتل یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے۔“

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ خَطَاً اس غلطی کے لئے بھی آتا ہے جو سہواً ہو، اور اس کے لئے بھی جو بالارادہ ہو۔ جو بالارادہ ہو، وہ جرم ہوگی اور قابل مؤاخذہ۔ بعض اہل لغت نے خَطِيًء کے معنی عمداً غلطی کرنا اور اَخْطَاً کے بغیر قصد غلطی کرنا بتائے ہیں۔

خ ط ب

اَلْخَطْبُ۔ بات، مسئلہ، حالت، معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ جَلَّ اَلْخَطْبُ۔ بات بڑی ہو گئی۔ معاملہ بڑا ہو گیا*۔ سورة يوسف میں ہے قَالَ مَا خَطْبُكَ كُنَّ (۱۲/۵۱) ”بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا معاملہ کیا تھا“۔ سورة حجر میں ہے قَالَ مَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ (۵۲/۱۵) ”اس نے کہا کہ اے پیغامبرو! تمہارا معاملہ کیا ہے“۔ اس میں معاملہ کے اہم ہونے کا تصور ضرور ہوتا ہے۔ خَطَبُ الْمَرْأَةِ خَطْبًا وَ خِطْبَةً۔ عورت کو نکاح کا پیغام دیا*۔ خِطْبَةً (۲۳۵/۲) نکاح کا پیغام۔ خِطْبَةً۔ منگیتر عورت*۔ اَلْخِطَابُ۔ ایک دوسرے سے بات چیت کرنا نیز جن الفاظ سے کسی کو مخاطب کیا جائے وہ خطاب کہلاتے ہیں**۔ فَصَّلْ اَلْخِطَابِ۔ دو ٹوک بات یا معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دینا (دیکھئے عنوان ف۔ ص۔ ل)۔ خَاطِبَةً۔

اس سے بات کی*۔ اِذَا خَاطَبْتَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (۲۵/۶۳)۔ جب ان سے نہ اواقف اور جاہل لوگ (بھی) ہم کلام ہوتے (یا معاملہ کرتے) ہیں تو وہ ”سلام“ کہتے ہیں یعنی ایسی بات کہتے ہیں جس سے وہ غلطی سے محفوظ اور سلامت رہیں۔ خَاطَبَ میں بات کرنا یا معاملہ کرنا۔ دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں (۱) دو آدمیوں کے درمیان باتیں ہونا۔ اور (۲) دو مختلف رنگوں کا ہونا۔

خ ط ط

الْخِطَّاءُ۔ کسی چیز میں لمبی دھاری یا لکیر۔ نرم زمین میں خفیف اور پتلا سا راستہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اس نشان کے ہیں جو لمبا ہو۔ نیز ہر راستہ۔ الْخِطَّاءُ۔ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ہوئی ہو لیکن اس میں نہ ہوئی ہو۔ وہ زمین جہاں تمہارے اترنے سے پہلے کوئی نہ اترتا ہو۔ الْخِطَّاءَةُ۔ زمین کا وہ حصہ جسے آدمی نشان لگا کر اپنے لئے برائے تعمیر مخصوص کر لے۔ خَطَّاءٌ۔ يَخْطُطُ۔ خَطَّاءٌ۔ لکھنا، کتابت کرنا۔ كِتَابٌ مَخْطُوطٌ۔ لکھی ہوئی کتاب*۔

سورة عنكبوت میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطُّهُ بِيَمِينِكَ... (۲۹/۳۸)۔ ”تو اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا“ اس میں ”اس (قرآن کـریم) سے پہلے“ کی تخصیص صاف بتا رہی ہے کہ نزول قرآن کـریم سے پہلے تو حضورؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن اس کے بعد یہ صورت نہیں رہی تھی۔ پھر آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس لئے یہ عقیدہ کہ حضورؐ ساری عمر اُمّی (آن پڑھ) رہے قرآن کـریم کی رو سے صحیح نہیں۔

خ ط ف

خَطِيفٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا۔ خَاطِيفٌ ظَلِيلٌ۔ ایک پرندے کا نام ہے جو پانی میں اپنے سایہ کو دیکھ کر اُسے پکڑنے کے لئے جھپٹتا ہے**۔ خُطَّافٌ۔ ایک سیاہ پرند جو پرواز کرنے میں جھپٹتا ہے**۔ الْخَاطِيفُ۔ اس تیر کو کہتے ہیں جو زمین پر لگ کر گھسٹتے

ہوئے نشانہ پر جا لگے۔ گویا وہ کوئی چیز زمین سے اچک رہا ہو اسی سے آج کل
 الْخَطِیْفَةُ۔ اس لڑکی کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص بھگا کر لے جائے***۔
 قرآن کریم میں ہے یَا كَادُ الْبَرْقُ یَخْطِفُ أَبْصَارَهُمْ (۲۰)۔
 ”قرب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی نگاہوں کو اچک کر لے جائے“۔ سورۃ حج
 میں ہے فَتَخْطِفُهُ السَّطِیْرُ (۲۲)۔ ”اُسے پرندے اچک کر لے گئے“۔
 دوسرے مقام پر ہے اِلَّا مَنْ خَطِیْفَ الْخَطِیْفَةِ (۳۰)۔ ”بجز اس کے کہ
 کوئی (یونہی ذرا سی) بات اچک کر لے جائے“۔ سورۃ عنکبوت میں ہے
 جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَیُتَخَطَفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹)۔ ”ہم
 نے حرم کو امن کی جگہ بنا دیا اور (حالانکہ) ان کے گرد و نواح سے لوگ اچک
 لئے جاتے ہیں“۔

خَطِیْفَ الْخَطِیْفَةِ (۳۰)۔ اور اِسْتَرْقَ السَّمْعَ (۱۸)۔ ”یونہی
 اچھٹی ہوئی بات لے اڑنا اور چوری چھپے کچھ سن لینا“۔ (دیکھئے عنوان
 س۔ ر۔ ق) یہ ان کاہنوں (نجومیوں) کے متعلق ہے جو علم غیب کی باتیں
 معلوم کرنے کے دعوے کرتے تھے۔ (اور اب بھی کئی جگہ کرتے ہیں جہاں
 ہنوز علم کی روشنی نہیں پہنچی)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ محض اٹکلیں
 دوڑاتے رہتے ہیں۔ کوئی بات یونہی ٹھیک نکل آئی تو اسے اچھالتے پھرے۔
 جو غلط ثابت ہو گئی، اس کی تاویل کر لی۔ ورنہ غیب کے علم پر ان کی قطعاً
 دسترس نہیں۔ لَا یَسْمَعُونَ (۳۸)۔ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُونَ وَلَوْ
 (۲۶)۔ نزول قرآن کریم کے بعد علم و بصیرت کا دور آ گیا۔ اب تو ہم
 پرستیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب ایسے عقائد کو علم کی بارگاہ سے آتشیں
 کوڑے پڑتے ہیں۔ (مزید تفصیل متعلقہ عنوانات میں ملیگی)

خ ط و

الْخَطْوَةُ (وَ الْخَطْوَةُ) جمع خُطًا وَ خُطُوَاتٌ۔ وہ فاصلہ جو
 دو قدموں کے درمیان ہو۔ پھر اس کا استعمال قدم کے لئے بھی ہونے لگا۔ یا
 راستے کے لئے۔ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ (۱۶۸) ”سرکش قوتوں کے یا مفاد
 پرستی کے جذبات کے راستے“۔ خَطَا الرَّجُلُ یَخْطُوُ اس آدمی نے چلنے
 کے لئے قدم بڑھایا۔ تَخَطَّیْتُهُ۔ میں اسے پھاند کر اس سے آگے بڑھ گیا*۔
 ابن فارس نے کہا ہے کہ خَطْوٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے آگے
 بڑھ جانا۔ اور چلے جانا۔

خ ف ت

خَفَّتِ الصَّوْتُ - بھوک کی شدت سے آواز میں پستی آ جانا یا آواز کا نہ نکلنا ، خَفَّتْ فُلَانٌ - فلاں آدمی مر گیا کیونکہ اس کی آواز منقطع ہو گئی اور وہ خاموش اور ساکت ہو گیا - الْخَفَّتُ - چھپا کر بات کرنا - پوشیدہ گفتگو کرنا ، * - (جہر کی ضد ہے) دیکھئے (۱۱۰) - سورہ طہ میں ہے يَتَخَفَتُونَ بَيْنَهُمْ (۲۰۳) - ”باہم چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں“ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پوشیدہ رکھنے اور چھپانے کے ہوتے ہیں۔

خ ف ض

الْخَفِضُ - رَفَعَ (بلند کرنا) کی ضد ہے - یعنی نیچے کرنا - خَفَضَ رَأْسَ الْبَغِيرِ - اس نے اونٹ کی گردن نیچے کی طرف جھکا دی تا کہ اس پر سوار ہو - الْخَافِضَةُ - پست ٹیلہ کو کہتے ہیں - الْخَفِضُ - نرم رفتاری - خَفَضَتِ الْإِبِلُ - اونٹ نے اپنی رفتار نرم کر دی - اسی سے اس کے معنی تواضع - فروتنی - اطمینان - سکون کے آتے ہیں۔

عَيْشُ خَافِضٌ - پرسکون و بافراغت زندگی - خَفِضَ الْعَيْشُ - وسعت اور فارغ البالی کی زندگی * - بغیر کسی دقت اور مشقت - پابندی اور رکاوٹ کے رزق فراواں ملنا - اس مادہ میں بنیادی طور پر یہ مفہوم ہوتا ہے - قرآن کریم میں ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِكَلِمَتِهِمْ (۱۵۸) - ”تو جماعتِ مومنین کے لئے اپنا بازو جھکا دے“ - اسے نرم کر دے - ان سب کو اپنے بازو کے نیچے لے لے - اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے - خَفَضَ الطَّائِرُ جَنَاحَهُ - اس وقت بھی کہتے ہیں جب پسرندہ اپنی پرواز کو روکنے کے لئے بازو سمیٹ لے * - ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اپنی تیز رفتاری میں کمی کر دے تا کہ دیگر افراد کارواں جو اتنے تیز رو نہیں ہیں ، تمہارے ساتھ چل سکیں - ایک قائد کو اپنے پروگرام کی ترتیب میں اپنے رفقاء کی استطاعت اور استعداد کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے - سورۃ واقعہ میں ہے خَافِضَةً رَافِعَةً (۵۶) وہ انقلاب سرکشوں اور متمرّدوں کو پست کر دیگا اور صحیح نظام خداوندی پر چلنے والوں کو بلند کر دیگا - یہاں خَفِضُ ضد ہے رَفَعَ کی - یعنی جو اوپر ہیں انہیں نیچے کر دیگا - جو نیچے ہیں اوپر کر دیگا - تہ و بالا کر دیگا (۱۱۱) -

خ ف ف

الْخِفِّ وَالْخَفِيفُ ہلکا (ثقیل کے مقابلہ میں)۔ الْخِفَّافُ ہلکا۔ بعض لوگوں نے خِفَّافٌ اور خَفِيفٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ خِفَّافٌ عقل و فکر میں ہلکا اور خَفِيفٌ جسم میں ہلکا*۔ (خَفِيفٌ کی جمع خِفَّافٌ ہے۔ ۹۱) راغب نے کہا ہے کہ خفیف کبھی تو قابل مدح صفت ہوتی ہے اور کبھی مذموم۔ مثلاً جس چیز کو ہلکا اور خوش آئند پایا جائے اسے خَفِيفٌ کہتے ہیں اور جو گراں ہو اسے ثَقِيْلٌ۔ یہ قابل مدح صفت ہے۔ اس کے برخلاف اوجھا، سطحیت پسند، کم وزن خَفِيفٌ کہلاتا ہے اور گراں بار و پروقار ثَقِيْلٌ۔ یہاں خفیف مذموم صفت ہوگی۔ اِسْتَخَفَّ فُلَانٌ بِحَقِّيْیَیْ - اس نے میرے حق کی کوئی عزت نہیں کی اور اسے بے وقعت سمجھا۔ تَخَفَّفٌ - کمی کر دینے کو کہتے ہیں۔ اَلْخِفُّ - اونٹ یا شتر مرغ کا پاؤں۔ نیز چرمی موزہ جو پاؤں میں پہنا جاتا ہے۔*

ہلکا ہونے کی جہت سے 'تیز خرامی (جلدی چلنے) کو بھی اس سے تعبیر کرتے ہیں۔ خَفَّ الْقَوْمُ عَنْ وَطَنِهِمْ - لوگ اپنے وطن سے نکل کر تیزی سے سفر میں چلے گئے*۔

قرآن کریم میں بدوؤں کے خیموں کے متعلق ہے تَسْتَخِفُّوْنَہَا (۱۶/۸) "تم انہیں ہلکا پھلکا پاتے ہو"۔ سورۃ الروم میں ہے لَا یَسْتَخِفُّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْقِنُوْنَ (۳۰/۶) "جو لوگ خدا کے قانون پر یقین نہیں رکھتے وہ تجھے خفیف نہ سمجھیں"۔ یعنی تم میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جس سے مخالفین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ تم اپنے دعوے میں ہلکے اور عزائم میں ڈھیلے ہو اس لئے تمہیں تمہارے مقام سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے چلنا چنداں دشوار نہیں۔

سورۃ القارعة میں ثَقُلْتَ بِمَقَابِلِهِ خَفَّتْ آیا ہے۔ وَ آمَنَ ثَقُلْتَ مَوَازِیْنُهُ فَهُوَ فِیْ عِیشَۃٍ رَاضِیَۃٍ۔ وَ آمَنَ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهُ فَأَمَّۃٌ ہَاوِیَّةٌ (۱۶/۹)۔ "سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگوار اور پسندیدہ زندگی بسر کریگا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہی کے عمیق گڑھے میں ہوگا،،۔ اس آیت میں ارتقاء کے ایک عظیم اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ طالب علموں کے لئے امتحان میں کامیابی کے لئے "فی صد نمبروں،، کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے (مثلاً ساٹھ فیصد)

جو طالب علم سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی چالیس فیصد غلطیوں سے در گزر کر دیا جاتا ہے اور اسے اگلی جماعت میں ترقی دیدی جاتی ہے۔ یعنی اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے اور غلطیوں کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو طالب علم چالیس فیصد نمبر حاصل کرتا ہے اسے فیل کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ترقی کے لئے مقرر ہے۔ کائنات میں قانون ارتقاء کا اصول بھی یہی ہے۔ جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی تھوڑی بہت کمزوریاں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں۔ جس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس کی تھوڑی بہت صلاحیت اس کے کسی کام نہیں آتی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی اصول انسانی ارتقاء کا بھی ہے۔ جس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائیگا اسے زندگی کی اگلی منزل میں ترقی مل جائیگی۔ جس کا پلڑا کمزور رہیگا، وہ ترقی نہیں پا سکیگا۔ ”ترقی پانے والوں، کو اہل جنت کہا گیا ہے اور آگے نہ بڑھنے والوں کو اہل جہنم۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ **إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۵)** ”یقیناً حسنات (اچھے اعمال) سیئات (غلط اعمال) کو دور کر دیتے ہیں،،۔ اگر حسنات (تقویت بخش) اعمال حیات کا پلڑا بھاری ہو تو کمزوریوں کے مضرت رساں اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسانی اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے لایا جاتا ہے **(۹۸)**۔ لیکن فیصلہ اسی سے ہوتا ہے کہ حسنات کا پلڑا بھاری ہے یا سیئات کا۔ انسانی ذات کی نشو و نما اور ضعف و اضمحلال کے لئے یہی اصول کار فرما ہے۔ جو اعمال اس کی تقویت اور استحکام کا موجب بنتے ہیں، اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو وہ اعمال جو اس کی کمزوری کا باعث تھے، نیچے دب جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اثرات اسکی نشو و نما کو روکتے نہیں۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہے، تو تقویت بخش اعمال، اس کے ارتقاء کا موجب نہیں بنتے۔ (مزید تشریح کے لئے ”ن۔ ج۔ و، کا عنوان دیکھئے)۔

خ ف ی

الْخَافِيَّةُ۔ عَلَانِيَّة کی ضد ہے۔ یعنی چھپنا۔ پوشیدگی۔ نیز چھپی ہوئی چیز۔ **الْخَفَاءُ**۔ جو چیز تم پر مخفی رہ جائے۔ **اخْتَفَى**۔ **اخْفَى**۔ **اسْتَخْفَى**۔ چھپ گیا۔ پوشیدہ ہو گیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (یعنی **اخْفَاءُ**) **إِبْدَاءُ** کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (إِنْ تَبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ - وَإِنْ تَخْفَوْهَا

..... ۲۱۰) **إِبْدَاءُ** کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ سائدہ میں **اخْفَاءُ**

تَبَيَّنَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵) اس کے معنی بھی ظاہر کر دینے کے ہیں۔
 نِدَاءٌ خَفِيًّا (۱۹) - دھیمی آواز - چھپی ہوئی آواز - سورة طٰه میں اخْفِیْ اور
 سِرًّا ساتھ ساتھ آئے ہیں - (۲۰) - سورة الحاقّة میں ہے لَا تَخْفِیْ مِنْكُمْ
 خَافِيَةً (۶۹) ”کوئی چھپی ہوئی بات چھپی ہوئی نہ رہ سکے گی“ - سورة
 النساء میں ہے - يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ (۱۰۸) ”وہ لوگوں سے چھپنا
 چاہتے ہیں“ - مَسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ (۱۳) - جو رات کو چھپ جائے یا
 چھپ جانا چاہے - الْخَفِيّ - پوشیدہ - جو ظاہر و آشکارا نہ ہو - قرآن کریم
 میں طَرَفٍ خَفِيٍّ (۳۲) کنکھیوں سے دیکھنے کے لئے آیا ہے -
 اخْفَاهُ - کسی بات کو ظاہر کر دینا - اس کے خفاء (پوشیدگی) کو
 دور کر دینا* - محیط میں ہے کہ خَفِيَ لَهُ کے معنی ظاہر ہونے کے آتے
 ہیں اور اس کا استعمال ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں کوئی چیز پہلے سے چھپی
 ہوئی ہو اور پھر ظاہر ہو جائے - یا کسی خفیہ طریقہ سے ظاہر ہو جائے** -
 لطائف اللغة میں ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے جس کے معنی کَتَمَ (چھپا
 دینا) اور اَظْهَرَ (ظاہر کرنا) دونوں آتے ہیں -

ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے -
 سورة طٰه میں ہے اَكَادُ اخْفِيْهَا (۲۰) اس میں اگر اَكَادُ کے معنی ارادہ
 کرنے کے لئے جائیں اور اخْفِيْهَا کے معنی ظاہر کرنے کے تو مطلب یہ ہوگا کہ
 میں اسے ظاہر کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں - اور اگر اَكَادُ کے معنی نفی کے لئے
 جائیں اور اخْفِيْهَا کے معنی پوشیدہ رکھنے کے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ
 میں اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں - مطلب
 دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا - اس نکتہ کی وضاحت عنوان (ک - و - د) میں
 کی گئی ہے جسے ضرور دیکھ لینا چاہئے -

خ ل د

خَلَّوْا دُ دوام کو کہتے ہیں - لیکن صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے
 لکھا ہے کہ جب کسی چیز میں تغیر اور فساد بہت دیر میں پیدا ہو، یعنی
 وہ بہت دیر تک نہ بگڑے تو اس کی اس صفت کے لئے خلود کا لفظ استعمال
 کر دیتے ہیں - لہذا کسی چیز کے عرصہ دراز تک علیٰ حالہ قائم رہنے کو
 بھی خَلَّوْا دُ کہتے ہیں خواہ وہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے* - چنانچہ رَجُلٌ
 مُّخَلَّدٌ - اس شخص کو کہتے ہیں جس میں بڑھاپا بہت دیر میں آئے - کتاب
 الاشتقاق میں اس کے معنی طَوَّلُ الْعُمُرِ (لمبے عرصہ تک رہنا) اور

الْبَقَاءُ (غیر متغیر رہنا) کے لکھے ہیں۔ اَلْخَوَالِدُ۔ پہاڑوں چٹانوں اور پتھروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتے ہیں۔ خانہ بدوش، صحراء میں کھانا پکانے کیلئے پتھر کھڑے کر کے چولہا بنا لیا کرتے تھے جو انکے کوچ کے بعد وہیں رہ جاتے تھے (وہ انہیں ساتھ نہیں لے جاتے تھے)۔ انہیں بھی خَوَالِدُ کہتے تھے ***۔ خَلَدَ وَآخُلَدَ بِالْمَكَانِ إِلَى الْمَكَانِ کے معنی ہیں وہ کسی جگہ مقیم ہو گیا اور کافی عرصہ تک اُس میں رہا۔ آخُلَدَ الرَّجُلُ بِصَاحِبِهِ کے معنی ہیں وہ شخص اپنے ساتھی کے ساتھ ساتھ رہا اور اسکا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخُلَدَ إِلَيْهِ کے معنی ہیں وہ اسکی طرف مائل ہوا اور اسکے ساتھ ہی چمٹ کر رہ گیا *۔ سورة اعراف میں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۱۶/۱)۔ ”اگر ہم چاہتے تو اس کے ذریعے اسے بلندی عطا کر دیتے لیکن وہ زمین کے ساتھ چمٹ گیا،“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ثبات اور مستقل ساتھ لگے رہنے کے ہیں۔ یعنی غیر متغیر ہونا اور کسی کے ساتھ چپکے رہنا۔

قرآن کریم میں جنت کے ساتھ خَالِدٍ یُنْفِیْہَا یَاہُمُ فِیْہَا خَالِدٌ وَنَ (۲۵/۲) عام طور پر آیا ہے۔ اسمیں جہاں اس دنیا کا جَنَّتِی معاشرہ مراد ہے (دیکھئے جَنَّتِی کا لفظ۔ ج۔ ن۔ ن کے عنوان کے نیچے) تو اس کے خُلُوْدٌ سے مقصود یہ ہے کہ جب تک وہ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق رہیگا اس میں تغیر اور بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں اس سے مراد اس زندگی کے بعد کی زندگی کی کیفیات ہیں، تو اس سے وہ حیاتِ جاوید مقصود ہے جو اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہے۔ یاد رہے کہ قرآن کریم میں جنت اور جہنم دونوں کے لئے خُلُوْدٌ کا لفظ آیا ہے۔ جنت کا خلود حیاتِ جاوید ہے۔ یعنی وہ زندگی جو اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے۔ اور جہنم کے خلود سے مراد وہ حالت ہے جسمیں صلاحیتوں کی نشوونما رک جاتی ہے اور زندگی، ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسلئے اس میں جمود آجاتا ہے۔ لہذا یہ خُلُوْدٌ پتھروں اور چٹانوں کا سا خلود ہے۔ (تفصیل ان نکات کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملیگی)۔

مُخْلَدٌ وَنَ۔ کلائیوں اور کانوں میں زیورات پہنے ہوئے۔ ان زیورات کو خَلَدٌ (واحد خَلَدَةٌ) کہتے ہیں۔ زیورات سے مزین ***۔ وَلِدَانٌ مُّخْلَدٌ وَنَ (۱۶/۵)۔ کتاب الاشتقاق نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

أَخْلَدَ۔ ایک زمانہ دراز تک مصیبتوں اور خرابیوں سے بچانا ***۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ شخص جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا

* تاج و محیط۔ ** تاج و راغب۔ *** تاج۔ ****۔ غریب القرآن میرزا ابو الفضل بحوالہ بحر المحيط و لسان العرب۔

رہتا ہے **يَحْسَبُ أَنْ مَالَهُ أَخْلَدَهُ** (۱۰۳) وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال زمانہ دراز تک اسے تباہیوں سے محفوظ رکھیگا یا حیات دوام عطا کر دیگا۔ یہ اس کا خیال خام ہے۔ بقا اس کے لئے نہیں جو مال جمع کر کے دوسروں کو اس کے فائدے سے محروم رکھتا ہے۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا كُتِبَ فِي الْكِتَابِ** (۱۰۳)۔

آخری زندگی کی حیات الخلد (زندگی جاوید) کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی ہمیشگی، خدا کی ابدیت کی طرح ہے۔ بالکل نہیں۔ خدا کی ابدیت کے مانند کوئی ابدیت نہیں۔ انسان کی حیات دوام، خدا کے قوانین کے مطابق ہوگی۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ ذہن انسانی کی موجودہ سطح اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتی ہے نہ بتا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت اور جہنم کے مخلود کے ساتھ **مَادَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ** (۱۰۸-۱۰۹) کہہ کر، خدائی ابدیت (Infinity) کی طرف سے خیال کا رخ ہٹا دیا ہے۔ (ان آیات میں **إِلَّا مَا شَاءَ رَبِّكَ** کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ی)۔

خ ل ص

خَلَصَ کے معنے ہیں کھوٹ اور میل سے الگ ہو کر صاف اور خالص ہو جانا۔ **خَلَصَ مِنَ الْقَوْمِ**۔ وہ قوم سے الگ اور کنارہ کش ہو گیا*۔ **أَخْلَصَ الشَّيْءُ** : کسی چیز کو خالص کیا، چن لیا۔ *** اس لئے **الْمُخْلَصُ** اُسے کہتے ہیں جسے دوسروں سے الگ کر کے کسی کام کیلئے خالص اور مختص کر لیا جائے*۔ **إِنَّ اللَّهَ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ** (۱۱۲)۔ وہ (یوسف) عام لوگوں کی راہ پر چلنے والا نہیں تھا۔ اسے عام لوگوں سے الگ کر لیا گیا تھا۔ وہ ہماری روشِ خاص پر چلنے والا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے متعلق ہے **خَلَصُوا أَنْجِيًّا** (۱۱۲) وہ باہمی مشورہ کرنے کے لئے لوگوں سے الگ ہٹ گئے۔ اسی اعتبار سے **خَالِصَةً** **مِنْ دُونِ النَّاسِ** (۹۳) کے معنے ہیں دوسرے لوگوں کو الگ ہٹا کر، خالص (Exclusively) ان کے لئے۔ **إِسْتَخْلَصَهُ**۔ اُسے اپنے لئے خاص کر لیا (۱۱۲)۔

خَالِصٌ۔ جس چیز سے آمیزش کو الگ کر دیا جائے۔ راغب نے لکھا ہے کہ **الْخَالِصُ**۔ اور **الْصَافِي**۔ دونوں مرادف المعنی ہیں۔ لیکن **الْصَافِي** کبھی ایسی چیز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے جو پہلے ہی سے

صاف ہو۔ اور خَالِصٌ وہ ہوتا ہے جس سے آمیزش دور کر کے اسے صاف کر لیا گیا ہو۔**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو صاف کرنا اور اس کے زائد اور فالتو حصوں کو چھانٹ دینا ہیں۔

الْخِلَاصُ - وہ مکھن یا سونا چاندی جسے تپا کر خالص کیا جائے۔ خَلَصَ اللَّهُ فُلَانًا - خدا نے فلاں کو اس مشکل اور الجھن سے نکال دیا جس میں وہ پڑ گیا تھا۔ جسطرح الجھا ہوا دھاگہ سلجھایا جاتا ہے*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ (۱۳۹)۔ ہم ہر طرف سے الگ ہٹ کر صرف قانون خداوندی کی راہ پر چلنے کیلئے مختص ہو چکے ہیں۔ اسکی وضاحت لہٰذا مُسْلِمُونَ اور لہٰذا عَلِيدُونَ نے کر دی ہے جو پہلی دو آیتوں میں آئے ہیں (۱۳۸-۱۳۶)۔ یعنی صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرنے والے۔ اس سے مُخْلِصِينَ لہٰذا الدِّينِ (۲۹) کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اور سب قوتوں سے منہ موڑ کر، اطاعت کو صرف خدا کے لئے مختص کر دینا۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا اِنَّمَا اَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الْقَادِرِ (۳۸)۔ ہم نے انہیں عام لوگوں سے الگ ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا) اس خصوصیت کی بنا پر کہ وہ ہمیشہ زندگی کے انجام و مسائل کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ حقیقی زندگی کے گھر کو پیش نظر رکھتے تھے (۲۹) تاکہ جہاں اس کا تصادم طبعی زندگی سے ہو (ان دونوں میں (Tie) پڑے) حقیقی زندگی کو طبعی زندگی کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے۔

خ ل ط

خَلَطَ اور خَلِطَ - کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ خواہ وہ اسطرح ملیں کہ پھر جدا بھی کر لی جا سکیں (جیسے اونٹوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دینا) اور خواہ اسطرح کہ وہ جدا نہ ہو سکیں*۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلْمَزْجُ صرف مِیْتَال چیزوں کے آپس میں ملانے کو کہا جاتا ہے اور اَلْخَلِطُ اس سے عام ہے۔*** جو شخص کاروبار میں شریک ہو اسے خَلِیْطٌ کہتے ہیں۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کے لئے کاروبار میں شرکت ضروری نہیں۔ جو لوگ ویسے ہی آپس میں میل جول رکھیں، مل جیل کر رہیں اور اسطرح ان میں دلی تعلق پیدا ہو جائے وہ بھی خَلِیْطٌ کہلاتے ہیں*۔ اس کے معنی ساتھ رہنے والا یا پڑوسی بھی ہیں۔ اسکی جمع خُلَطَاءُ آتی ہے۔ (ابن فارس)۔

اِخْتِلَاطٌ کے معنی مباشرت کے بھی ہوتے ہیں۔ رَجُلٌ خِلَاطٌ
مِلَاطٌ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو مختلط النسب ہو۔ اور اِخْتِلَاطٌ
ولد الزنا کو*۔

خَالَطَهُ۔ اس کے ساتھ مل کر رہا، گڈمڈ ہو گیا۔ سورۃ بقرہ میں یتیموں
کے متعلق ہے وَ اِنْ تَخَالِطُوْهُمْ فَاَرْحَمُوْهُمْ (۲۲۰)۔ اگر تم ان سے
میل جول رکھو یا ان کے کاروبار میں شریک ہو جاؤ تو ہر وقت اسکا خیال
رکھو کہ وہ تمہارے اپنے بھائی ہیں۔ سورۃ ص میں خُلَاطَاءُ کا لفظ کاروباری
شرکاء کیلئے آیا ہے (۳۸)۔ سورۃ توبہ میں خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا.....
(۱۰۲) کے معنی ہیں، جنہوں نے اچھے کام کو برے کام کے ساتھ ملا دیا۔
سورۃ انعام میں ہے مَا اِخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۱۳۷) جو (چربی) ہڈی کے ساتھ ملی
(لگی) ہو۔ سورۃ کہف میں ہے فَاِخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتٌ اَلَا رُضٍ (۱۸)۔
اس (بارش) کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل جاتی ہے۔

خ ل ع

خَلَعَ۔ کسی چیز کو اتار دینا۔ (نَزَعَ کے معنی میں آتا ہے اس
فرق کے ساتھ کہ خَلَعَ میں مہلت اور آہستگی ہوتی ہے۔ یعنی یہ عمل فوراً
نہیں ہوتا۔ اور نَزَعَ میں جلدی اور تیزی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے
خَلَعَ اور نَزَعَ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ اَلْخَالِعُ۔ گرا ہوا، ٹوٹا ہوا
درخت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اُس
چیز سے الگ ہو جانا جس کے ساتھ وہ پہلے شامل تھی۔ اَلْخُلْعُ۔ وہ طلاق
جو عورت اپنے خاوند سے حاصل کرے**۔ (یہ فقہی اصطلاح ہے قرآنی نہیں۔)

سورۃ طہ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا فَاِخْلَعْ
نَعْلَیْكَ (۲۰)۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”تو اپنے جوتے اتار دے“۔ لیکن
صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم اسی جگہ
قیام کرو۔ یہیں ٹھہرو۔ جیسے تم اس شخص کو جسے تم چاہو کہ تمہارے پاس
کچھ وقت ٹھہیر جائے کہتے ہو کہ ذرا اپنے جوتے موزے اتار کر اطمینان
سے بیٹھو**۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ
سے کہا کہ تم جلدی نہ کرو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات سنو۔ اب تمہارا سفر
(جو تم تلاش حقیقت میں کر رہے تھے) ختم ہو گیا ہے۔ اب تمہاری مسافتیں
سمٹ گئی ہیں۔ (دیکھئے طوی)۔ اب تمہیں وحی کے ذریعے منزل مقصود

کا پتہ بلا کاوش و تردد مل جائیگا۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اِخْلَعُ نَعْلَیْكَ کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے اہل و عیال کے مشاغل سے فارغ ہو جا یعنی ذہن سے ان کے خیال کو نکال دے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں نَعْلٌ سے مراد اہل و عیال بھی لئے جاتے ہیں۔

خ ل ف

خَلَفٌ کے معنی ہیں پیچھے۔ نیز یہ بعد کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً خَلَفَكَ۔ تیرے بعد۔ اَلْخَلَفُ۔ ایک قرن کے بعد دوسرا قرن (ایک نسل کے بعد دوسری نسل) نیز ان انسانوں کو کہتے ہیں جو پہلے لوگوں کے جانشین ہوں اور ان سے زیادہ ہوں۔ اَلْخَلَفُ۔ باپ کے بعد اس کی جانشین ہونے والی نیک اولاد، اگر اولاد بد اطوار ہو تو وہ خَلَفٌ کہلائیگی۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بولدے جاتے ہیں۔ ابن بَرِّی کا کہنا ہے کہ اَلْخَلَفُ آدمی کے بعد اس کے پسماندہ جانشینوں کے لئے، نیز بدل و عوض کے معنوں میں آتا ہے اور اَلْخَلَفُ اس کے لئے جو پہلے کے بعد آئے، جیسے قرن کے بعد قرن۔ یا لوگوں کے جانشین خواہ وہ لوگ مر چکے ہوں یا زندہ ہوں۔ ہلاک ہو جانے والوں کے بعد باقی رہ جانے والے۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ خَلَفْتُ ہو یا خَلَفْتُ، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی گزرے ہوؤں کے بعد آنے والے، البتہ فرق یہ ہے کہ خَلَفْتُ خیر میں استعمال ہوتا ہے اور خَلَفْتُ شر میں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے تین بنیادی معنی ہیں (۱) ایک چیز کا دوسری چیز کے بعد آنا اور اس کی جگہ لے لینا۔ (۲) آگے کی ضد۔ یعنی پیچھے۔ اور (۳) تغیر و تبدیل۔ خِلْفَةٌ ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت جھڑ کے بعد درخت پر نکلیں۔ ایک دوسرے کے بعد آنے اور اس کی جانشینی کرنے کے لئے بھی خِلْفَةٌ بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (۲۵)۔ ”اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو اس طرح بنایا کہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ اَلْخِلْفَةُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھے یا جو پیچھے رہ جائے۔ ساتھ شریک نہ ہو (۸۳)۔ خَلَفَ آبَاهُ کے معنی ہیں وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اَلْخِلْفَةُ دوسرے کا جانشین، نیز وہ فرمانروا جو اپنے سے پہلے فرمانروا کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خُلَفَاءُ اور خَلَائِفُ ہے*۔ جب حضرت موسیٰؑ طُور پر گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا

اُخْلَفْنِيْ رَفِيْ قَوْمِيْ (۱۳۲) - تم (میری غیبت میں) قوم میں میرے جانشین بنو۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا تصور خاص طور سے ذہن نشین کرنے کے قابل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ زندہ ہو لیکن اُس جگہ موجود نہ ہو۔ اور خواہ مر چکا ہو۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكَمْ خَلَآئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ (۱۰)۔ ”ہم نے تمہیں اُن کے بعد ملک میں ان کا جانشین بنایا“۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے روگردانی کی تو یَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱) میرا رب تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا۔ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جانشین ایک اور قوم ہو جائیگی۔ قوم عاد کے متعلق ہے جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (۶۹)۔ ”تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا“۔ اور ثمود کے متعلق ہے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا (۷۴)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آدم (انسان) کے متعلق ہے۔ اِنْسِيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں خَلِيْفَةُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ۔ یعنی زمین پر خدا کا نائب یا قائم مقام۔ یہ معنی بوجہ غلط ہیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ قرآن کریم میں آدم کو کہیں بھی خَلِيْفَةُ اللّٰهِ (اللہ کا خلیفہ) نہیں کہا گیا۔ خَلِيْفَةُ فِي الْاَرْضِ کہا گیا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خَلِيْفَةُ کے معنی ہیں کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اسکی جگہ لینے والا۔ (انگریزی میں اسے Successor کہتے ہیں)۔ خدا ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اسلئے خدا کے بعد یا خدا کی عدم موجودگی میں اسکی جانشینی کا تصور ہی باطل ہے۔ جو خود موجود ہو اسکا جانشین (Successor) کیسا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خَلِيْفَةُ الرَّسُوْلِ تھے۔ یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انکے جانشین۔ وہ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ نہیں تھے۔ بیعت خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو ”یا خلیفۃ اللہ“، کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں ”خلیفۃ الرسول“ ہوں، ہوں۔ ”خلیفۃ اللہ“، نہیں ہوں۔ انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کیلئے نہیں آیا۔ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے

اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کیلئے آیا ہے۔ آدم (انسان) کو جو خَلِيفَةً^۱ فِي الْأَرْضِ کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیا میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین (Successor) ہے۔ (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م اور ج۔ ن۔ ن)۔ چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار شامل ہوتا ہے اسلئے اِسْتِخْلَافٌ^۲ فِي الْأَرْضِ سے مراد ہے مسلک کی حکومت۔ کسی دوسری حاکم قوم کی جانشینی۔ (تفصیل ان امور کی میری تصنیف ”ابلیس و آدم“ میں ملیگی جہاں آدم کے متعلق شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے)۔

یہ نظریہ بھی کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ (Powers Delegate) کر دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو۔ نہ مذہبی پیشوا کو۔ حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کئے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانین خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ دین بناتا نہیں۔ اس لئے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم ”خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا“، لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لئے ”نائب“، کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے تفویض اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

اِخْلَافٌ کے معنی ہیں وعدہ خلافی کرنا۔ اَخْلَفَ وَعْدَهُ کے معنی ہیں اس نے وعدہ کیا اور بعد میں اسے پورا نہ کیا*۔ فَلَمَنْ يَخْلِفُ اللّٰهُ عَهْدَهُ (۲۰/۸)۔ ”اللہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کریگا“۔

اِخْتِلَافٌ۔ اتفاق (موافق ہونے) کی ضد ہے۔ اس کے معنی یکے بعد دیگرے آنے کے بھی ہوتے ہیں*۔ (جیسے اِخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۲۳/۱) رات اور دن کا یکے بعد دیگرے ادل بدل کر آنا۔ اور اختلاف یا مخالفت کرنے کے بھی*۔ (جیسے فَاِخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۱۹/۱۶)۔ ”پھر ان کے درمیان فرقوں نے اختلاف کیا“۔

بعض کا خیال ہے کہ خَلَفٌ اولاد صالح کو کہتے ہیں اور خَلَفٌ غیر صالح کو۔ اور بعض نے اس فرق کو تسلیم نہیں کیا*۔ قرآن کریم میں فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِ هِمْ خَلَفٌ (۱۶۹; ۱۹۹) غیر صالح کے لئے آیا ہے۔ تَخَلَّفَ پیچھے رہ جانا (۱۲۰)۔ مَخَلَّفُونَ پیچھے رہ جانے والے (۸۱)۔ خَالَفَهُ اسکی مخالفت کی۔ مَخْلِفٌ وہ جو وعدہ خلافی کرے (۱۴)۔ مَخْتَلِفٌ الگ الگ (۱۶)۔ اِسْتَخْلَفَ جانشین بنانا (۲۲)۔ مَسْتَخْلَفٌ وارث (۵۷)۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے (۲۲)۔ لہذا جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں غلبہ و اقتدار اور حکومت و شوکت نہیں قرآن کریم کی رو سے نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمال صالحہ۔ ایمان و اعمال صالحہ کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان کا نتیجہ صرف آخرت میں (مرنے کے بعد) برآمد ہوگا، اس دنیا سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ یا ان سے مقصود ایک فرد کی اپنی ”روحانی ترقی“، ہے جسے معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو غلط روش زندگی سے باز رہنے کی تلقین کی اور فرمایا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ (۱۱۸)۔ تاج نے لکھا ہے کہ خَالَفَهُ إِلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز سے منع کرنے کے بعد اس کا قصد کرنا۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں جس بات سے تمہیں روکتا ہوں میرا ارادہ قطعاً یہ نہیں کہ میں خود اس کا قصد کروں۔

قرآن کریم کی رو سے کسی قوم میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے (۱۰۳) اور اختلافات کا مٹ جانا اللہ کی رحمت (۱۱۱-۱۹)۔ قرآن کریم، لوگوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے (۱۶)۔ اور اسی لئے یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ جنتی زندگی کے مستحق وہ ہیں جن میں اختلافات نہ ہوں (۱۰۵-۶)۔ باہم اختلافات اور دین میں تفرقہ شرک ہے (۳۲-۳۱)۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا طریق یہ ہے کہ ان کے ہر متنازع فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے (۲۲)۔ لیکن یہ فریضہ امت کا اجتماعی نظام (حکومت قرآنی) سر انجام دیگا۔ (۲۵)۔ (ان امور کی مزید تفصیل ف۔ ر۔ ق کے عنوان میں ملیگی۔ نیز دیکھئے میری کتاب، سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم)۔

خ ل ق

خَلَقَ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کے لئے اسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا (یہی مفہوم تقدیر کا بھی ہے دیکھئے ق۔ د۔ ر) اسکے تناسب و توازن کو دیکھنا۔ یا کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مطابق بنانا۔ کسی چیز کو نرم و ہموار کرنا*۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا**۔ خَلَقَ إِلَّا دَرِيْمَ کے معنی ہیں اسنے کوئی چیز بنانے کے لئے چمڑے کو ناپا اور پہلے اس کا اندازہ لگایا۔ رَجُلٌ تَمَّ الْخَلْقَ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکی ساخت میں اعتدال ہو۔ جو بناوٹ اور تناسب کے اعتبار سے مکمل اور سڈول ہو۔ اس معنی میں خَلِيقٌ بھی کہتے ہیں۔ اور خُلُقَةً کے معنی ہیں چکنا پن، ہمواری، برابر ہونا۔ الْخَلْقُ کے معنی ہیں کسی چیز کا شگاف وغیرہ سے خالی اور ہموار ہونا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا (استعمال کے بعد) ہموار اور صاف اور چکنا ہو جانا۔ (اسی جہت سے پرانی چیز کو خَلَقَ کہتے ہیں کیونکہ وہ گھس کر سپاٹ ہو جاتی ہے اور اس کا رُوں زائل ہو جاتا ہے)۔

لہذا خَلَقَ کے معنی ہونگے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو و زوائد کو دور کرنا اور پھر اسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا، اس طرح کہ اسکا توازن و تناسب بالکل درست رہے۔ اور وہ صاف اور ہموار ہو جائے۔ بَدَعَ اور فَطَرَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ پہلی بار پیدا کرنا۔ ایجاد کرنا۔ اس اعتبار سے خَلَقَ کے معنی ہونگے مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دینا اور اس طرح ان سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ (۱۶)۔ یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۵۵)۔

سورۃ حج میں رحم ماسر میں نطفہ اور جنین کے مختلف منازل کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ مَضْغَةً میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی مِخْلَقَةً اور غَيْرِ مِخْلَقَةً (۲۲)۔ مِخْلَقَ کے معنی ہیں مکمل شدہ۔ یا ہموار کیا ہوا یا نرم کیا ہوا (محیط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الْمِخْلَقُ اُس تیر کو کہتے ہیں جسے سدھار کر ٹھیک کر دیا جائے۔ اس لئے آیت سے یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ مَضْغَةً یا تو پورا بچہ بن جاتا ہے اور یا نا تمام رہ کر گر جاتا ہے۔

سورۃ شعراء میں ہے "ہَذَا اِلَّا خَلْقٌ" (۲۶/۱۳۷) یعنی یہ تو وہی پہلوں کا دستور، پرانی عادت، یا طریق کہن ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی رسم و رواج کے بھی لئے ہیں*۔ اور اسی سے اس کے معنی عادات و اطوار کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ خَلْقٌ کسی کی طبعی عادت کو کہتے ہیں*۔ اور چونکہ عادت عموماً پرانی ہوتی ہے اس لئے خَلْقٌ کے معنی کہنگی کے بھی ہیں۔ خَلَقَ الشُّوْبُ - کپڑا پرانا ہو گیا۔ (۳۸/۴) میں ہے "ہَذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ"۔ یہ گھڑی ہوئی بات ہے۔ خِلْقَةٌ کے معنی ہیں کسی کی طبعی ترکیب (Natural Constitution)*۔ خَلَقٌ کے معنی ہیں انداز کے مطابق مقرر کیا ہوا حصہ۔ اُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۳۶/۲۶) میں خَلَقٌ کے یہی معنی ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ خَلَقٌ کے معنی میں وہ فضیلت جو حسن اخلاق کی بنا پر حاصل ہو۔

(قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ بھی آیا ہے۔ (۵۳/۷)۔ اس کے متعلق ا۔ م۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔ خَلَقٌ کے معنی ٹھیک اندازہ لگا کر اس کے مطابق عزم کرنے اور منصوبہ باندھنے کے بھی آتے ہیں۔ نیز تربیت کرنے کے بھی**۔

خَلَقٌ اور خَالِقٌ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات ہیں (۳۶/۸۱ و ۵۹/۲۵)۔ لہذا جس فرد یا قوم میں صفات خداوندی کی نمود ہوگی اس کا مظاہرہ اس کی قوت تخلیق سے ہوگا۔ اولاد پیدا کرنا تخلیق (Creation) نہیں، تولید (Procreation) ہے۔ یہ وہ حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوانات بھی انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ لہذا تولید، حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، انسانی سطح پر تخلیق شروع ہوتی ہے جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتے جس قوم میں قوت تخلیق نہیں اس میں صفات خداوندی کی نمود نہیں۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ :

ہر کہ اورا قوت تخلیق نیست نزد ما جز کا فرو زندیق نیست

یہ بھی یاد رہے کہ تخلیق محض (Duplication) نہیں۔ یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے چلے جانا تخلیق نہیں۔ تخلیق نئے نئے اضافے چاہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے یَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۵/۱)۔ "وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے،"۔ اس لئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اضافے کرتے رہیں۔ اس کو ایجاد کہتے ہیں۔

* (تاج و لین ** غریب القرآن - میرزا ابوالفضل، بحوالہ صحاح

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلِّقَ عَظِيْمٌ (۶۸) ”اور یقیناً تو خلق عظیم کا حامل ہے“۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خلق کے معانی میں اعتدال، توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ یہ چیز شرف انسانیت کی دلیل ہے۔ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی میں یہ شرف اپنی بلند ترین سطح پر تھا۔ ہمارے ہاں جس چیز کو ”اخلاقیات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارے دور ملوکیت کی تمدنی زندگی کا آئینہ ہیں۔ قرآن کریم نے جو صفات مؤمن کی بیان کی ہیں، وہی صحیح اخلاق ہیں۔ اور ان صفات کی بلند ترین مظہر نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے جو نوع انسانی کے لئے حسین ترین نمونہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت کا یہ نمونہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

خ ل ل

اَلْخَلَّٰلُ - وہ راستہ جو ریگزار کے اندر تک جاتا ہو۔ یا جو دو ریگزاروں کے درمیان سے گذرتا ہو۔ اَلْخَلَّلُ - دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ خِلَالٌ - درمیان کی جگہ۔ خِلَالٌ اِلَیَّیْہَا - گھروں کے درمیان کی جگہ، گھروں کی حدود کے آس پاس کی جگہ۔ تَخَلَّلَ الشَّیْءُ چیز کے اندر گھس جانا۔ خَلَّ الشَّیْءُ - چیز میں سوراخ کر دیا اور اس میں سے آر پار چلا گیا۔ اَلْخِلَالُ - وہ چیز جس سے آر پار سوراخ کیا جائے۔ اَلْخِلَالَةُ - احتیاج۔ اضطراری حالت*۔ فَجَا سُوْا خِلَالِ اِلَیَّیْہَا (۱۷) وہ شہروں کے اندر گھس گئے۔ خِلَالِہَا (۱۷) اس کے اندر۔

خُلَّةٌ - دوستی*۔ (۲۵۳) غالباً اس اعتبار سے کہ دوست ایک دوسرے کے دلوں کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں، یا انہیں ایک دوسرے کی احتیاج ہوتی ہے۔ خَلِیْلٌ (جمع أَخِلَاءُ) - دوست (۱۲۶) و (۲۶۷)۔ خِلَالٌ - باہمی دوستی (۱۳۱)۔

اَلْخَلَّ - سر کہہ*۔

خ ل و

خَلَا اَلْمَمَکَانَ کے معنی ہیں مکینوں کے چلے جانے سے کسی جگہ کا خالی ہو جانا۔ خَلَا الشَّیْءُ - کسی چیز کا گذر جانا اور چلا جانا۔ خَلْوَةٌ کے معنی تنہائی ہیں۔ خَلِیْقَةٌ - شہد کی مکھیوں کا چھتہ*۔ راغب کا قول

ہے کہ خَلُّوْا کا استعمال زمان اور مکان دونوں کیلئے آتا ہے۔ چونکہ زمانے میں مرور (گذرنا) پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت نے خَلَّالَ الزَّمَانِ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لئے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہو جانا۔

قرآن کریم میں خَلُّوْا بمقابلہ لَقُّوْا کے آیا ہے (۲/۲۶ و ۲/۲۷) جہاں اسکے معنی علیحدگی اور تنہائی میں ملنے کے ہیں۔ خَلُّوْا مِّنْ قَبْلِكُمْ (۲/۲۶) کے معنی ہیں وہ لوگ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَّتْ (۲/۱۳۱) ”یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی،“۔ لَا يَتَّامِ الْخَالِيَةَ (۶۹/۲۳) کے معنی ایام گذشتہ ہیں۔ سورة يوسف میں يَخْلُ لَكُمْ وَجْهٌ أَبِيكُمْ (۱۲/۹) کے معنی ہیں تمہارے باپ کی ساری توجہ خالصتاً تمہارے لئے ہو جائیگی۔ کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں ہوگا۔ خَلَّافِيْهَا نَذِيرٌ (۳۵/۲۳) جسمیں کوئی آگاہ کرنے والا (نہ) گزرا ہو۔ تَخَلَّتْ (۸۳/۸) خالی اور صاف ہو جانا۔ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۹/۵) ان کا راستہ چھوڑ دو۔ ان سے تعرض مت کرو۔ خَلَّ سَبِيْلَ الْاَسِيْرِ کے معنی ہیں قیدی کو آزاد کر دیا***۔

خ م د

خَمَدَتِ النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا اگرچہ اس کے انگارے نہ بجھے ہوں۔ اگر انگارے بھی بجھ جائیں تو اسے خَمَدَتِ النَّارُ کہیں گے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حرکت کا ساکن ہو جانا نیز گر جانا بتائے ہیں۔ اَخْمَدْتُهَا۔ میں نے آگ کے شعلوں کو ساکن کر دیا۔ اَلْخَمْدُ وہ جگہ جہاں آگ کو دبا دیا جاتا ہے۔ خَمَدَ الْمَرِيضُ۔ مریض بیہوش ہو گیا یا مر گیا۔ قَوْمٌ خَامِدُونَ۔ وہ لوگ جن کی تم کوئی آہٹ تک نہ سنو****۔ بے حس و حرکت لوگ۔ اَخْمَدَ اللَّهُ أَنْفَاسَهُ۔ خدا نے اسے ذلیل کیا یا موت دیدی***۔ سورة انبیاء میں ہے جَعَلْنَاهُمْ حَصِيْدًا خَامِدِيْنَ (۲۱/۱۵) ”ہم نے انہیں نشو و نما کی قوت سے عاری کر کے بے حس و حرکت کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا“۔ دوسری جگہ ہے فَادَّاهُمُ خَامِدُونَ (۳۶/۲۹)۔ ”سو دیکھو! وہ بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گئے“۔ زجاج نے بھی اس آیت کے معنی بتائے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی خاموش اور مردہ ہیں****۔ تباہ ہو جانے والی قوموں کے خون سے حرارت سلب ہو جاتی ہے اور

ان کے پیکر را کھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی ان کا خمود ہے۔ بجھے ہوئے انگارے۔ نیز ان کی حیاتِ ملی کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کٹ جاتی ہیں اور ان کے صرف نشانات باقی رہ جاتے ہیں۔

خ م ر

خَمْرٌ - کسی چیز کو ڈھانپ دینا یا چھپا دینا۔ خَمَرَ الشَّيْءَ يَخْمِرُهُ - اس کو چھپا دیا۔ ڈھانپ دیا۔ خَمَرَ فُلَانٌ الشَّهَادَةَ - فلان نے گواہی کو چھپا دیا۔ الْخَمَرُ - اوٹ، آر، پردہ۔ خِمَارٌ - اوڑھنی جس سے عورتیں اپنے سر کو ڈھانپتی ہیں*۔ (جمع خُمُرٌ - ۲۳)۔ لطائف اللغة میں ہے کہ عورتیں پہلے اپنے سر پر الْغِفَارَةُ اوڑھتی تھیں اور اس کے اوپر الْخِمَارُ - (غِفَارَةُ کے لئے دیکھئے عنوان غ - ف - ر) الْخَمَرُ - ہر نشہ آور چیز۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے۔ الْخَمَرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ - خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں گڈمڈ اور فتور پیدا کر دے۔ بعض کا قول ہے ”لَا نَشْهَأُ تَخْمِيرَ الْعَقْلِ“ - یعنی شراب کو خمر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے*۔ عرب عام طور پر شیرہ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خَمْرٌ کہتے تھے۔ ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی خَمْرٌ کہتے ہیں*۔ تَخْمِيرٌ کے معنی ہیں خمیر اٹھانا*۔ خَامَرَ الرَّجُلُ فِي الْبَيْعِ مَخَامَرَةً - اس شخص نے خرید و فروخت میں فریب سے کام لیا اور آزاد کو غلام بنا کر بیچ دیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپ لینے اور ڈھانپ لینے کے ساتھ گھل میل جانے کے ہیں۔ اور لَا سِتِخْمَارٌ کے معنی ہیں غلام بنا لینا۔ اس لئے کہ کسی کو غلام بنانے کے لئے اس کی عقل کو سلب کر لینا ضروری ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں خَمْرٌ اور مَيْسِرٌ*** کے متعلق ہے کہ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَ مَنَافِعٌ لِلنَّاسِ - ”ان میں بڑا اثم ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی“۔ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِّنْ نَّفْعِيْهِمَا (۲۱۹)۔ ”ان کا اثم ان کے فائدوں کی نسبت بہت زیادہ ہے“۔ اِثْمٌ کے معنی ہیں اضمحلال۔ افسردگی۔ تکان۔ سستی۔ ایسی کمزوری جس سے انسان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے۔ (دیکھئے عنوان ا - ث - م)۔ یعنی نشہ آور اشیاء (اور میسر یعنی آسانی سے ہاتھ آئی ہوئی دولت) سے بیشک دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ انسان میں وقتی طور پر گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد قویٰ اس قدر

* تاج و راغب - ** محیط - *** ميسرة کے معنی ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ ج-وا بھی اس میں شامل ہے۔ (دیکھئے عنوان ی - س - ر)

کمزور ہو جاتے ہیں کہہ ان میں جد و جہد اور سعی و عمل کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے انہیں رَجُسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دیکر اس سے باز رہنے کی تاکید کر دی گئی (۹۰) اور بتا دیا کہ ان سے تمہارے اندر باہمی عداوت پیدا ہو جائیگی اور تم نظام صلوٰۃ کو قائم کرنے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔ (۹۱)۔ خَمْرٌ (شراب) کے طبعی اثرات کے متعلق ڈاکٹروں کی تحقیق یہی ہے کہ اس کا پہلا اثر دورانِ خون کو تیز کرتا ہے۔ اور یہ چیز بعض حالتوں (بیماریوں) میں اچھے نتائج مرتب کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کا اثر دورانِ خون کو بہت سست کر دیتا ہے۔ اور یہ اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ابتدائی فائدے کے مقابلہ میں اس کا ثانوی نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

خَمْرٌ (اور مَیْسِرٌ) سے صرف انسانی جسم ہی میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسانی ذات کی توانائیاں بھی افسردہ ہو جاتی ہیں، اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔

خ م س

الْخُمْسَةُ - پانچ - ۵ - وَ يَقُولُوْنَ خُمْسَةَ (۱۸) - يَوْمُ الْخَمِيْسِ - پانچواں دن (جمعرات) - خُمْسُوْنَ - پچاس - ۵۰ - اِلَّا خُمْسِيْنَ عَامًا (۲۹) - خُمْسٌ اور خُمْسٌ - پانچواں حصہ - فَاِنَّ لِلّٰهِ خُمْسَهُ (۸۱) - خَامِسٌ - پانچواں - اس کا مونث الْخَامِيسَةُ ہے (۲۳)۔ مال غنیمت کا خُمْسٌ (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے ہے (۸۱)۔ یعنی مرکز نظام خداوندی کے لئے - امیر ملت اس مال کو امت کی اجتماعی ضروریات پر صرف کریگا، اسی کو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے۔

خ م ص

الْخَمَصَةُ - بھوک - خَمِصَ الْبَطْنُ - پیٹ کھانے سے خالی ہو گیا اور اندر کو پچک گیا - اِلَّا خَمِصٌ - پاؤں کے تلوے کو کہتے ہیں جسکا قعر (Curve) اندر کی طرف ہوتا ہے۔ چونکہ سخت بھوک میں پیٹ بھی اسی طرح کمر کے ساتھ جا لگتا ہے اسلئے اس طرح کے بھوکے آدمی کو خَمِصٌ کہتے ہیں۔ اور مجازاً زَمَنْ خَمِصٌ قحط سالی کے زمانہ کو*۔ قرآن میں مَخْمَصَةٌ سخت بھوک کیلئے آیا ہے (۵)۔

خ م ط

خَمَطَ السَّالِحُ يَخْمِطُهُ - اسنے گوشت کو بھون لیا۔ اگر اسے پانی میں ابال لیا جائے تو سَمَطٌ کہیں گے۔ اَلْخَمَطُ - کھٹا۔ ہر کڑوی چیز۔ ہر پودا جس میں کسیلا پن اور کڑواہٹ ہو۔ ایک قسم کا زہر قاتل یا زہریلا مہلک درخت۔ ہر بے کانٹوں والا درخت، پیلو کے درخت کا پھل*۔ راغب نے اس کے معنی پیلو کا درخت کئے ہیں۔ قرآن کریم میں اہل سبا پر عذاب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ان کے عمدہ باغات کی جگہ ایسے باغات پیدا ہو گئے جو ذَوَاتِیْ اُكْلٍ خَمَطٍ تھے (۳۳/۱۶)۔ یعنی کڑوے پھلوں والے۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کی خوشگوار یوں کو بدمزگیوں سے بدل دیا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) ننگا اور خالی اور سپاٹ ہونا۔ اور (۲) تسلط و غلبہ۔ اس اعتبار سے (معنوی انداز میں) اس کا مفہوم ہوگا کسی کو جور و اکراہ اور ظلم و استبداد کی پاداش میں متاع حیات سے محروم کر دینا۔ یہی اہل سبا کے ساتھ ہوا تھا۔

خ ن ز ر

اَلْخَنَزَرَةُ - موٹا ہونا۔ بڑا موٹا ہتھوڑا جس سے پتھر توڑے جاتے ہیں۔ اَلْخَنَزَرِيُّ - سؤر۔ (جمع خَنَازِرٌ)۔ خَنَزَرٌ - اس نے خنزیر کے سے کام کئے۔ کسی کو کنکھیوں سے دیکھنے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے**۔ قرآن کریم میں لحم خنزیر کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ہوا ہے (۲/۱۷۳)۔ نیز ان لوگوں کیلئے بھی یہ لفظ (خنزیر) آیا ہے جن کی سیرتیں مسخ ہو کر بدترین حیوانوں جیسی ہو جائیں۔ (۵/۶۰)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کا استعمال مسخ صورت اور مسخ سیرت دونوں کیلئے ہو سکتا ہے***۔ (نیز دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ د) صاحب غریب القرآن نے اسے خَنَزَرٌ + نَزَرٌ سے مرکب لکھا ہے جسکے معنی ہیں سڑی گلی اور ناقص چیز****۔ خنزیر (سؤر) کے متعلق یہ عجیب چیز ہے کہ اسے دنیا میں ہر جگہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یورپ کی جو قومیں اس کا گوشت کھاتی ہیں وہ بھی اس کے نام کو بطور گلی استعمال کرتی ہیں۔ خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ہے۔

خ ن س

خَنَسَ عَنْهُ - يَخْنِسُ - خَنَسًا - اس سے پیچھے ہٹ جانا - خَنَسَهُ - کسی کو پیچھے ہٹا دینا - الْخُنُسُ - ہرنوں کے چھپنے کی جگہ - (نیز دیکھئے کُنُسٌ) - خَنَسَ مِنْ بَيْنِ أَصْحَابِهِ - وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان میں سے چھپ گیا - الْخَنَسُ فِي الْقَدَمِ - پاؤں کے تلوے کا سپاٹ اور پر گوشت ہونا* - الْخِنِيسُ گھات لگانے والے مکار، نیز حیلہ ساز اور چالباز کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنُوسِ (۱۵) - اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو پیچھے ہٹتے ہیں - اور چونکہ ستاروں کی رفتار میں آواز نہیں ہوتی اسلئے دبے پاؤں پیچھے ہٹنے کا مفہوم بھی اس میں آ جاتا ہے - یہ وہی شہادت ہے جو وَاللَّيْلِ إِذَا هَوَىٰ (۵۳) میں بیان ہوئی ہے (نیز، ۵۶/۵ میں) - کیونکہ اس کے بعد بھی وحی و رسالت کا بیان ہے (۲۰-۲۲)۔

سورة الناس میں الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۳) آیا ہے - یعنی کانوں میں کچھ پھونک کر دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا - چپکے چپکے غلط خیالات پھیلا کر چھپ جانے والا - مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ الْخَنَّاسُ، چھپنے والی طاقت کو کہتے ہیں - یا اسے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسی کے بنیادی معنی چھپنے اور پوشیدہ ہونے کے ہیں -

خ ن ق

خَنَقَ - يَخْنِقُ - گلا گھونٹ دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تنگی کے ہوتے ہیں - چنانچہ الْخَنَاقُ - تنگ گھاٹی کو کہتے ہیں - تنگی کی جہت سے الْخَنَقُ کے معنی گلا گھونٹنے کے آتے ہیں - الْخِنَاقُ - وہ رسی جس سے گلا گھونٹا جائے - اِنْخَنَقَ - اس کا گلا گھٹ گیا*** - (خِنَاقٌ اسی سے ہے) الْمُنْخَنِقَةُ - جس کا گلا گھٹ جائے (اور وہ اس طرح مر جائے) قرآن کریم نے ایسے جانور کو حرام قرار دیا ہے (۵/۳)۔

خ و ر

خَوَّرَ - يَخْوَرُ - خَوَّرًا - کمزور ہو جانا - بزدل ہو جانا - ٹوٹ جانا - سست پڑ جانا - خَارَتُ قُوَّةُ الْمَرْيُضِ - مریض کی قوت کم ہو گئی

یعنی وہ کمزور ہو گیا۔ خَوَّارَتْ اِلَّا رُضٌ۔ بارش کی کثرت سے زمین کی مٹی بہ گئی*۔

اَلْخَوَّارُ۔ گائے بیل بکری۔ ہرن یا تیرون کی آواز۔ دراصل یہ گائے بیل کی آواز کے لئے تھا، پھر دوسری آوازوں کے لئے بھی بولا جانے لگا*۔ راغب نے کہا ہے کہ خَوَّارٌ خاص طور پر گائے بیل کی آواز کو کہتے ہیں پھر استعارۃً اونٹ کی آواز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے*۔ قرآن کریم نے عِجْلٌ (بچھڑے) کیلئے لہ خَوَّارٌ کہا ہے (۱۳۸)۔ یعنی جس سے آواز نکلتی تھی۔

خ و ض

خَاضَ۔ یَخْضُوْضٌ۔ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں پانی میں اترنا اور اس میں چلنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ اس کے بعد اسکا استعمال کسی معاملہ میں دیر تک مشغول رہنے کیلئے ہونے لگا۔ قرآن مجید میں اس کا بیشتر استعمال فضول باتوں میں الجھنے کیلئے ہوا ہے***۔ خَاضَ۔ اس نے بیکار بات کی (اقرب الموائد)۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے وَخَضُّتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوا (۹۹) اس کے معنی فضول باتوں میں الجھے رہنا ہیں۔ سورۃ طور میں ہے اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَلْعَبُوْنَ (۵۲)۔ ”جو لوگ باطل میں منہمک اور حق سے غافل ہیں“۔ سورۃ مدثر میں مجرمین کی فہرستِ جرائم میں یہ بھی ہے کہ كُنَّا نَخْوُضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ (۳۵)۔ یہ اس ٹائپ کے لیڈروں کا ذکر ہے جو فلاح عامہ کیلئے عملاً کچھ نہیں کرتے لیکن بیانات دھڑا دھڑا دیتے، ریزولیشن پاس کرتے، اسکیمیں بناتے اور ہمیشہ (Planning) میں وقت گزارتے رہتے ہیں۔ یعنی باتیں ہی باتیں اور کام کچھ نہیں۔ نیز ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی موشگافیوں اور نکاتِ آفرینیوں میں لگے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں (۳۱-۳۲)۔

خ و ف

خَوْفٌ۔ قرائن اور شواہد سے کسی آنے والے خطرہ یا نقصان کا اندیشہ کرنا۔ اسے (Apprehend) کرنا۔ جس طرح طَمَعٌ کے معنی ہیں قرائن

و شواہد سے کسی فائدہ کی توقع کرنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں **خَوْفًا وَ طَمَعًا** اکٹھا آیا ہے (۵۶)۔ اس کے برعکس **حُزْنٌ** بالعموم اس غم کو کہتے ہیں جو حادثہ کے گزر جانے کے بعد اس کے نقصان کی وجہ سے ہو۔ یعنی **خَوْفٌ** کا تعلق مستقبل (حادثہ واقع ہونے سے پہلے) کے اندیشہ سے ہے۔ اور **حُزْنٌ** بالعموم گزرے ہوئے واقعہ کے غم کو کہتے ہیں*۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے **وَإِنْ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا** (۱۲۸) جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ہو۔ لہذا خوف خدا وندی کے معنی یہ ہیں کہ اس احساس سے کہ قوانین خدا وندی کو چھوڑ دینے سے میرا کس قدر نقصان ہوگا، ان قوانین کا اتباع کرنا۔ غلط روش کے تباہ کن نتائج کے احساس اور اندیشہ سے اس روش سے مجتنب رہنا۔ چنانچہ سورۃ نحل میں **أَشْيَاءُ كُنُتَ،** اور ملائکہ کے متعلق ہے **يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ** (۱۶)۔ ”یہ اپنے نشو و نما دینے والے کے غلبہ و اقتدار سے ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں“۔ یعنی وہ قوانین خدا وندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ہوگا۔ لہذا خدا کا خوف کسی مستبد حاکم کے خوف کے مرادف نہیں۔ اس خوف سے مفہوم ایسا ہی ہے جیسے ہم جلنے کے اندیشہ سے آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ چنانچہ **الْخِيفَةُ** اس چرمی جبہ کو کہتے ہیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا اوڑھ لیتا ہے (تا کہ شہد تو مل جائے لیکن وہ مکھیوں کے ڈنک سے محفوظ رہے)۔ نیز تھیلہ جس میں (تلف ہونے کے خوف سے) کسی چیز کو محفوظ کیا جاتا ہے**۔

خَوَافٌ۔ شور و غل کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی پریشانی اور گھبراہٹ کے ہیں۔ **خَوْفٌ** کے معنی قتل اور جنگ کے بھی ہیں**۔ چنانچہ (۳۳/۱۹) میں **خَوْفٌ** کے معنی قتل و قتال کے کئے گئے ہیں۔ **تَخَوَّفَ الْقَشِيَّةَ** کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کر دینا**۔ **تَخَوَّفَهُ حَقُّهُ** اس کے حق کو کم کر دیا۔ **أَوْيَا خَذَهُمْ** **عَلَى تَخَوَّفٍ** (۱۶/۱) کے معنی ہیں انہیں بتدریج کم کرتا ہوا تباہ کر دے، دفعۃً نہیں۔ نیز **تَخَوَّفَ** کے معنی خوف کرنا، ڈرتے رہنا ہیں۔ اس طرح یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ باوجود ان کے خوف کرنے اور ہوشیار رہنے کے انکی گرفت کر لے۔ لیکن اول الذکر معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔

الْخِيفَةُ۔ حالت خوف کو کہتے ہیں***۔

اتباع ہدایت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو خوف اور حزن نہیں رہتا (۲۸/۳)۔ لہذا اگر کسی قوم پر خوف چھایا رہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہدایت خداوندی کا اتباع نہیں کر رہی۔ مومن اور خوفِ باطل دو متضاد باتیں ہیں۔ لفظ مومن کا تو مادہ ہی امن ہے۔ پھر اسے باطل سے خوف کیوں؟

خ و ل

الْخِثَالُ - ماں کا بھائی، یعنی ماموں - (جمع أَخْوَالٌ - أَخْوَالَتٌ - خَوُّوْلٌ) - الْخِثَالَةُ - ماں کی بہن یا خالہ (اس کی جمع خِثَالَاتٌ ہے)۔ (۳۳/۲) - أَخْوَالٌ (۲۱/۲) میں آیا ہے۔ الْخِثَالُ - بھلائی کا نشان جو کسی آدمی میں نظر آئے۔ فوج کا جھنڈا - سیاہ اونٹ - هُوَ خَالٌ مَالٍ - وہ اونٹوں کا محافظ ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی خبر گیری اور نگہداشت کرنے کے ہوتے ہیں۔ خَوَّلَ (تَخَوَّلَ) کسی کو سامانِ حشم و خدم عطا کر دینا - یا ایسی چیزیں دینا جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت پڑے**۔ إِذَا خَوَّلَهُ، نِعْمَةً (۳۹/۸)۔ ”جب اللہ اسے سامانِ آسائش عطا کرتا ہے،“۔

خ و ن

الْخَوْنُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کم کر دینا - خَوَّنَهُ - اس کو کم کر دیا - فِي ظَهْرِهِ خَوْنٌ - اس کی کمر میں کمزوری ہے - نگاہ کی چندھیماہٹ کو بھی خَوْنٌ کہتے ہیں*۔

خَانَ - يَخُونُ - خَوْنًا سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے۔ اس کا نام خِيَانَةٌ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خِيَانَةٌ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں خَانَ الدَّلَّوَالُ الرَّشَاءُ - رسی نے ڈول سے وفا نہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب سے ڈول کنویں میں گر گیا*۔ ہم رسی کی مضبوطی کے بھروسہ پر ڈول کو بھر کر کھینچتے ہیں۔ اگر رسی درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ جائے تو یہ اس کی خِيَانَةٌ کہلاتی ہے۔ لہذا اَمَانَةٌ تو یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے مطمئن (امن میں) ہو جائے اور اپنے اعتماد کو نہیں کھوئے۔ لیکن خِيَانَةٌ میں یہ اعتماد اور بھروسہ

باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قوانین خداوندی کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایک ایسی مضبوط کڑی ہے کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲۵۶)۔ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ ان پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کبھی راستہ میں دغا نہیں دیتے۔ یہ درمیان میں پہنچ کر ٹسوٹ نہیں جاتے۔ صرف ٹوٹ کر نقصان پہنچانا ہی نہیں بلکہ ہر تغیر، کمی اور تبدیلی کرنے کو تَخَوُّنٌ کہتے ہیں*۔ خَانَہُ الدَّهْرُ۔ زمانہ نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، یعنی اس کی حالت بگاڑ دی*۔

قرآن میں ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ (۲۲/۳۸)۔ خَوَّانٌ ہر ایسے شخص کو کہہ سکتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جاسکے، اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کر دینے کی کوشش کرے۔ نیز بڑا خائن۔ قرآن کریم نگاہ کی خیانت تک سے منع کرتا ہے (۳۰/۱۹)۔

سورۃ بقرہ میں ہے اَنۡتَکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتٰنُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ (۲/۱۸۷)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِخۡتِیَانٌ سے مراد خیانت کا ارادہ یا تیاری کرنا ہے**۔ لہذا دوسروں سے تو ایک طرف، خود اپنی ذات سے بھی خیانت نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ خیانت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہئے۔ سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے۔ یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف عمل کرنا (خواہ اس کا علم کسی دوسرے کو ہو یا نہ ہو)۔ یہ انسانی خودی کی کمزوری کی دلیل، بلکہ (Dual Personality) کی علامت ہے۔ یعنی اُن باتوں کو ماننے والا کوئی اور ہوتا ہے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور۔ قرآن کریم اس سے روکتا ہے۔

سورۃ نساء میں ہے الَّذِیۡنَ یَخۡتٰنُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ (۴/۱۰۷) جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے کہ تم نہ تو نظام خداوندی کے خلاف سازش کرو۔ (لَا تَخۡوۡنُوۡا)۔ اور نہ ہی ان امور میں کسی قسم کی خیانت کرو جو تمہارے سپرد کئے جائیں (۸/۲۸)۔

خ و ی

خَوَّتِ السَّادِرُ۔ گھر ویران ہو کر گر پڑا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں خالی ہونا اور گھرنا لکھے ہیں۔ اَرْضٌ خَاوِیۡۃٌ۔ ویران زمین*۔ اَلۡیَخَوَءُ کے معنی خالی ہونے کے ہیں**۔ خَوِیَ الْمَکَانُ۔ جگہ خالی ہوئی***۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

سورة بقرہ میں ایک بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (۲۵۹)۔ برباد اور ویران جسکے مکانات گر پڑے تھے۔ یا اس کے مکان، باوجود چھتوں کے قائم ہونے کے خالی تھے۔ سورة الحاقہ میں ہے اَعْجَازٌ نَخْلٍ خَاوِيَةٌ (۶۹) اندر سے کھوکھلے ہو کر گر پڑنے والے کھجور کے تنے۔ تباہ و برباد۔

خ ی ب

خَابَ - يَخِيبُ - خَيْبَةٌ - محروم رہ جانا - نقصان اٹھانا - مایوس ہو جانا - نامراد رہ جانا* - توقعات کا منقطع ہو جانا - مطلوب کو حاصل نہ کر سکرنا - محتاج و فقیر ہو جانا** - اَلْخَيْبَاتُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ نہ نکلے۔ (ابن فارس) قرآن میں ہے فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ (۱۳۶)۔ ”وہ خاسر و نامراد واپس ہو جائیں“، قرآن کریم میں خَابَ کا لفظ اَفْلَحَ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اَفْلَحَ کے معنی ہیں کھیتیوں کا پروان چڑھنا، ثمر بار ہونا۔ لہذا خَابَ کے معنی ہونگے، بے ثمر رہ جانا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (۹۰-۹۱) جس نے انسانی ذات (نفس - Self) کی نشو و نما کی، اس کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ جس نے اسے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشت حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلہ زندگی افسردہ ہو گیا۔ ایسے چقماق کی مانند ہو گیا جس سے چنگاری نہ نکلے۔ اسی لئے سورة ابراہیم میں خَابَ کی تفسیر هَلَكَ سے کر دی گئی ہے۔ تباہی اور بربادی (۱۳۱-۱۳۲)۔ اسمیں اس زندگی کی بربادی بھی شامل ہے (بلکہ یہ تو سب سے پہلے سامنے آ جاتی ہے)۔ اسمیں انسانی ذات (Self) کی نشو و نما کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگوار یوں کا حاصل ہو جانا بھی ہے۔ ترک دنیا سے ”روحانی ترقی“، کا خیال غیر قرآنی ہے۔ انسانی ترقی تسخیر کائنات سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی جس میں شعلہ نہ ہو، راکھ کا ڈھیر ہے۔

خ ی ر

الْخَيْرُ۔ ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو سب کو مرغوب ہو۔ نیز مفید چیز۔ یہ الشَّرُّ کی ضد ہے۔ اَلْخَيْرُ، ہر قسم کے مال کو کہتے ہیں۔ عرب گھوڑوں کو بھی ان کی افادیت کے اعتبار سے خَيْرٌ کہتے تھے (۳۸)۔ خَيْرَاتٌ۔ خوبصورت و خوش اخلاق عورتوں کو کہتے ہیں*۔ (یا جن میں بہت سی

خوبیاں ہوں۔ خوبصورتی بھی ایک خوبی ہے)۔ خَیَارٌ کے معنی اختیار کے ہیں۔ یعنی اس امر کا اختیار کہ جس چیز کو چاہے لے لے اور جسے چاہے چھوڑ دے (Choice)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ اَنْتَ بِالْخَیَارِ۔ تمہیں حسب مرضی کام کرنے کا اختیار ہے۔ خَیَّرَهُ بَیْنَ الشَّيْئَيْنِ۔ اس نے اُسے اختیار دے دیا کہ وہ دو چیزوں میں سے جسے چاہے لے لے*۔ اسْتَخَارَہ کے معنی ہیں دو باتوں میں سے بہتر کو طلب کرنا*۔ چونکہ دو چیزوں میں سے جسے اختیار کیا جاتا ہے وہ بہرحال دوسری چیز سے بہتر ہوتی ہے (یا اُسے ایسا سمجھا جاتا ہے) اس لئے خَیْرٌ کا لفظ شرف و برتری، فضیلت و کرم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ هُوَ خَیْرٌ مِنْكَ۔ وہ تم سے بہتر ہے، یہ افعِلِ التَّفْصِيلَ ہے۔ خَارَ الرَّجُلُ عَلٰی غَیْرِہِ وَ خَیَّرَہُ تَخَیَّرًا۔ اس نے آدمی کو دوسرے لوگوں پر فضیلت اور ترجیح دی۔ اخْتَرْتُہُ عَلَیْہِمُ۔ میں نے اسے ان سب پر فضیلت دے دی۔ خَارَہُ۔ اُس کو چن لیا، منتخب کر لیا۔ الْخَیَارُ۔ ککڑی کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں خَیْرٌ کا لفظ مال و دولت کے معنوں میں متعدد جگہ آیا ہے۔ (مثلاً ۱۸۰/۲ و ۲۲۲/۲)۔ اَدْنٰی کے مقابلہ میں خَیْرٌ (۲۱۱/۲) میں آیا ہے۔ مِثْلٌ۔ کسی چیز کے مانند۔ اور خَیْرٌ۔ اس سے بہتر (۱۰۶/۲)۔ سورۃ انعام میں یہ لفظ ضُرٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱/۶)۔ سورۃ حج میں فِتْنَةٌ کے مقابلہ میں (۲۲۲/۱) اور سورۃ بقرہ میں شَرٌّ کے مقابلہ میں (۲۱۶/۲)۔ سورۃ نحل میں یہ لفظ ہر اچھی بات یا اچھے کام کے لئے آیا ہے (۱۶/۱)۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے بَیْدَرَكَ الْخَیْرُ (۳۵/۳)۔ اس میں اختیارات و اقتدار اور ہر قسم کی بھلائیوں کا تصور موجود ہے۔ سورۃ احزاب میں خَیْرَةٌ کا لفظ اختیار و انتخاب کے معنوں میں آیا ہے (۳۳/۳)۔ کائنات میں جو انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل جاری ہے اس کے لئے یَسْخَرُ کا لفظ آیا ہے (۲۸/۲)۔ سورۃ طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ (۲۸/۲)۔ میں نے تجھے (ایک مقصد عظیم کے لئے) چن لیا ہے۔ منتخب کر لیا ہے۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے اَخْیَارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۳)۔ یعنی منتخب افراد۔ ابن فارس نے کہا ہے قَسُوْمٌ خَیَارٌ اور اَخْیَارٌ کے معنی ہیں بہت سی صلاحیتوں کی مالک قوم۔

(۵۵) میں خَيْرَاتٌ حِسَانٌ۔ متناسب الاعضاء اور معتدل سیرت و کردار رکھنے والی عورتوں کے لئے آیا ہے، یا متوازن اور عمدہ خوشگوار اشیاء کے لئے۔ چونکہ زندگی کی تمام خوشگواریاں اور اختیارات و اقتدارات کی وسعتیں قوانین خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہیں اس لئے وحی کے لئے بھی خَيْرٌ کی جامع اصطلاح آئی ہے (۱۰۵)۔ لہذا مومنین کی زندگی یہ ہے کہ انہیں وحی کے اتباع سے ساری دنیا کی مفید اور حسین چیزیں میسر ہوں اور ان کے اختیارات کی وسعتیں حدود فراموش ہوں۔ یہ ہے خَيْرٌ جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لئے سورۃ نحل میں ہے کہ جب مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے کیا نازل کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں ایک جامع لفظ کہہ دیتے ہیں۔ قَالُوا خَيْرًا (۱۰۶)۔ یعنی تمام دنیا کی خوشگواریاں اور خوشحالیاں اور اختیارات کی وسعتیں۔ اس کی تفسیر اگلے الفاظ نے یہ کہہ کر کر دی ہے کہ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارًا رَّأٰ الْآخِرَةَ خَيْرٌ (۱۰۷) اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں، اور مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ لہذا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں، خیر ہے اور جس کا نتیجہ اس کے برعکس ہو وہ شر ہے۔ خوشگوار یوں میں انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما (Development) سب سے مقدم ہے۔ بلکہ یوں کہہئیے کہ خوشگوار کہتے ہی اسے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشو و نما ہو۔ جس سے اس کی نشو و نما رک جائے وہ شر ہے۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اسے وہ اعمال صالحہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوں۔ (دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ ح) سورۃ بقرہ میں حج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَ تَسْزَوْدُوْا فَاِنْ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۱۰۹)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم حج کے لئے زاد راہ ضرور لیا کرو۔ اس زاد راہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں بھیک مانگنے سے بچے رہو گے۔ (یہاں خَيْرٌ کے معنی فائدے کے ہیں اور تقویٰ کے معنی محتاجی کی ذلت سے محفوظ رہنے کے۔)

خ ی ط

الْخَيْطُ۔ دھاگہ۔ لڑی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریکی کے ساتھ دراز ہونے کے ہیں۔ الْخَيْطُ۔ الْمَخِيْطُ

سوئی*۔ فی سَمِّ الْخَيْطِ : سوئی کے ناکہ میں (سَمِّ)۔ خَاطَ الثَّوْبَ۔
 کپڑے کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ سی دینا**۔ خَيْطًا۔
 درزی*۔

قرآن کریم میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ
 وَالْخَيْطُ الْاَسْوَدُ آیا ہے (۱۸۷) یعنی سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ۔
 اس سے مراد ہے صبح کی پھٹنے والی روشنی اور رات کی تاریکی*۔ اس سے ظاہر
 ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ لفظی معنی نہیں لئے جاتے بلکہ مفہوم کے
 اعتبار سے مطلب لیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر لطائف اللغة میں الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ
 کے معنی اَلنَّوْرُ (روشنی) کئے گئے ہیں۔

اَلْخَيْطُ۔ رنگ کو بھی کہتے ہیں*۔ اور جماعت کو بھی*۔

خی ل

خَالَ۔ يَخَالُ۔ گمان کرنا۔ خیال کرنا۔ خَيَّلَ۔ اندازہ سے معلوم
 کرنا اور تاڑنا۔ خَيَّلَ إِلَيْهِ أَنْتَهُ كَذَا۔ اس کے وہم میں کوئی چیز ایسی
 معلوم ہوئی۔ یعنی کوئی چیز جو درحقیقت ایسی نہ ہو لیکن یونہی متخیلہ میں
 ایسی دکھائی دے۔ چنانچہ اَلْاَسْتَحَابَّةُ اَلْمُخَيَّلَةِ اس بادل کو کہتے
 ہیں جسے تم دیکھنے پر برستا ہوا خیال کرو۔ اَلْاَخْيَالُ (Scare - Crow) کو
 بھی کہتے ہیں۔ یعنی دو لکڑیوں کے اوپر سیاہ رنگ کا کپڑا ڈال کر اسے آدمی
 کی شکل دیتے ہیں اور کھیت میں کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ جانور اسے آدمی
 سمجھ کر کھیت کے قریب نہ آئیں*۔ انہی معانی کے لحاظ سے سورۃ طہ میں
 ساحرین دربار فرعون کے متعلق ہے کہ انہوں نے رسیوں کو پھینکا تو يَخَيَّلُ
 إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِ هِمٍ اَنْتَهُمَا تَسْعَى (۲۶) ”ان کی نگاہ بندی کی وجہ سے
 حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں ایسا خیال پیدا ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں“۔
 یعنی وہ درحقیقت دوڑ نہیں رہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ
 متحرک ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے سحر (Magic) کے متعلق کتنی بڑی
 حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ سحر کے زور سے اشیاء کی
 مسابہت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ صرف دیکھنے والے کے خیال میں
 تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اسے وہ اشیاء ایسی نظر آنے لگ جاتی ہیں، یعنی
 اس کا اثر محض نفسیاتی ہوتا ہے۔

لیکن یہ مفہوم اسی صورت میں لیا جائیگا جب دربار فرعون کے منتریوں کی ”رسیوں اور لاٹھیوں“ کو حقیقی معنوں میں لیا جائے۔ اگر ان کے مجازی معنی لئے جائیں تو پھر مطلب اور ہوگا۔ تفصیل ان امور کی اپنے اپنے مقام پر ملیگی۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ ح۔ ر)

اسی سے خَيْلَاءُ کے معنی ہیں ایسا غرور جو انسان اپنے اندر یونہی کسی ذہنی بڑائی کی بناء پر پیدا کر لے۔ یعنی وہ بڑائی در حقیقت اس میں موجود نہ ہو لیکن وہ خود فریبی سے ایسا سمجھ لے کہ اس میں وہ بڑائی ہے اور پھر اس پر فخر کرنے لگ جائے۔ ایسا کرنے والے کو مُخْتَالٌ کہتے ہیں۔ (۳۱/۱۸) یعنی خود فریبی میں مبتلا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایسی حرکت کے ہیں جس میں تلون بھی شامل ہو۔ خَيْالٌ اسی سے ہے۔ خَيْالٌ در حقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان خواب میں دیکھے۔ ایک تو خواب میں ہر شے متلون ہوتی ہے۔ ابھی کچھ ابھی کچھ۔ دوسرے انسان سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ فی الواقعہ ایسا ہے۔ حالانکہ اسکی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے اس آیت کا مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ساحرین کی سحر طرازی کا ذکر ہے (اور جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ یعنی ۲۰/۶۶)۔

راغب نے کہا ہے کہ اسی سے لفظ خَيْلٌ (۳۷/۱۳) ہے (یعنی گھوڑے یا گھڑ سواروں کا دستہ)۔ (۱۶/۳۰) کیونکہ گھوڑا بھی اپنی رفتار میں اٹھلاتا ہوا چلتا ہے۔ اور گھڑ سوار کے دل میں بھی ایک عجیب قسم کا تکبر سا ہوتا ہے۔

خ ی م

تَخِيْمٌ کے معنی ہوتے ہیں خیمے نصب کر کے قیام کرنا۔ عرب اپنے قیام کیلئے جو عارضی سا گھر بنا لیتے تھے اسے خَيْْمَةٌ کہتے تھے۔ اسکی ساخت کے متعلق بہت سے اقوال ہیں لیکن عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ چار لکڑیاں کھڑی کر کے ان پر درختوں (جھاؤ وغیرہ) کے پتے ڈال دئے جاتے تھے۔ اسے خَيْْمَةٌ کہتے تھے۔ جو خیمہ کیڑے سے بنایا جاتا تھا اسے مِظَلَّةٌ کہتے تھے۔ خَيْمَ الشَّيْءِ کے معنی ہیں اُسے کسی چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دیا۔ *** خَيْْمَةٌ کی جمع خِيَامٌ ہے۔ یہ لفظ (۵۵/۲) میں آیا ہے۔ حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِی الْخِيَامِ۔

د

د ا ب

اَلدَّاءُ بٌ - اَلدَّاءُ بٌ - (کسی کام میں) مسلسل لگے رہنا۔ لگا تار کوشش کرتے رہنا۔ تسلسل اور مداومت کی وجہ سے اس کے معنی عادت مستمرہ یا حالت، دستور، طور طریق کے ہو گئے *۔ دَآءُ بٌ فُلَانٌ - اس شخص نے لگا تار کوشش کی، تھکا اور مصروف عمل رہا ***۔ کتاب الاشتقاق میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ دَآءُ بٌ اس کام کے لئے بولتے ہیں جو مسلسل، بلا انقطاع کیا جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مداومت کے ہیں۔

سورة آل عمران میں ہے کَدَّآءُ بِالِ فِرْعَوْنَ (۱۰۳)۔ قوم فرعون کی روش کے مطابق۔ سورة يوسف میں دَآءُ بٌ (۱۲۲) کے معنی ہیں بہت زیادہ محنت اور کوشش کے ساتھ مسلسل۔ سورة ابراهيم میں ہے وَالشَّامُوسُ وَالْقَمَرُ دَائِبَيْنِ (۱۲۳)۔ سورج اور چاند مسلسل اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں مسلسل مصروف ہیں۔

داو، د علیہ السلام

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آپ حضرت ابراهيمؑ کی ذریت (نسل) میں سے تھے۔ وَ مِّنْ ذُرِّيَّتِهِمُ دَاوُدَ (۸۴)۔ اللہ نے انہیں ایک کتاب (زَبُورًا) دی تھی۔ (واضح رہے کہ زَبُورًا کے معنی ”ایک کتاب“، ہیں۔ لیکن سورة انبیاء میں اَلزَّبُورُ بھی آیا ہے۔ ۲۱۵)۔ جس کے معنی خاص کتاب کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ پر نازل شدہ کتاب کا نام ہو) آپ کو علم کی فراوانی عطا کی گئی تھی (۲۱۵) اور محکم سلطنت (۳۸)۔ تا کہ آپ لوگوں میں حق کے ساتھ حکومت کریں (۳۸)۔ پہاڑی قبائل کے بڑے بڑے سردار آپ کے مطیع و فرمان پذیر تھے اور آپ کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے (۳۸)۔ نیز قبیلہ طیر کے خانہ بدوش افراد بھی جن سے شاہی

*راغب - **تاج و محیط و اقرب الموارد -

رسالے (گھوڑوں کے لشکر) مرتب ہوئے تھے (۳۸/۱۹)۔ آپ نے اس سے قبل بنی اسرائیل کے لشکر کے ساتھ جالوت کے لشکر کو شکست دی تھی اور جالوت کو قتل بھی کیا تھا (۲۵/۲۱)۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائیوں میں پہننے کا لباس (زرہ بکتر) آپ کی ایجاد تھی یا آپ کو اس میں خصوصی ملکہ حاصل تھا (۲۱/۸)۔ آپ کا زمانہ اندازاً ۱۰۰۰ ق۔ م۔ سمجھنا چاہئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ بڑے خوش آواز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلات موسیقی ایجاد کئے۔ جب وہ پہاڑوں پر بیٹھ کر اپنا ہربط بجاتے تھے تو شجر و حجر جھومنے لگ جاتے تھے۔ تورات اور ہماری تفسیری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے**۔

د ب ب

دَبَّ النَّعْمُلُ يَدَبُّ دَبًّا - خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا۔ اس سے دَبَّ الشَّرَابُ فِی الْجِیْسَمِ کہتے ہیں۔ یعنی شراب کا جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر جانا۔ الدَّبَابَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے۔ ہر رینگنے اور چلنے والا جاندار*۔ الدَّبَابَةُ آہستہ رفتار۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس رفتار کو کہتے ہیں جو مَشْشً سے خفیف ہوتی ہے۔ الدَّبَابَةُ - کھالوں اور لکڑیوں سے بنائی ہوئی ایک بہت بڑی سی محفوظ گاڑی جس میں بیٹھ کر سپاہی قلعہ کی دیوار تک پہنچ جاتے تھے تاکہ اسے توڑ سکیں*۔ (آجکل ٹینک کو دَبَابَةُ کہتے ہیں)۔ یہ آہستہ آہستہ چلتی تھی اور اس میں بیٹھنے والا دشمن کی زد سے محفوظ رہتا تھا۔ الدَّبَابَةُ سخت زمین پر چلنے سے قدموں کی آواز۔ نیز شور۔ ڈھول بجانا اور ڈھول کی آواز کو بھی کہتے ہیں*۔

[قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو دب دب کے عنوان کے تحت آنا چاہئے لیکن چونکہ اسے محض ضمنی طور پر لکھا گیا ہے اور قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا اس لئے اسے الگ لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔]

قرآن کریم میں دَابَّةٌ کا لفظ، رینگنے والے جانور، دو پاؤں پر چلنے والے اور چار پاؤں پر چلنے والے جانور، سب کے لئے آیا ہے۔ (۲۳/۳۵)۔ دَابَّةٌ کی جمع دَوَابٌّ ہے۔ سورۃ حج میں یہ لفظ انسانوں کے علاوہ باقی ذی حیات کے لئے آیا ہے (۲۲/۱۸)۔ سورۃ فاطر میں یہ لفظ انسانوں اور سویشیوں کے علاوہ دیگر ذی حیات کے لئے آیا ہے۔ (۳۵/۳۸)۔ سورۃ نحل میں ہے لَوْ یُؤْخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَوْا عَلَیْهَا مِنْ دَابَّةٍ (۱۱/۱۱) نیز

(۳۵/۳۵)۔ ”اگر اللہ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے، ان کی (فوری) گرفت کرتا تو زمین پر کوئی دابة نہ چھوڑتا،۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں ”دابة“، کا لفظ خود انسانوں کے لئے آیا ہے کیونکہ انسانوں کے غلط اعمال کی وجہ سے انسانوں کو ہلاک ہونا چاہئے، نہ کہ دیگر مخلوقات کو بھی۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کی وسعت کو دیکھا جائے تو اس سے مراد، انسان اور دیگر ذی حیات بھی ہو سکتے ہیں۔ سورۃ انفال میں، عقل و خرد سے کام نہ لینے والے انسانوں کو شَرَّ السَّوْآتِ (۸۲/۱) کہا گیا ہے۔ یعنی چلنے والے جانوروں (یا ذی حیات) میں سب سے زیادہ بدتر۔ یعنی حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ (۱۶۹/۱)۔

سورۃ النمل میں ہے وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (۸۲/۲)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شریر لوگ ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہیں۔ اس طرح یہ لفظ جمع ہو جائیگا*۔ لیکن جب قرآن نے دَابَّةً کا لفظ انسانوں کیلئے بھی استعمال کیا ہے تو پھر ان شریر انسانوں کی جانوروں کے ساتھ مماثلت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس سے مراد جنگجو قومیں ہونگی۔ اس کی وضاحت تَكَلِّمُهُمْ نے بھی کر دی ہے جس کے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔ لیکن اگر تَكَلِّمُهُمْ کے معنی بات کرنے کے بھی لئے جائیں تو بھی دَابَّةً کے مندرجہ بالا مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (دیکھئے عنوان ک۔ ل۔ م)۔ سورۃ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے نالائق (جانشین بیٹے) کیلئے یہ لفظ آیا ہے (۳۴/۱۳)۔ یعنی وہ انسان نہیں تھا، محض حرکت کرنے والا پیکر تھا۔ (تفصیل سلیمانؑ کے عنوان میں ملیگی) سورۃ ہود میں ہے وَمَا مِن دَابَّةٍ فِیْ الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۱)۔ ”اس زمین میں کوئی دَابَّةً ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو،۔ دَابَّةً سے مراد خواہ تمام حیوانات (انسان سمیت) ہوں یا صرف انسان، ان سب کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو پھر دنیا میں لوگ بھوک سے کیوں مرتے ہیں؟ ایک قحط میں مرنے والوں کی تعداد لا کھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور عام حالات میں بھی کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو وہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور نہایت غور طلب۔ (جیسا کہ میں

نے اپنی کتاب ”نظام ربوبیت“ میں تفصیل سے لکھا ہے) ایسے مقامات میں اللہ کی ذمہ داری اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یعنی یہ نظام ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جنکی نسبت (قرآن میں) اللہ کی طرف کی گئی ہے اور اسی طرح وہ حقوق و واجبات بھی اسکی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جنہیں خدا کے حقوق کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے کی جاتی ہے جو خدا کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اور عَلٰی اللہ رَزَقَہَا کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ ان تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام کے سر پر عائد ہو جاتی ہے۔ لہذا نظام خداوندی میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے۔ رزق کے سرچشمے اصلاً اس نظام کی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں اور وہ نظام خدا کے دئے ہوئے رزق کی تقسیم اسطرح کرتا ہے کہ کوئی متنفس اس سے محروم نہیں رہنے پاتا۔ اسطرح خدا کی ذمہ داریاں خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ ہو تو مستبد قوتیں رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتی ہیں اور کمزور انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ جسے چاہتے ہیں رزق دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ آسمانی انقلاب، رزق کے سرچشموں کو ان کے ہاتھ سے چھین کر، انسانیت کی پرورش کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے۔

سورۃ شوریٰ میں ہے وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَاْلَاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا مِنْ دَابَّةٍ - وَہُوَ عَلٰی جَمْعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (۳۹)۔ ”اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموات، زمین اور فضائی کروں، کو پیدا کیا اور (جو) ان کے اندر اس نے ذی حیات (دابة) پھیلا دئے ہیں۔ اور وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق انہیں جمع کرنے پر قادر ہے،“ اس آیت سے آسمانی کروں میں ذی حیات آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ نیز، اب غالباً وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب زمین کی آبادی، آسمانی کروں کی آبادی کے ساتھ مل جائے (دونوں جمع ہو جائیں)۔ قرآن نے انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہ رکھا ہے کہ ارض و سموات میں جو کچھ ہے وہ اس کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اسکی یہ کوشش کہ آسمانی کروں تک جا پہنچے، قرآنی تعلیم کے مطابق ہے۔ ان کروں میں سے جن میں آبادی ہوگی وہ اسطرح زمین کی آبادی کے ساتھ مل جائیگی۔ دیکھا آپ نے کہ انفس و آفاق کی نشانیاں کسطرح قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے چلی جا رہی ہیں؟ (۳۹)۔

د ب ر

الشَّدْبُرُ - الشَّدْبُرُ - ہر شے کا پچھلا حصہ۔ بات کا انجام، نیز اس کے معنی پشت اور مقعد کے بھی کئے گئے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا آخری اور پچھلا حصہ بتائے ہیں۔ جمع اَدُبَارٌ - سورۃ قمر میں ہے یَوَلِّشُونَ الشَّدْبُرَ (۵۳/۳۵) - وہ پیٹھ پھیر دینگے۔ سورۃ یوسف میں ہے مِّنْ دُبُرٍ (۱۲/۲۵) - پیچھے سے۔ سورۃ نمل میں ہے وَلَیُّ مَدْبِرًا (۲۰/۱۰) - وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔

اَدُبَارٌ - پیچھے ہٹنا، آخری وقت۔ اَدُبَارُ الشَّجْوَمِ (۵۲/۳۹) - آخر شب میں ستاروں کے ڈوبنے کا وقت*۔ ستاروں کا پیچھے ہٹنا۔

اَلْدَّابِرُ - ہر چیز کا آخر۔ اصل و بنیاد*۔ فَتَقْطِيعَ دَابِرِ الْقَوْمِ (۶۱/۳۵) - اس قوم کا آخری آدمی تک بھی ہلاک ہو گیا۔ اسکی جڑ کٹ گئی۔ اَلتَّدْبِيرُ - اَلتَّدْبِيرُ - کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا۔ آخری منزل (مقام تکمیل) کو سامنے رکھ کر نظم و نسق کرنا۔ یُدَبِّرُ الْأُمُورَ (۳۲/۵) - وہ تدبیر امور کرتا ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ (۸۲/۳) ”کیا یہ اس پر غور و فکر نہیں کرتے کہ قرآن کیا کہتا ہے، اور کاروان انسانیت کو کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ سورۃ ص میں ہے لَیَدَّبِّرُوا آيَاتِهِ (۳۹/۳۸) - تا کہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔

اَلْمُدَبِّرَاتِ أُمُورًا (۹۰/۵) - معاملات کو تکمیل تک پہنچانے والے۔ تدبیر امور کرنے والے۔

سورۃ ق میں ہے فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ - وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَادْبَارَ النُّجُودِ (۳۰-۳۹)۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس سے مضطرب و بیچین نہ ہو۔ اور خدا کی ربوبیت کو مظہر حمد و ستائش بتانے کے لئے سرگرم عمل رہو۔ طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے۔ اور رات میں بھی اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جدو جہد کرو۔ اور اَدُبَارِ النُّجُودِ میں بھی۔ سورۃ طور کے اخیر میں بھی یہی مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں آیا ہے۔ لیکن وہاں اَدُبَارِ النُّجُودِ ہے۔ اس کے معنی ستاروں کے ڈوبنے یا پیچھے ہٹنے کے ہیں۔ لیکن سورۃ

ق میں آدُ بَار آیا ہے جو دُ بَر کی جمع ہے۔ دوسرا لفظ سَجَوْد ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی جھکنے یا مائل ہونے کے ہیں۔ اس سَجَوْد کے آدُ بَار کیا ہیں، یہ چیز غور طلب ہے۔ عام تفاسیر اور کتب لغت میں اس کے معنی ”نماز کے بعد، لکھے ہیں۔* لیکن یہ معنی جپتے نہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہاں لفظ آدُ بَار آیا ہے اِدُ بَار نہیں۔ نیر دُ بَر کسی شے کے آخری اور پچھلے حصہ کو کہتے ہیں جو اس میں شامل ہوتا ہے۔ اور ”بعد، کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ یا چیز ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی اور واقعہ یا چیز شروع ہو۔ ہم اپنی اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق متعین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

د ث ر

الدُّثْرُ - مالِ کثیر یا ہر کثیر شے کو کہتے ہیں۔ مَالٌ دُثْرٌ - بہت زیادہ مال۔ الدُّثَارُ - وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے۔ تَدُّ ثَرًا بِالشَّوْبِ - وہ کپڑے میں لپٹ گیا۔ دَثْرَ الشَّجَرِ دُثُورًا - درخت نے نئے پتے نکال لئے اور اسکی سبز شاخیں پھیلیں۔ هُوَ دَثْرٌ مَالٍ - وہ اونٹوں کی اچھی خبر گیری کرنے والا ہے۔ تَدُّ ثِيْرُ الشَّيْطَانِ - پرند کا اپنے گھونسلے کو درست کرنا۔ نيز الدُّثُورُ - سست رفتار۔ بوجھل۔ اور زیادہ سونے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ (جو کپڑوں میں لپٹا رہے)۔ اور دَثْرَ الاَثَرِ نشان کے مٹ جانے کو کہتے ہیں۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے آ جانا۔ تہ بہ تہ جم جانا۔ یا اوپر چڑھ جانا۔ ان معانی کی رو سے راغب نیز ابن فارس نے اس سادہ کے مختلف استعمالات بیان کئے ہیں جن سے مفہوم کسی کے اوپر چھا جانا ہے۔ مَنَزَلَ دَاثِرٌ - وہ منزل جس کے آثار (نشانات) مٹ گئے ہوں یا تہ بہ تہ مٹی چڑھ جانے سے چھپ گئے ہوں۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۹۳) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ الدُّثَارُ کے اعتبار سے اس کے عام طور پر معنی کئے جاتے ہیں۔ اے کپڑا اوڑھنے والے۔ لیکن تَدُّ ثِيْرُ الشَّيْطَانِ کے مفہوم کی رو سے اس کے معنی ہونگے، گھر کو ٹھیک کرنے والا۔ اور دَثْرٌ مَالٍ کے مفہوم کے پیش

* لسان العرب - تفسیر فتح القدیر (شوکانی) - تفسیر روح المعانی (آلوسی) ** تاج -

محیط - راغب -

نظر اسکے معنی ہونگے، اچھی خبر گیری کرنے والا۔ لہذا اسکا یہی مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اے وہ جس کے ذمہ انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ہے۔ یا اے وہ جو نوع انسانی کے معاملات کو حسن تدبیر سے سلجھانے کیلئے آیا ہے۔ اور دَثَرُ الشَّجَرِ کے اعتبار سے معنی ہونگے، اے وہ جسکی آمد سے ایک نئی دنیا وجود میں آنے والی ہے۔ یا جسکی آمد سے چمن عالم پر بہار آنے والی ہے۔ اس مخاطب کے بعد آپؐ سے کہا گیا قُمْ فَأَنْذِرْ (۳۳) ”اٹھ اور دنیا کو غلط روش کے عواقب سے آگاہ کر دے“، اس کے بعد اس دعوت انقلاب کے مختلف اجزا کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اَلْمُذْتَرِّیُّ میں انقلاب آفرینی اور نوع انسان کی خیر سگالی کا پہلو نمایاں ہے۔ یہی ایک آسمانی داعی انقلاب کی خصوصیت اور ذمہ داری ہوتی ہے۔ راغب نے جو مفہوم بیان کیا ہے اسکی رو سے اس کے معنی باطل کے ہر تصور اور نظریہ پر چھا جانے والا۔ (غالب آجانے والا) بھی ہو سکتے ہیں۔ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۳۱) ”تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے“، اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے استعمال کی مثالیں دیتے ہوئے کہا ہے کہ تَدَثَّرَ الرَّجُلُ فَرَسَهُ کے معنی ہیں آدمی اپنے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا*۔ اس میں ”اچھل کر یا اچک کر، کی خصوصیت قابل غور ہے۔ یہ چیز بتدریج نہیں ہوتی بلکہ یک لخت ہوتی ہے۔ جو انقلاب نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کا طریق (Revolutionary) تھا۔ یعنی انقلاب کا دفعۃً رونما ہو جانا۔ اس کے بعد اب قرآنی تصورات حیات کا غلبہ بتدریج ہو رہا ہے۔ اسے (Evolutionary) طریق کہتے ہیں۔ زمانہ ایک چیز کو لیتا ہے۔ اس کا تجربہ کرتا ہے اور اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صحیح نظریہ وہی ہے جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دیا تھا۔ لہذا اب قرآنی تصورات کا باطل کے تصورات پر غلبہ تدریجاً ہو رہا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس نظام کو لیکر اٹھے یا کوئی مملکت اسے اپنے ہاں نافذ کر کے اس کے انسانیت ساز تعمیری نتائج دنیا کے سامنے لے آئے تو یہ نظام پھر اچک کر، دوسرے نظامہائے حیات پر غالب آ سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت رسول اللہؐ کے اتباع میں تَدَثَّرَ کا یہ عمل خیر کس قوم کے ہاتھوں سر انجام پاتا ہے؟ وہی قوم اس دور میں انسانیت کی سب سے بڑی محسن ہوگی، اسی کے ہاتھوں شجر ہستی کے پھول کھلینگے اور چمن کائنات پر پھر بہار آئیگی۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی ہیں انسانی کمالات اور شرف نبوت سے آراستہ و پیراستہ ہونے والا۔ نیز اس نے کہا ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی کنایۃً ایسے شخص کے ہیں جس کے پاس کوئی پروگرام نہ ہو اور وہ فارغ بیٹھا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہہ کر حضورؐ کو عظیم الشان انقلابی پروگرام عطا کر دیا۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) نے اس کے معنی لکھے ہیں، نبوت اور اسکی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والا۔

عام خیال یہ ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ دراصل اَلْمُتَدَّثِّرُ تھا۔ (یعنی تَفَعَّلَ کے خاندان سے)۔ تاء مد غم ہو گئی دال میں۔ اور اس طرح اَلْمُدَّثِّرُ بن گیا۔

د ح ر

اَلدَّحْرُ - کسی کو نکال دینا۔ دور کر دینا۔ دھکا دینا۔ ذلت کے ساتھ جبراً نکال دینے کو کہتے ہیں*۔ سورة صافات میں ہے وَيَقْذِفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۹-۸) ”اور ہر طرف سے ملامت کئے جاتے ہیں، دھتکارے ہوئے“۔ دور اور دفع کرنے کے معنوں میں، سورة اعراف میں ابلیس کے متعلق ہے مَذْعُوٌّ مُّمْتَسِدٌ حُوْرًا (۱۸)۔ ”ذلیل۔ دھتکارا ہوا۔ دور کیا ہوا“۔

د ح ض

دَحَضَ - اس کے اصلی معنی پھسلنے کے ہوتے ہیں۔ پھر اسکا استعمال کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانے، مٹانے یا باطل کر دینے، کیلئے ہونے لگا۔ کیونکہ دَحَضَ بَرِّ جُلِّہ - اس وقت بولتے ہیں جب کوئی ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح اپنے پاؤں زمین پر مارتا اور رگڑتا ہے۔ مَكَانٌ دَحَضٌ - پھسلنی جگہ کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے اس مادمے کے بنیادی معنی ہٹ جانے اور پھسلنے کے لکھے ہیں۔

سورة کہف میں ہے لِيَذُحِضُواٰ بِهٖ الْحَقَّ (۱۸)۔ تا کہ وہ (باطل کے ذریعہ) حق کو اپنے مقام سے پھسلا دیں اور بیکار کر دیں۔ سورة شوریٰ میں ہے۔ حُجِّتْهُمْ دَاحِضَةً (۲۱۶) انکی دلیل اور دعویٰ (خدا کے نزدیک) بالکل بودا اور بے ثبات ہے۔ سورة صافات میں ہے فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۹)۔ اسکا پاؤں پھسل گیا۔ یا اسمیں طاقت نہ رہی۔ وہ کمزور و ناتوان ہو گیا۔

د ح و (ی)

دَحٰی - پھیلا دینا - بچھا دینا - وسیع کر دینا* - دَحَا اَلْمَطَرُ اَلْحَصَا - بارش نے کنکریوں کو بہا دیا - دَحٰی اَلْبِلّٰل - اس نے اونٹوں کو ہانکا** - مَرَّ الْفَرَسُ يَدُ حَوْ دَحْوًا - گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا مٹی اڑاتا ہوا دوڑا*** - هُوَ يَدُ حَوْ بِالْحَجَرِ - اس نے پتھر پر پھینکا**** - تاج نے اس معنی میں يَدُ حَوْ الْحَجَرِ بَيَدِهِ لکھا ہے -

دَحَا کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں اجرام سماوی کی تخلیق کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وَ اَلْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا (۹۹)۔ ”اور زمین کو اس کے بعد پھینکا - اور ہموار کیا، - سورۃ انبیاء میں کہا ہے کہ اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱) - اجرام فلکی (ارض و سما) کا ہیولی پہلے باہمد گر پیوست تھا - پھر انہیں الگ الگ کیا گیا - اس طرح زمین کے کرہ کا جداگانہ وجود عمل میں آیا - پھر اس میں مزید تغیرات سے ہمہواری پیدا کی گئی - اس حقیقت کو دَحَاهَا سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی اَرْضُ (زمین) کو اس ہیولی سے یوں الگ کیا جس طرح گوپٹے سے پتھر پھینکا جاتا ہے - یا جیسے بارش کنکریوں کو بہا کر دور لیجاتی ہے - یا جیسے گھوڑا گرد و غبار اڑاتا چلا جاتا ہے - ذرا سوچئے کہ آج سے قریب ڈیڑھ ہزار سال پہلے، اجرام فلکی کی تخلیق سے متعلق یہ باتیں وحی کے علاوہ اور کون بتا سکتا تھا؟ نیز بَعْدَ ذٰلِكَ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ اَرْض (زمین) کی تخلیق اس ہیولی کے بعد ہوئی - یعنی یہ دوسری اسٹیج تھی - پہلے وہ ہیولی وجود میں آیا جو باہمد گر پیوست تھا - پھر اس میں سے مختلف کرے (منجملہ اَرْض) تیزی سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے ”فلک“، میں تیرنے لگے (۳۶)۔

د خ ر

دَخَرَ - يَدُ خَرٌ و دَخِرَ - يَدُ خَرٌ - چھوٹا ہونا - مطیع ہو کر جھک جانا - اَلْدَّخِرُ - جھکنے والا - دُخُوْرٌ - ذلت اور کمتری کو کہتے ہیں - اَلْدَّخِرُ - تحیر کو کہتے ہیں جو عقل کی بیچارگی اور عاجزی کی دلیل ہے - اَدُ خَرَهُ - اس نے اسے ذلیل کر دیا - عاجز بنا دیا***** -

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کہ وہ دَاخِرُوْنَ هیں (۱۶/۳۸) - یعنی قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز - یہ معانی اس سے ملحقہ

آیت نے واضح کر دئے ہیں جس میں ہے کہ **لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶۱)**۔ ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ (کے قانون) کے سامنے سجدہ ریز ہے،“ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س - ج - د)۔

انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے، مظاہر فطرت (اشیائے کائنات) کو معبود قرار دیکر، انسان کو ان کے سامنے جھکنا سکھایا ہے۔ قرآن کریم نے یہ اعلان کر کے کہ تمام اشیائے کائنات ان قوانین خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں جن کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے، دنیائے انسانیت میں کتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا؟

د خ ل

دَخَلَ يَدُ خُلٍّ - اندر داخل ہوا - **خَرَجَ** کی ضد ہے **(۱۱۱)**۔
اَدْخَلَ - داخل کیا **(۱۱۲)**۔ **دَاخِلَةٌ** **اَلْاَرْضِ** - وہ چیزیں جو زمین کے اندر چھپی ہوئی ہوں۔ **اَلَّذِیْ دَخَلَ** - جو کچھ اپنی جائداد سے آمدنی ہو۔ **اَلَّذِیْ دَخَلَ** - مکر و فریب، دھوکا، نیز عقلی یا جسمانی ابتری اور فساد کو بھی کہتے ہیں*۔
 راغب نے اندرونی ابتری اور دشمنی کے لئے بھی **دَخَلَ** کا استعمال کنایۃً بتایا ہے**۔ **سورة نحل میں ہے تَتَخَيَّدُونَ وَاٰیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ** **(۱۱۲)** ”تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا موجب بنا لیتے ہو،“۔ یہاں **دَخَلَ** کے معنی فساد اور ابتری کے ہیں۔

دَخَلَ بِالْمَرْءَةِ کے معنی ہیں، اس نے عورت سے مباشرت کی۔ **سورة نساء میں ہے مِّنْ نِّسَائِكُمُ الَّذِي دَخَلْتُم بِهِنَّ (۲۳)**۔ اسمیں اسکے معنی مباشرت کے ہیں۔ یعنی ان عورتوں کے بطن سے جن سے تم زنا شوئی کے تعلقات قائم کر چکے ہو۔

سورة توبہ میں منافقین کی ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ طوعاً و کرہاً تمہارے ساتھ میدان جنگ میں آتے تو گئے ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغْرَاتٍ أَوْ مَدْخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ (۹) اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا (چھپنے کے لئے) غار یا گھسنے کے لئے کوئی مقام مل جائے تو یہ بدحواسی سے اسکی طرف بھاگ نکلیں۔ یہاں قرآن کریم نے **مَدْخَلًا** کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ باب

افتعال سے ہے جس کے خواص میں کسی کام کو پورا زور لگا کر بہ مشقت کرنا داخل ہے۔ اس باب کے انتخاب سے قرآن کریم نے ان کی بدحواسی اور میدان سے بھاگ نکلنے کی شدت آرزو کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ یعنی اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی چھپنے کی جگہ بھی آ جائے تو یہ اس میں گھسنے کی کوشش کرینگے خواہ اس میں کتنا ہی زور کیوں نہ لگانا پڑے۔

د خ ن

الدُّخَانُ - دھواں - دَخَنَ الدُّغْبَارُ دُخُوْنًا - غبار بلند ہو گیا*۔
دَخَنَ الْفِتْنَةَ - فتنہ کو ظاہر کرنا اور ہر انگیزتہ کرنا**۔ خُلِقَ دَاخِنٌ -
خراب اخلاق - الدُّخَانُ - قحط سالی، خشک سالی، اور بھوک کو بھی کہتے ہیں کیونکہ بھوک آدمی کو بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سا نظر آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بھوک کو دُخَانٌ اسلئے کہتے ہیں کہ خشک سالی میں زمین سے غبار اڑ کر آسمان میں دھواں سا بن جاتا ہے۔ الدُّخَانُ - شر، خرابی اور ابتری کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ يَوْمَ دَخَنَانَ - سخت گرمی اور مصیبت کا دن**۔

قرآن کریم میں ہے کہ اَرْضٌ کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ ثُمَّ اسْتَوَىٰ اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۳۱)۔ پھر وہ دیگر اجرام فلکی کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ بالکل دھوئیں (گیس) کی حالت میں تھے۔ سائنس کے انکشافات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں جسے قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے بیان کیا تھا۔ اجرام سماوی کے اولین ہیولہ (Nebulae) کو ایسا ہی بتایا جاتا ہے۔

سورة دخان میں ہے۔ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (۳۳)۔ جب ساری فضا میں گرد و غبار (یا دھواں) پھیل جائیگا۔ جب مصائب و آلام عام ہو جائیں گے۔ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل جائیگا۔ یا بھوک اور قحط کی وجہ سے آسمان دھواں ہی دھواں نظر آئیگا۔ یہ عذاب الیم ہوگا (۳۳)۔

د ر ا

دَرَأَهُ - يَدْرُوهُ - دَرَأً - دفع کرنا۔ رد کرنا**۔ سختی سے ہٹانا***۔
دَرَأَ عَلَيْهِمُ دُرُوءًا - یکایک کسی کے سامنے نمودار ہو جانا۔ جَاءَ

*تاج - محیط - راغب - **تاج - ***محیط۔

السَّيْلُ دَرًّا - سیلاب کہیں دور سے آگیا، نہ معلوم کہاں سے یکایک آگیا*۔
 دَرًّا تَهْ عَسْنِي - میں نے اسے اپنے پاس سے ہٹایا (۱۶۷)۔ مَدَّارًا تَهْ -
 کے معنی مخالفت اور مدافعت کے ہوتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے وَ يَدْرُؤُ عَنْهَا الْعَذَابَ (۲۸)۔ ”یہ بات عورت سے سزا کو دفع کر سکتی ہے“۔ اس سے اس کی سزا رک سکتی ہے۔ سورۃ قصص میں ہے وَ يَدْرُءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۲۸)۔ حسنات کے ذریعہ سیئات کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر، متنوع اسالیب سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور مؤثر تر تعمیر سے ہوتی ہے۔ آپ کمزور ہیں اس لئے ہر قسم کے تخریبی جراثیم آپ پر غالب آجاتے ہیں اور آپ بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیں۔ اس طرح آپ کی تخریب رک جائیگی اور تعمیر کا سلسلہ آگے چلیگا۔ زندگی کے ہر گوشے میں، تخریب کی مدافعت کا یہی صحیح طریق ہے۔ اسی کو ”نیکوں کا پلڑا جھکنا“ کہتے ہیں۔
 تَدَارَعُوْا فِي الْخُصُوْمَةِ - کے معنی ہوتے ہیں جھگڑے میں ایک دوسرے کو دھکا دینا یا بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا اور اس طرح باہم اختلاف کرنا*۔ یعنی ایک کا کہنا کہ یہ اس نے کیا ہے اور دوسرے کا کہنا کہ نہیں اس نے کیا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (۲۲) میں آیا ہے۔ یعنی فَادْرَأْتُمْ فِيْهَا - اہل لغت کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں تَدَارَأْتُمْ تھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک الگ باب ہے جسے قرآن کریم نے تو استعمال کیا ہے لیکن صرفیوں نے اسے الگ شمار نہیں کیا۔

درج

دَرَج - چلنا۔ بہت آہستہ آہستہ، کھسک کھسک کر چلنا* اوپر چڑھنے والے کی طرح چلنا**۔ مَدْرَجَةً الطَّيْرُ يَقِي - راستے کا واضح اور کھلا حصہ۔ دَرَجَ الْقَوْمُ - (آہستہ آہستہ) قوم ختم ہو گئی اور اس کی نسل باقی نہ رہی*، قرآن کریم میں ہے سَنَسُدُّ رَجُومًا مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (۱۸۲)۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم انہیں یوں اس طرح آہستہ آہستہ پکڑ لینگے اور ختم کر دینگے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ تباہی کہاں سے آگئی۔

دَرَجَ الشَّيْءِ - اس نے چیز کو تو کیا اور لپیٹ لیا - اَلدَّرَجُ - وہ چیز جس پر کچھ لکھا ہوا ہو - دَرَجُ الْكِتَابِ - کتاب کی تہ* -

اَلدَّرَجَةُ - سیڑھی کا ایک ڈنڈا (Step) (دَرَجَاتٌ - اوپر کی طرف لے جانے والے ڈنڈے (Steps) اور دَرَكَاتٌ نیچے کی طرف لانے والے**) - راغب نے کہا ہے کہ مَنَزِلَةٌ اور دَرَجَةٌ تقریباً ایک ہی چیز ہے - لیکن مَنَزِلَةٌ (اترنے کی جگہ) کو دَرَجَةٌ اس وقت کہتے ہیں جب اس پر چڑھا جا رہا ہو - نیز دَرَجَةٌ سے بلند منزلت بھی مراد لی جاتی ہے - اسی اعتبار سے دَرَجَاتٌ کے معنی مراتب ہیں - ایک دوسرے کے اوپر طبقات - اَلْمَدَارِجُ - پہاڑی راستوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر ہر موڑ کے بعد راستہ اور بلند ہو جاتا ہے - ان موڑوں کو اَلْمَدَارِجُ کہتے ہیں* - مجاہدین کے متعلق فرمایا کہ انہیں قَاعِدِيْنَ (بیٹھے رہنے والوں) پر دَرَجَةٌ حاصل ہے (۹۵) - سورۃ توبہ میں ہے کہ مجاہدین اور مہاجرین اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ (۹۶) ”اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ“ رکھتے ہیں -

قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کے متعلق ہے کہ وَ لَتَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيَّهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸) - عورتوں کے لئے، از روئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں - یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں - بلحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر افضلیت نہیں - دونوں مساوی ہیں - لیکن اس کے بعد ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيَّهِنَّ دَرَجَةٌ (۲۲۸) - مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے - وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں موجود ہے - طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی ميعاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتی لیکن مرد کے لئے عدت کی کوئی قید نہیں - نیز اگر طلاق مرد کی طرف سے ہو اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی مطلقہ بیوی کو پھر سے اپنی زوجیت میں لا سکتا ہے - وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا (۲۲۸) - یہ ہے وہ بات جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں رعایت یا دَرَجَةٌ (ایک فضیلت) حاصل ہے - یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں - آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے - عورتوں اور مردوں کے تعلقات کے سلسلہ میں ہر جگہ

”عَلَيْهِنَّ“ نمایاں طور پر دکھائی دیگا۔ یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہونگے اور عورت کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں۔ عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کر سکیگی۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کریم کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے۔ اور اس باب میں دونوں برابر ہیں۔ جس قسم کے مردوں کے حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ)۔ انسان کی عمرانی اور معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب ہے جو ان چار لفظوں کی رو سے پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور کس قدر جامع ہیں یہ چار لفظ۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ۔ اس کے بعد بِيَالْمَعْرُوفِ کہہ کر اس کی بھی صراحت کر دی کہ یہ بات کسی فرد یا معاشرہ کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی گئی۔ اس کی (Provision) قانونِ خداوندی میں کر دی گئی ہے۔ اسی قانون (قرآن کریم) نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بات کیا ہے جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک فوقیت (دَرَجَةً) حاصل ہے۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت کی طرف سے جو فرائض مرد اور عورت پر عائد ہوتے ہیں وہ بھی یکساں ہیں۔ تقسیم عمل کے لحاظ سے فطرت نے مرد اور عورت کی تخلیق میں فرق رکھا ہے۔ اس لئے جو فرائض عورت کے ذمے عائد کئے گئے ہیں انہیں عورت کو سرانجام دینا ہوگا اور جو مرد کے ذمے ہیں انہیں مرد کو۔ عورت کا مختص فریضہ جسے مرد ادا نہیں کر سکتا، اولاد کی پیدائش اور تربیت ہے۔ اور چونکہ اس میں عورت کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اس لئے کسب معاش کا فریضہ مردوں کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔ اَلرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النَّسَاءِ (۳۳)۔ کے یہی معنی ہیں۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر ملیگی)

د ر ر

الْقَدَرُ۔ دودھ (لیکن اس میں موٹی دھار کا تصور اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے) اَلِدَّرَّةُ۔ دودھ کی فراوانی۔ اِسْتَدْرَ اللَّبَنُ۔ دودھ کثیر ہو گیا۔ دَرَّتِ السَّمَاءُ بِالْمَطَرِ۔ آسمان سے بکثرت (موسلا دھار) بارش برسی۔ ایسے موسلا دھار برسنے والے بادل مِدْرَارٌ کہلائیے گئے*۔ (۶)۔ دَرَّ السَّيْرُ اَجٌ۔ چراغ خوب روشن ہو گیا۔ كَوَّ كَبٌّ دُرِّيٌّ۔ چمکدار روشن ستارہ*۔

جسمیں سے نور کی ندیاں روان ہوں (۲۳/۳۵)۔ یہ لفظ دُرَّةٌ (ایک موتی) میں یاے نسبتی لگا کر بنایا گیا ہے۔ یعنی موتی جیسا۔ صاحب محیط نے کہا ہے الْقَدَرُ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی دوسری چیز سے پیدا ہونے کے ہیں*۔ جیسے، جانور سے دودھ۔ چراغ سے روشنی۔ تارے سے چمک۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے پیدا ہونا ہیں۔ نیز حرکت و اضطراب۔ اس سے دودھ کی دھار اور ستارے کی جھلملاتی روشنی کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ نے اپنے نور ہدایت (قرآن کریم) کو، کَوُكَبٌ دُرِّیٌّ (۲۳/۳۵) سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ایسا ستارہ جس سے علم و بصیرت کی کرنیں، اس ندی کی طرح رواں ہوں جس میں جمود نہ ہو بلکہ پیہم حرکت ہو۔ یہ نور علم خداوندی سے پیدا ہو اور دنیا میں روشنی پیدا کرتا چلا جائے۔

درس

دَرَسَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کوئی چیز پرانی ہوئی اور اس کا نشان مٹ گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مخفی ہونا، پست ہونا اور مٹنا ہیں۔ دَرَسَهُ الْقَوْمُ۔ لوگوں نے اس کے نشان کو مٹا دیا۔ طَرِيقٌ مَدْرُوسٌ اس راستے کو کہتے ہیں جو لوگوں کی کثرت آمد و رفت کی وجہ سے پٹ کر دب گیا ہو۔ اسی طرح دَرَسَ الْحِنْطَةُ کے معنی ہیں گیہوں کو گاہ دینا۔ گیہوں (یا دوسرے اناج) کی بالوں کو زمین پر بچھا کر اس پر بیلوں کو مسلسل اور متواتر چلاتے رہتے ہیں جس سے بھوسہ اور اناج الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسے گاہنا کہتے ہیں۔ لہذا دَرَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گھسنا یا ملنا کہ اس کا نشان مٹ جائے۔ اسی سے دَرَسَ التَّنَاقُتُ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع و منقاد ہو جائے۔ اَلْمَدَارَسَةُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کیلئے پیہم مشقت کرنا یا اس کی خبر گیری کرنا**۔ اور دَرَسَ الْكِتَابَ يَدْرُسُهُ، کے معنی ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ ازبر ہو جائے***۔

سورة آل عمران میں ہے بِيَمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۹) کتاب کو اس طرح گاہنا کہ اس کے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آجائیں۔ اس پر مسلسل غور و فکر کرنا تا کہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں وہ نکھر کر سامنے آجائیں۔ یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں۔

سورة انعام میں درِ راسۃ کا لفظ آیا ہے (۱۵۷)۔ یعنی نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرنا۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ (۱۵۷)۔ ہم ان کے مطالعہ کرنے سے یقیناً بے خبر تھے۔

درک

اَلْقَدَرُكَ۔ کسی کا پیچھا کر کے اس سے جا ملنا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اسے جا پکڑنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ سورة طہ میں ہے لَا تَخَافُ دَرَكَ (۲۰)۔ ”تجھے اسکا ڈر نہیں ہوگا کہ فرعون تجھے پیچھے سے آکر پکڑ لیگا،“۔ سورة شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا اِنَّا لَمُدُّ رَكْوَنَ (۲۶)۔ ”بس ہم پکڑے گئے،“۔ فرعون کے لشکر نے ہمارا پیچھا کر کے ہمیں پکڑ لیا۔ تَدَارُكَ۔ کسی سے جا کر مل جانا۔ اسے پا لینا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اس میں یکے بعد دیگرے پہنچتے رہنے کا تصور ہے۔ مثلاً۔ سورة قلم میں ہے لَوْ لَا اَنْ تَدَارَكَہ نِعْمَۃٌ (۶۹)۔ اگر (اسکے رب کی) نعمت اس تک نہ پہنچ جاتی۔ یعنی اس (حضرت یونسؑ) پر مختلف واقعات گزرتے رہے لیکن خدا کی نعمت مسلسل اور متواتر اس کے شامل حال رہی۔ اَلِدَّرَکُ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے مسلسل آنا۔ اَلتَّدَرُّکُ۔ رِیْکُ مِّنَ الْمَطَرِ۔ بارش کا یکے بعد دیگرے مسلسل گرنا*۔ الدَّرُکُ وَاللَّدَرُکُ۔ کسی چیز کی گہرائی کا آخری حصہ۔ تہ۔ اَلدَّرُکُ۔ دَرَجٌ کے مقابل میں آتا ہے۔ سیڑھی کے ڈنڈوں کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے دَرَجَاتٌ کہتے ہیں اور نیچے اترنے کے لحاظ سے دَرَكَاتٌ*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت کے مراتب و منازل کو دَرَجَاتٌ کہا ہے۔ اس کے برخلاف جہنم کے منازل کو دَرَكَاتٌ۔ فی الدَّرُکِ اَلْاَسْفَلِ مِّنَ النَّارِ (۱۳۵) جہنم کی سب سے نیچلی تہ۔ غور کیجئے۔ سیڑھی وہی ہوتی ہے اور اس کے ڈنڈے بھی وہی۔ جو شخص اوپر چڑھنا چاہتا ہے سیڑھی اسے بلندی تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جو نیچے اترنا چاہتا ہے، وہی سیڑھی اسے پستی کی طرف لے جانے کا موجب ہو جاتی ہے۔ زندگی ایک ہی ہے۔ جو اسے جس انداز سے بسر کرنا چاہے یہ اسے اسی انداز کی منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اَدْرَکَہ : اسے جا لیا، پا لیا۔ اَدْرَکُتْہُ بَبَصَرِیْ۔ میں نے اسے نگاہ سے پا لیا۔ دیکھ لیا*۔ اسی اعتبار سے اِدْرَکُ اس علم کو کہتے ہیں

جو محسوسات (حواس) کے ذریعہ حاصل ہو۔ سورۃ یونس میں ہے حَتَّىٰ إِذَا
 آدُرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰:۹) ”جب اسے غرق ہونے لگا،،۔ یعنی جب اس نے
 اپنے غرق ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جب اس نے محسوس کر لیا
 کہ وہ غرق ہو چلا ہے۔

آدُرَكَ الشَّيْءُ - چیز اپنے وقت کو پہنچ گئی اور مکمل ہو گئی۔
 انتہا کو پہنچی*۔ قرآن کریم میں ہے بَلْ آدُرَكَ عَلَيْهِمُ فَيُ
 الْآخِرَةِ (۲۶:۶۶)۔ اہل لغت نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کا
 آخرت کے متعلق علم ختم ہو گیا۔ یہ اسکی حقیقت کو نہ پا سکے۔ اس سے بے
 خبر رہے*۔ راغب نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے
 اس کے معنی یوں بھی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں جا کر اس بات کا علم
 ہو جائیگا**۔ لیکن ہمارے نزدیک ان معانی کی رو سے آیت کا مطلب واضح
 نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ بات بنتی نہیں۔ آدُرَكَ کے معنی ہیں کسی چیز
 کا مسلسل اور پیہم اسطرح آگے چلتے آنا کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے
 سے ملا ہوا ہو۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ان لوگوں
 کو مسلسل اور پیہم علم پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ اس کے
 بارے میں شک و شبہ میں ہیں بلکہ اندھوں کی طرح تاریکی میں۔ بَلْ هُمْ
 فِي شَكٍّ مِّنْهَا - بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ (۲۶:۶۶)۔

درہم

آلِدُرْهُم - ایک چاندی کے سکے کا نام ہے۔ اسکی جمع دَرَاهِمُ ہے۔
 یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اسکی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے
 یونانی*۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رومی لفظ (Drawbrug) کا معرب ہے۔
 اسطرح دینار (Dinarins) کا، اور فلس (Fails) کا۔
 سورۃ یوسف میں ہے دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ (۱۲:۱۲)۔ (انہوں نے حضرت
 یوسفؑ کو) چند درہموں کے عوض (بیچ دیا)۔

دری

دَرَيْتُهُ - میں نے اسے جان لیا۔ (۲۱:۹)۔ آدُرَاهُ بِہ - اس کو اس
 کے متعلق بتلایا*۔ دَرَايَةُ کے معنی ہیں کسی قسم کی کوشش یا تدبیر سے
 معلوم کرنا یا ایسی چیز کو معلوم کرنا جس میں پہلے شک ہو۔ یہی وجہ ہے

کہ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا ہیں۔ نیز کسی چیز میں تیزی۔ چنانچہ مِیدُ رَی کنگھی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے دندانوں میں نکملا پن اور تیزی ہوتی ہے۔ (اس سے دِرَایَۃٌ میں طلب و قصد کے ساتھ، تیزی فہم کا تصور بھی ہو سکتا ہے)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں مَا آدُ رَاکِت (تجھے کیا خبر ہے یا تجھے کس نے آگاہ کیا) آیا ہے اس کے بعد اس چیز کی بابت بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۶)۔ لیکن جہاں جہاں مَا یُدُ رَیْکِت (تجھے کیا چیز بتاتی ہے) آیا ہے وہاں اس چیز کے بعد اس کے متعلق بیان نہیں کیا گیا**۔ بلکہ اس کے بعد لَعَلَّ (شاید) کہہ کر، پیش نظر بات کہی گئی ہے (دیکھئے ۳۲/۱ و ۳۳/۶ و ۸۰/۸)۔ یعنی مَا آدُ رَاکِت کے بعد بات کا علم یقینی طور پر دے دیا گیا ہے لیکن مَا یُدُ رَیْکِت کے بعد کہا ہے کہ شاید (یا ہو سکتا ہے) کہ یہ اس طرح ہو جائے۔ مثال کے طور پر سورۃ القدر میں پہلے کہا گیا ہے کہ وَمَا آدُ رَاکِت مَالِیْلَۃُ الْقَدْرِ (۱۶)۔ ”تجھے کیا خبر کہ لیلة القدر کیا ہے“ اس کے بعد باقی آیات میں لیلة القدر کے متعلق مزید صراحت ہے۔ اس کے برعکس سورۃ شوریٰ میں ہے۔ وَمَا یُدُ رَیْکِت لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۳۲/۱) ”تجھے کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو،“۔

ان مثالوں سے مَا آدُ رَاکِت اور مَا یُدُ رَیْکِت کے استعمال کا فرق سامنے آ جاتا ہے۔

د س ر

دُسْرٌ - دِسَارٌ کی جمع ہے۔ دِسَارٌ کے معنی کیل یا میخ کے ہیں۔ دَسْرٌ کے اصلی معنی سختی اور زور سے دھکا دینے کے ہیں**۔ دَسْرَ الدِّسَارُ۔ کیلوں کو زور سے ٹھونکا۔ ویسے الدِّسَارُ کھجور کے ریشے کی رسی کو بھی کہتے ہیں جس سے کشتی کے تختوں کو آپس میں باندھا جاتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ الدِّسَارُ کے یہ معنی خلافِ قیاس ہیں۔ دَسْرَ رَأْعٍ خود کشتی کو بھی کہتے ہیں* اس لئے کہ وہ پانی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ قرآن کریم میں کشتی حضرت نوحؑ کو ذَاتِ الْوَاحِ وَ دَسْرٍ (۵۳/۱۳) کہا گیا ہے۔ یعنی تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی کشتی۔ اگر دَسْرٌ

سے مراد میخیں ہی ہیں (ریشوں کی رسی نہیں) تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں دھات کا استعمال ہونے لگ گیا تھا اور کشتیاں محض درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر لینے سے نہیں بنا لیتے تھے بلکہ تختوں اور میخوں سے بنائی جاتی تھیں۔ لیکن کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں یہ بھی ہے کہ اسے خدا کی زیر نگرانی، اس کی وحی کے مطابق بنایا گیا تھا (۱۱/۱۱)۔ ممکن ہے اُس زمانہ میں اس قسم کی صنعتی نادرہ کاری کا علم بھی (پہلے پہل) وحی کے ذریعے دیا جاتا ہو اور پھر اسکا استعمال عام ہو جاتا ہو۔

تاریخ انسانیت سے پردے اُٹھ جانے سے نہ معلوم کیا کیا حقائق سامنے آئیں گے، اور کتنی ایسی چیزیں، جن کے متعلق آج یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عقلِ انسانی نے کی تھی، وحی کی رہینِ منت متحقق ہونگی؟

دس س (دس و)

الدَّسُّ - کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے نیچے چھپا دینا یا دبا دینا۔ دفن کر دینا*۔ راغب نے اس کے معنوں میں مجبور کرنے کا اضافہ کیا ہے۔ یعنی کسی چیز کو بزور کسی چیز کے اندر داخل کر دینا**۔ دَسَّتُ الشَّيْءَ فِي التَّرَابِ - میں نے اس چیز کو مٹی میں چھپا دیا*۔ سورۃ نحل میں ہے کہ جب (جاہلیت عرب میں) انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو وہ سوچتے کہ امٌ یَدُّسُّہُ فِي التَّرَابِ (۱۶/۱۶)۔ ”یا وہ اسے زمین میں دفن کر دے“۔ سورۃ شمس میں نفسِ انسانی کے متعلق ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۹۱/۹۱)۔ ”جس نے اس کی نشو و نما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا“ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (۹۱/۹۱)۔ ”جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام رہا“۔ کھیتی (أَفْلَحَ) کی نسبت سے بیج کی مثال کو سامنے لائیں۔ اس کی برومندی کے لئے اسے مٹی میں ملانا پڑتا ہے۔ اگر پانی۔ مٹی۔ ہوا۔ حرارت۔ روشنی کا تناسب صحیح صحیح ہو تو بیج کی صلاحیتیں نشو و نما پالیتی ہیں۔ وہ شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے۔ کونپل بن کر ابھرتا ہے اور تناور درخت کی شکل میں فضا میں جھومتا ہے۔ لیکن اگر اسی بیج پر مٹی زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو اس کی تمام صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ انسانی ذات میں بڑھنے پھولنے اور پھلنے کی صلاحیتیں مضمر کردی گئی ہیں۔ لیکن ان صلاحیتوں کی نشو و نما (موجودہ سٹیج پر) مادی دنیا کے اندر ہوتی ہے۔

اگر مادی قوتوں سے مناسب کام لیا جائے تو انسانی ذات کی مضمحل صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ مفاد پرستیوں کے بوجھ کے نیچے دب جائے تو اس کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

دَسَقٰی اصل میں دَسَسَ تھا۔ چونکہ تین سین کا یکجا جمع ہونا گراں گزرتا ہے اس لئے اسے دَسَقٰی بنا دیا۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ اس سے مراد بخل ہے۔ کیونکہ بخیل آدمی اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور سخی اپنے آپ کو نمایاں اور کھلا ہوا رکھتا ہے۔ یہ معنی اس اعتبار سے (ایک گونہ) صحیح ہیں کہ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کی نشو و نما کا راز اَعْطٰی (دوسروں کو دینے) میں بتایا ہے اور بَخِلَ کو اس کی تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ فَآمَنَّا مَنۡ اَعْطٰی وَاتَّقٰی... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرِی۔ وَآمَنَّا مَنۡ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی... فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرِی (۹۲/۶)۔ اسی کو ربوبیت کہتے ہیں۔ یعنی دوسروں کی پرورش سے اپنی ذات کی نشو و نما کرنا۔ اور یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہی ہے۔

چھپانے کے اعتبار سے الدَّسِیْسَةُ اس مکر و فریب کو کہتے ہیں جو چھپا ہوا ہو۔ مخفی طور پر داخل ہونے والی چیز۔

اہل لغت نے دَسَّهًا میں دَسَقٰی کا مادہ د۔ س۔ و یا د۔ س۔ ی بھی بتایا ہے۔ ان مادوں کے بنیادی معنوں میں یکسانیت کی وجہ سے ہم نے دَسَّهَ اور دَسَّاهَ کو ایک ہی عنوان کے تحت دیدیا ہے۔

د ع ع

الدَّعِیُّ - سختی کے ساتھ دھکا دینا۔ دَاعِ دَاعِ - بکریوں کو ڈانٹنے کی آواز۔ الدَّعَاعُ - آدمی کے چھوٹے بال بچے*۔ (جن کی وجہ سے اسے دھکے کھانے پڑتے ہیں)۔

قرآن کریم میں ہے فَذٰلِکَ الذَّیۡ یَدْعُ اِلَیَّتِیْمَ (۱۴۰)۔ ”یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے“۔ سورۃ طور میں ہے۔ یَوْمَ یُدْعَوْنَ اِلَی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًا (۵۲)۔ ”جس دن یہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھکیلنے اور اضطراب کے ہیں۔

سورة الماعون کی مذکورہ بالا آیت (۱۰۴) پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے
 سورة کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِاللَّذِينَ
 (۱۰۴) ”کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا
 ہے؟“، کون ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہیگا کہ دین کی تکذیب کون
 کرتا ہے؟ اس کا جواب اگلی دو آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ فَذَٰلِكَ الَّذِي
 يَدْعُ ٱلْيَتِيمَ وَلَا يَحْضُ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۱۰۵)۔ ”یہ
 وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب
 نہیں دیتا،“۔ آپ نے غور کیا کہ دین اور معاشیات میں کتنا گہرا تعلق
 ہے؟ بلکہ صلوٰۃ اور معاش میں بھی؟ اس لئے کہ اگلی آیات میں یہ کہا گیا
 ہے کہ ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ
 نماز کے محسوس و سرئی ارکان کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن رزق کے ان
 سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح، رواں، دواں ہر ایک ضرورت مند تک
 پہنچنا چاہئے، بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں ملیگی)۔

د ع و

دَعَا کے معنی کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں۔ چنانچہ الدَّعَاءُ۔
 اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے۔
 الدَّاعِيَّةُ۔ جنگ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں۔ هُوَ مِّنِّي
 دَعْوَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی
 کی آواز پہنچ جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں
 کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا۔

دَعَاہُ إِلَى الْأَمِيرِ کے معنی ہیں وہ اسے امیر کی طرف لے گیا۔
 اس اعتبار سے دَاعٍ صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی
 کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کی طرف لے جائے*۔ اِدْرِ عَاءُ۔
 (يَدْعُوْنَ) کے معنی تمنا کرنے کے ہیں*۔ یا کسی چیز کو پکار پکار کر
 بلانے کے (۱۰۸)۔

تَدَاعَوْا عَلَيْهِ کے معنی ہیں وہ اس کے خلاف جمع ہو گئے۔ اور
 تَدَاعَى عَلَيْهِ الْعَدُوُّ مِّنْ كَثَرِ جَانِبٍ کے معنی ہیں دشمن نے
 ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ تَدَاعَتْ الْحَيَاطَانُ کے معنی ہیں
 دیواریں پکے بعد دیگرے گر پڑیں*۔

دَعَوْتُهُ زَيْدًا - میں نے اسکا نام زید رکھ دیا - اَلدَّاعِيُّ ۱۱ - وہ لڑکا جسے متبنی بنا لیا جائے* - (اسکی جمع اَدْعِيَاءُ ہے ۱۳۳) -

اَلدَّاعِيَّةُ - اس دودھ کو کہتے ہیں جسے تھنوں میں اسلئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسکے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جا سکے* - نیز سبب یا باعث - اَلدَّوْاعِيُّ - ان چیزوں کو کہتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اسکے اندر ہیجان پیدا کر دیں** - (ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے دُعَاءُ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے) -

وَاَدْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ (۲۳) کے معنے ہیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ - سورۃ کہف میں نَادَى اور دَعَا دونوں مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۱۸) - سورۃ اعراف میں دَعَا کے مقابل میں صَحَّت کا لفظ آیا ہے (۱۹۳) جسکے معنے چپ رہنے کے ہیں - لہذا دَعَا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ہوئے -

سورۃ بقرہ میں ہے فَاَدْعُ لَنَا رَبَّكَ (۲۱) - جسکے معنے ہیں ہمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار - اَلدَّعْوَى - پکار - مطالبہ - تقاضا - (۱۰) -

اب ہمارے سامنے دُعَا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لاحق ہو جاتے ہیں - یہ گوشہ ہے ”خدا سے دعا مانگنے“ کا - ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مثال پر غور کیجئے - کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ - زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے - اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں -

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں - اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہوگی یا فتح - اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دیگا اور زید مقدمہ ہارنے کے بجائے جیت جائیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا

رہتا ہے۔ یعنی خدا، انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے، خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے۔

اور اگر خدا سچے کے حق ہی میں فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے، تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ خدا کو بہر حال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ہوا۔

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔ ناجائز نہ سہی، جائز ہی سہی۔ کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائیگا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ سب بیکار ہوگا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ۔ تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کریگا اور کس کی رد کریگا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذہب* اور فلسفہ

* مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ۔

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۴)۔ ”تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائیگا،۔“

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جس قدر کوشش کریگا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔ لَيْسَ لِنَاسٍ إِلَهٌ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ (۵۳/۳۹) ”انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے۔ اور اسکی کوشش کا نتیجہ بلا تاخیر سامنے آ جائیگا،۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائیگا، اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے لَئِهٖ دَعْوَةُ الْحَقِّ۔ انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے۔ وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُمْ بِشَيْءٍ۔ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر، اپنی توہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی سانگ پوری نہیں کر سکیں گی۔ ایسے لوگوں کی مثال کَبَا سِطْرٍ كَفَّيْنَهُ إِلَى السَّمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ۔ ہے، یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آ جائے تو) اس طرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا، وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (۱۳/۱۳)۔ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا... (۱۳/۱۵)۔ کائنات کی ہر شے، طوعاً و کرہاً، خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، تو انسان اس سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟

لہذا، قرآن کریم کی رو سے ”خدا سے دعا، کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا۔ یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا)۔ اس کے بعد ہے اِنَّ التَّٰذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۲/۶)۔ یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سرکشی برتتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ”خدا کو پکارنے، سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمر ہار ہونا۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يَتُومِنُ بَاٰتِنَا التَّٰذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲/۱۵)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشو و نما دینے والے (کے پروگرام کو) درخور حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اور وہ ان احکام سے سرسبزی نہیں کرتے۔ تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنْ الْمَضٰجِيعِ۔ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّزَقْنَاهُمْ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۲/۱۵-۱۶)۔ وہ ان احکام کی تعمیل میں اس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ راتوں کو بھی جاگتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کسے عمدہ نتائج مرتب ہونگے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر تباہیاں آئیں گی، جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ المؤمن میں ہے فَاَدْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ... (۲/۶)۔

خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری کے ہر گوشے کو خالصۃً اُسی کے لئے وقف اور مختص کر دو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَ يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۳۲)۔ ”وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں“۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ ”پکار اور اس کے جواب“ سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ (۵۵)۔ ”تم اپنے نشو و نما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔ اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا“۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ”خدا کو پکارنے“ سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت بے اسی مفہوم کی تشریح کردی ہے جہاں کہا ہے وَلَا تَفْسِدُوا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ وَاَدْعُوْهُ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۶-۵۷)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد نا ہمواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے“۔

یہاں ”خدا کی رحمت“ کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ۔ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ ”اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب - ۱۶۵)۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے،، اس کے بعد ہے۔ فَلْيَسْتَجِيبُوْا لِيْ وَلْيَسْتَجِيبُوْا لِيْ لَعَلَّہُمْ يَرْشُدُوْنَ (۱۸۶)۔ ”پس انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں،،۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اُس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کس طرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مؤمنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتَّی نَصْرُ اللّٰهِ (۲۱۳)۔ خدا کی نصرت کب آئیگی؟ ان سے کہا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَكْشِفُ السُّوْءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ... (۲۱۴) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے! لیکن یہ استخلاف فی الارض، تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکیگا (۲۱۵)۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بیکسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کر دیگا۔ اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں، ان مخالفین کی ضرور رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہیں گی (۲۱۶)۔ جماعت مؤمنین تو ایک طرف، خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا۔ مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے۔ قَدْ اُجِیْبَتْ دَعْوُکُمَا، فَاَسْتَقِیْمَا (۱۸۹)۔ تم دونوں کی ”دعاء قبول ہو گئی ہے“۔ بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائیگا) تو اس کے بعد اس کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعاء قبول ہو گئی ہے۔ لہذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں۔ اسی ”دعا“ کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا۔ قُلْ اِنْشَمَّا اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَا اُشْرُ کُتْبِہٖ اَحَدًا (۲۱۷)۔ ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا

ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا - یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸۶)۔

”دعا، کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے - جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں ”دعا“ کہتے ہیں، قرآن کریم میں وہ بھی ہیں - مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَلَا تُرَافِقْنَا فِيْهَا أَمْرَنَا وَتُبَّاتٍ أَقْدَامَنَا - وَأَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۳۶)۔ ”اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں، اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر دے، - یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے برآئے کی درخواست کرتا ہے - یہ دعائیں درحقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں - اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اسکی خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں - انکی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پالینے کے قابل ہو جاتا ہے - (السَّادَةِ اور السَّادَةِ) کے جو معنی شروع میں دئے گئے ہیں - ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خداوندی کے مطابق ہو - اور پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے - اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو، قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے، ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے درحقیقت مضر ہوگا - (۱۴)۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ -

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اسکی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں - پھر اس میں اور خدا سے دعاء کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اسطرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد

صرف قوتوں کی بیداری نہیں۔ سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے۔ یعنی وہ مقصد ہے کیا جسکے حصول کیلئے آرزو کی جا رہی ہے۔ اور وہ ہے کیسا؟۔ پھر اسکے حصول کیلئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائیں گے۔ اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائیگا۔ ایک مرد مومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اسلئے وہ، پہلے قدم سے آخری قدم تک، خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اسکی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اسکے لئے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے۔ خدا کی طرف سے سب کچھ اسکے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ حَتَّٰثَکَ دَعَاءُ کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اسکے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ علاوہ بریں، ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما سے اپنے اندر (علیٰ ہد بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لا محدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات حسنیٰ کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے معیار (Standard) بن جاتی ہے۔ انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے۔ یہ ہے فرق ”خدا سے دعا مانگنے“، اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں۔

(دعا کی اجابت کے لئے عنوان ج و ب بھی دیکھئے)

اب رہیں حضرات انبیاء کرامؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے۔ اسکے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ ہم ان کے لئے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے۔ باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے۔ تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے۔ خدا، حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا۔ اور نبی اکرمؐ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے۔

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے ”خدا کے کسی مقرب“، سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے

دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی۔ ایسا سمجھنا شرک ہے۔ ”خدا تک پہنچنے،، یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر انسان، اس کے قوانین کے اتباع سے ”اس تک پہنچ سکتا ہے،، اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے۔ (وسیلہ کے قرآنی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوان دیکھئے) اور اس کے قوانین کا اتباع، قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں۔ مثلاً ۱/۵ و ۲۰/۱ و ۲۸/۲ و ۳۰/۲ و ۳۱/۳ و ۱۹۲/۳۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے۔ یعنی وَإِذَا مَسَّكَ عَبْدُكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (۱۸۶/۲)۔ ”جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہہ دو کہ) میں قریب ہوں،،۔ یا نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِن حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۱/۱۶) ”میں انسان سے اسکی رگ جان سے بھی قریب ہوں،،۔ تو ان میں ضمنًا خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ وہ ہر انسان سے، اسکی رگ جان سے بھی قریب ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن اس طرح موجود نہیں جس طرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا، اس کائنات میں، بغیر جگہ (Space) گھیرے کس طرح موجود ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ لَا تَدْرُكُهُ أَلَّا بُبْصَارًا۔ وَهُوَ يَدْرُكُ أَلَّا بُبْصَارًا (۱۰۳/۱)۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے۔ خود خدا کی ذات سے نہیں۔ دُعَا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔

باقی رہا خدا کا علم، سو جس چیز کو ہم ”ماضی۔ حال۔ مستقبل،، کہتے ہیں، علم خدا وندی کی رو سے اسکی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود

ہوتے ہیں۔ یعنی اسے ہونے والے واقعات کا اسطرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اسوقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے۔ اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا۔

د ف ا

الدَّفْعُ۔ حرارت اور گرمی۔ نیز وہ چیز جو گرمی پہنچائے۔ اَدْفَاءُ۔ اس نے اسے ایسا کپڑا پہنا دیا جو اسے گرم کر دے۔ الدَّفْعَاءُ۔ ہر وہ چیز جو گرمی پہنچائے۔ مثلاً اون وغیرہ*۔ قرآن کریم میں مویشیوں کے متعلق ہے لَکُمْ فِیْہَا دَفْعٌ وَمَنْفَعٌ (۱۶)۔ یعنی ان میں تمہارے لئے (اون وغیرہ سے) گرمی یا گرمی بہم پہنچانے والا سامان اور دیگر فائدے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دَفْعٌ۔ اونٹوں کے بچوں، ان کے دودھ اور ان کی دیگر منفعت بخش اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے۔

د ف ع

دَفْعٌ۔ کسی چیز کو قوت سے دور کر دینا۔ ہٹا دینا**۔ (۲۵۱) صاحب محیط نے کہا ہے کہ الدَّفْعُ کے معنی ہیں کسی بات کو وارد ہونے سے پہلے ہی دور کر دینا اور الدَّفْعُ کے معنی ہیں اسے وارد ہو جانے کے بعد دور کرنا***۔ بصائر میں ہے کہ جب دَفْعٌ کے بعد الٰہی آئے تو اس کے معنی سونپنے یا ادا کر دینے کے ہونگے۔ جیسے۔ فَادْفَعُوْا اِلَیْہِمْ اَمْوَالَہُمْ (۳) میں یعنی۔ ”ان کے مال انہیں سونپ دو“۔ اور جب اس کے بعد عَنْ آئے تو اس کے معنی حمایت کرنے یا حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں**۔ جیسے

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا (۲۲/۸۰)۔ ”یقیناً اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں،،۔ اَلْمُدَّافِعَةُ۔ ایک دوسرے کو ہٹانا اور دھکے دینا*۔ دَافِعٌ۔ ہٹانے والا (۲/۴)۔

د ف ق

دَفَقَ الْمَاءَ يَدْفُقُ۔ اس نے پانی گرا دیا بہا دیا۔ دَفَقَ الْكُوزَ۔ پیالہ کے پانی کو یکبارگی گرا کر منتشر کر دیا۔ دَفَقَ الْمَاءَ۔ پانی یکبارگی ابل پڑا۔ سَيَّلَ دُفَاقٌ۔ وہ سیلاب جس کا پانی وادی سے اوپر اچھل جائے۔ اَلدَّفَقُ۔ تیز رفتار اونٹ۔ اَلدَّفِيقُ۔ ایک ایسی تیز رفتار جس میں جانور اچھل کر چلے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو آگے کی طرف دھکا دینا۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے خَلَقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (۸۶/۱)۔ ”اسے پیدا کیا گیا ہے تیزی سے اچھل کر گرنے والے پانی (سادہ تولید) سے۔ (یہ مَاءٌ مَدْفُوقٌ کے معنوں میں آیا ہے)۔

د ک ک

اَلدَّكَكُ۔ کوٹنا۔ توڑنا (دیوار یا پہاڑ کو) منہدم کر دینا۔ دراصل یہ کسی چیز کو توڑ کوٹ کر زمین کے برابر کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پست ہو جانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اَلدَّكَّةُ۔ اَلدَّكَّةُ۔ اَلدَّكَّةُ۔ اَلدَّكَّةُ۔ زمین کے نشیب و فراز (اونچائی نیچائی) کو ہموار کر دینا***۔ اِذَا دُكَّتِ اِلْاَرْضُ دَكًّا (۸۹/۱)۔ ”جب زمین کے نشیب و فراز کو مٹا کر ہمواری پیدا کر دی جائے گی“۔ جب معاشی**** ہمواریاں پیدا کر دی جائیں گی اور اونچ نیچ سب مٹا دی جائیں گی۔ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً (۶۹/۱)۔ ایک ہی مرتبہ ہمواری کر دی جائیگی۔ جَعَلَهُ دَكًّا (۱۳۴/۱)۔ اسے ہموار کر دیا۔ نشیب و فراز مٹا دیا۔ جَعَلَهُ دَكَّاءَ (۹۸/۱) اسے توڑ کر ہموار کر دے گا۔ (یہاں اَرْضٌ محذوف ہے جس کے لئے دَكَّاءٌ مؤنث آیا ہے)۔ تاج نے لکھا ہے کہ اَلدَّكَّةُ مٹی کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے جَعَلَهُ دَكَّاءَ کے معنی یہ ہونگے کہ وہ دیوار مسمار ہو کر ٹیلہ سا بن جائیگی۔ اَرْضٌ دَكَّاءٌ۔ ہموار زمین*****۔ اَلدَّكَّانُ۔ ایسی جگہ جس کا اوپر کا حصہ بیٹھنے کے لئے ہموار کر لیا جائے***۔

*تاج۔ **تاج و راغب و محیط۔ ***تاج و محیط۔ ****دیکھئے عنوان ارض۔ *****راغب۔

دل ک

دَلَّكَهٗ بِیَدِهِ دَلَّكَآ - کسی چیز کو ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا۔
 دَلَّكَتِ الشَّمْسُ دُلَّوْكَآ - آفتاب کا غروب ہونا، کیونکہ اسکی طرف دیکھنے
 والا اپنی آنکھوں کو ملنے لگتا ہے*۔ (لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ کمزور
 سی ہے) دَلَّكَتِ دُلَّوْكَآ - آفتاب کا زرد ہو جانا اور زوال یا غروب کی طرف
 مائل ہو جانا۔ آفتاب کا ظہر کے وقت وسط آسمان سے نیچے کی طرف ڈھل جانا**۔
 ازہری نے کہا ہے کہ اسکے یہی معنی صحیح ہیں کیونکہ کلام عرب میں
 دُلَّوْكَآ کے معنی زوال کے آتے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی
 معنی کسی چیز کا دوسری چیز سے ہٹ جانا (زوال) بتائے ہیں۔ لیکن اس نے
 کہا ہے کہ دُلَّوْكَآ میں کسی چیز کا نرمی اور آسانی سے ہٹ جانا پایا جاتا
 ہے۔ ملنے رگڑنے کے لئے بھی یہ لفظ اسی جہت سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ
 ایسی صورت میں ہاتھ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔

آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک
 جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے ہیں۔ اس لئے زوال بھی دلوک ہے اور
 غروب بھی دلوک ہے۔ جب آفتاب نصف النہار میں زوال کر جاتا (ڈھل جاتا)
 ہے تو اسے دَالِیْکَہ کہتے ہیں۔ ایسے ہی جب وہ غروب ہو جائے تب بھی
 اسے دَالِیْکَہ کہتے ہیں،** کیونکہ دونوں حالتوں میں اسے زوال ہوتا ہے۔
 لیکن نوادر الاعراب میں ہے کہ اسکے معنی آفتاب کے بلند اور اونچا ہونے کے
 آتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دال (د) جہاں بھی لام (ل) کے ساتھ
 آئیگا تو وہ حرکت کرنے، آنے جانے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ زوال
 پذیر ہونے، پر دلالت کریگا۔ چنانچہ دَلَّكَ الشَّوْبُ کے معنی ہیں کپڑے
 کو دھونے کیلئے ملا۔ دَلَّكَتِ الْمَرْأَةُ الْعَجِیْنَةَ - عورت نے آٹا
 گوندھا۔ تَدَلَّكَتِ الرَّجُلُ - آدمی نے نہاتے ہوئے اپنے بدن کو ملا۔
 اَلَدَّلُوْكَآ - خوشبو یا دوا وغیرہ جسے ملا جائے۔ بَعِیْرٌ مَدَّ لُوْكَآ - اس
 اونٹ کو کہتے ہیں جسے سفروں میں برابر کام میں لایا گیا ہو۔ اَلَدَّالِیْکُ -
 چلنے میں بلا پاؤں جمائے تیزی سے چلنا*۔ ان تمام معانی سے واضح ہے کہ
 اصل معنی اس مادہ کے حرکت کرنے ہی کے ہیں۔ لہذا جب آفتاب طلوع
 صبح سے دوپہر تک بلند ہوتا جاتا ہے تو اسے بھی دُلَّوْكَآ کہینگے۔ (جیسا
 کہ نوادر الاعراب کے حوالہ سے اوپر لکھا گیا ہے) اور جب وہ نصف النہار

تک پہنچ کر نیچے کی طرف حرکت کریگا (یعنی ڈھلنا شروع ہوگا) تو اسے بھی دُلُوک^۳ ہی کہہینگے (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ نیز راغب نے بھی اس کے معنی مسائل بہ غروب ہونے کے لکھے ہیں*) ابن درید نے جمہورۃ اللغۃ میں کہا ہے کہ دلوک کے معنی غروب اور غائب ہو جانا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (۱/۱۸)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا ”صلوۃ قائم کرو دلوک شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن“، یہاں اگر دُلُوک^۳ کے معنی عام حرکت کے لئے جائیں تو اسمیں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آجاتا ہے۔ اور قُرْآنَ الْفَجْرِ۔ طلوع آفتاب سے پہلے، اور غَسَقِ اللَّيْلِ۔ غروب آفتاب کے بعد۔ یعنی اس طرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آجاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلوۃ کیلئے یہ سارا وقت تمہارے لئے کھلا رکھا ہے۔ اور اگر دُلُوک^۳ کو زوال آفتاب سے غروب تک مقید کر دیا جائے تو پھر (اوپر کے مفہوم کی رو سے) طلوع آفتاب سے لیکر اس کے نصف النہار تک پہنچنے کا وقت خارج ہو جائیگا۔ دوسری جگہ صَّلَاةٌ كَيْلَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱/۱۳) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دن کے دونوں کناروں اور رات کے (ابتدائی) حصوں میں۔ دن کے دونوں کنارے فجر اور مغرب ہیں اور رات کے (ابتدائی) حصے غَسَقُ اللَّيْلِ۔ سورۃ نور میں صَّلَاةُ الْفَجْرِ اور صَّلَاةُ الْعِشَاءِ (۲/۴۸) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہ ﷺ) کے زمانہ میں ان دونوں اوقات میں اجتماعات صلوۃ ہوتے تھے۔ یہ قُرْآنَ الْفَجْرِ اور غَسَقُ اللَّيْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت دُلُوک^۳ الشَّمْسِ سے غَسَقُ اللَّيْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ دُلُوک^۳ کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ موزوں ہونگے۔ (غَسَقُ اللَّيْلِ۔ ابتداء شب کی تساری کی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان غ۔ س۔ ق)۔

صلوۃ سے متعلق عنوان (ص۔ ل۔ و) میں آپ دیکھینگے کہ صلوۃ سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن کریم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس آیت (۱/۱۸) میں بھی اقامت صلوۃ کے معنی فرائض زندگی کی سرانجامدہی

یا قرآنی نظام کے قیام کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز، صبحدم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لئے قرآن کریم کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے (یہ قرآن الفَجْرِ ہوگا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت صلوة دلوک شمس سے غسق لیل تک ہوگا۔

دل

دَلَّ الْمَرْءُ أَقْرَبَهُ دَلَّاهَا عَلَى زَوْجِيهَا - بیوی کا اپنے شوہر سے ناز و نخرے کرنا۔ اسکا فرط ناز میں ایسی حرکات کرنا جن سے بظاہر نظر آئے کہ وہ شوہر کی مخالفت کر رہی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ دَلَّاهُ عَلَى الشَّيْءِ - اسے کوئی چیز بتائی، اس تک رہنمائی کی۔ آدَلَّ عَلَيْهِ - وہ اس سے بے تکلف ہوا، اس پر جری ہوا، اس کی محبت پر مکمل اعتماد کی وجہ سے اس پر زیادتی کی۔ آدَلَّاهُ - ناز و ادا۔ آدَلَّاهُ - واضح راستے کو کہتے ہیں۔ اور آدَلَّاهُ - رہنما جس سے کسی چیز کا پتہ نشان معلوم کیا جائے۔ وہ چیز جس سے بات واضح کی جائے۔ آدَلَّاهُ - کسی کو راستہ دکھا دینے نیز علامتوں سے کسی چیز کا پتہ دینے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے کسی دوسری چیز کی معرفت حاصل کی جائے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی ایسی علامت کے ذریعے ظاہر کر دینا جسے تم غور و فکر کے بعد بتدریج جانو۔ یعنی معلوم علامت کے ذریعے اظہار حقیقت۔ نیز کسی چیز میں اضطراب اور حرکت کا موجود ہونا۔ قرآن مجید میں ہے کہ تم اپنے رب کے سایہ بڑھانے (کی حکمت) پر غور نہیں کرتے۔ اس کے بعد ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَيْهِ دَلِيلًا (۲۵)۔ سایہ کے اس طرح گھٹنے اور بڑھنے کو معلوم کرنے کا ذریعہ (یا اسکا موجب) سورج کی روشنی ہے۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہ ہو اور اسکا گھٹنا بڑھنا معلوم نہ ہو سکے۔ سورة السبا میں ہے مَا دَلَّاهُمْ عَلَى مَوْتِهِمْ إِلَّا.... (۳۳)۔ کسی چیز نے انہیں (حضرت سلیمانؑ کی) موت کا پتہ نہیں دیا بجز..... یعنی وہ چیز بتدریج، غور و فکر کے بعد، ذریعہ بنی اس امر کا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ فی الواقعہ وفات پا چکے ہیں۔ (اسکی تفصیل عنوان حضرت سلیمانؑ میں ملیگی)۔ لہذا دلیل وہ ذریعہ ہے جس سے کسی بات کا علم غور و فکر کے بعد بتدریج ہو سکے۔

د ل و (ی)

اَلْقَدْلُوْ - ڈول - (جب ڈول پانی سے بھرا ہوا ہو تو اسے ذَنْوُبٌ کہتے ہیں **** لیکن یہ کلیہ نہیں ہے -) دَلْوَتٌ - اَدْلِيْتُ - میں نے ڈول کنویں میں ڈالا* - یا ڈول بھر کر کنویں سے نکالا** - اسی سے اَدْلِي کے معنی ہیں کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ یا وسیلہ فراہم کرنا - جیسے پانی تک پہنچنے کے لئے ڈول ڈالنا پڑتا ہے - اَدْلِي اِلَيْهِ بِمَالِهِ : اسے اپنا مال دیا* - دَلِي حَاجَتَهُ دَلْوًا - اس نے اپنی ضرورت کو طلب کیا - اَدْلِي بِرَحِمِهِ - اس نے اپنی رشتہ داری کو ذریعہ بنا کر چاہا کہ دوسرے تک پہنچ جائے اور اپنا کام نکال لے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں نرمی اور سہولت کے ساتھ کسی چیز کے قریب ہو جانا - قرآن کریم میں ہے تَدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحِكْمِ (۱۸۸) مال کے ذریعہ (رشوت دیکر) حکام تک پہنچ کر اپنے حق میں فیصلہ لے لینا -

ڈول کو کنویں میں لٹکانے کی جہت سے تَدْلُو کے معنی ہوتے ہیں لٹکانا - قریب ہو جانا - سورة النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلُّی (۵۳) وہ قریب ہوا - (ہم رنگ ہو گیا) - ان حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا - یہ مقام نبوت کی خصوصیات میں سے ہے - سورة اعراف میں ہے فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ (۲۲) انہیں فریب دیکر پستیوں کی طرف گرا دیا - دَالَاهُ - مَدَالَاةً - اس سے نرمی اور مدارات کی **** - دَلِي - يَدْلُو - متحیر ہونا* -

د م د م

دَمْدَمَ الْقَوْمَ وَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ - قوم کو ہلاک و برباد کر دیا - دَمْدَمَ عَلَيْهِ - اس پر غصہ ہوا اور غصہ میں اس سے بات کی* - دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ - انہیں ہلاک کیا اور پریشان و بے چین کیا **** - الدَمْدَمَةُ پریشان کن گفتگو - غضب* - تباہ و برباد کرنا **** الدَمْدَمُ، سوکھی گھاس* - دَمْدَمَ الْقَرْعُدُ - گرج زور دار ہوئی** -

قرآن کریم میں ہے فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ (۱۱) - ان کے رب (کے قانون مکافات) نے انہیں اس طرح ہلاک کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا -

د م ر

الْدَمُورُ - الدمارُ - ہلاک ہو جانا - ہلاک کر دینا - اَلْتَدْمِيرُ
 ہلاک کر دینا - بیخ کنی کر دینا - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں
 تباہی و بربادی کو کسی چیز میں داخل کر دینا - دَمَرٌ عَلَیْہِمْ - وہ بغیر
 اجازت، برائی کی نیت سے ان کے پاس آیا - وہ اچانک ان پر حملہ آور ہوا* -
 قرآن کریم میں ہے وَدَمَرْنَا (۱۳۱) ہم نے تباہ و برباد کر دیا - ابن فارس
 نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھر وغیرہ میں داخل ہونے کے ہیں -
 بعض اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ داخلہ بغیر اجازت کے ہوتا ہے -

د م ع

الْدَمْعُ - آنسو خواہ وہ غم کے ہوں یا خوشی کے - اَلْدَمْعَةُ - آنسو
 کا ایک قطرہ - دَمَعَتِ الْعَيْنُ - آنکھ نمناک ہو گئی* -
 دَمَعَتِ السَّحَابَةُ - بادل سے پانی برسا** - سورۃ مائدہ میں ہے -
 تَرَىٰ اَعْيُنُهُمْ تَفِيضٌ مِّنَ الدَّمْعِ (۵/۸۳) ”تو دیکھیگا کہ ان کی
 آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں“ -

د م غ

اَلِدِّمَغُ - بھیجا (سر کا گودا) دَمَغٌ - يَدْمَغُ - اسنے اسے ایسا زخم
 لگایا کہ وہ دماغ تک پہنچ گیا - اَلْدَمُوءُغُ - وہ چیز جو کسی چیز کو
 توڑ پھوڑ کر رکھ دے - دَمَغَهُ - وہ اس پر غالب آ گیا* - دَمَغَ الْحَقِّ
 الْبَاطِلَ - حق نے باطل کو ختم کر دیا - اسے مٹا دیا** - حُجَّةٌ دَامِغَةٌ -
 دماغ توڑ دلیل*** -

سورۃ انبیاء میں حق کے متعلق ہے فَيَدْمَغُهُ (۲۱/۱۸) وہ باطل کا بھیجا
 نکال دیتا ہے - اسے مٹا کر رکھ دیتا ہے - حق و باطل کی کشمکش میں (جو
 تعمیری اور تخریبی قوتوں کی شکل میں کائنات کے ذرے ذرے میں جاری ہے)
 حق (تعمیری پہلو) ہمیشہ باطل (تخریبی پہلو) پر غالب آتا ہے اور اس طرح یہ
 سلسلہ کائنات ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے - اگر تخریب غالب رہے
 تو ارتقاء تو ایک طرف کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہے - لہذا سنت اللہ یہ ہے
 کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَتَازَ اَهُوَ
 زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) - ”ہم حق کے ذریعہ باطل پر ضرب لگاتے ہیں - سو حق،

باطل کا مغز توڑ دیتا ہے۔ سو دیکھو! وہ (باطل کس طرح) نیست و نابود ہو رہا ہے!،،۔ اس کشمکش میں خدا کے تعمیری پروگرام کا، تخریبی پروگراموں پر غالب آنا، قانون کائنات ہے۔ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس کے غلبہ اور تسلط کی رفتار (ہمارے پیمانوں کے مطابق) بہت سست ہے۔ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا) ہوتا ہے۔ (۳۲/۵ و ۳۰/۴) لیکن اگر انسان، خدا کے قانون کا رفیق بن جائے، تو پھر اس کے نتائج، خود انسان کے حساب و شمار کے مطابق مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

د م و (ی)

دَمَّ کے معنی ہیں خون۔ اَلِدَّمَاءُ (۲/۳۰) اسکی جمع ہے *۔ (دَمَّ - در اصل دَمَوٌ - یا دَمَیٌ تھا)۔ قرآن کریم نے دَمًا مَسْفُوحًا (۱۳۶/۶) ”بہتے ہوئے لہو“ کو حرام قرار دیا ہے۔ (مزید تشریح س - ف - ح کے عنوان میں ملیگی)۔

د ن ر

دِرْہَمٌ - ایک طلائی سکے کا نام ہے۔ اسکی جمع دَنَانِیْرٌ آتی ہے۔ غیر عربی لفظ کو عربی بنا لیا گیا ہے۔ عرب اسے قدیم زمانہ سے بولتے چلے آ رہے تھے اسلئے یہ عربی ہو گیا *۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (۳۳/۳) میں آیا ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ لفظ در اصل دِرْہَمٌ تھا۔ اسی لئے اسکی جمع دَنَانِیْرٌ آتی ہے *۔ اس کے معنی پونڈ یا گنی یا اشرفی کے ہیں جو طلائی ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ، رومی لفظ (Dinarins) کا معرب ہے۔ عربوں کے ہاں رومیوں کے سکوں کا زیادہ رواج تھا۔ (نیز دیکھئے درہم)۔

د ن و

دَنَا - يَدْنُو - دُنُوًّا - دَنَاوَةً - قریب ہونا۔ اَلْدُّنْيَا - نزدیک ترین چیز (یہ مؤنث ہے۔ اس کا مذکر آدُنْیٰ ہے)۔ دَنْیٰ - يَدْنٰی کے معنی ہیں کمزور اور ضعیف ہونا۔ آدُنْیِ السَّرْجُلُ اِدْنَاءً - اس شخص نے تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کی۔ آدُنْیِ الشَّیْءُ کسی چیز کو قریب کیا۔

آدُنَتْ ثَوْبَهَا عَلَيْهِمَا : اس نے اپنا کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا ***۔ اسی سے ہے يَدْ نِيْنِ عَلَيْهِنَّ مِّنْ جَلَالِ بِيْـَٔتِهِنَّ ^(۳۳/۵۹) ”وہ اپنی چادریں (جلباب) اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔“۔

آلَادُنِيْ کے معنی ہیں زیادہ قریب، لیکن کبھی اس سے مراد اصْغَرُ ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے مقابلہ میں اَكْبَرُ آتا ہے۔ کبھی اس سے مراد اَرْذَلُ ہوتا ہے تو اس کے مقابلہ میں خَيْرُ آتا ہے۔ جب اس سے مراد اَوْسَلُ ہوتا ہے تو اس کے مقابلہ میں اَخِرُ آتا ہے۔ جب اس سے مراد اَقْرَبُ ہوتا ہے تو اس کے مقابلہ میں اَقْصَى آتا ہے۔**۔

قرآن کریم میں ہے فِیْ آدُنِیْ اِلَّا رُضِیَ ^(۳۰/۳)۔ یعنی قریب کی سر زمین۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا اَوْ اَدُنِیْ ^(۵۳/۸-۹)۔ اس کے معنی ہیں پھر وہ قریب ہوا یا قریب تر۔ سورۃ الرحمن میں دَانَ ^(۵۵/۵۳) بمعنی قریب آیا ہے۔ سورۃ الحاقۃ میں ہے قُطُّوْا فِہَا دَانِیَّةً ^(۶۹/۲۳)۔ اس کے معنی بھی قریب ہیں۔ اَلْاَسْمَاءُ الدُّنْیَا ^(۶/۳۷ و ۶/۷۷) کے معنی ہیں قریب ترین آسمان۔ (دیکھئے عنوان س۔ م۔ و کے تحت سماء)۔

الدُّنْیَا (قریب تر) بمقابلہ اَلْقُصْوٰی (بعید تر) ^(۸/۲۲) میں آیا ہے۔ اَكْبَرُ کے مقابلہ میں یہ لفظ ^(۳۲/۲۱) میں آیا ہے۔ اور اَكْثَرُ کے مقابلہ میں ^(۵۸/۷) میں۔ خَيْرُ کے مقابلہ میں ^(۲۱/۱) میں۔

قرآن کریم میں اَلْحَیْوٰۃُ الدُّنْیَا۔ بمقابلہ اٰخِرَۃً۔ اکثر مقامات پر آیا ہے۔ اور یہی وہ تقابل ہے جو زیادہ غور طلب ہے۔ اس لئے کہ اس تقابل میں اَلْحَیْوٰۃُ الدُّنْیَا کو آخرت کے مقابلہ میں کم قیمت قرار دیا گیا ہے۔

عام مذاہب عالم میں، جہاں روح اور مادہ کی ثنویت (Duality) کا عقیدہ رائج ہے، دنیا اور اس کی متاع کو بڑا ذلیل اور حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے دنیا ہے ہی مایا یعنی فریب۔ اور اس فریب سے چھوٹ جانے کا نام نجات یا مکتی ہے۔ بدھ مت میں دنیا کے متعلق ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس لئے اصل حیاتِ ترکِ آرزو کا نام ہے۔ یہی عقیدہ عیسائیت میں ہے جہاں نیکو کاروں کی بادشاہت آسمان میں ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ترک دنیا سب سے بڑی ولایت ہے۔ یہی عقیدہ تصوف کی اصل ہے اور اس سے متاثر ہو کر خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی دنیا کو بڑا حقیر اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ”دنیا دار، اور گنہگار، قریب قریب

مرادف المعنی الفاظ ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس، دین اور دنیا ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ مومن کو (آخرت کے علاوہ) فی "هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ" (۱۵۶) کی دعا سکھاتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لِيَقْذِرِينَ آحْسَنُوا فِي "هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ" (۱۵۷)۔ حسن عمل کا نتیجہ (آخرت کے علاوہ) اس دنیا کی خوشگواریاں ہیں۔ اس کے مقابلہ میں وہ ذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۵۲)۔ "دنیا میں ذلت و خواری،، کو خدا کا غضب اور اس کی لعنت قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ تصور باطل ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اور اس کی آسائشیں اور آرائشیں گناہ کی آلودگیاں!

لیکن قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں متاع دنیا کو قلیل اور اس کی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے (ا۔ خ۔ ر) اور (ع۔ ج۔ ل) کے عنوانات دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ مَفَادٍ عَاجِلَةٍ اور مَتَاعٍ آخِرَةٍ سے قرآن کریم کا مطلب کیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ہے جو اپنی نگاہوں کو مفادِ عاجلہ (فوری حاصل ہو جانے والے مفاد) پر مرکوز رکھتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی مفادِ عاجلہ کو وہ مَتَاعٌ الدُّنْيَا قریبی مفاد، یا پیش پا افتادہ مفاد کہہ کر پکارتا ہے اور ان لوگوں کو سخت مطعون کرتا ہے جو ان پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر مستقبل کی خوشگواریوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ لہذا جو چیز قرآن کریم کی رو سے مذموم ہے وہ یہ ہے کہ انسان قریبی مفاد (Immediate Gain) کی خاطر مستقبل (Future) کی تابناکی کو نظر انداز کر دے۔ یعنی وہ زندگی اسی طبعی زندگی ہی کو سمجھ لے۔ اور یہ بھی مذموم ہے کہ انسان دنیا کو ترک کر کے صرف "عاقبت منواریں،، کے خیال میں لگ جائے (اسے رہبانیت کہتے ہیں جسے قرآن کریم جائز قرار نہیں دیتا۔ دیکھئے عنوان ر۔ ہ۔ ب)۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲۰۱)۔ اس دنیا میں، بھی خوشگواریاں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ حال بھی درخشندہ اور مستقبل بھی تابناک۔ قریبی مفاد بھی اور مستقبل کے مفاد بھی۔

اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جس کا حال درخشندہ نہیں وہ سمجھ لے کہ اس کا مستقبل بھی تاریک ہی ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمٰی فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمٰی وَأَضَلُّ سَبِيلًا (۱۴)۔ "جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں

بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا، - (آعمی کے مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ع - م - ی) - لہذا -

(۱) یہ تصور بھی غلط ہے کہ دنیا کی خوشگواریاں قابل نفرت ہیں -

(۲) اور یہ بھی غلط ہے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے، لہذا مفاد صرف اسی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد ہیں -

(۳) صحیح تصور یہ ہے کہ اس دنیا کے مفاد بھی حاصل ہوں اور انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے اس قابل ہو جائے کہ وہ اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرے - نیز اس دنیا میں نگاہ صرف اپنے ذاتی مفاد پر نہ رہے بلکہ تمام نوع انسانی اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی پر بھی نگاہ رہے - یہ مستقبل اس دنیا میں ہوگا اور دوسرا مستقبل اس کے بعد کی زندگی میں (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے عنوان ا - خ - ر) -

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان کو اقدار (Values) متعین کر کے دیتا ہے - وہ ہر شے کے متعلق بتاتا ہے کہ انسانیت کی میزان میں اس کی قدر و قیمت کیا ہے - اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ عقل اور ایمان کی رو سے صحیح مسلک زندگی یہ ہے کہ انسان، بلند قدر و قیمت کی شے کے لئے کم قدر و قیمت کی شے کو قربان کر دے - وہ بتاتا ہے کہ دنیاوی سامان زندگی اور اس کی خوشنمائیاں اپنی قدر رکھتی ہیں - انہیں ضرور حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہئے - لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی زندگی (یعنی انسان کی طبعی زندگی - Physical Life) کے کسی تقاضے میں اور انسانی زندگی (انسانی ذات) کے کسی تقاضے میں تصادم واقع ہو جائے (ان میں (Tie) پڑ جائے) تو اسوقت، انسانی ذات کے بلند تقاضہ کی خاطر طبعی زندگی کے کمتر درجہ کے تقاضہ کو قربان کر دینا چاہئے - یہ ہیں وہ مقامات جہاں قرآن کریم نے (طبعی زندگی اور انسانی ذات کا مقابلہ کرتے ہوئے) دنیاوی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو کم قیمت بتایا ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیاوی زندگی قابل نفرت ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ جب طبعی زندگی اور انسانی زندگی (جسے مرنے کے بعد بھی قائم رہنا ہے) کا مقابلہ ہو تو پھر طبعی زندگی کی قیمت، انسانی زندگی کے مقابلہ میں کمتر سمجھنی چاہئے - یہ ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم ”دنیا اور آخرت“ کے متعلق -

دھر

آلّٰہ دھُرُ - دراصل مُدتِ عالم کو کہتے ہیں جو اسکی ابتداء آفرینش سے لیکر اسکی اختتام تک ہوتی ہے - پھر، طویل مدت کیلئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا - برخلاف زَمَانٌ کے جسکا اطلاق مُدتِ قلیلہ اور مُدتِ کثیرہ دونوں پر ہوتا ہے* - قرآن کریم میں (تخلیق انسانی کے سلسلہ میں) حَیْنٌ مِّنَ الشَّہْرِ (۱/۶) آیا ہے - یعنی ایک زمانہ - یا زمانے کی ایک مدت -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور زبردستی کے ہوتے ہیں - زمانہ کو دَہْرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز پر سے گزرتا اور اس پر غالب آجاتا ہے - آلّٰہ دھَارِیْرٌ - زمانہ کے حوادث اور گردشیں - دَہْرَہُمْ اَمْرٌ - ان پر کوئی مصیبت نازل ہو گئی** -

قرآن کریم میں ان لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے جو زندگی کو اس طبعی زندگی تک محدود سمجھتے ہیں - کہ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الشَّہْرُ (۳۵/۲۳) - یہ صرف مرور زمانہ (Time) ہے جو ہمیں ہلاک کر دیتا ہے - وقت گزرنے سے انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور اسطرح وہ (Deteriorate) ہوتا ہوا مر جاتا ہے اور زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے - اسکی بعد کوئی اور زندگی نہیں - یہ وہی تصور ہے جسے دور حاضر کی اصطلاح میں (Materialistic Concept of Life) مادی نظریہ حیات کہتے ہیں - قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَہُمْ بِذَٰلِکَ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ ہُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۳۵/۲۳) - ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں - یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں - قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی - اب ہمارے دور میں دھر (Time) کے متعلق جو جدید فلسفیانہ (اور سائنٹفک) تصورات قائم ہوئے ہیں ان کی رو سے زمان (Time) کی حقیقت ہی کچھ اور ہو گئی ہے - اور ابھی تو اس نہایت مشکل اور نازک موضوع پر تحقیق و تفتیش اور بحث و نظر کی ابتداء ہوئی ہے - آگے چلکر دیکھئے اس کے متعلق کیا کیا تصورات قائم ہوئے ہیں - بہر حال یہ عقیدہ کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ہے اور مرور زمانہ سے اسکا خاتمہ ہو جاتا ہے، اب عہد کہن کا فرسودہ خیال سمجھا جاتا ہے - اب تحقیقات کا رخ اسی طرف کو ہے کہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے - (اسکی متعلق تفصیل سے معارف القرآن

کی آخری جلد میں لکھا جائیگا جو آخرت سے متعلق ہوگی۔ لیکن ضمنی طور پر، میری کتاب ”انسان نے کیا سوچا، میں بھی لکھا جا چکا ہے)۔ مرور زمانہ سے انسان کا جسم مضمحل ہوتا ہے۔ اسکی ذات (Personality) پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ زمانے کے اثرات سے غیر متاثر رہتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں، جسم کے علاوہ، اسکی ذات بھی ہے۔ اگر اس کی نشو و نما قرآن کریم کے طریق کے مطابق ہو جائے تو موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسی لئے، دھر (زمانہ) کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے ”الدھر“ اس زمانے کو بھی کہا ہے جب انسان ہنوز وجود میں بھی نہیں آیا تھا۔ ”هَلْ آتَىٰ عَلَىٰ الْإِنْسَانِ حَيِّنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْ كُورًا“ (۹۶)۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ خود زمانہ (دھر) کو خدا مان لیا جائے۔ بہر حال، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، زمانہ یا دھر (Time) کے متعلق بحث، بڑی فلسفیانہ ہے جو ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (دھر) انہی دو مقامات میں آیا ہے جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے۔ ان مقامات میں اس لفظ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

دھق

دَهَقَ الْكَاسَ - اسنے پیالہ بھر دیا۔ مَاءٌ دِهَاقٌ - کثیر پانی۔ كَاسٌ دِهَاقٌ - صاف پیالہ۔ بھرا ہوا پیالہ۔ الدَّهَقُ کے معنی ہوتے ہیں زور سے دبانا۔ الدَّهَقُ - شکنجے کو کہتے ہیں۔ اَلْمُدَّهَقُ - زور سے دبایا ہوا*۔ (بھرے ہوئے کیلئے دِهَاقًا کا لفظ غالباً اسلئے بولتے ہیں کہ اس میں چیز دبا دبا کر بھری جاتی ہے)۔

قرآن کریم میں كَاسٌ مَّاءٌ دِهَاقًا - (۳۳) آیا ہے۔ یعنی پاک اور صاف، لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ۔ لبریز بھی اور مصفا بھی۔ یہی جنتی معاشرہ کی خصوصیت ہے۔ صحیح زندگی ایسی ہی ہونی چاہئے۔ بھر پور اور مصفا۔ جس میں زندگی، پاکیزگی اور حرکت بڑھانے والے عناصر کی فراوانی ہو، سب کچھ فراوانی اور پاکیزگی سے ملے۔ جس میں (طبعی ضروریات کے علاوہ) انسان کی مضمحل صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے اور تطہیر قلب و نگاہ

بھی میسر ہو۔ زندگی کے پیالے پاکیزہ اور قوت بخش خوشگوار یوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں لبریز ہونے کے علاوہ چھلکنے (یعنی متحرک ہونے) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

د ھ م

الْأُدْهُمَّةُ - سیاہی - اِدْهُمَّ الشَّيْءُ - چیز سیاہ ہو گئی - اِدْهُمَّ السَّزُوعُ : سیرابی کی وجہ سے کھیتی سیاہی مائل ہوئی - حَذِرْ يُقْتَةُ دَهْمَاءُ وَمُدُّ هَامَّةٌ - سرسبز باغ جو اپنی سرسبزی کی شدت سے مائل بہ سیاہی ہو رہا ہو - عربوں کے ہاں گہرے رنگ کی سبزی کو دَهْمَةُ کہتے تھے کیونکہ گہری سبزی سیاہی مائل ہو جاتی ہے - اور ہلکے رنگ کی سیاہی کو خَضْرَوَةٌ کہتے تھے کیونکہ وہ سبز رنگ کے قریب قریب آ جاتی ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تاریکی کے ساتھ کسی چیز پر چھا جانا ہیں - بعد میں کثرت استعمال سے اس میں تاریکی کی شرط بھی نہ رہی - قرآن کریم نے جنتی باغات کی شادابی و سرسبزی کی شدت کی بنا پر، اُنہیں مَدُّ هَامَّتَيْنِ (۵۵/۶۳) کہا ہے - ایسی زندگی جس میں تازگی، شادابی، سرسبزی، شگفتگی، اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو -

د ھ ن

الْأُدْهُنَّةُ - چکناہٹ - الْأُدْهُنُّ - تیل - الْأُمْدُ هُنُّ - تیل کی شیشی - اِدْهُنَّ - اس نے تیل مل لیا** - قرآن کریم میں زیتون کے متعلق ہے تَنْبُتُ بِالْأُدْهُنِّ (۲۳/۲۰) وہ روغن (تیل) لیے ہوئے نکلتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت اور قلت کے ہوتے ہیں - اور اِدْهُنَّ کے معنی خیانت کرنے کے - الْأُمْدُ أَهْنَةُ - فریب - ہناوٹ - تصنع، نمائش (چکنی چپڑی باتوں کے اعتبار سے) - اَلْدُّ هَانٌ - فریب دینا - باطن کے خلاف ظاہر کرنا - نرمی برتنا - رعایت کرنا - سنجیدگی اور حقیقت کا دامن چھوڑ دینا** - سورة قلم میں ہے وَادَّوْا لَوْ تَدُّ هَيْنٌ فَيَدُّ هَيْنُونٌ (۶۸/۱) - یہ چاہتے ہیں کہ اگر تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو وہ بھی اپنے مقام سے ہٹ کر تجھ سے ”مفاہمت“، (Compromise) کر لیں - لیکن جو شخص حق پر ہو وہ اگر اپنے مقام سے ذرا سا بھی ہٹ جائے تو وہ باطل پر

* تاج و راغب - ** تاج و محیط و راغب -

پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس، باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ باطل کا باطل ہی رہتا ہے۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں اور بکر کہتا ہے کہ نہیں۔ تین اور تین چار ہوتے ہیں۔ اب ان میں ”مفاہمت“، کرانے والا کہتا ہے کہ کچھ تم گھٹو اور کچھ تم بڑھو اور دونوں یہ مان لو کہ تین اور تین پانچ ہوتے ہیں۔ بکر کا اس سے کچھ نہیں بگڑیگا کیونکہ وہ جیسا پہلے غلطی پر تھا ویسا ہی اب رہیگا۔ لیکن اس سے زید فوراً اپنے مقام حق سے باطل پر آ جائیگا۔ یہ وجہ ہے کہ حق کسی کی خاطر اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتا۔ وہ اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے۔ دین کے محکم اصول اپنے اندر کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔ سورۃ واقعہ میں پہلے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کس قدر عظیم کتاب ہے۔ اس کے بعد ہے۔ اَفَبِیْہٰذَا الْاٰیٰتِیْنَ اَنْتُمْ مُّدْہِنُوْنَ (۵۶/۸۱) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا تم ایسی کتاب میں خیانت کرتے ہو۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں کمی بیشی کرتے ہو۔ اور دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ان کے صحیح مقام سے پھسلاتے ہو؟ مفہوم درحقیقت دونوں سے ایک ہی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اس طرح لوگوں کو حق کے مقام سے ہٹا دیتی ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ اَنْتَکُمْ تَکْذِبُوْنَ (۵۶/۸۱)۔ اس تکذیب کو تم اپنے لئے ذریعہ معاش بناتے ہو؟

اَلِدَّہَانُ - سرخ رنگ کی کھال - تیل کی تلچھٹ*۔ سورۃ رحمن میں ہے کہ اَسْمَانٍ وَرْدۃٌ کَالِدَّہَانِ (۵۵/۳۳) ہو جائیگا۔ دوسری جگہ ہے کَالْمُہْلِ (۷۸/۸)۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائیگا۔

دہی (و)

دَہَاہُ - دَہِیًّا - اس نے اس میں عیب نکالا۔ اس کی تنقیص کی۔ اسے سخت تکلیف پہنچائی۔ اَلِدَّہِیَّةُ - امر عظیم - سخت مصیبت - دَوَاہِیُّ - الدَّہْرُ - زمانہ کے ہاتھوں جو سخت مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اَلِدَّہِیُّ - اَلِدَّہَاۃُ - حیرت انگیز ہوشیاری اور چالاکی، نیز رائے کی عمدگی۔ دَہِیٌّ - اس نے نہایت درجہ ہوشیاری سے کام کیا**۔ چنانچہ رَجُلٌ دَاہٍ - انتہائی

ہوشیار اور چالاک آدمی کو کہتے ہیں*۔ (دنیا کی مصیبتوں کا بیشتر حصہ عقلِ فریب کار کی چالاکیوں ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے)۔

قرآن کریم میں ہے وَ السَّاعَةِۢۤ اَدُّۤہٰی (۵۳/۶)۔ وہ انقلاب کی گھڑی سخت مصائب والی ہوگی اور اچانک اور تحیر انگیز طریق سے آئیگی۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ دَہٰی کے بنیادی معنی ہیں کسی ایسی چیز کا سامنے آجانا جو خوشگوار نہ ہو۔ لیکن حیرت انگیز اور اچانک طریق سے سامنے آنا جس سے انسان بھونچکا رہ جائے۔ انقلاب کہتے ہی اسے ہیں جو اچانک نمودار ہو اور دیکھنے والے متحیر ہو جائیں۔

دور

دَارَ - يَدْوُرُ - دَوْرًا - کسی چیز کا اس طرح گھومنا کہ وہ گھوم پھر کر وہیں آجائے جہاں سے چلی تھی۔ الدَّوْرَةُ - پرکار۔ الدَّائِرَةُ - حلقہ (سرکل) اس کی جمع دَوَائِرُ ہے۔ الدَّوَارُ (جمع دِيَارٌ)۔ مکان۔ اس لئے کہ اس میں لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ یا گھوم پھر کر وہاں آجاتے ہیں۔ محلہ - شہر - علاقہ - ٹھہرنے اور سکونت پذیر ہونے کی جگہ - نیز ساری دنیا کو بھی کہتے ہیں، اور زمانہ کو بھی جو گردش کرتا رہتا ہے۔ دَارَةٌ - مصیبت گردش - الدَّوَارُ - گھومنے کی جگہ**۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کو چاروں طرف سے گھیر لینا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے عَلَيْهِمُ الدَّائِرَةُ السَّوْءُ (۳۸/۶)۔ تباہی اور بربادی نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ یہاں دائرہ کے معنی ہیں وہ چیز جو کسی کو محیط ہو جائے۔ جو اسے ہر طرف سے گھیر لے۔ جیسا کہ دائرہ (سرکل) ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے يَتَرَبَّصُّۢمُ بِكُمُ الدَّوَّائِرَ (۹۸/۹)۔ ”وہ تم پر گردشوں کے آنے کا انتظار کرتے ہیں“۔

سورۃ نوح میں دِيَارًا (۶۱/۶) کے معنی ہیں، بسنے والا۔ مکین - نیز یہ نفی کے بعد، کسی ایک، کوئی ایک، کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے**۔

دَارُ الْاٰخِرَةِ (۲/۹۳) کی اصطلاح قرآن کریم میں متعدد بار آئی ہے۔ اس کے معنی ہیں ”آخرت کا گھر“۔ یعنی مستقبل کی زندگی اور اُس زندگی کی آسائشیں۔ (دیکھئے عنوان ۱ - خ - ر)۔

سورۃ بقرہ میں تجارت کے متعلق ہے تَدْرِیْرُوْنَہَا (۲۸۲) - جس کا تم لوٹ پھیر کرتے ہو۔ یعنی آپس میں مبادلہ کرتے ہو۔ چیزوں کو گردش دیتے ہو۔

دول

الدَّالَّةُ - شہرت - الدَّوْلَةُ - باری اور نوبت - صَارَ الْفَيْئُ - دَوْلَةً بَيْنَهُمْ - مال غنیمت ان میں منقسم ہو کر گردش کرنے لگ گیا۔ دَاوَلَ - پھیرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا۔ قرآن کریم میں ہے تِلْكَ الْاِیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیْنَ النَّاسِ (۱۳۹) - ”یہ وہ حالات ہیں جنہیں ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں“ - کبھی اسکی باری کبھی اُسکی باری - تَدَاوُلُوْہُ انہوں نے اسے باری باری لیا۔

دَوْلَةٌ اور دَوْلَةٌ - بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی گردش کرنا۔ پھرتے رہنا۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کے معنی ہیں دو لشکروں کا باری باری ایک دوسرے کو شکست دینا اس طرح کہ پہلے ایک کو شکست ہو لیکن پھر شکست کھانے والا غلبہ حاصل کر لے۔ اور دَوْلَةٌ ان طور طریقوں کو کہتے ہیں جو ادلتے بدلتے رہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو مختلف ہاتھوں میں گھومتی پھرتی اور آتی جاتی رہے۔ اور دَوْلَةٌ اس چیز کے ادلتے بدلتے کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے مال کی گردش کے متعلق کہا ہے کَسٰی لَا یَکُوْنُ دَوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَّاءِ مِیْنُکُمْ (۵۹) - تاکہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی نہ گھومتا پھرتا رہے۔ معاشیات (Economics) کا کتنا بڑا اصول ہے جسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص (اوپر کے) طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) رہنی چاہئے، نہ دولت کو ایک خاص سرکل کے اندر گردش کرنا چاہئے۔ علاوہ برین، قرآن کریم میں یہ اصول بالخصوص مالِ فے کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے روپیہ کو بھی اوپر کے طبقہ (یعنی اربابِ حل و عقد) کے اندر صرف نہیں ہوتے رہنا چاہئے۔ اسے رفاہِ عامہ کے لئے گردش کرنا چاہئے۔

د و م

دَوَامٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر قائم رہنا۔ دَامَ الشَّيْءُ اسوقت بولتے ہیں جب کسی چیز پر لمبا زمانہ گزر جائے*۔ اس سے الْمَاءُ الدَّائِمُ۔ ٹھہرے ہوئے یا ساکن پانی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اَلْمُدَامُ اُس بارش کو کہتے ہیں جو لگاتار ہوتی رہے۔ لہذا اس مادہ میں کسی چیز کا لمبے زمانے تک یا ایک حالت پر رہنے کا تصور ہوتا ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ دَامَ الشَّيْءُ کے معنی ہوتے ہیں چیز گھومی۔ نیز یہ فعل تھکنے یا ٹھہرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ گھومنے کے اعتبار سے، اَلشَّدَوَامَةُ لٹو کو کہتے ہیں جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ ابن کيسان نے لکھا ہے کہ مَادَامَ میں، ما کے معنی وقت کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کہتے ہیں قُمْ مَادَامَ زَيْدٌ قَائِمًا۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں جب تک زید کھڑا رہے تم بھی کھڑے رہو**۔ سورة رعد میں جنت کے متعلق ہے اُكْلُهَا دَائِمٌ (۱۳/۳۵)۔ اس کے پھل قائم رہینگے۔ یعنی جنت کی منفعت بخش چیزوں کا سلسلہ جاری رہیگا۔ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ وہاں رزق کی کمی نہیں ہوگی۔ اور سورة هود میں ہے خَالِدِينَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۱۱/۸)۔ جب تک زمین و آسمان موجودہ حالت میں رہینگے۔ یعنی بہت لمبے عرصہ تک کے لئے۔ (تفصیل خ۔ ل۔ د کے عنوان میں دیکھئیے)

سورة آل عمران میں ہے اِلَّا مَادُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا (۳/۱۳)۔ سوائے اس کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے۔

د و ن

دُونَ۔ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَوْقُ (اوپر) کے برخلاف نیچے کے معنوں میں۔ هُوَ دُونَهُ۔ وہ اس کے نیچے ہے۔ کبھی قریب کے معنوں میں۔ زَيْدٌ دُونَكَ۔ زید تجھ سے (مرتبہ وغیرہ میں) قریب ہے۔ سامنے کے معنوں میں۔ مَشَىٰ دُونَهُ۔ وہ اس کے آگے آگے چلا۔ پرے کے معنوں میں۔ هُوَ اَمِيرٌ عَلٰی مَادُونُ جَيْحُوْنَ۔ وہ جیحون سے پرے کے علاقہ کا امیر ہے۔ علاوہ کے معنوں میں۔ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُونَ ذٰلِكَ۔ وہ اس کے علاوہ اور بھی کام کرتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ یہ لفظ

اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی پیچھے اور آگے، نیچے اور اوپر، سب آتے ہیں۔ شَمِئِيٌّ دُونُ - ذلیل چیز کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس شریف اور اچھی چیز کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے وَ اِنَّا مِّنْهَا الصّٰلِحٰیْنَ دُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذَٰلِیْكَ (۲۱/۲۱) ہم میں سے بعض صالح ہیں اور بعض اس سے کم تر درجے پر ہیں۔

علاوہ یہاں پہلے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳/۲۱) میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَنَنْذِرُ یُّقِنْتَهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَلَا کُبِّرَ ہم انہیں عذاب اکبر کے علاوہ۔ یا اس سے پہلے عذاب ادنیٰ کا مزہ بھی چکھائیں گے۔ مِّنْ دُوْنَ کے معنی ہیں ”علاوہ“، لَا یَسْتَفِیْذُ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْ لِیْسَاءَ مِّنْ دُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۳/۳۳)۔ ”مومن مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں“۔ یعنی ایسا کبھی نہ کریں کہ مومنوں کو بھی دوست رکھیں اور ان کے ساتھ کفار کو بھی۔ انہیں مومنوں کو دوست رکھنا ہوگا یا کفار کو۔ اگر وہ کفار کو دوست رکھیں گے تو انہی میں سے ہو جائیں گے۔ قرآن کریم میں مِّنْ دُوْنَ اللّٰہِ بھی اکثر مقامات پر آیا ہے جس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ لوگ خدا کے ساتھ ساتھ اور قوتوں کی بھی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ خدا کے قانون تک نہیں پہنچتے۔ اس سے پہلے (یا ورے) ہی انسانوں کے خود ساختہ قانون و شریعت کو اپنے لئے واجب الاتباع مان لیتے ہیں۔ کتنے معبود ہیں جو انسانوں نے خدا سے ورے ہی اپنی ”پرستش“ کے لئے تجویز کر رکھے ہیں۔ یہ معبود مٹی اور پتھر کے بت نہیں۔ انسانی جذبات کے بت، ارباب اقتدار کے بت مذہبی پیشواؤں کے بت، غرضیکہ ہر آن ایک نیا بت۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندی دگر

رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

یہی وہ بت ہیں جو انسان کو خالص قوانین خداوندی کے اتباع سے روکتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز تک پہنچنے سے قاصر رہ جانے کے لئے دُونُ بولا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مِّنْ دُوْنَ اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہوئے اس سے ورے ہی اور چیزوں کو اپنا مقصود و منتہی قرار دے لینا۔ نزول قرآن کے بعد خدا تک پہنچنے سے قاصر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی کتاب کا اتباع ہے اور وہ کتاب ہر ایک کے سامنے ہے۔

د ی ن

دِرِیْنٌ^۵۔ یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ از انجملہ، غلبہ۔ اقتدار۔ حکومت۔ مملکت۔ آئین۔ قانون۔ نظم و نسق۔ فیصلہ۔ ٹھوس نتیجہ۔ جزا و سزا۔ بدلہ، ہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانبرداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے*۔ صاحب لطائف اللغة نے بھی اس کے معانی حساب۔ غلبہ۔ تدبیر اور عادت کے لکھے ہیں۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی اطاعت۔ روش (دَآءُ ب^۶) اور ملت کے لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں، أَسْلَمْتُ لِرَبِّ^۷ الْعَالَمِیْنَ۔ عالمگیر نشو و نما دینے والے کے قوانین و احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے، کو آلدِیْنٌ^۸ کہا گیا ہے (۱۳۱-۱۳۲)۔ اسی کو دوسری جگہ آلا سَلامٌ^۹ کہا گیا ہے (۱۸)۔ سورۃ واقعہ میں غَیْرَ مَدْرِیْنِیْنَ^{۱۰} (۵۶/۸۶) کے معنی ہیں وہ جو کسی کے ماتحت نہ ہوں۔ سورۃ توبہ میں ہے وَلَا یَدْرِیْنُوْنَ دِرِیْنََ الْحَقِّ^{۱۱} (۲۹)۔ وہ نظام خداوندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے۔ سورۃ یوسف میں دِرِیْنََ الْمَلِکِ (۱۲) کے معنی بادشاہ کا قانون ہیں۔ اور سورۃ نور میں جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے وہاں دِرِیْنََ اللّٰہِ (۲۳) کے معنی خدا کا قانون یا ضابطہ حکومت ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں، جہاں سال کے بارہ مہینوں اور ان میں سے چار حرمت والے مہینوں کا ذکر ہے، کہا گیا ہے کہ ذَآلِکَ الْیَدِیْنِ^{۱۲} الْقَیِّمِ^{۱۳} (۹۶) اسمیں بھی دِرِیْنٌ^{۱۴} کے معنی ضابطہ قانون ہے۔ لیکن یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰہُ دِرِیْنَهُمُ^{۱۵} الْحَقِّ^{۱۶} (۲۵) میں دِرِیْنٌ^{۱۷} کے معنی اعمال کا بدلہ (جزا و سزا) ہیں۔ (اس میں دین کے معنی حساب بھی ہو سکتے ہیں)**۔ اس سے بھی مطلب مکافات عمل ہی ہے۔) سورۃ صافات میں ہے عَاِنَا لَمَدْرِیْنُوْنَ^{۱۸} (۳۷)۔ کیا ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا؟ کیا ہمارا حساب ہوگا؟۔

غلبہ و اقتدار اور قانون و اختیار کے مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے یَوْمَ الْیَدِیْنِ کے معنی خود واضح کر دئے ہیں جہاں کہا ہے کہ مَا آدُرَاکَ مَا یَوْمَ الْیَدِیْنِ۔ ”تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے،“۔ جواب میں کہا کہ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا^{۱۹} وَالْآمُرُ یَوْمَئِذٍ لِلّٰہِ (۱۸-۱۹)۔ جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کیلئے کچھ اقتدار و اختیار نہیں رکھیگا۔ اور تمام معاملات قانون خداوندی

کے مطابق فیصل ہونگے۔ اسی کے متعلق سورۃ فاتحہ میں مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جس دور میں انسانی زندگی آئین خداوندی کے مطابق بسر ہوگی۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی غلبہ و اقتدار نہیں ہوگا۔ غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا ہوگا۔ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو آئین خداوندی کے تابع حاصل ہوتی ہے!

دِیْن کے معنی عادت مستمرہ کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ دِیْن اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو عادتاً ہمیشہ ایک جگہ آ کر برستی ہو*۔ اس مفہوم میں بھی قانون اور ضابطہ کی شان جھلکتی ہے۔ خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) ملتا ہے۔ یہ قانون اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کا نام الدِّیْن ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے کو اَلْاِسْلَام کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں، نظام معاشرہ، ضابطہ زندگی، قانون حکومت آئین مملکت، عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے۔ اور وہ ہے الدین۔ یہی ہمارے معاشرہ کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے۔ اس آئین کی رو سے، انسانوں کی آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرنے کا پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوتا ہے۔ کسی اور کو نہیں ہوتا۔ اس لئے الدین میں اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) خدا کی ہوتی ہے۔ اس کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے بروئے کار آتا ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عملاً اقتدار اعلیٰ کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت، قرآنی اصولوں کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ (Agency) ہوتی ہے۔ اور چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار بھی یہی کتاب ہے، اس لئے جزا اور سزا (اعمال کے نتائج) بھی اس کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔ اس جہت سے دین کا یہ مفہوم (جزا و سزا) بھی عملاً سامنے آ جاتا ہے۔ اسے نظام عدل کہا جائیگا جس کا دائرہ صرف عدالتی عدل تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اسلامی مملکت کا کانسٹی ٹیوشن قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کا دوسرا نام ہے۔ اس مملکت کا تمام کاروبار انہی اصولوں کی حدود کے اندر سر انجام پاتا ہے۔ اور مقصود اس سے نظام عدل و توازن کا قائم رکھنا ہے۔ اس کا نام الدین ہے۔

لہذا، الدین سے مراد ہے خدا کا عطا کردہ نظام زندگی جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جس دور میں انسان اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لے آئینگے وہ تمام دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف قوانین خداوندی کے محکوم ہونگے۔ اس لئے کہ ”مالک یوم الدین“، خدا کے سوا کوئی اور نہیں۔ ہر وہ فیصلہ جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، دینی فیصلہ کہلائگا اور عدل کے محکم اصول پر مبنی ہوگا۔ سورۃ فاتحہ میں دیکھئے۔ خدا کی صفت ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کے ساتھ ہی اس کے نظام عدل و قانون (مالک یوم الدین) کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو سامان زیست اور اسباب نشو و نما تو بلا مزد و معاوضہ عطا کر دئے ہیں لیکن انسانی مدارج کا تعین، ان کے اعمال کی رو سے ہوگا۔ اس کا نام آئین و قوانین کے مطابق عدل کی زندگی ہے۔ اور یہ چیز حیوانیت سے آگے بڑھ کر، خاصہ انسانیت ہے۔

مَدْرِیْنَتَہٗ کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ دَرِیْن کے اس مفہوم سے بنایا گیا ہے جس کا تعلق نظم و نسق سے ہے۔ کیونکہ مَدْرِیْنَتَہٗ وہی مرکزی مقام ہوتا ہے جو شہری نظم و نسق کے محاسن رکھتا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اطاعت کے مفہوم کے اعتبار سے وضع ہوا ہے کیونکہ مَدْرِیْنَتَہٗ (شہر) میں قانون اور ضابطہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے*۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک یہ لفظ در اصل مَدْرِیْنَتَہٗ تھا، اور دَرِیْن سے مشتق۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دَرِیْن کے بنیادی معنوں میں اطاعت پائی جاتی ہے اور شہر کو مَدْرِیْنَتَہٗ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حکومت کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور قرض کو دَرِیْن اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقروض کو جھکنا پڑتا ہے۔

دَرِیْن - قرضہ - اور تَدَاوِیْن - ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا (۲۸۲) - دَرِیْن اس قرضہ کو کہتے ہیں جسکی ادائیگی کیلئے مدت مقرر کر لی جائے۔ جس قرض کیلئے مدت متعین نہ ہو وہ دَرِیْن نہیں بلکہ قَرْض کہلاتا ہے*۔ محیط المحيط میں، تاج کے قول کی تائید کے ساتھ، یہ بھی لکھا ہے کہ عرف عام میں دَرِیْن اس قرضے کو کہتے ہیں جو مدت معینہ کیلئے سود پر دیا جائے۔ لیکن قرآن کریم نے چونکہ ربو کو حرام قرار دیا ہے اسلئے اسمیں مسلمانوں کے باہمی لین دین میں دَرِیْن کا لفظ قرضہ بلا سود ہی کے لئے ہے (۲۸۲)۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلام کیلئے قرآن کریم نے دین کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ضابطہ حیات کے ہیں۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۱۸)۔ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِينًا (۵)۔ یہی اَلدِّينُ ہے جسے دیکر نبی اکرمؐ کو بھیجا گیا تھا۔ هُوَ الَّذِي ارْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹)۔ نیز (۳۸) ”خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین (نظام حیات) کو، دیگر تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے،۔ مَذْهَبٌ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اسلئے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہئے۔ دین ہی کہنا چاہئے۔ مَذْهَبٌ اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔ اور دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ملا ہو۔ (مَذْهَبٌ کے معنی کیلئے دیکھئے عنوان ذ۔ ہ۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ہیں لیکن دین میں فرقہ سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۲)۔ جو دین خدا کی طرف سے ملا تھا وہ سب کے لئے ایک ہی تھا۔ اس میں مختلف فرقوں کا کیا سوال؟ فرقے، مختلف انسانوں کے بنائے ہوئے راستے (مذہب) پر چلنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام سابقہ کے پاس خدا کا دین (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) آتا رہا لیکن انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو ضائع کر کے، ان کی جگہ انسانوں کے تراشیدہ راستوں کو اختیار کر لیا۔ اس طرح ان سے دین گم ہو گیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اسکی اصلی شکل میں قرآن کریم میں عطا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ یہی دین تھا جو اس مملکت کا آئین (Constitution) تھا جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس کے بعد، ہم نے، خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑے۔ اس طرح ہم نے بھی دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس نہج سے ہم بھی اقوام سابقہ کی سطح پر آ گئے۔ لیکن ہم میں اور ان میں ایک فرق ہے۔ ان کے پاس دین اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اس لئے وہ اپنے مذہب کو خدا کے عطا کردہ دین سے بدل نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس لئے ہم جسوقت بھی چاہیں اپنے مروجہ مذاہب کو دین خداوندی سے بدل سکتے ہیں۔ (اسی طرح دیگر اقوام عالم بھی چاہیں تو اپنے مذہب کو چھوڑ کر، قرآن کریم میں دئے ہوئے دین کو اختیار کر سکتی ہیں)۔ جب تک ہم ایسا نہیں کرتے، زندگی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

ذ

ذ ا

ذَا - یہ - اس کا مونث ذِہْ - ذِہِ - ذِہِیْ - تَا - تِیْ وغیرہ ہیں - اس کا تشبیہ (دو کے لئے) ذَا نِ اور ذِیْنِ - (مونث کے لئے تَا نِ - تِیْنِ) آتا ہے - اور جمع اُولَآءِ (دیکھئے عنوان اولاء) اس سے پہلے اکثر ہٹا سلا ہوا ہوتا ہے - جیسے ہٰذَا (اس کا مونث ہٰذِہِ آتا ہے) یہ اشارہ قریب کے لئے ہے - اشارہ بعید کے لئے ذٰلِکَ (مذکر) تِلْکَ (مونث) - اس کے آخر میں مخاطب کے مطابق ضمیر بدلتی رہتی ہے - مثلاً ہمارا مخاطب ایک مرد ہے اور ہم اُس سے کہہ رہے ہیں کہ اُس چیز کو دیکھو - تو ہم ذٰلِکَ کہہینگے - اور اگر مخاطب دو مرد ہوں تو ذٰلِکُمَا کہہینگے - بہت سے ہوں تو ذٰلِکُم - اسی طرح اگر مخاطب ایک عورت ہو تو ذٰلِکِ کہہینگے - اور بہت سی عورتیں ہوں تو ذٰلِکُنَّ کہہینگے -

ذَا کے مختلف استعمال یہ ہیں - ذَاکَ - ذَاۓکَ - (ہَاتَاکَ - ہَاتِیْکَ) - جمع کے لئے اُولَآکَ یا اُولَئِکَ - کبھی ذَاکَ کے درمیان ل - لا کر، ذٰلِکَ (مونث کے لئے تِلْکَ) بنا لیتے ہیں - اس سے پہلے کاف آنے سے کَذٰلِکَ ہو جاتا ہے - اس کے استعمال کی مثالیں یہ ہیں -

(۱) مَن ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہُ..... (۲۵۵) - وہ کون ہے جو اس کے ہاں کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے -

(۲) یَسْأَلُوْۤنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ..... (۱۲۵) - تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے جسے کھلا رکھا جائے -

(۳) اِنْ هٰذَا نِ لَسٰحِیْرَ اَنْ..... (۲۳) - یہ تو بس دو جادوگر ہیں -

(۴) ذٰلِکَ الْکِتٰبُ..... (۲) - یہ وہ کتاب ہے... تِلْکَ اُمّۃٌ قَدْ خَلَتْ (۱۴۱) - یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی -

(۵) فَذَٰلِكَ بِرُّ هَٰئِنِ... (۲۸/۳۴)۔ یہ دونوں روشن دلیلیں ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ذَٰلِكَ اشارہ بعید (وہ) ہے لیکن یہ اشارہ قریب (یہ) کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں ذَٰلِكَ اشارہ قریب (یہ) کے لئے زیادہ اور اشارہ بعید (وہ) کے لئے کم آیا ہے۔ مثلاً سورۃ روم میں فِطْرَتَ اللّٰهِ التَّتٰی فِطْرَ النَّفَاسِ عَلَیْہَا۔ لَا تَبْدِلُ لِیْخَلُقِ اللّٰہ کے بعد ہے ذَٰلِكَ التَّدْرِیْنِ الْقَسِیْمِ (۳۰/۳۳)۔ یہی دینِ قسیم ہے۔ یا مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ماپ تول کے متعلق ضروری ہدایت کے بعد فرمایا ذَٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۱۶۵/۱) ”یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے“۔ ان مقامات میں ذَٰلِكَ اشارہ قریب کے لئے ہے۔

اس کے برعکس سورۃ کھف میں جہاں حضرت موسیٰؑ کے ایک سفر کا ذکر ہے وہاں (اس مقام پر جہاں آپ کا ساتھی مچھلی پیچھے بھول آیا تھا) کہا کہ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ (۱۸/۱۶) ”وہی توجگہ تھی جسکی ہمیں تلاش تھی“۔ یہاں ذَٰلِكَ اشارہ بعید کے لئے ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ ذَٰلِكَ آتا تو ہے بعید کے لئے لیکن اس سے بُعْدِ مسافت ہی مراد نہیں۔ جوشے بلندی مرتبت کی وجہ سے اونچے مقام پر ہو اور یوں دور ہو، اس کے لئے بھی ذَٰلِكَ آتا ہے خواہ وہ چیز ویسے قریب ہی رکھی ہو۔ اسی اعتبار سے ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (۲/۲) کے معنی ہونگے یہ کتاب جو بڑی باعظمت اور رفیع الشان ہے

ذَٰلِکَ الْکُفْلِ

قرآن کریم نے آپ کا نام انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں لیا ہے (۲۱/۸۵ و ۳۸/۳۸) لیکن مزید تعارف نہیں کرایا۔ قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ک۔ ف۔ ل)

ذَٰلِکَ النُّونِ

حضرت یونسؑ کا لقب ہے (۲۱/۸۵)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ”یونس“ اور ”نون“۔

ذ اب

الذَّئِبُ - بھیڑیا (۱۲/۱۲) - الذَّأْبُ - ڈرانا۔ مذمت کرنا۔ سخت آواز*۔ بدزبانی - ذَا أَبَ الرَّجُلِ - آدمی زور سے چیخا**۔ ابن فارس نے کہا ہے

کہ اس کے بنیادی معنی کم ٹھہرنا ، بے قراری ہیں ۔ نیز کسی چیز کی ایسی حرکت جو ایک سمت سے نہ ہو ۔ مثلاً تَذَابَّتِ السَّحَابُ يَمُوحُ کے معنی ہیں ہوا ہر طرف سے آئی ۔ بھیڑئیے کو ذِئْبٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک طرف سے آتا ہے کبھی دوسری طرف سے ۔

ذ ا م

ذَا مَہ - يَذُّوْا مَہ - کسی کو حقیر و مذسوم گردانا ۔ نیز اس کے معنی عیب لگانے ، رسوا کرنے ، کے آتے ہیں ۔ کسی کو جھڑک کر نکال دینے کے بھی * ۔ رَاغِبٌ لِّمَذُوْمٍ بمعنی مَذُوْمٌ لکھا ہے ۔ اَذُوْا مَہ - اسے مرعوب و خوفزدہ کر دیا * ۔

قرآن کریم میں ابلیس کے متعلق ہے ۔ قَالَ اخْرِجْ مِنْهَا مَذُوْعًا وَ مَذُوْرًا (۱۸) ۔ اس کے معنی ذلیل اور حقیر ہی کے ہیں ۔ یا جھڑک کر نکالے ہوئے کے ۔

ذ ب ب

ذُبَابٌ - مکھیاں ۔ واحد ذُبَابَةٌ ۔ صاحب محیط نے جاحظ کے حوالے سے لکھا ہے کہ (عام مکھیوں کی جملہ اقسام کے علاوہ) عربوں کے ہاں ذُبَابٌ کا اطلاق ہر قسم کی بھڑوں، شہد کی مکھیوں اور مچھروں پر بھی ہوتا ہے ** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَنْ يَخْلُقُوْا ذُبَابًا (۲۲) ۔ ”وہ مکھی بھی نہیں پیدا کر سکیں گے“ ، ۔ مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں ہٹایا اور دور کیا جاتا ہے ۔ یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ہوتا ۔ اس مادہ میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب و حرکت کے بھی ہیں ۔ رَاغِبٌ نے لکھا ہے کہ اَلتَّذَبُّدُ بَتَةٌ مَعْلَقٌ شَيْءٍ كَيْفَ هَلْنِیْ كِیْ اَوَازِ كُو كِهْتِیْ ہِیْ ۔ پھر، یہ لفظ ہر حرکت و اضطراب (تردد اور ڈھل مل یقینی) کے لئے آتا ہے *** ۔ بَعِیْرٌ ذَابٌ ۔ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ایک جگہ پر کھڑا نہ رہے **** ۔

ذَبْذَبَةٌ ۔ اگرچہ یہ لفظ ذ ب ذ ب کے تحت آنا چاہئے لیکن بعض اہل لغت نے اسے ذ ب ب کے تحت لکھا ہے ۔ ہر دو میں اشتراک معنی کی وجہ سے ہم بھی اسے یہاں (ذ ب ب کے تحت) درج کر رہے ہیں ۔ قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ہے مَذَبْذَبٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَالِکَ (۱۳۳) اور

اسکی تشریح یہ کہہ کر دی ہے۔ لَا اِلٰی هٰوَعٌ لَا عِ وَلَا اِلٰی هٰوَعٌ لَا عِ (۱۳۳/۱)۔ نہ یکسو ہو کر ادھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲/۱)۔ جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ ادھر فائدہ دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ اُدھر دیکھا تو اُدھر جھک گئے۔ مکھی کی طرح، کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے اس کے بعد اڑ کر کہاں جا بیٹھیگی۔ یہ کیفیت، ایمان اور یقین کی یکسر نقیض ہے۔ ایمان کی کیفیت تو یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبَّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۳۱/۳)۔ ایک مرتبہ خدا کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ ایمان اور استقامت، یہ ہے مومن کا شعار۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

خ ب ح

ذَبَحَ - يَذْبَحُ - اندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑے سے حلق کاٹ دینا - چیر دینا - پھاڑ دینا - شق کر دینا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ذَبَحَتْهُ الْعَبْرَةُ - آنسوؤں نے اسکا گلا گھونٹ دیا - اَلْتَّذْبِيحُ - بہت زیادہ ذبح کرنا - سر کو اسقدر جھکا دینا کہ وہ کمر سے نیچا ہو جائے - اِلِذْبِيحُ - وہ چیز جو ذبح کی جائے* -

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون یُذَبِّحُوْنَ
 اَبْنَاءَ کُتْمٍ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَ کُتْمٍ (۲۹) و دیگر مقامات)۔ ”تمہارے
 اپنا کو ذبح کر دیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے،،۔ عام طور پر اس
 سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل
 کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو
 زندہ رکھا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ سے مراد سچ سچ ذبح کر
 دینا ہے یا اس کے معنی کچھ اور بھی ہیں۔ سورۃ اعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی
 جگہ یُقَتِّلُوْنَ آیا ہے (۱۴۱)۔ یعنی وہ تمہارے اپنا کو قتل کر ڈالتے
 تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے اس
 باب میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں
 دیکھنا یہ ہے کہ قَتْلٌ کے معنی کیا ہیں۔ اس لفظ کے متعلق عنوان
 ق۔ ت۔ ل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ اس کے

معنی صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اس کے معنی ذلیل و خوار کرنا۔ کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا۔ ایسا بنا دینا کہ اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو۔ کسی کو حقیر کر دینا، بھی ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی کو علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہیں۔ (ان معانی کی اسناد ق۔ ت۔ ل کے عنوان میں ملیں گی)۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذَبْحٌ یا قَتْلٌ سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل و حقیر کرنا اور کمزور و غیر مؤثر بنا دینا ہیں۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ہیں۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کے تمام لڑکے مار دئے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ہی ختم ہو جائیگی*۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی (حضرت ہارونؑ) بھی زندہ موجود تھے۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی پیدا ہوتے ہی مار نہیں ڈالے گئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار نہیں دیا کرتے تھے۔

(۳) سورۃ یونس میں ہے کہ فَمَا اٰمَنَ لِمُوسٰی اِلَّا ذُرِّۙۤیَّتَہٗۤ سِنٌ قَوْمِہٖ (۱۰/۸۳) ”موسیٰؑ پر اس کی قوم کی ذُرِّۙۤیَّتٌ ایمان لائی،،۔ ذریت نئی پود (یا نو جوانوں) کو کہتے ہیں۔ (دیکھئے ذ۔ ر۔ ر)۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ہی نہ ہوتی۔ (قوم کے نو جوانوں کے ایمان لانے کی وجہ سمجھنے کے لئے عنوان ذ۔ ر۔ ر۔ دیکھئے)۔

(۴) جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے ہیں تو اس نے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اس قدر احسانات کئے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رہا ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنَّۤ لَہَا عَلٰیۤ اَنْ عَبَّۤدْتُۤ اَبْنٰیۤ اِسْرَآئِیْلَ (۲۶/۲۶)۔ ”یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ہے،،۔ آپ دیکھئے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے خلاف جو الزام عائد کیا ہے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ہے۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ہوتا تو آپ سب سے پہلے اس کا ذکر

* بعض تفاسیر میں ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوے ہزار بچوں کو قتل کیا تھا۔

کرتے کیونکہ یہ جرم، قوم کو غلام (محکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جائیے۔ حضرت موسیٰؑ نے کسی جگہ بھی فرعون اور اسکی قوم کو اس جرم سے مطعون نہیں کیا۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اسکی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سیچ سیچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے۔ یعنی انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰؑ کو صندوق میں ڈال کر دریا میں کیوں بہا دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسوقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو محفوظ رکھنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اسکی تصریح موجود ہے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے*) اُسوقت دیا تھا جب حضرت موسیٰؑ اپنی دعوتِ انقلاب لیکر آئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھ کر فرعون کے امیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ انکے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اسطرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ یہ جوجی میں آئے کرتے جائیں؟ اسکے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں! میرے سامنے ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ سننقتیل* ابناء ہم* ونستحیی نساء ہم* (۱۲۰)۔ ”عنقریب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور انکی عورتوں کو زندہ رکھیں گے“۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اسوقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت پھیلی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا۔ سورۃ المؤمن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت لیکر گئے تو اسنے کہا کہ اُقتُلُوا ابناء الذین آمنوا معہ واستحیو نساء ہم* (۳۵)۔ ”جو لوگ موسیٰؑ پر ایمان لائیں انکے بیٹوں کو قتل کر دو اور انکی عورتوں کو زندہ رکھو“۔ اس سے نہ صرف یہی واضح ہے کہ یہ حکم دعوت حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں دیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ یہ

*جب تک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ہو جاتا ہم یہی الفاظ لکھتے جائیں گے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ۔

حکم تمام بنی اسرائیل کیلئے نہیں تھا۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے*۔

ان شواہد سے واضح ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا۔ لہذا جب یہ حکم ہی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اسلئے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا۔ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رہا ہوگا۔ لیکن اسکے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کو محکوم قوم کا درجہ دیدیا ہوگا۔ اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی لیکن اُس زمانے میں تو محکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ہوتی تھی۔ نہ انکے بچوں کیلئے تعلیم و تربیت کے کوئی مواقع ہوتے تھے، نہ بڑوں کیلئے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے ساتھ ڈکر لینے کیلئے پیدا کیا گیا تھا۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ انکی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہوتی اور انہیں رموز مملکت اور غوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ہوتے۔ اس مقصد کیلئے تجویز یہ کیا گیا کہ انکی پرورش خود فرعون کے محلات میں ہو اور انکا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبنی کی حیثیت سے گزرے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کیلئے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰی عَيْنِي (۲۹) ”تا کہ تیری تربیت ہماری زیر نگرانی ہو،“۔ یعنی اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔ اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جسکے مطابق حضرت موسیٰؑ کو اس مہم کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس سے ذرا آگے ہے۔ ثُمَّ جِئْتُ عَلٰی قَدَرٍ يٰمُوسٰی (۳۱)۔ ”اسطرح آہستہ آہستہ تم، اے موسیٰ، ہمارے پیمانے پر پورے اتر آئے،“۔

* یہ بات آگے چلکر بتائی جائیگی کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے انکے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا۔ انکے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا؟۔

سورۃ القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں سے کہا گیا کہ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ^۳ (۲۸)۔ ”تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ۔ اور جب تجھے اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا،“۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کو قتل کر دینگے۔ لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زمانے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا۔ اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑ لیا تو اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوْهُ^۴ (۲۹) ”اسے قتل نہ کرو،“۔ اسے ہم متبنیٰ بنا لیتے ہیں۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے۔ قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں۔ لہذا یہاں لَا تَقْتُلُوْهُ کے معنی قتل کرنا نہیں ہونگے بلکہ حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے ہونگے۔ (دیکھئے عنوان ق۔ ت۔ ل)۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ يَذَّبُحُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ^۵ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَهُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت عام ہو رہی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔ چنانچہ فرعون کے ارباب حل و عقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کو کب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائیگا۔ اس کا کچھ علاج کرنا چاہئے (۱۳۷) تو اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے۔ ہم اس پر عمل پیرا ہونگے۔ اور وہ تجویز یہی (قتل ابناء کی) تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو كَيْدٌ^۶ (۳۵) سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی ہیں ایک گہری چال۔ یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورۃ قصص میں ہے کہ وَجَعَلَ اٰهْلَهَا شِيْعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ^۷ (۳۸)۔ ”وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا“۔ اس کے بعد ہے يَذَّبُحُ اَبْنَاءَهُمْ^۸ وَ يَسْتَحْيِيْ نِسَاءَهُمْ^۹ (۳۸)۔ یعنی ان کے اَبْنَاء کو ذبح کرتا تھا اور نِسَاء کو زندہ رکھتا تھا۔ اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا جائے تاکہ اُس قوم میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ باہمی آویزشوں میں الجھی رہے۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم، قومِ محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے۔ جن کے متعلق وہ سمجھتا کہ اُن کا اُبھرنا خطرناک ہے۔ انہیں دباتا۔ اُنہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا۔ اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں، اُنہیں ابھار کر معزز و مقرب بنا لیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا۔ یہ کچھ بھی ہر ماسر سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوہرِ مردانگی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو، آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے اَبْنَاءَ کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَاءَ۔ اور قَتْلِ اَبْنَاءَ سے مراد ہے انہیں ذلیل و حقیر رکھنا۔ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاءَ سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو کمزور کئے جا رہا تھا۔

قرآن کریم کے شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قَتْلِ یَا ذَبْحِ اَبْنَاءَ سے یہی مراد ہے۔ لیکن بہر حال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرعون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے اَبْنَاءَ کو قتل کر دیا جائے (۲۵)۔ یعنی اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے پھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنا دی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہو سکتا ہے انہیں ایسا غیر موثر بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے (قَتْلِ کے یہ معنی عنوان ق۔ ت۔ ل میں دیکھئے)۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ، اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربارِ فرعون کے ساحرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔

بہر حال، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآنی شواہد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْحِ اَبْنَاءَ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاءَ کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں۔ سچ سچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دئے گئے ہیں۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْحِ ابْنِ سَاءِ کو حقیقی معنوں میں لیا جائیگا۔ یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا۔ اسوقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جسقدر پردے اٹھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔ اسوقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مار ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

سورة مائدہ میں ان جانوروں کو جو بتوں کے استھانوں پر قربانی دئے جاتے تھے مَذْبُحٍ عَلٰی النَّصِيبِ (۵/۳۰) کہا ہے۔

سورة صافات میں حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے آپ کو اس طرح قربان کر دینے کیلئے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دیکر اس سے روک دیا اور وَقَدْ يَنْهٰ بِذَبْحِ عَظِيْمٍ (۱۰۸/۳۰)۔ ”اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا،۔ جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے کہ انہیں شام کے سرسبز و شاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ و گیاه سر زمین میں خانہ کعبہ کی تولیت کیلئے متعین کر دیا۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کیلئے تھی۔ نہ صرف اپنی ماری عمر کے لئے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی۔ وَ تَرَكُنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنِ (۱۰۸/۳۰) اسلئے یہ ذبح عظیم تھی۔ یعنی بہت بڑی قربانی۔ (مزید تفصیل میری کتاب ”جوئے نور“ میں ملیگی۔ اور بنی اسرائیل کے حالات ”برق طور“ میں)۔

ذ خ ر

ذَخَرَ - يَذْخَرُ - کسی چیز کو لئے لینا۔ اپنا لینا۔ کسی چیز کو اسلئے چھپا رکھنا کہ وہ بوقت ضرورت کام آئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سمیٹ لینا۔ اِدْخَرَ اِدْخَارًا باب افتعال سے بمعنی ذَخَرَ ہی ہے۔ (اِدْخَارًا اصل میں

اِذْ تَخَارَا تَہَا) - اَلْمُدَّخِرُ - اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑنے میں اپنی پوری پوری طاقت خرچ نہ کرے بلکہ کچھ طاقت بچا رکھے * - اَلْمُدَّخِرُ - قربہ - موٹا ** -

سورة آل عمران میں ہے مَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (۳۸)۔ اس کے معنی ذخیرہ کرنے کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ (خدا کے ایک سچے داعی انقلاب ہونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے۔ اس میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ذ ر ا

ذَرَأَ الْاَرْضَ - زمین میں بیج ڈال دیا * - ذَرَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ - اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بڑھایا - کثیر کر دیا * - چنانچہ قرآن کریم میں ہے - يَذْرُؤُكُمْ فِيْهِ (۲۲) - ”وہ اس طرح تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا رہتا ہے،، - سورة المؤمنون میں ہے هُوَ الَّذِيْ ذَرَأَكُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳) - ”وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں بڑھایا اور پھیلایا ہے،، -

ذُرِّيَّةٌ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ یہ ذَرَأَ سے مشتق ہے - لیکن بعض کے نزدیک یہ ذَرَّ سے مشتق ہے - ہم نے اسے (ذ - ر - ر) کے نیچے لکھا ہے -

ذ ر ر

الذَّرُّ - بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو دھوپ میں منتشر نظر آتے ہیں - الذَّرُّ کا واحد ذَرَّةٌ ہے - نہایت چھوٹی اور کم وزن چیز کو بھی اسی جہت سے ذَرَّةٌ کہا جاتا ہے - سورة زلزال میں مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۹۶) آیا ہے - ذرہ کے وزن برابر - یعنی خفیف سے خفیف - ذَرٌّ - کسی چیز کو چھڑکنا - متفرق کرنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باریکی اور انتشار ہوتے ہیں - ذَرَّ الْمِلْحَ عَلٰی اللَّحْمِ - اسنے گوشت پر نمک چھڑکا - ذَرَّ الْحَبَّ فِي الْاَرْضِ - اسنے زمین میں بیج بکھیر دیا * -

الذَّرِّيَّةُ - الذَّرِّيَّةُ - آدمی کی اولاد اور نسل، خواہ نر ہو یا مادہ - لیکن کبھی اسکا اطلاق انسان کے والدین اور آبا و اجداد پر بھی ہوتا ہے - یعنی یہ لفظ اجداد میں سے ہے * - (اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائیگا) -

راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنی تو چھوٹے بچے ہیں لیکن یہ کبھی چھوٹے اور بڑے سب بچوں پر بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہے تو جمع ہی کیلئے لیکن پھر واحد اور جمع سب کیلئے یکساں آتا ہے۔ بعض کے نزدیک ذُرّ ۳ یثّۃ کا مادہ ذرّا ہے۔ جسکے معنی پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہیں۔ (لین)۔

ذَرَّ الْبَقْلُ - سبزی پھوٹی *

قرآن کریم میں ذُرّ ۳ یثّۃ بمعنی اولاد اور نسل (۱۲۳) میں آیا ہے۔ سورة یٰسین میں جہاں کہا ہے کہ اِنَّا حَمَلْنَا ذُرّ ۳ یثّۃہُمْ فِی الْفُلْکِ (۳۶)۔ ”ہم نے ان کی ذریت کو کشتی میں سوار کیا“۔ تو وہاں ذریت کے معنی (اس نسل کے) چھوٹے بڑے سب ہیں۔ اس آیت (۳۶) ہی کی وجہ سے اہل لغت نے الذّرّ ۳ یثّۃ میں اولاد اور آباء کے معنی تسلیم کئے ہیں اور اسی بناء پر یہ لفظ اضداد میں مانا گیا ہے، لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کہیں بھی آباء کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ آباء کے بالمقابل اولاد کے لئے ہی استعمال ہوا ہے (۸۸)۔ مذکورۃ الصدر آیت (۳۶) میں بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ذُرّ ۳ یثّۃ اولاد ہی کے لئے ہے، جبکہ ہم الفلک اَلْمُشْحُوْن سے مراد حضرت نوحؑ کی ایک معین کشتی لیں جو وحی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی اور ذرّ ۳ یثّۃہُمْ سے مراد اُس زمانہ کے انسانوں کی نسل لی جائے۔ اس طرح اس لفظ میں متضاد معانی باقی نہیں رہینگے۔

سورة یونس میں ہے فَمَا اَمِّنَ لِمُؤَسٰی اِلَّا ذُرّ ۳ یثّۃ مِّنْ قَوْمٍ۔ (۱۳۱)۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں بہت تھوڑے لوگوں نے ***۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں اسکی قوم کے نوجوان ****۔ ہمارے نزدیک دوسرے معنی زیادہ واضح ہیں۔ انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ہیں۔ پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے، یا نئے ماحول سے مطابقت، کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ قوم کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے جو ظلم و استبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ کرتے ہوئے، دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ۔ ب۔ ح)۔

ذرع

أَلِذَّ رَاعٌ - ہاتھ کا کہنی سے لیکر درمیانہ انگلی کے آخر تک کا حصہ۔
 کلائی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، نیز ایک پیمانہ جس سے ناپا جاتا ہے*۔ سورۃ
 کہف میں ہے وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (۱۸)۔ ”ان کا کتا اپنے دونوں
 ہاتھ (یعنی اگلی ٹانگیں) بچھائے ہوئے تھا،،۔ ذِرْعُهُ كَذَا - اسکا طول
 اسقدر ہے**۔ ذِرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا (۶۹)۔ ”اسکی پیمائش ستتر ہاتھ
 ہے،،۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا لمبا
 ہونا اور آگے کی طرف حرکت کرنا۔ مَالِيٌ بِهِ ذِرْعٌ - مجھے اسکی دسترس
 نہیں*۔ ضِيقْتُ بِهِ ذِرْعًا - کسی کام کی دسترس نہ رکھنا۔ سورۃ ہود میں
 حضرت لوطؑ کے متعلق ہے ضَاقَ بِهِمْ ذِرْعًا - (۱۱)۔ اسنے ان کے معاملہ
 میں اپنے آپکو کوتاہ دست پایا۔

الذِّكْرُ يُعْتَمَدُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو شکار کیلئے بطور آڑ
 استعمال کی جاتی ہے*۔ نیز ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کے توسط سے مقصد
 تک ہاتھ پہنچ سکے۔

ذرو

ذَرَّتِ الرِّيحُ الشَّيْءَ ذَرُوءًا - ہوا اس چیز کو اڑا کر لے گئی۔
 ذَرَا الْجِنِّطَةِ يَذُرُوهَا ذَرُوءًا - اسنے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے
 کے لئے ہوا میں اڑایا۔ فَتَذَرَّتْ - پس گیہوں بھوسے سے الگ ہو کر صاف
 ہو گیا۔ ذُرَاوَةُ النَّبْتِ - پودے کے جھڑے ہوئے خشک اجزاء جو ہوا
 میں اڑ جائیں۔

ذُرُوءَةُ الشَّيْءِ - چیز کا بلند تر اور اونچا حصہ*۔

سورۃ کہف میں ہے تَذَرُوهُ الرِّيحُ (۱۸)۔ ”ہوائیں اسے اڑائے
 اڑائے پھرتی ہیں،،۔ سورۃ ذاریات میں ہے - وَالَّذِي يَتَذَرُوهَا - (۵۱)۔
 ذَرُوءٌ - پھیلا دینا۔ بکھیر دینا۔ ذَارٍ (الذَّارِي) بکھیر دینے والا، پھیلا
 دینے والا (نشرو اشاعت کرنے والا)۔ وہ قوتیں جو کسی پیغام (یا نظام) کی
 نشرو اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے۔ ذرائع
 رسل و رسائل و مواصلات و نشرو اشاعت۔

* تاج - ** محیط - * تاج و راغب -

ذ ع ن

أَذُّعَنَ - اطاعت میں جلدی کرنا - دوڑ کر حکم کی تعمیل کرنا -
نَاقَتَةٌ مِذُّعَانٌ - مطیع اونٹنی - مِذُّعَيْنَيْنِ (۲۳/۹) لپک کر اطاعت کرنے
والے * - أَذُّعَنَ لَهُ - اس کے لئے جھکا اور اس کا تابع فرمان ہوا ** -

صاحب محیط نے آلا ذُّعَانُ کے اصطلاحی معنی بتاتے ہوئے لکھا
ہے کہ الا ذُّعَانُ اعتقاد یعنی دلی عزم کو کہتے ہیں - اور عزم، تردد کے
بعد ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں - اذُّعَانُ کے مختلف مراتب ہوتے
ہیں جن میں سے ادنیٰ ترین کو ظن اور اعلیٰ ترین کو یقین کہا جاتا ہے -
اور ان دونوں کے درمیان تقلید اور جہل مرکب کا مرتبہ ہوتا ہے ** -

ذ ق ن

الذَّقَنُ - ٹھوڑی * - جمع أَذْقَانٌ - (۳۶/۸) - مجازاً چہرے کو بھی
کہہ دیتے ہیں - جیسے يَخْرِقُونَ لِيْلَاءَ ذَّقَانٍ سَجْدًا (۱۰۰/۱) میں منہ کے بل
گرنے کیلئے یہ لفظ آیا ہے -

ذ ک ر

أَلِذَّكَرٌ وَالتَّذَّكَرُ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - کسی بات کا
دل میں حاضر کر لینا - یہ لفظ نَسِيَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶۱/۸) - نَسِيَ
کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا - لہذا ذِكَرٌ کے معنی ہوئے
کسی بات کو یاد کرنا -

إِدَّةٌ كَرَّةٌ - اِسْتَدَّ كَرَّةٌ - تَذَكَّرَهُ - کے عام معنی ہیں کسی بات
کو یاد کر لینا - لیکن ابواب کے خواص کے لحاظ سے ان کے مفہوم میں
لطیف سا فرق ہے -

التَّذَكُّرُ كِرَةٌ - جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے - (۳۹/۶)
أَلِذَّكَرُی (۶۱/۱) یاد دہانی -

ذَكَرَ حَقَّقَهُ - اس کے حق کی حفاظت کی اور اس کو ضائع نہیں کیا -

أَذُّكَرُوا نِعْمَةً اللّٰهِ عَلَیْكُمْ - تم پر جو خدا کے احسانات ہیں
انکی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو * -

شہرت کو بھی ذِکْرُ کہتے ہیں۔ نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی۔ اور شرف و عزت کو بھی۔ اور عبرت و موعظت کو بھی۔ ذِکْرُ اُس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں*۔

الَّذِکْرُ۔ قوی اور شجاع مرد۔ تلوار کی تیزی اور سختی کو بھی کہتے ہیں*۔ نیز نر، بمقابلہ الانثیٰ (۳۵) میں آیا ہے۔

مُذْکِرٌ۔ مؤنث کی ضد ہے۔ نیز سخت مصیبت جس کا مقابلہ مرد ہی کر سکیں*۔

قرآن کریم کو الذِّکْرُ کہا گیا ہے (۱۶)۔ کیونکہ اسمیں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی۔ اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُونَ (۱۳) کہا گیا ہے۔ نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکْرُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جدوجہد جنہیں انہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ (۲۴ و ۲۵)۔ اسلئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اس طرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکْرُ کہا گیا ہے (۳۵)۔ اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں، حتیٰ کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔ خود قوانین خداوندی ذِکْرُ اللہ (۳۹) ہیں۔ شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳) میں آیا ہے۔ نیز (۳۳) میں، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِیَقَوْمٍ مِّکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو۔ سورۃ قمر میں مُذْکِرٌ آیا ہے (۱۵)۔ سورۃ دھر میں جہاں آیا ہے کہ انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمْ یَسْکُنْ شَیْئاً مَّذْکُورًا (۶)۔ تو اسمیں مَذْکُورًا کے معنی ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آگئی ہو اور قائم ہو**۔ (Existing by Itself)۔

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْکُرْ وَنْیْ اَذْکُرْ کُمْ (۱۵۲)۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا۔ تم

ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ (یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اسکا جواب دیتا ہے۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے)۔ لہذا ذکر اللہ کے معنی قوانین خداوندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ گنتے رہنا)۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لئے جاننا، ذکر اور تسبیح ہے۔ (تَسْبِيْحٌ کیلئے دیکھئے س۔ ب۔ ح کا عنوان)۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت و موعظت حاصل کرنا ذکر ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشر و اشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ”ذکر اللہ“ ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (۱۳۸)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ”سچے“ کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کس طرح رہیں؟ سچا اطمینان، علی وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آ جانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق و صداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ سچا اطمینان، جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہوا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی (۱۳۵)۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا۔

ذک و

ذکاء کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا مکمل ہو جانا۔ خلیل نے کہا ہے کہ الذکاء فی السین۔ عمر کے پختہ ہو جانے کو کہتے ہیں جب انسان کی قوتیں کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی اعتبار سے الذکاء ذہانت اور فطانت کی تیزی اور تکمیل کو کہتے ہیں۔ ذکر کی تیز فہم۔

بڑا ذہین۔ ذَکَّتِ النَّارُ۔ آگ بھڑک اٹھی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تیزی اور نفوذ کے ہوتے ہیں۔

الَّتَذُّ كَيْتَةً کے معنی جانور کو ذبح کر دینے کے ہوتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی حرارت غریزی نکال دینے کے ہوتے ہیں*۔ (ذَکَّتِ النَّارُ کی جہت سے)۔ باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہوتا ہے۔ یہ اس کی مثال ہے۔ یعنی ذَکَّاءٌ کے معنی حرارت۔ اور ذِکِّیُّ کے معنی حرارت نکال لی۔ سلب کر لی۔ اسی کو سلب ساخذ کہتے ہیں۔ یعنی لفظ کے سادہ کی جو خصوصیت ہو اسے سلب کر لینا۔ قرآن کریم میں ہے اِلَّا مَآذَکَیَّتُمْ (۵/۳۰)۔ ”بجز اس کے جسے تم ذبح کر لو“۔

ذ ل

ذِلَّةٌ۔ ذَلَالَةٌ کے معنی ہیں کسی کی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔ راغب نے الذِّلَّ ذُلٌّ۔ زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہا ہے اور الذِّلُّ اس جھکنے کو کہتے ہیں جس میں طبیعت کی تیزی و سختی از خود مغلوب ہو جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ذُلُّ کسی غیر کے دباؤ اور جبر سے نہ ہو تو یہ مذموم صفت نہیں رہتی۔ ذَلُّوا۔ (جمع ذُلُّوا) جو تابع فرمان ہو جائے اور منہ زور نہ رہے*۔ سورۃ بقرہ میں ہے اِنْتَهَا بِقَرَّةٍ لَا ذَلُّوا (۲/۱۶) ”وہ ساندھے جسے ہل میں نہیں جوتا گیا“۔ عِیْرُ الْمَذَلَّةِ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کے اوپر بوجھ لدا ہو اور پیچھے سے لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہو**۔ اس سے ذِلَّت کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

ذُلُّ الْکَرَمِ تَذْلِيلٌ کے معنی ہیں انگور کے خوشے نیچے جھکا دیئے گئے*۔

قرآن کریم میں تَذْلِلُ، تَعِزُّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵/۳)۔ اور وہیں ان دونوں لفظوں کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یعنی عِزَّت کے معنی ہیں حکومت اور مملکت مل جانا۔ غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانا۔ اور ذِلَّت کے معنی حکومت و مملکت کا چھن جانا۔ غلبہ و اقتدار کا کھو جانا۔ سورۃ یس میں موشیوں کے متعلق ہے فَهَمُّ لَهَا مَالِکُوْنَ۔ وَذَلَّلْنَاهَا (۱/۳۶)۔ انسانوں کو ان پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے۔ انہیں انسانوں کا مطیع

و فرماں بردار بنا دیا ہے۔ سورۃ طہ میں نَزَّلَ وَ نَخَزَىٰ (۲۰/۱۳۳)۔ ذلت و رسوائی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ میدان جنگ میں کمزوری کیلئے یہ لفظ (۱۳۳/۱) میں آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ (۵/۵۴)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں اَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ کے معنی رُحَمَاءَ بَيْنَتِهِمْ (۲۸/۲۹) ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلہ میں سخت۔ جَنَاحَ الذَّلِيلِ (۱۴/۱) نرمی تواضع اور مہربانی کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم نے ذلت و مسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے۔ (۲۱/۴)۔ یہ ذلت اسی دنیا کی ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (۱۵۲/۱)۔ اس کے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ و اقتدار اور قوت و سطوت کی زندگی ہے۔ وَاللَّهُ الْعِزَّةُ وَالرَّسُولُ، وَاللَّهُمُّوْمِنِينَ (۶۳/۸)۔ ”غلبہ و اقتدار اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعت مومنین کے لئے ہے“۔ مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (۱۳۸/۳)۔ سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔ حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (۵۵/۲)۔ لہذا جس زندگی میں غلبہ و اقتدار اور شوکت و حشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ وَخُزِرَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبِ اللَّهِ (۲۱/۴) ”ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے“۔ اس دنیا کو اغیار کے حوالے کر کے، بیکسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو ”روحانی ترقی“ حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔ قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت و اقتدار سرفرازی و سربلندی۔ شوکت و حشمت۔ دولت و قوت۔ حکومت و سطوت کی زندگی، ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ذلت و خواری، محکومی و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہو سکتا۔ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى (۲۳/۱)۔ ”جو ہمارے قانون سے اعراض برتیگا تو اسکی روزی تنگ ہو جائیگی اور ہم

اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائینگے۔“ یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

ذ م م

ذَمَّہُ - يَذُمُّہُ - ذَمًّا - مَذَمَّةٌ - مَذْحٌ کی ضد ہے۔ برائی کرنا۔
اسْتَذَمَّ - اسنے قابل مذمت کام کیا۔ بِہِ ذَمِّمَتَہُ - اسے کوئی ایسا عارضہ یا آفت لا حق ہے جسکی وجہ سے وہ باہر نہیں نکل سکتا* - مَذْمُومٌ (۶۸/۳۹) میں انہی معانی میں آیا ہے۔

ذِمَّةٌ - ہر وہ ذمہ داری - معاہدہ - قول و قرار جسکے ضائع کر دینے سے مذمت لازم آتی ہو** - جس عہد وغیرہ کے توڑ دینے پر انسان کی مذمت کی جاتی ہو***۔

آلِ ذِمَّةٍ - امان - کفالت - ضمانت - ذِمِّیٌّ - وہ آدمی جسے عہد حاصل ہو۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی گئی ہو۔ جسے ہر طرح کی ضمانت دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم میں ہے لَا يَرْقَبُوا فِيكُمْ إِلَّا وَّ لَا ذِمَّةٌ (۹/۸) ”یہ کسی حق اور حرمت - عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے،، - (اسکی تشریح کیلئے عنوان ال ل دیکھئے)۔

ذ ن ب

الذَّنْبُ - دُمٌ - ذَنْبٌ - وہ اسکے (دُم کے) پیچھے پیچھے رہا۔
مُسْتَذْنِبٌ - اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹوں کی دموں کے پیچھے پیچھے رہے۔ آلِ الذَّنْبِ - ہر چیز کا پچھلا حصہ نیز اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی دم کو کجاوہ سے باندھ دیا جائے۔ اس جہت سے اس مادہ کے معنوں میں کسی چیز کے آخری حصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ذَنْبَةُ الْوَادِي - وادی کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور الذَّنَابَةُ پیچھے لگنے والے کو۔ انہی معانی کے پیش نظر راغب نے لکھا ہے کہ الذَّنْبُ دراصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کے پکڑنے کو کہتے ہیں۔ نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو۔ نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذَنْبٌ کہتے ہیں**۔ اس اعتبار سے یہ لفظ جرم اور معصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمُ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ (۹۱/۱۳) میں اسکے معنی جرائم کے ہیں۔ یعنی ان کے رب نے ان کے جرائم کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ نیز ذَنْبٌ - خسیس چیز اور رذیل اور کمینہ کو بھی کہتے ہیں*۔

چونکہ دُم ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اسلئے ان اتہامات کو بھی ذَنْوُبٌ کہا جا سکتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے چپکا دئے جائیں۔ (جسطرح الْقِفْوَةُ دُم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ دیکھئے عنوان ق۔ ف۔ و)۔ چنانچہ سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (۳۸)۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اسلئے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہو جائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر ورغلائے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا۔ (نیز دیکھئے عنوان ق۔ د۔ م)۔

ذَنْوُبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسکی دُم کے بال گھنے ہوں اور وہ بالوں سے بھری ہوئی ہو۔ نیز اس بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ (اگر وہ خالی ہو تو اُسے دَلْوٌ کہا جائیگا)۔ نیز ایسے دن کو بھی کہتے ہیں جس کا شر بہت طویل ہو جائے، اتنا طویل کہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو۔

سورۃ ذاریات میں ہے فَان لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا ذَنْوُبًا مِّثْلَ ذَنْوُبِ اصْحَابِ بَيْهِيمٍ (۵۹)۔ تاج، محیط اور راغب نے کہا ہے کہ ذَنْوُب کے معنی نصیبہ یا حصہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا نصیبہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو ان کی مثل تھے۔

بعض لوگ اپنے آپ کو، ازہ کسر نفسی، مَذْنِب (عاصی پر معاصی وغیرہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ذنب یا گناہ، حکومت خداوندی کے جرم کو کہتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو ”مجرم“ کہنا پسند نہیں کرتے تو مَذْنِب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہو گیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہئے، نہ کہ اسے اپنے لئے نشان امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دیدیا جائے۔

ذہب

ذہاب کے معنی ہیں چلا جانا۔ گزر جانا۔ ذہب بہ کے معنی ہیں لے جانا۔ ذہب علی کے معنی ہیں، میں فلاں بات کو بھول گیا۔ اگر ذہب کے ساتھ عن آئے تو اس کے معنی چھوڑ دینے کے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ الی آئے تو اس کے معنی متوجہ ہو جانے کے آتے ہیں*۔ صاحب کشاف نے کہا ہے کہ آذہبہ کے معنی ہیں اس کو زائل کر دیا۔ دور کر دیا۔ لے گیا۔ (۲۶)۔ اور ذہب بہ کے معنی ہیں اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ یعنی خود بھی اس کے ساتھ چلا گیا**۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں آیا ہے ذہب اللہ بنورہیم (۲۷) تو اس کے معنی لے جانے کے ہیں۔ ساتھ چلے جانے کے نہیں۔ المذہب۔ جانا، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ہو۔ نیز بیت الخلاء کو بھی کہتے ہیں جہاں قضائے حاجت کیلئے جائیں*۔ لیکن قرآن کریم میں مذہب کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ اسلام کیلئے درین کا لفظ آیا ہے۔ درحقیقت مذہب کے معنی مکتب فکر (School of Thought) کے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں صرف درین تھا۔ بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو درین کی جگہ مذہب (طریقہ) نے لے لی۔ چنانچہ ذہب فی الدین مذہباً کے معنی ہیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا۔ اور فلان یذہب الی قول ایسی حنیفۃ کے معنی ہیں فلاں شخص امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ہے***۔ اس سے درین (یعنی وہ ضابطہ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) گم ہو گیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مذہب آہیب آگے چل پڑے۔ جب تک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مذہب نہیں ملتے درین قائم نہیں ہو سکتا۔ ”مٹنے“ کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ ان حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا۔ یا وہ جزئیات تھیں جنہیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا۔ انکی حیثیت ابدی نہیں ہے۔ ابدی صرف خدا کا دین ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ لہذا، اسلاف کے مختلف مذاہب کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس چلا آ رہا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے۔ جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے۔ باقی

رہیں فقہی جزئیات، تو ان کی حیثیت دائمی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر دور کی فقہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ہوگی۔

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے وہاں مذہب اسلام کا ترجمہ (Religion of Islam) ہو گیا اور اس سے درین کا تصور بالکل مٹ گیا، اور اسلام بھی دیگر مذاہب عالم میں سے ایک مذہب سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ اسلام، درین^۳ (ضابطہ حیات) کا نام تھا۔ مذہب (Religion) نہیں تھا۔

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے لیکن اس پر عمومی اجماع ہے کہ اس کے اصلی معنی ”دیوتاؤں کی تعظیم“ کے ہیں۔ اس کے بعد کسی مافوق الفطرت ہستی کی پرستش کے قواعد و ضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان ہی معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ہے (دیکھئے Century Dictionary)۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس معنی میں ریلیجن نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات یا زندگی کا قانون ہے۔ لہذا اسلام کو ریلیجن یا مذہب نہیں کہنا چاہئے۔ یہ درین^۳ ہے۔

”مذہب“، درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ہے جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ وہ اسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رونما ہوتے ہیں، وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لئے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لئے ان کے سامنے جھکتا اور گڑ گڑاتا تھا۔ ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتا تھا۔ سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا۔ انسان کی اپنی توہم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھگتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرادی۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے۔ حکمران طبقہ نے ان ”خدائی نمائندگان“ سے گٹھ جوڑ پیدا کیا تو انہوں نے انہیں ”ایشور کا اوتار“، ”ظل اللہ علی الارض“، اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دیکر، عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا۔ ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام ”مذہب“، (Religion) ہے جو انسانوں میں اب تک متواتر چلا آ رہا ہے۔

مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لئے، خدا کی طرف سے، ہوساطت حضرات انبیاء کرام^۴ دین ملتا رہا۔ اس نے انسان کو، کائنات میں، اس کے صحیح مقام سے شناسا کرایا۔ اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشو و نما اور بہبود و ترفع کے لئے استعمال کرے۔ اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی۔ خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور ”مذہب“ کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔ دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ہو رہا ہے اس لئے آہستہ آہستہ مذہب کا دور دورہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ اس طرح دین کے قیام کے لئے راستہ صاف ہو رہا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کس طرح ملوکیت - سرمایہ داری - مذہبی پیشوائیت سے بیزار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہی قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ہوگا۔ اب انسان سن شعور کو پہنچ رہا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کی توہم پرستیاں ڈرا سکتی ہیں، نہ کاغذ کے پھول بہلا سکتے ہیں۔ اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

الذہب - (۱۸) اس سونے کو کہتے ہیں جو کان سے نکال کر صاف کر لیا گیا ہو۔ (جو ابھی کان میں ہو اور گلا کر صاف نہ کیا گیا ہو) اسے تَبَرٌ کہتے ہیں)۔ جس چیز پر سونے کا ملمع کیا گیا ہو یا سونے کا پترہ چڑھایا گیا ہو اسے مَذْهَبٌ کہتے ہیں۔ ذَہِيبُ الرَّجُلِ - اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایک دم کان میں بہت سا سونا دیکھے اور اسے دیکھ کر سراسیمہ و مبہوت ہو جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) چلے جانے اور (۲) حسن و تازگی کے ہیں۔ سونے کو ذَہِيبٌ ان دوسرے معانی کی جہت سے کہتے ہیں۔ اَلِذَّہْبَةُ - ہلکی سی بارش یا سخاوت کو کہتے ہیں*۔

ذہل

ذَہَلَهُ - ذَہَلَ عَنْهُ - کسی چیز سے ربط و ضبط رکھنے کے باوجود اسے چھوڑ دینا۔ یا جانتے بوجھتے چھوڑ دینا۔ یا کسی شغل میں منہمک ہو

جانے کی وجہ سے بھول جانا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ذُوْهُوْل کے معنی ہیں محبوب چیز کی یاد باقی نہ رہنا اور اس کی عدم موجودگی کے باوجود دل کا خوش رہنا اور کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرنا*۔ صاحب محیط نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ذُوْهُوْل کسی دہشت کی وجہ سے محبوب کو چھوڑ دینا ہے۔ ذَہِل۔ ہوش و حواس جاتے رہنا**۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہو جانا۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (۲۲)۔ ”جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دیگی“۔ یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لئے کہی گئی ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سامنے آ جاتا ہے جس میں مسائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی۔ اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں خارج نہ ہوں۔ ذَہِل میں یہ تمام معانی آ جاتے ہیں۔ یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اس طرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہو جاتے ہیں۔

ذُو

ذُو۔ صاحب، والا (جیسے ہم، صاحب اولاد یا عقل و فکر والا، کہتے ہیں)۔ اسکی جمع ذَوُون اور ذَوِیْن نیز اُولُوْہُ آتی ہے۔ مونث ذات*۔ تشبیہ ذَوَاتَانِ۔ جمع ذَوَات*۔ قاعدے کی رو سے ذُو کبھی ذِی اور کبھی ذا ہو جاتا ہے۔ ذَوُوعُسْرَةٍ (۲۸۰)۔ صاحب عسرت۔ جو تنگدستی میں پڑا ہو۔ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ (۳۱)۔ لمبی چوڑی دعائیں مانگنے والا۔ ذَوِی الْقُرْبٰی (۱۷۷)۔ رشتے دار۔ ذَاتِ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتِ الشِّمَالِ (۱۸) دائیں اور بائیں طرف۔ بِذَاتِ الصُّدُوْر (۱۵۳)۔ دلوں کے اندر کی باتیں۔ یعنی جو کچھ دل کے اندر ہے۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ (۵۵)۔ مختلف علوم و فنون والے۔

ذو القرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رہائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا۔ قرآن کریم نے (سورۃ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے (۱۰۱-۸۳) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ن)۔

ذ و د

الْذَوْدُ - ہانکنا۔ دفع کرنا۔ جھڑک کر نکال دینا۔ ہٹا دینا۔ اَلْمِذْوَدُ - وہ جگہ جہاں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا ہے۔ بیل کے سینگ جس سے وہ اپنی مدافعت کرتا ہے، یعنی جس سے وہ دوسروں کو ہٹا کر دور رکھتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز سے الگ اور یک سو کر دینا۔

سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ^۴ مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پیاء (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ہیں (تَذَوْدَانِ ۲۸) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نقشے کو پھر سامنے لائیں کہ پیاسے جانور پانی کی طرف بڑھنا چاہیں اور ان کا چرواہا انہیں آدھر جانے سے روکے۔ اسے اَلْذَوْدُ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ^۴ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے روک کیوں رہی ہیں۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ لَا نَسْقِيْ حَتّٰی يُصْدِرَ الرَّعَاءُ (۲۸)۔ ہم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواہے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی اسکی وجہ بھی بتائی کہ وَ اَبَوْنَا شَيْخًا كَبِيْرًا (۲۸) (ہم لڑکیاں ہونے کی وجہ سے کمزور ہیں) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اس لئے ہم کب جرات کر سکتی ہیں کہ ہمارے جانور پہلے پانی پی لیں۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری کی پوری داستان کس حسن و خوبی سے بیان کر کے رکھ دی ہے۔ دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہو رہا ہے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ہے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری

آتی ہے۔ اسمیں استثناء ہے تو اُنہی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لیکر آتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو انکی باری پر پانی پلانے کا انتظام کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے۔ فَسَقَى لَهُمَا (۲۸) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پیغمبر یہی کچھ کرنے کے لئے آتے تھے۔ اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں یہی کچھ کریگا۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لئے آزاد کرا دینا تا کہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں۔

ذوق

ذَاقَ - چکھنا۔ مزہ معلوم کرنا*۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ دراصل تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کھا کر اسکی اندرونی حالت کو معلوم کرنا ہیں۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں۔ پھر اسکا اطلاق ہر تجربہ پر ہونے لگا**۔ یعنی کسی چیز کا تجربہ ہو جانا۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (۲۲)۔ جب انہیں ”شجرہ“ کا تجربہ ہو گیا۔ ذَاقَ - چکھنے والا۔ جو تجربہ حاصل کرے (۱۸۳)۔ (مؤنث ذَائِقَةٌ)۔ آذَاقَ - مزہ چکھانا۔ تجربہ حاصل کرانا (۱۶۲)۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بالعموم عذاب کے ساتھ آیا ہے (اگرچہ بعض مقامات پر رَحْمَةً کے ساتھ بھی آیا ہے)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو اس طرح محسوس کرے گویا اس نے ان کا مزہ چکھ لیا ہے۔ اسے اسکا عملی تجربہ ہو جائے کہ فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

ذی ع

ذَاعَ - يَذْرِعُ - پھیل جانا۔ ظاہر ہو جانا۔ عام ہو جانا۔ آذَاعَ سِرَّهُ - اس نے اس کے راز کو افشا کر دیا۔ ظاہر کر دیا۔ اور لوگوں میں مشہور کر دیا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی لوگوں میں پکار کر کہہ دینا اور اعلان کر دینا ہیں***۔ (۸۳) میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ آذَاعُوا بِهِ - ”جب ان تک کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلاتے اور اڑاتے ہیں“۔

ر

رأس

الرَّأْسُ - (جمع رُءُوسٌ) سر - ہر چیز کا اعلیٰ حصہ - سردار قوم - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور بلند ہونے کے ہیں - رَئِيسٌ - سردار قوم - رَأْسُ الْمَالِ - اصل مال - الرَّائِسُ - والی - حاکم - الْمَرْؤُسُ - رعیت *

قرآن کریم میں مناسک حج کے ضمن میں ہے - وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ (۱۹۶) - اپنے سروں کو نہ منڈاؤ - دیکھئے (عنوان ح - ل - ق) - اصلی سرمایہ کیلئے رُءُوسٌ اَمْوَالِكُمْ آیا ہے (۲۹) - یعنی ”سرمایہ“، (تفصیل ر - ب - و کے عنوان میں دیکھئے) -

رأف

الرَّأْفَةُ - رحمت اور رافت مرادف المعنی الفاظ ہیں - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ رَأْفَةٌ تو یہ ہے کہ تم سے ان امور کو دفع کر دیا جائے جو ضرر رساں ہوں اور رَحْمَةٌ یہ ہے کہ تمہیں ایسے امور بہم پہنچائے جائیں جو راحت رساں ہوں ** - اسکی تائید صاحب المنار نے کی ہے جس میں لکھا ہے کہ رَأْفَةٌ کا نتیجہ دفع بلا ہے اور رَحْمَةٌ سے مراد خوشحالیوں کا زیادہ عطا کرنا ہے *** - لہذا رَعُوفٌ اور رَحِيمٌ سلبی (Negative) اور ایجابی (Positive) دونوں پہلوؤں کو محیط ہو جاتے ہیں - ان اسباب و عناصر کا دفع کرنا جو کسی کی نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں اور اسکی ساتھ ہی اس ساز و سامان کا بہم پہنچانا جس سے اسکی نشو و نما ہوتی جائے -

خدا کی رَأْفَت و رَحْمَت کسطرح ملتی ہے، اس کے متعلق سورۃ بقرہ میں کہہ دیا کہ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ - إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَحِيمٌ (۲/۱۳۳) - اللہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے ایمان کو یونہی بلا حفاظت، چھوڑ دے اور وہ بلا نتیجہ رہ جائے۔ وہ تورؤف رَحِيمٌ ہے۔ یعنی وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے ایمان کے نتیجہ خیز ہونے کی راہ میں جس قدر موانع آئیں انہیں راستہ سے ہٹائے اور ایمان کے مثبت نتائج پیدا کرتا جائے۔ لہذا اس کی رَأْفَت اور رَحْمَت، اِیْمَان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی انسانیت کی صحیح نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ ایمان کے معنی ہیں قانون خدا وندی کی صداقت پر یقین اور اعتماد رکھنا اور اس کی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینا۔

چونکہ عام طور پر انسانوں کی تکلیف رفع کرنے کا جذبہ مجرکہ، رقت قلب (دل کی نرمی) ہوتا ہے اس لئے رَأْفَت کے معنی نرمی کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ (۲۴/۲۳)۔ ”قانونِ خدا وندی کے نفاذ میں نرمی سے کام مت لو،۔ ایسا نہ ہو کہ اس خیال سے کہ یہ سزا انہیں تکلیف پہنچائیگی تم مجرمین کو جرم کی سزا ہی نہ دو یا اس میں نرمی برتو۔ اس لئے کہ اگر ظالمین اور مجرمین کو سزا نہ دی جائے تو مظلوموں کی داد رسی کیسے ہو۔ عیسائیت نے خدا ترسی کا یہی غلط مفہوم اپنے سامنے رکھا جس کی وجہ سے ظالموں کی رسیاں دراز ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ مذہب کو کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر محبوس ہونا پڑا اور سیاست بے مہار ہو گئی۔ قرآن کریم نے اسی لئے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ یہ انکا خود تراشیدہ مسلک تھا اور جذباتِ رافت و رحمت کی غلط تعبیر کا پیدا کردہ (۵۷/۲۴)۔ اسلام عدل قائم کرنا سکھاتا ہے جس کے لئے زیادتی کرنے والوں کی قوتوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ لہذا اسمیں رَأْفَت کے ساتھ غِلْظَت (نرمی کے ساتھ سختی) کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ (دیکھئے عنوان غ - ل - ظ)۔

رأی

رُؤْيَا - کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا۔ یہ لفظ آنکھوں سے دیکھنے یا عقل و بصیرت سے معلوم کرنے یا خواب و خیال میں دیکھنے اور تصور کرنے سب کے لئے آتا ہے۔ جوہری نے کہا ہے کہ جب اس کے ساتھ صرف ایک مفعول آئے تو اس کے معنی آنکھ سے دیکھنے ہوتے ہیں اور جب دو مفعول

آئیں تو اس کے معنی جاننے یا علم حاصل کرنے کے ہوتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی ہوتے ہیں اور جب اس کے بعد الی آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اس طرح دیکھنا (یا غور و فکر کرنا) کہ اس کے بعد انسان کو عبرت و موعظت حاصل ہو*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ رَأَى رُؤْيَةً۔ آنکھ سے دیکھنے کو۔ رُؤْيَا خواب دیکھنے کو، اور رَأَى يَأْدُل سے دیکھنے اور غور کرنے کو کہتے ہیں**۔ الْمَرَأَى وَالْمَرَأَةُ۔ منظر۔ الْمَرَأَةُ۔ آئینہ۔ الرُّؤْيَا۔ خواب۔ الرِّئَايُ۔ رائے۔ خیال۔ جب کوئی بات یقینی نہ ہو، ظنی ہو تو اس کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کر لینا رائے کہلاتا ہے*۔ أَرَأَيْتَكَ۔ (۱۰۷) عرب اس معنی میں بولتے ہیں جس معنی میں ہم کہتے ہیں ”بتاؤ تو مہی“۔ ”ذرا خبر تو دو“۔ اور أَلَمْ تَرَ إِلَى..... (۱۰۸) تعجب کے موقع پر بولتے ہیں ”تم نے دیکھا نہیں!“! یعنی تمہیں اس بات پر تعجب نہیں آتا؟* لیکن ایسے موقعوں پر اس میں عبرت خیز نظر ڈالنے کی دعوت بھی ہوتی ہے۔ سورة آل عمران میں يَرَوْنَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ۔ (۱۳) تاکید اور وضاحت کے لئے آیا ہے۔ جیسے ہم لوگ ”آنکھوں دیکھی“ وغیرہ بولتے ہیں۔ اور سورة مریم میں رَرِئِيًّا (۱۹) منظر یا ظاہری حالت کے معنوں میں آیا ہے۔ رِئَاءَ النَّاسِ (۲۴) لوگوں کے دکھانے کے لئے۔ يُرَآءُ وَنَ النَّاسِ (۲۴) لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ هُمْ يُرَآءُ وَنَ (۱۰۷) وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں (کہ وہ نمازی ہیں) لیکن صلوة کی حقیقت کو فراموش کر چھوڑتے ہیں۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں کو آب رواں کی طرح کھلا رہنا چاہئے انہیں بند لگا کر روک رکھتے ہیں (۱۰۷)۔ سورة مؤمن میں هَ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَى (۲۹) ”میں تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں“۔ سورة شعراء میں هَ فَلَمَّا تَرَ آءَ الْجَمْعِ عَن (۲۶) ”جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا“۔ بَادِرِ الرِّئَايِ (۱۱) کے لئے دیکھئے عنوان (ب۔ د۔ و)

ر ب ب

رَبٌّ کے معنی نشو و نما دینا ہیں۔ یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اسلئے گزارنا کہ وہ بتدریج نشو و نما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے***۔ جس طرح فطرت، قطرہ، نیساں کو موتی بنانے کے لئے نئی نئی تبدیلیوں

سے گزارتی اور رفتہ رفتہ اسکی نشوونما کئے جاتی ہے*۔ یہ طریق نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں رَبٌّ وَلَدَهُ رَبًّا وَرَبَّيْتَهُ وَتَرَبَّيْتَهُ*۔ اس نے بچے کی پرورش و تربیت کی۔ نگرانی کی تاآنکہ وہ بالغ ہو گیا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے۔

مِنْ دُرَّةٍ بَيْضَاءَ صَافِيَةٍ
مِمَّا تَرَبَّبَ حَائِرَ الْبَحْرِ

یعنی (ممدوح) اس صاف اور سفید موتی سے (بھی زیادہ خوبصورت ہے) جس نے سمندر کی گہرائیوں میں پرورش پائی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا اور اسے سنوارنا۔ اسی سے الرَّبُّ مالک، خالق، کسی چیز کی نگرانی اور اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں (۲) کسی چیز کا جمعے رہنا اور ایک جگہ قیام رہنا۔ چنانچہ کہتے ہیں أَرَبَّتِ السَّحَابَةُ بیہذہ البَلَدَ۔ بدلی برابر اس شہر پر ٹھہری یا برستی رہی۔ اور (۳) کسی شے کو دوسری شے کے ساتھ ملا دینا۔ لہذا تسلسل کے ساتھ نشوونما دیتے چلے جانا اور درست کرتے رہنا ربوبیت ہے۔ مجازاً بچہ کو تھپک کر سلا دینے کے لئے رَبَّتِ الْمَرْأَةُ صَبِيَّهَا کہتے ہیں*۔ کیونکہ نیند اور آرام و سکون کا وقفہ بچہ کی نشوونما سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

کسی معاملہ کی اصلاح اور درستگی اور اسکے استحکام کے لئے بھی رَبٌّ يَرْبُّ رَبًّا کہا جاتا ہے*۔ اور کسی چیز کو جمع کرنے اور بڑھانے چلے جانے کو بھی*۔ چنانچہ رَبَّابَةٌ اس تھیلہ کو کہتے ہیں جس میں بہت سے تیروں کو اکٹھا رکھا جائے۔ اور رَبُّ الشَّهْنِ کے معنی ہیں، اس نے تیل کی اصلاح کر کے اسے خوشبودار بنایا**۔

چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے أَلْبَنَتْهُ اُنْ پودوں کو کہتے ہیں جو گرمیوں میں بھی مرجھاتے نہیں بلکہ ان کی سرسبزی و تازگی، سردی اور گرمی دونوں میں یکساں رہتی ہے*۔ اور أَلْمَرَبُّ اُس زمین کو کہتے ہیں جہاں درخت اور پودے بکثرت پائے جائیں اور جہاں ہمیشہ سرسبزی و شادابی رہے*۔ اسی طرح أَلْتَرَبَّتْ کے معنی ہیں بہت سے گھنے درخت۔ بہت بڑی جماعت (جو دس ہزار یا اس سے لگ بھگ ہو)۔ یا سامان عیش کی کثرت و فراوانی*۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جماعت کو رَبِّيَّی کہا جاتا ہے گویا یہ رَبَّيْتَهُ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اسکی جمع

رَبِّیُّوْنَ اَتی ہے * - (دیکھئے ۱۳۵) - اَلرَّبَّابَةُ - تہ برتہ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں ** - اور اَلرَّبَّابُ - شیریں پانی جو کثرت سے ایک جگہ جمع ہو گیا ہو ** - اَلرَّبَّیْبَةُ کے معنی عہد و میثاق اور مملکت کے بھی ہیں *** - کیونکہ اس سے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ مل جاتی ہے - (ابن فارس) - اَلرَّبَّیَّةُ - بیوی کی لڑکی (جو اس کے پہلے خاوند سے ہو) - نیز وہ بکری جسے چراگاہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ گھریلو چارہ پر پرورش کیا جائے تاکہ جس وقت ضرورت ہو اسکا دودھ دوہ لیا جاسکے ** -

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر رَبِّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی نشوونما دینے والا - پایہ تکمیل تک پہنچانے والا - انتظام کرنے والا - اصلاح کرنے والا - اسلئے قوم کے مدبر اور منتظم سردار کو رَبِّ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے - اور گھر کے مالک کو رَبِّ الْبَيْتِ ** - رَبِّ الْقَوْمِ کے معنی ہیں اس نے قوم کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان پر سیادت کی **

بڑے بھائی کو بھی رَبِّ کہا جاتا ہے **** - اس اعتبار سے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ (فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا ... ۲۴) - تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ تو اور تیرا بڑا بھائی (ہارونؑ) دونوں جاؤ اور دشمن سے جنگ کرو - یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے طنزاً کہا ہو کہ تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمن سے جنگ کرو - اَلرَّبَّانِیُّ - جس کی نسبت رب کی طرف ہو - یا وہ معلم جو لوگوں کو بڑے بڑے علوم سے پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کی غذا دیکر انکی ذہنی نشوونما کرے - ہر صاحب علم کو بھی رَبَّانِیُّ کہا جاتا ہے - اور راسخ فی العلم کو بھی ** - انہی معنوں میں رَبِّشی بھی استعمال ہوتا ہے -

قرآن کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (۱) سے ہوتی ہے - یعنی کائنات کا ہر حسین گوشہ خدا کی صفت ربوبیت کا پیکر حمد و ستائش ہے - کائنات میں ہر شے اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک عظیم الشان پروگرام کارفرما ہے جس میں ایک ادنیٰ سا بیج اپنی نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے - اسی کو خدا کا نظام ربوبیت کہتے ہیں - اللہ تعالیٰ اسی لئے قابل حمد و ستائش ہے کہ وہ ہر شے کو ربوبیت عطا کرتا ہے - قرآن کریم کہتا ہے کہ جس طرح

خدا کا یہ نظام ربوبیت خارجی کائنات میں از خود کارفرما ہے اسی طرح انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی اور معاشری دنیا میں اسی نظام ربوبیت کو نافذ کریں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ رزق کے تمام سرچشمے تمام افراد کی پرورش کے لئے عام ہو جائیں اور ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کو دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے وقف کر دے۔ اس طرح تمام نوع انسانی کی مضمحل صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطہ تکمیل تک پہنچ جائیں گی۔ جو لوگ اس نظام کو قائم کر دیں گے وہ رَبَّانِیُّوْنَ کہلائیں گے ($\frac{۳}{۸}$)۔ اور اس نظام کا قیام قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہوگا۔ یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہی ہے۔ یعنی دنیا میں نظام ربوبیت کا قیام۔ اسی کے لئے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ ذریعہ ہوتی ہے افراد انسانیہ کی ربوبیت کا۔ چونکہ ربوبیت میں انسان کی طبعی (جسمانی) زندگی کی پرورش بھی شامل ہوتی ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی، اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ایسے وسائل و ذرائع، ہر ایک کے لئے یکساں طور پر، مہیا کرے جن سے ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ جب انسانی ذات کی اس طرح نشوونما ہو جائے تو موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے حیات آخرت کہتے ہیں۔ خدا کی ربوبیت کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا ہے۔

”ربوبیت عالمینی“۔ بس یہ ہے اسلامی معاشرہ کا مقصود و منتہی۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت بلا لحاظ نسل و رنگ اور بلا امتیاز خون و وطن۔ جب تک خدا کی یہ صفت، افراد۔ اور ان کے مجموعہ معاشرہ، میں منعکس نہیں ہوتی، ان کی زندگی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ یہ قرآن کریم کی پہلی آیت اور اس کی تعلیم کا نقطہ آغاز ہے۔ جس کے اندر یہ صفت خداوندی منعکس ہوتی ہے، وہ پوری پوری محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے۔ اسی لئے اس معاشرہ میں، نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے، نہ دولت اکٹھی کرنے کا خیال۔ نہ رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ دوسروں کی محنت کو غصب کر لینے کا خیال۔ قرآن کریم کا مقصود اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل اور قیام ہے

اور یہی معاشرہ ہے جو دنیا کو محسوس طریق پر دکھا سکتا ہے کہ خدا کا تجویز کردہ نظام کس قدر درخور حمد و ستائش ہے۔ یہ عملی تفسیر ہے۔ الحمد للہ رب العالمین کی۔

رَب (حرف)

رَبَّ - رَبَّ - رَبَّ - رَبَّ - یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم اپنے ہاں ”اکثر و بیشتر“ کا لفظ بولتے ہیں۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے“۔ ”عام طور پر کہا جاتا ہے“۔ ”عموماً حالت یہ ہوتی ہے“۔ وغیرہ۔ نیز یہ تاکید اور شدت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں، وہ بہتیرا چاہتے رہے۔ انہوں نے اس کے لئے کتنی ہی بار کوشش کی۔ وغیرہ۔ رَبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۱۵)۔ انکار کرنے والے بہتیرا چاہینگے کہ اے کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ یا انکار کرنے والوں کی اکثر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے۔ یا یہ لوگ ہمیشہ اس حسرت میں رہیں گے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے۔ اس کے برعکس یہ حرف ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ”کبھی کبھی“۔ قرآن کریم میں سیاق و سباق سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرف کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

رَب ح

رَبَّحٌ - تجارت میں چیزوں کے تبادلے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اسے رَبَّحٌ کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی تجارت میں زیادتی، اضافہ اور کامیابی بتائے ہیں۔ رَبَّحٌ و رَبَّاحٌ - تجارت میں اضافہ و ترقی کو کہتے ہیں**۔ أَرْبَحَ النَّاقَةَ - اسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص صبح کے وقت بھی اونٹنی کا دودھ دوہے اور پھر دوپہر کے وقت بھی۔ لیکن تَرَبَّحَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی حیران رہ گیا***۔ قرآن کریم میں آیا ہے فَمَا رَبَّحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲۶)۔ ”ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا،“۔

رَب ص

تَرَبَّصْ - انتظار کرنا۔ کسی پر خیر یا شر واقع ہونے کا انتظار کرنا**۔ یا سودے وغیرہ کے سستا یا مہنگا ہونے کا انتظار کرنا یا کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا*۔

سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ایلاء کے سلسلہ میں انتظار کیلئے آیا ہے۔
لِّلَّذِينَ يُؤْتُونَ مِن نِّسَاءِهِمْ ثَرْبًا مِّمَّا كَسَبُوا... (۲۲۶)
”جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت تک انتظار ہے،،۔ یعنی وہ عورتوں کو اس حالت میں غیر معین عرصہ تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں چار ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں نکاح میں رکھنا ہے یا آزاد کر دینا ہے۔ مَثَرَبِئَصٍّ۔ انتظار کرنے والا (۲۳۵)۔

ر ب ط

رَبَطَہُ۔ اسے باندھ دیا۔ اَلِرِّبَاطُ۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو باندھا جائے۔ اَلرَّابِطَةُ۔ تعلق۔ بندھن۔ ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی پختگی سے باندھنا اور جمے رہنا دئے ہیں۔ اَلِرِّبَاطُ۔ کسی کام کو مسلسل کرتے رہنا۔ دشمن کی سرحدوں پر مسلسل پہرہ دیتے رہنا۔ رِبَاطُ اَلْخَيْلِ۔ سرحد پر حفاظت کیلئے فوج کے اڈے بنانا*۔ (۶۰)۔

سورۃ آل عمران میں ہے اَصْبِرْ وَاَوْصَابِرْ وَاَوْصَابِرْ وَاَوْصَابِرْ (۱۹۹)۔ اس میں رَابِطُوْا کے معنی اپنی حفاظت کا مستحکم انتظام کرنا، اور ایک دوسرے سے جڑ کر رہنا یا مسلسل مقصد کے لئے سرگرم عمل رہنا ہیں۔

رَبَطَ اللّٰهُ عَلٰی قَلْبِہِ۔ خدا نے اسے صبر و ضبط کی توفیق دی اور اس کے دل کو مضبوط کر دیا*۔ سورۃ انفال میں ہے وَلِيَّرْطَبْ عَلٰی قُلُوبِکُمْ وَيُثَبِّتَ بِہِ الْاَلَامَ (۱۱)۔ ”تا کہ وہ تمہارے دلوں کو تقویت دے اور اس کے ذریعے تمہارے قدموں میں ثبات عطا کر دے،،۔ اَلرِّبَاطُ۔ ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جانا۔ تعلق*۔

ر ب ع

اَرْبَعَةٌ۔ چار کا عدد (مذکر کیلئے) (۲۶۰) اور اَرْبَعٌ مؤنث کیلئے (۲۶۱)۔ اَرْبَعُونَ وَاَرْبَعِينَ۔ چالیس۔ (۲۶۱) اَلرَّبْعُ اور اَلرَّبْعُ ایک چوتھائی* (۲۶۲) رُبَاعٌ۔ چار چار۔ (۲۶۲)۔ رَابِعٌ۔ چوتھا (۲۶۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ”چار کے عدد، کے علاوہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز پر قائم رہنا اور اسے اوپر اٹھانا بھی ہیں۔

ر ب و

رَبًّا - يَرْبُو - زیادہ ہونا - بڑھنا - پھولنا* - لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ (۳۹) - ”تا کہ لوگوں کے اموال میں بڑھتی ہو“ - سبزی کا بڑھنا اور پھولنا (۲۲) - رَبَّ السَّوْبِقِ - اس نے ستو میں پانی ملایا اور اس طرح ستو پھولا* - رَابٍ - مونث رَابِيَّةٌ - وہ چیز جو اوپر چڑھ جائے - جو اوپر آجائے - زَبَدًا رَابِيًا (۱۳) - وہ خس و خاشاک یا جھاگ جو اوپر آجائے - أَخَذَ رَابِيَةً - سخت گرفت - بہت زیادہ (بڑھی ہوئی) گرفت* - ایسی گرفت جو انسان کے اوپر چھا جائے اور اسے مغلوب کر دے - (۶۹) - أَرْبَى - زیادہ کثیر - مال و دولت میں زیادہ بڑھا ہوا* - (۱۶) - رَبْوَةٌ - زمین کا بلند حصہ - سطح مرتفع* - (۲۳) - رَبَّيْتُهُ - میں نے اسے بڑھایا، اسے غذا دی - اسے پیالا - پرورش کیا** - (۱۴) - أَلْرَبَّا (الرَّبَّو) - وہ سود جو قرض پر وصول کیا جاتا ہے - رأس المال پر زیادہ لینا*** (تفصیل آگے آتی ہے) -

سورة آل عمران میں ہے لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً (۱۲۹) - سود مت کھاؤ - تم سمجھتے ہو کہ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے - حالانکہ درحقیقت اس سے قومی سرمایہ میں کمی ہوتی ہے - (دیکھئے - عنوان ض - ع - ف) - قرآن کریم نے جو معاشی نظام تجویز کیا ہے اس میں سود کی کہیں گنجائش نہیں - جب اس میں دولت کا جمع کرنا ہی منع ہے تو پھر سود تو کجا، اس میں قرضہ کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا - اس میں فالتو سرمایہ (Surplus Money) کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں - سارے معاشرے میں بٹ جاتا ہے - قرآن کریم میں قرضہ وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں، وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآن کریم کا معاشی نظام ربوبیت متشکل نہ ہوا ہو -

سود تو ایک طرف - اُس نظام میں کسی کو عطیۃً بھی کوئی چیز اس نیت سے نہیں دی جاسکتی کہ اس سے زیادہ واپس ملیگی - وَمَا اتَّيْتُم مِّنْ رَبًّا لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ (۳۹)**** - جو کچھ تم لوگوں کو ان کے واجبات سے زیادہ دو اور اس سے غرض یہ ہو کہ اس میں بڑھتی ہو تو نظام خداوندی میں اس میں بڑھتی نہیں ہو سکتی - اس کی تفسیر (۴۳) میں یہ کہہ کر

* تاج و محیط - ** اس کے لئے عنوان ر - ب - ب بھی دیکھئے - *** راغب -

**** تاج نے اس کے معنی ”عطیہ“ کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو کسی کے واجب سے زیادہ دی جائے -

کردی کہ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ کسی پر اس مقصد کے لئے احسان نہ کر کہ تجھے اُس سے زیادہ واپس ملے۔ اس نظام کی تو بنیاد ہی اِيتَاۤءُ زَكٰوۃٍ پر ہے۔ یعنی دوسروں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا۔ اس لئے (۳۹) میں رَبَّآ کے مقابلہ میں زَكٰوۃٌ آیا ہے۔

قرآن کریم نے اَلرِّبُو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ہے کہ وَ اَحَلَ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵)۔ ”خدا نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربو کو حرام“۔ سوال یہ ہے کہ ربو کسے کہتے ہیں؟ اس مقام پر قرآن کریم ربو کو بیع کے مقابلہ میں لایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ربو، بیع کی ضد ہے۔ بیع کیا ہے، اس کی تشریح، عنوان (ب۔ ی۔ ع) میں کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔

جو کچھ ہم کسی دوسرے سے لیتے ہیں، اسکی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً عطیہ۔ اجرت۔ سود (عام معنوں میں)۔ منافع (تجارت میں)۔ جوئے کی جیت۔ اب دیکھئے کہ ان میں فرق کیا ہوتا ہے۔

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے، نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے کچھ واپس لینے کے خیال کے بغیر، تحفہً دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں نہیں لایا جاسکتا۔ اسلئے یہ شکل ہمارے زیر نظر موضوع سے خارج ہے۔

(۲) اجرت۔ یہ محنت (Labour) کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ (Capital) کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) سود۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ (Capital) دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر، اصل سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ہے۔ اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار۔ اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ نہ محنت کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ ”انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے“۔ یعنی وہ صرف محنت کا معاوضہ جائز قرار دیتا ہے۔ سرمایہ (Capital) استعمال کرنے کا معاوضہ جائز نہیں قرار دیتا۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں کے سامنے

نہیں تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربو' میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دیتا ہے۔ اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس میں بھی اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل پر زائد ہیں، تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذالیک بیا نھم قالوا انما البیع میثل الربو' (۲/۲۵۰)۔ وہ بیع اور ربو' کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں ایک نوعیت کی چیز نہیں ہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے، اور دکاندار کو اسکی محنت کا معاوضہ سرمایہ سے الگ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے۔ لیکن ربو' میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے، جو حرام ہے۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ٹھہرا کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام ہے۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربو' ہے۔ (اس بات کا تعین معاشرہ کریگا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا)۔ لہذا، ہر وہ کاروبار جس میں انسان صرف سرمایہ لگا کر، اپنے اصل سے زائد وصول کرے، قرآن کریم کی رو سے الربو' میں داخل ہوگا۔ خواہ وہ زمین کی بٹائی ہو یا کاروبار میں (Sleeping Partner) کا منافع میں حصہ۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (Un-earned Income) کہتے ہیں۔ یعنی وہ آمدنی جو محنت سے کمائی نہ جائے۔

اور جب نہ سرمایہ لگایا جائے نہ محنت کی جائے تو وہ آمدنی جوئے کی ہے۔ (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (Risk) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع یا نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربو' میں (Risk) نہیں ہوتا۔ لیکن یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (Risk) ہو تو جو عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ہر داؤ میں (Risk) ہوتا ہے۔ بیع اور ربو' میں اصل فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ بیع میں رأس المال + محنت کا

معاوضہ (اجرت) واپس ملتے ہیں۔ اور ربو' میں رأس المال + رأس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ اجرت حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام ہے، خواہ وہ سود کے نام سے پکارا جائے یا تجارت کے 'منافع' کے نام سے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رأس المال پر اضافہ کسی شکل میں بھی جائز نہیں ہوگا۔ اگر تجارت اُس زمانہ میں ہوگی جب هنوز افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ نے اپنے اوپر نہیں لی (یعنی عبوری دور میں) تو رأس المال کے علاوہ اتنے منافع کی اجازت ہوگی جو دکاندار کی دن بھر کی محنت کے معاوضہ کے برابر ہو۔ اور جب دکاندار کی ضروریات زندگی بھی معاشرہ پوری کریگا تو تجارت میں اشیاء کی فراہمی بلا منافع ہوگی۔ معلوم نہیں انسان کو قرآن کریم کے نظام معاش تک پہنچنے میں ابھی کتنا وقت لگے۔ لیکن جتنا وقت بھی لگے، انسان اپنے خود ساختہ جہنم سے اسی وقت نکل سکے گا جب اس نے قرآنی نظام اختیار کیا۔ موجودہ نظام معیشت جس میں سرمایہ کے استعمال کے معاوضہ کو حلال و طیب سمجھا جاتا ہے، قرآنی نظام کے خلاف اعلان جنگ ہے (۲/۹)۔

رت ع

رَتَعَ - يَرْتَعُ - رَتَعًا - سرسبز مقام میں سیر ہو کر کھانا پینا اور حسب مرضی گھومنا پھرنا۔ رَتَعَ کا لفظ دراصل جانوروں کے کھانے چرنے کیلئے آتا ہے اور جی بھر کر کھانے کے لئے، پھر استعارۃً انسانوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے*۔ جَمَلَ رَاتِعٌ (جمع۔ ایل رَتَاعٌ) آزادی کے ساتھ کھانے پینے والا اونٹ۔ اَلْمَرْتَعُ - چراگاہ۔ اَرْتَعَتِ اَلْأَرْضُ - زمین میں گھاس اور چارہ بکثرت ہو گیا*۔

سورۃ یوسف میں ہے کہ برادران حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ یوسفؑ کو ہمارے ساتھ باہر جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے يَرْتَعُ وَ يَلْعَبُ (۱۲)۔ تا کہ یہ وہاں ہنسی خوشی سے کھائے پیے اور کھیلے کودے۔ "يَرْتَعُ وَ يَلْعَبُ"، کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو آجکل ہمارے ہاں پکنک (Picnic) کا ہے۔

رت ق

رَتَّقَ - شگاف کو بند کر دینا، بھر دینا، ملا دینا۔ نیز جڑی ہوئی اور ملی ہوئی چیز۔ اَرْتَتَّقُ الشَّيْءُ - چیز مل گئی اور جڑ گئی۔ اس میں

*تاج و محیط و راغب -

کہیں شگاف نہ رہا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْقَرْتَقُ جوڑنا اور ملانا ہے خواہ وہ خلقی ہو خواہ مصنوعی**۔ قرآن کریم میں ارض و سموات کے متعلق ہے کہ کَانَتَا رَتَقًا فَفَتَقْنَاهُمَا - (۲۱)۔ شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولہ ملا جلا تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کڑے الگ الگ ہو گئے۔ (۹)۔ غور کیجئے کہ یہ اعلان چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کے ذہن میں اسکا تصور تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرام شروع میں ایک ہی ہیولہ تھے اور بعد میں یہ الگ الگ ہوئے۔ آج سائنس کی تحقیقات نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لیکن اُسوقت اس حقیقت کو خالق کائنات کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا؟

رت ل

اَلْقَرْتَلُ۔ دانتوں کا موتیوں کی لڑی کی طرح سفید، آبدار، اور نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ہونا۔ کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ مربوط و مرتب ہونا، حسن ترتیب اور حسن نظم لئے ہوئے ہونا۔ اَلْقَرْتَلَاءُ۔ ایک قسم کی مکڑی جو اپنے جالے کو نہایت عمدہ حسن اور تناسب سے بنتی ہے***۔

قرآن کریم کے متعلق ہے وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِیْلًا (۲۵)۔ ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب، تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہم دگر جوڑا ہے۔ اسکی ساری تعلیم، ایک خاص نظم کے ساتھ، اسکے مرکزی فکر کے گرد گھومتی ہے۔ نبی اکرمؐ سے کہا گیا وَرَتَّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِیْلًا (۳۷)۔ تم بھی اسے اسی طرح حسن نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔

رج ج

اَلْقَرَجُ۔ ہلانا۔ شدت سے حرکت دینا۔ زلزلہ ڈال دینا۔ کسی چیز کو ہلا کر اسکی جگہ سے ہٹا دینا، بے جگہ کر دینا۔ اِرْتَجَّ اَلْبَحْرُ۔ سمندر متموج اور متلاطم ہو گیا۔ اَلْقَرَجَا جَۃٌ۔ شیر کی کچھار****۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا رُجَّتِ اِلْاَرْضُ رَجًّا (۵۶)۔ جب زمین سخت حرکت سے متزلزل ہو جائیگی۔ دوسری جگہ ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتْ اِلْاَرْضُ زِلْزَالًا (۹۹)۔ جب زمین کو ہلایا جائیگا اس کا ہلایا

جانا،،۔ یعنی پوری شدت سے ہلائی جائیگی۔ قرآن کریم کے اس قسم کے بیانات سے، کائنات کا طبیعی انقلاب بھی مقصود ہو سکتا ہے اور تمدنی انقلاب بھی۔

رج ز

رَجَزٌ (اور رَجَزٌ) کے بنیادی معنی اضطراب پیہم اور مسلسل حرکت کے ہیں۔ اَلرَّجَزُ۔ اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اسکی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اسکی ٹانگیں اور رانیں کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اٹھنے کے قابل ہو سکتا ہے*۔

رَجَزٌ۔ وہ عذاب ہے جس میں کوئی قوم اضطراب پیہم میں مبتلا رہے اور ایسی کمزور ہوتی جائے کہ اس کے لئے اٹھنا دشوار ہو جائے۔ عَذَابٌ مِّنْ رَّجَزٍ اَلِیْمٌ (۳۳/۵)۔ ”وہ عذاب جو درد ناک اضطراب ہے،،۔ دوسری جگہ ہے۔ رَجَزًا مِّنَ السَّمَاءِ (۲۹/۳۳)۔ وہ تباہیاں اور بربادیاں جو خارجی حوادث کی رو سے آئیں۔ سورۃ اعراف میں ان مختلف قسم کی تباہیوں کو رَجَزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوم فرعون کو پیش آئی تھیں۔ (۱۳۳/۷)۔

سورۃ انفال میں ہے کہ ہم نے (بدر کے میدان میں) شیطان کے پیدا کردہ رَجَزٌ کو تم سے دور کر کے تمہارے دلوں میں تقویت اور پاؤں میں استقامت پیدا کر دی (۱/۱)۔ یہاں سے رَجَزٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی پائے استقلال میں لغزش آ جانا۔ ایسی کمزوری پیدا ہو جانا جس سے دلوں میں اضطراب اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے۔ اسلئے سورۃ المدثر میں جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ”اب تو اس دعوت انقلاب کو لیکر اٹھ،،۔ تو اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَالرَّجَزَ فَا هُجِرٌ (۴۳/۵)۔ اس کمزوری کو جھٹک کر الگ کر دے جو اٹھنے میں لڑکھڑاہٹ کا موجب بن جائے۔ تم اور تمہارے رفقاء اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لو کہ تم اس بار گراں کو لیکر مردانہ وار اٹھ کھڑے ہو۔ اس سورۃ میں مخاطب تو نبی اکرمؐ سے ہے لیکن یہ تعلیم تمام جماعت کے لئے ہے۔ ایسا عظیم انقلاب اسی جماعت کے ہاتھوں برپا ہو سکتا ہے جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئے۔

رج س

الرَّجْسُ - سخت آواز - کسی بہت بڑی اور مختلف قسم کی مخلوط چیزوں کی آواز کو کہتے ہیں - جیسے فوج یا سیلاب کا شور یا بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک - رَجَسَتْ السَّمَاءُ - بادل بڑے زور سے گرجا - ارْتَجَسَ الْبَيْتَاءُ - عمارت اس طرح ہلی یا لرزی کہ اسکی آواز سنائی دی - الرَّجَّاسُ - سمندر کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سخت اضطراب بھی ہوتا ہے اور شور بھی - لہذا رَجَسَ کے معنی ہوتے ہیں التباس - شک - تردد - اضطراب - کسی معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا - هُمْ فِي مَرَجٍ وَسَةٍ مِّنْ أَمْرِ هَيْمٍ - وہ لوگ اپنے معاملہ میں شک - اضطراب اور التباس میں ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اختلاط اور التباس کے ہیں - گندگی کو بھی اَلِرَّجْسُ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ لتھڑا اور چپک جاتی ہے - اور خود اس میں بھی کئی آلائشیں ہوتی ہیں - قرآن کریم میں ہے وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱:۱۰) - ”جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ رجس ڈال دیتا ہے“ - یہاں عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ رَجَسٌ بتایا گیا ہے - لہذا معنی واضح ہیں - یعنی شک - التباس - اضطراب - نیز اس کے معنی ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر تک بھی قبیح ہو اور ان میں بہت زیادہ قباحیت ہو* - نا خوش آئند امور - قرآن کریم نے خَمْرٌ - مَيْسِرٌ - أَنْصَابٌ - أَزْلَامٌ - کورِجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کہا ہے (۹۰) - اس میں قباحیت اور نا پسندیدگی بھی ہے اور اضطرابی کیفیت بھی - اسی طرح کھانے کی حرام چیزوں کے متعلق کہا ہے - فَإِنَّ اللَّهَ رَجَسٌ (۱۳۶) - رَجَسَهُ عَنْ الْأَمْرِ کے معنی ہیں ، اُس نے اسے اس کام سے روک دیا* - لہذا رَجَسٌ وہ کام ہیں جن سے انسانی شرف کے نشو و نما میں خلل اور رکاوٹ پیدا ہو جائے - تاج نے کہا ہے کہ اس سے وہ کام مراد ہیں جو انسان کو عذاب (تباہی) کی طرف لے جائیں - بات ایک ہی ہے - مِرْجَاسٌ اس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو یہ دیکھنے کے لئے کنویں میں لٹکایا جائے کہ پانی کی گہرائی کس قدر ہے* -

سورة احزاب میں اہل بیت نبویؑ کے متعلق ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳) - خدا چاہتا ہے کہ تم سے رَجَسٌ دور کر دے - یعنی اضطرابات اور التباسات - یا وہ موانع جو تمہاری صحیح

نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں۔ سورۃ انعام میں ایمان والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا سینہ اسلام کے لئے کھل جاتا ہے۔ اس کے برعکس، غلط راستے پر چلنے والوں کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے کَذَّالِیْکَ یَجْعَلُ اللّٰهُ اِلَیْہِ رَجْسًا عَلٰی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۱۲۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ رجس کے اندر دل کی تنگی۔ تعصب۔ تنگ نگہی ضد۔ ہٹ دھرمی۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا۔ نیز شکوک۔ اضطراب وغیرہ سب کا مفہوم آ جاتا ہے۔ اسی بنا پر منافقین کو رجس مجسم کہا گیا ہے (۹۵)۔ یعنی شکوک و اضطراب اور صحیح نظام کے راستے میں خلل اور رکاوٹ۔ برعکس ایمان والوں کے (۲۵-۱۲۳)۔

رجع

رَجُوعٌ کے معنی ہیں پلٹنا۔ لوٹنا۔ واپس ہونا۔ اور رَجَعٌ کے معنی ہیں پلٹانا*۔ لیکن اس حقیقت کو شروع ہی میں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے ہاں جس مفہوم کیلئے رجعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں۔ ہمارے ہاں رجعت سے مراد ہوتی ہے پسپائی۔ کسی کا اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانا۔ (رجعت پسند Re-actionary کو کہتے ہیں)۔ یعنی اسمیں تنزل۔ پستی اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ برعکس اسکے عربی زبان میں اسکے معنی یا تو اُسی پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور یا اُس سے بہتر کیفیت لئے ہوئے۔ چنانچہ اَلرَّجْعَةُ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد، پھر ازدواجی تعلق قائم کر لینے (میاں بیوی بن جانے) کو کہتے ہیں۔ یعنی اُسی پہلی حالت کی طرف لوٹ آنے کو۔ اور لَیْسَ لَیْ لَیْ مِّنْ فُلَانٍ رَّجْعٌ کے معنی ہیں مجھے اس شخص سے کوئی نفع نہیں پہنچا۔ یعنی اس کے ہاں سے کوئی چیز پلٹ کر نہیں آئی۔ اسی طرح عربوں کے ہاں ضرب المثل ہے مَا هُوَ اِلَّا سَجْعٌ لَّیْسَ تَحْتَهُ رَجْعٌ۔ یہ نرا سجع ہی سجع ہے جسکے تحت کوئی (رجع) فائدہ نہیں۔ چنانچہ اَرْجَعْتَ الْاَبِلَ اُسوقت کہتے ہیں جب اونٹ لاغر ہو جانے کے بعد پھر فربہ ہو جائے۔ اور سَفْرَةٌ مَّرْجِعَةٌ اس سفر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ مَتَاعٌ مَّرْجِعٌ۔ بہت نفع بخش جنس۔ رَجِیْعٌ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جسکے بٹ کھل گئے ہوں اور اسے دوبارہ بٹ دیا جائے*۔

رَجَعٌ کے معنی پلٹانا ہیں۔ جو چیز گردش کرتی ہے وہ پلٹ کر اُسی مقام پر آتی ہے جہاں سے وہ چلی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر گردش میں رَجَعٌ پایا جاتا ہے۔ سورۃ الطارق میں ہے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱)۔ اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ کائنات کی بلند فضا یا اس کے اندر جو کُترے ہیں وہ گردش کرتے ہیں۔ اور جس مقام سے چلتے ہیں پلٹ کر وہیں آ جاتے ہیں۔ یا اس کے معنی ہیں وہ بلند فضا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کروں کو یا دیگر اشیا کو پلٹاتی ہے۔ (اور انکی گردش سے کائناتی زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں)۔ پیچھے لوٹنے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۶/۶) میں آیا ہے جہاں اس کے مقابلہ میں مُضِيًّا ہے جس کے معنی آگے چلنے کے ہیں۔

رَجَعَ إِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا۔ (Having a Recourse to)**۔ نیز رَجَعٌ کے معنی ردِ عمل (Reaction) یا نتائج مرتب ہو جانے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعَ الْعَلَفُ فِي الدَّابَّةِ۔ جانور پر چارہ کا اثر نمایاں ہو گیا*۔ رَجَعَ كَلَامِي فِيْهِ۔ میری بات نے اس پر اثر کیا*۔ اَلرَّجِيْعُ مِّنَ الْكَلَامِ کے معنی ہیں وہ بات جو خود کہنے والے کی طرف لوٹا دی جائے*۔

زالہ (اولیٰ) کو بھی رَجَعٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ اس پانی کو واپس دیدیتا ہے جو اس نے زمین سے حاصل کیا تھا۔ نیز بارش کو بھی*۔ اور اس پانی کو بھی جو سطح ارض پر بہ رہا ہو****۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱) کے معنی ہونگے وہ بلندی جو بخارات کو پانی (بارش) کی شکل میں پلٹا دیتی ہے۔

قرآن کریم میں ہے صُمُّ بَكْمٌ عُمِيٌّ فَهَمٌّ لَا يَرْجِعُونَ (۲/۱۸)۔ ایسے مقامات پر یَرْجِعُونَ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو سامنے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک اہل کتاب، جو کسی وقت میں حق پر تھے لیکن بعد میں حق کے راستے سے ہٹ گئے۔ ان سے یہی کہا گیا کہ تم پھر حق کی طرف پلٹ کر آ جاؤ۔ وہ اس سے انکار کرتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف پلٹ کر نہیں آتے۔ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا۔ وہ جب حق کی طرف نہیں آتے تھے تو ان کے

متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔ اسکی طرف آتے ہی نہیں۔ اسکی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم نے لَا يَرْجِعُونَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان مقامات میں صحیح ترجمہ ”رجوع کرنا“، ہوگا۔ ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر حق کی طرف نہیں پلٹتے۔

سورة طہ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے فَرَجَعْنَاكَ اِلٰى اُمِّكَ (۲۰)۔ ”ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا۔“، سورة نور میں ہے۔ وَ اِنْ قِيلَ لَكُمْ اَرْجِعُوْا فَاَرْجِعُوْا (۲۸)۔ ”اگر صاحب خانہ تم سے کہیں کہ واپس چلے جاؤ۔ تو واپس ہو جاؤ“۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی جب باپ کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تو اس کے لئے فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰى اٰبِيْهِمْ۔ کے الفاظ آئے ہیں (۹۲)۔

سورة النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے قاصد کو خط دیکر ملکہ سبا کی طرف بھیجا تو اس سے کہا کہ خط دینے کے بعد پیچھے مڑ آنا۔ اور پھر انتظار کرنا کہ ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ فَاَنْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۸)۔ سورة ق میں موت کے بعد دوبارہ زندگی کو رَجْعٌ کہا گیا ہے (۵۰)۔ یعنی مرنے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا۔ (اس دنیا کی طرف لوٹنا نہیں۔ بلکہ مرنے کے بعد زندہ ہو جانا)۔

اس مقام پر اس غلط تصور کا ازالہ ضروری ہے جو رَجَعْتَ اِلٰی اللہ کے غیر قرآنی مفہوم سے عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کی موت کی خبر سن کر کہا جاتا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُوْنَ (۱۵۶)۔ اور اس کے معنی کئے جاتے ہیں ”ہم اللہ کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں“۔ اس سے ذہن دو صورتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم پیدا ہونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد (حشر کے دن) ایک میدان میں جمع ہونگے جہاں اللہ تعالیٰ بھی ہونگے اور اس طرح ہم لوٹ کر اُس کی طرف چلے جائیں گے۔ یہ تصور اس لئے غیر قرآنی ہے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ہے اور تمام انسانوں کو اس مقام کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ خدا کے لئے کسی خاص مقام کا تعین باطل تصور ہے۔ وہ ہر مقام پر ہے۔ هُوَ مَعَكُمْ اٰیْنَمَآ كُنْتُمْ (۵۰)۔ مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی، اعمال کے جزا و سزا کا رننگ کیا ہوگا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی مسابہت اس زندگی میں

سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ مردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔ قرآن کریم تو یہ بھی کہتا ہے کہ **وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۸۹)**۔ تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔ **وَجِئَآیَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۸۹)**۔ اُس دن جہنم لائی جائیگی۔ خدا کے متعلق کسی خاص مقام یا سمت کا تصور جہاں ہم مرنے کے بعد جائیں گے، قرآن کریم کی رو سے درست نہیں۔ دوسری صورت جسکی طرف ذہن (انثا للہ سے) منتقل ہوتا ہے تصوف کی پیدا کردہ ہے۔ ویدانت (ہندوؤں کے ”تصوف“) کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح (آتما) درحقیقت روح کائنات، یعنی خدا (پر ماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ جزو اپنے کل سے جدا ہو کر مادیات کی دلدلوں میں پھنس چکا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے تناسخ کے چکر کاٹ رہا ہے۔ آخر الامر یہ جزو پھر اپنے کل میں جا ملیگا جس طرح، (اپنشد کے الفاظ میں) ”شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں“۔ ویدانت کا یہی تصور ہمارے تصوف میں آیا جسکی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ ”انسانی روح“ خدا کا ایک جزو ہے اور یہ جزو اپنے کل سے ملنے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند

از جدا ئیها شکایت مسے کند (رومی)

مرنے کے بعد نیک لوگوں کی روح اپنے کل (خدا) میں جا ملیگی۔ یہی زندگی کی کامیابی و کامرانی ہے۔

عشرتِ قطره ہے دریا میں فنا ہو جانا (غالب)۔

”إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ سے (ان کے نزدیک) مراد ہے جزو کا اپنے کل کی طرف لوٹ جانا اور اُس سے جا کر مل جانا۔ اسی لئے یہ لوگ موت کو وصال کہتے ہیں۔ (فلاں صاحب کا وصال ہو گیا۔ یا فلاں بزرگ واصل بالحق ہو گئے) وصال کے معنی مل جانے کے ہیں۔

یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے، اسلئے کہ انسان اور خدا کا تعلق جزو اور کل کا نہیں۔ کسی کل سے اگر کوئی جزو الگ ہو جائے تو کل ناساتمام رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیز ذات خداوندی میں نقص کا باعث ہے۔ لہذا، **إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کا یہ مفہوم بھی غلط ہے۔

* ”انسانی روح“ کی ترکیب بھی غیر قرآنی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ر۔و۔ح)۔

سمت یا مقام کا تصور رَاجِعُونَ کے علاوہ إِلَيْهِ (اس کی طرف) کے لفظ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اسلئے کہ ہم إِلَيْهِ يَا إِلَيْنَا سے خود ہی سمت مراد لے لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس کا ہر جگہ یہی مفہوم نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ - تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب سائے کو کس طرح پھیلاتا ہے۔ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلْنَاهُ سَاكِنًا تَمَّ جَعَلْنَا الشَّجَرُ عَلَيْهِ دَلِيلًا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے قانون مشیت کی رو سے ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سائے نہ گھٹتے نہ بڑھتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سورج کو اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ اس کے گھٹنے بڑھنے کی دلیل (موجب) بن گیا ہے۔ اس کے بعد ہے تَمَّ قَبْضَنَا إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا (۲۵-۳۶)۔ پھر ہم اسے (یعنی سائے) کو اپنی طرف (إِلَيْنَا) کھینچ لیتے ہیں، نہایت آسانی سے کھینچ لینا۔ اس آیت میں إِلَيْنَا کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص سمت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے قانون کائنات کے مطابق سائے سمٹ جاتے ہیں۔ لہذا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کا ایک مفہوم ”خدا کے قانون طبعی کے مطابق نقل و حرکت کرنا“ بھی ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے وَلَوْ أَنَّمَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۸۲)۔ کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے سر بسجود ہے۔ طوعاً و کرہاً۔ اور اس طرح ہر شے کا قدم اُسی سر کی طرف اُٹھتا ہے۔ ہر شے اُسی محور کے گرد گردش کر رہی ہے۔ اُسی قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سورۃ یس میں ہے فَسُبْحَنَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۳)۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے۔ ہر شے کی باگ ڈور اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس لئے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے۔ اس کا ہر قدم اسی قانون کی طرف اُٹھتا ہے۔ اس سے وہ ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتی۔ اور چونکہ ”اشیاء“ میں خود انسان بھی شامل ہیں اسلئے یہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانونِ مکافات کی زنجیروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اسلئے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اُٹھ رہا ہے۔ (وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ)۔

اب یہاں سے ہم خارجی کائنات کے قانونِ طبعی سے آگے بڑھ کر انسانی دنیا کے قانونِ مکافات کی طرف آ گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات میں إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) آئے ہیں۔ مثلاً

ارشاد ہے کَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَافٍ - اُنْ رَّأَاهُ اسْتَغْنَى - جب انسان اپنے متعلق یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں (ہر ایک سے مستغنی ہے) تو پھر سرکشی اختیار کر لیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لا کھ اپنے آپکو مستغنی سمجھے - اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الشَّرْجُ عٰی (۹۶-۸) - وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا - اسے بہر حال اسی قانون کی طرف آنا ہے - اس حقیقت کو وَ اِلٰی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُورُ (۳۵) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی یہاں ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے - سورۃ انبیاء میں ہے کہ تمام نوع انسانی ایک ہی جماعت اور ایک ہی برادری ہے لیکن لوگوں نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے - وَ تَقَطَّعُوا اَمْرًا هُمْ بِبَيْنِهِمْ (۲۱) - اس کے بعد ہے کُلُّ النَّاسِ لِيَّ وَاَجْعَلُوْنَ - اور اس کے بعد ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِّنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِّسَعْيِهِ وَاِنَّا لَنَاقِلُوْهُ (۲۱) - پس جو شخص صلاحیت بخش پروگرام پر کاربند رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اس کی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں - ہم ان سب کو لکھتے رہتے ہیں - اس سے کُلُّ النَّاسِ لِيَّ وَاَجْعَلُوْنَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے قانونِ مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں - تمام اعمال اس محور کے گرد گردش کرتے ہیں - ہر ایک کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے - کوئی اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا - یہ لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری گرفت سے دور جا رہے ہیں حالانکہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف از خود کھینچے چلے آ رہے ہیں - کُلُّ النَّاسِ لِيَّ وَاَجْعَلُوْنَ - نیز دیکھئے (۱۶۵ و ۲۸۱-۸۲) جہاں مکافات عمل کا مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے -

اعمال کے نتائج کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ یہ نتائج صرف دوسری زندگی میں جا کر مرتب ہونگے - یہ تصور بھی صحیح نہیں - اعمال کے نتائج، عمل سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں - پھر ان میں سے بعض نتائج کا ظہور اسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور بعض کا ظہور اس کے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے - لہذا قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ اِلٰی رَبِّكُمْ رَاجِعُكُمْ فَانْزِلْكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹) - اور جس کے معنی یہ کہے جاتے ہیں کہ ”تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے - پس میں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دوں گا،“ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ

جب انسان مرنے کے بعد خدا کی طرف جائیگا تو اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے تمام اعمال ہمارے قانونِ مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے انکے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ اسی کی رو سے انکے نتائج تمہارے سامنے آ جاتے ہیں۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ **فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَالْيَمَّانَا يَرْجِعُوْنَ** (۲۸)۔ ہم ان مخالفین کو جس سزا کی وعید دے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا تیری وفات کے بعد ہو۔ لیکن زود ہو یا بدیر۔ ان کے اعمال کے نتائج بہر حال ہمارے ہی قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ یہ اس کے دائرے سے باہر جا نہیں سکتے۔ **(فَاِلْيَمَّانَا يَرْجِعُوْنَ)**۔

لیکن جن اعمال کے نتائج انسان کی اس زندگی میں سامنے نہیں آتے وہ اس کے بعد کی زندگی میں سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ آیا ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی **اِلَيْهِ تَرْجِعُوْنَ**۔ ”خدا کی طرف لوٹو گے“۔ یعنی تم یہ نہ سمجھ لو کہ اب تو ہم سر گئے اس لئے اب ہم پر کسی کی گرفت نہیں۔ تم مرنے کے بعد بھی خدا کے قانونِ مکافات کی طرف جاؤ گے۔ اس سے تمہارے لئے کہیں مفر نہیں۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے **اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** کا مفہوم۔

بعض مقامات پر یہ لفظ ٹھیک ان معنوں میں بھی آیا ہے جن معنوں میں ہمارے ہاں رجوع کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً **اَنْتَهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ** (۳۶)۔ یہ لوگ اپنے رسولوں کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ ان تصریحات کی روشنی میں **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** کا صحیح مفہوم سمجھئے۔ قرآنِ کریم میں جہاں **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** آیا ہے اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہے کہ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ اس میں جان تک بھی دیندینی پڑتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تمہارے سامنے بھی زندگی کے مختلف پہلو آئیں گے۔ دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی کا خوف۔ بھوک۔ اموال و ثمرات اور نفوس کا اتلاف۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ اس کے بعد ہے **وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** (۲۵۶)۔ تو خوشگوار نتائج کی بشارت دیدے ان لوگوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ

انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری ساری زندگی خدا (کے نظام) کیلئے وقف ہے۔ اور ہم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یا یہ کہ جب ہماری ساری زندگی اُسکے نظام کیلئے وقف ہے تو یہ مشکلات و مصائب ہمیں اُسکے راستے سے ہٹا نہیں سکتیں۔ ان کے علی الرغم ہمارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھتا ہے۔ ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ (إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)۔ اور ہماری اس جد و جہد کے نتائج بھی اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہونگے جس پر ہمیں پورا پورا بھروسہ ہے۔ جتنے موانعات آنا چاہتے ہیں آئیں۔ جتنی رکاوٹیں کوئی ڈالنا چاہتا ہے ڈال لے۔ ہم ان سے گھبرا کر اپنا رخ کسی دوسری سمت کو کبھی نہیں موڑینگے۔ ہمارا ہر قدم، بہر حال و بہر طور، اسی منزل کی طرف اٹھیگا جو ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا منتہی و مقصود ہے۔ (إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)۔ اس کے بعد ہے اُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّهَدُونَ (۱۵۵-۵۷)۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک و تہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے۔ ”اُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّهَدُونَ“ خود ”إِلَيْهِ رَاجِعُونَ“ کی تشریح کر رہا ہے۔

قرآن کریم کے ان مقامات سے واضح ہے کہ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کے یہ معنی نہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے اور ہم لوٹ کر اُس مقام کی طرف اُسکے پاس جائینگے۔ نہ ہی یہ کہ ہماری ”روح“، اُس کل کا ایک جزو ہے اور یہ جزو آخر الامر اپنے کل سے جدا ملیگا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی، نظامِ خداوندی کیلئے وقف ہے۔ (إِنَّا لِلَّهِ)۔ اور دنیا بھر کی مشکلات و مصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اُسی نظام کی طرف اٹھتا ہے۔ اُسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اس کی رو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ وہی ہمارے دائرہ حیات کا مرکز ہے۔ ہماری تمام تگ و تاز کا رخ اسی قبلہ کی طرف ہے۔ (إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ)۔ نیز یہ کہ ہمارا ہر عمل اس کے قانون مکافات کی طرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔ وہ اس سے ادھر ادھر کہیں ہٹ نہیں سکتا۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ اس زندگی میں سامنے آ جائے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی میں۔ اس لئے کہ اس کا قانون مکافات اُسی دنیا تک محدود نہیں۔

رج ف

الْـرَّجْفُ - کسی چیز کا متحرک ہو جانا - یا لرز اٹھنا۔ اس میں حرکت کے ساتھ اضطراب اور پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔ رَجْفٌ الْقَلْبِ - گہرا ہٹ کی وجہ سے دل کا شدید اضطراب*۔ راغب نے کہا ہے کہ الْـرَّجْفُ - اضطراب شدید کو کہتے ہیں**۔ الْـرَّاجِفُ - لرزہ کے ساتھ بخار۔ أَرْجَفْتَ الرِّيحَ الشَّجَرَ - ہوا نے درختوں کو ہلا ڈالا۔ رَجَفْتَ الرُّضُ - زمین متزلزل ہوئی۔ الْـرَّجْفَةُ - زلزلہ۔ أَلَا رَاجِيفٌ - فتنوں کو بیدار کرنے والی، بے حقیقت، اضطراب انگیز خبریں*۔ اس سے فعل أَرْجَفَ آتا ہے۔ الْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ (۳۳/۶) - شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے لوگ جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے*۔

قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے فَاتَّخَذَ تَهُمُ الرَّجْفَةَ (۸۸/۷)۔ ”انہیں زلزلہ نے آن پکڑا،“۔ سورۃ نازعات میں ہے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (۹۶/۷)۔ ”جس دن کانپ اٹھنے والی کانپ اٹھیگی،“۔ دوسری جگہ ہے يَوْمَ تَرْجُفُ الرُّضُ (۱۳۳/۷)۔ جسوقت نچلے درجہ کے لوگ (عوام) سخت اضطراب میں ہونگے۔ یا جسدن زمین لرز اٹھیگی۔

رج ل

رَجُلٌ - (جمع أَرْجُلٌ) - پاؤں (۳۸/۳)۔ رَجَالٌ - پیادہ چلنے والے (یہ رَجُلٌ کی جمع ہے) بمقابلہ رُكْبَانًا (۲۳۹/۲) نیز خَيْلٌ (رسالہ) کے مقابلہ میں رَجِلٌ بمعنی پیادہ لشکر (۱۴۰/۱)۔ رَجُلٌ - مرد۔ جمع رَجَالٌ (۲۲۸/۲)۔ لوگ۔ اشخاص (۲/۴)۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ مرد کو اس کی قوت اور بہادری کی بنا پر رَجُلٌ کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ جَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى (۳۶/۲) اور وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ (۲۸/۲) میں رَجُلٌ کے معنی قوی اور بہادر آدمی کے ہونگے***۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر مشتقات ٹانگ کے معنوں سے مشتق ہیں لیکن الرَّجُلُ بمعنی مرد اس معنی سے جداگانہ مفہوم رکھتا ہے۔

رج م

رَجْمٌ کے اصلی معنی ہیں پتھروں سے مارنا (ابن فارس)۔ پھر اس کے معنی قتل کرنے کے بھی ہو گئے۔ نیز تہمت لگانا اور گالی دینا۔ جھڑک کر

نکال دینا۔ کسی کو چھوڑ دینا یعنی قطع تعلق کر لینا*۔ نیز الرَّجْمُ کے معنی ہیں کسی کو مطعون کرنا*۔ الرَّجَامُ۔ پتھروں کو کہتے ہیں۔ اور میرِ جَام (Sling) یعنی گوبھیا کو جس سے پتھر کو دور پھینکا جاتا ہے**۔

سورة یس میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرَّجُمَنَّكُمْ (۳۶/۱۸)۔ ”اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دینگے“۔ یا قتل کر دینگے۔ سورة شعراء میں ہے لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶)۔ ”تو ان میں سے ہوگا جنہیں سنگسار یا قتل کر دیا جاتا ہے“۔ سورة حجر میں شیطان کو رَجِیْمٌ کہا گیا ہے جس کی تفسیر یہ کہہ کر کر دی گئی اِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ (۳۵/۱۵)۔ لہذا رَجِیْمٌ اور مَلْعُوْنٌ ہم معنی ہیں۔ (مَلْعُوْنٌ کے لئے دیکھئے عنوان ل۔ ع۔ ن)۔ یعنی وہ جو خدا کی نوازشات سے محروم رہ جائے۔ جو اس سے دور ہو جائے۔ جس سے قطع علائق کر لیا جائے۔ جس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے۔

رَجْمٌ۔ اٹکل پچو باتیں کرنا۔ چنانچہ حَدِیْثٌ مَّرَجَمٌ کے معنی ہیں ایسی ظنی بات جس کی حقیقت معلوم نہ ہو سکے*۔ رَجْمَ الرَّجُلِ بِالْغَیْبِ کے معنی ہیں اس آدمی نے غیب کے متعلق ایسی بات کہی جسے وہ جانتا نہیں۔ قَالَهُ رَجْمًا۔ اس نے یونہی اٹکل پچو بات کہہ دی**۔ سورة کہف میں ہے کہ یہ لوگ جو اصحاب کہف کی تعداد بتاتے ہیں یونہی رَجْمًا بِالْغَیْبِ (۱۸/۱۱) باتیں کہتے ہیں۔ یعنی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ بسے جانے بوجھے (حقیقت کا علم رکھے بغیر) اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ صاحب لطائف اللغة نے بھی الرَّجْمُ کے معنی اللَّظَنَ لکھے ہیں۔

زمانہ قدیم میں مندروں اور معبدوں میں کاہن ہوتے تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ (اب بھی مندروں کے پجاری اور خانقاہوں کے پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں)۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہم یہ باتیں ”آسمان“ سے سنکر آتے ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ یہ سب رَجْمًا باتیں کرتے ہیں۔ یعنی محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔ ان میں سے کبھی کبھار کوئی بات ٹھیک بھی نکل آتی ہے (جیسے دس قیاسی باتوں میں سے ایک آدھ ٹھیک نکل آیا کرتی ہے) ورنہ انہیں علم و حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دیکھئے (۱۵/۱۸ و ۱۶/۹ و ۱۷/۹ و ۱۸/۹)۔ نزول قرآن کے بعد علم و بصیرت کا زمانہ آگیا، اس لئے اس قسم کی توہم پرستیوں کیلئے اب کوئی گنجائش نہ رہی۔ اب ان خرافات کو ”آسمان سے آتشیں کوڑے“ پڑتے ہیں۔

جیسا کہ (ل۔ع۔ن) کے عنوان میں بتایا جائیگا، قرآن ک۔ریم کی رو سے لَعْنَت گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ یعنی غلط روش کی بنا پر زندگی کی ان خوشگوار یوں سے محرومی جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ جسے اس طرح خوشگوار یوں سے محروم کر دیا گیا ہو وہ مَلْعُونٌ کہلائیگا۔ یہی معنی رَجِيمٌ کے ہیں۔ یعنی دور پھینکا ہوا۔ یعنی جو ان خوشگوار یوں سے محروم ہو۔ اسکے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے۔ اس سے دور دور رہا جائے۔ ہر وہ قوت یا جذبہ جو ہمیں قوانین خداوندی کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرے یا جہالت اور بے بصری کی طرف مائل کرے، اس قابل ہے کہ اس سے دور دور رہا جائے۔ اسی کو ملعون یا رجیم کہا جائیگا۔

رج و

الرَّجَاءُ۔ امید (یأْس کی ضد ہے)*۔ بالعموم یہ ایسی امید کو کہتے ہیں جو موہوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے ظن کے لئے بولا جاتا ہے جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ لیکن چونکہ خوشی اور ڈر دونوں لازم ملزوم ہیں اس لئے پھر یہ ایسے ظن کے لئے بھی بولا جانے لگا جس میں خوف ہو۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ آمَلٌ اور رَجَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ آمَلٌ تو پسندیدہ امر کے لئے آتا ہے اور رَجَاءٌ پسندیدہ اور غیر پسندیدہ دونوں کے لئے**۔ ازہری نے کہا ہے کہ رَجَاءٌ کے ساتھ اگر حرف نفی ہو تو اسکے معنی خوف کے آتے ہیں*۔ ابن قتیبہ نے بھی لَا يَسْرُجُونَ کے معنی لَا يَخَافُونَ کہتے ہیں (القرطین۔ جلد ۱)۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ بعض اوقات رَجَاءٌ کا لفظ بول کر خوف کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ لَا رَجَاءَ۔ موخر کرنا۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا۔ معاملہ کو ملتوی کرنا۔ الرَّجَاءُ۔ کنارہ۔ کنویں کا کنارہ، اوپر سے نیچے تک*۔ طرف۔ جمع آرْجَاءٌ (۶۹)۔ مَرْجُونَ۔ جس سے امیدیں وابستہ ہوں (۱۱)۔ مَرْجُونَ۔ جنہیں انتظار میں رکھا جائے۔ جن کا معاملہ تعویق میں ڈال دیا جائے۔ (۱۰۶)۔ سورۃ شعراء میں ہے قَالُوا أَرْجَاهُ (۲۶)۔ ”انہوں نے کہا کہ اسکے معاملہ کو تاخیر میں ڈال دو“۔ (نیز ۱۱۱)۔ سورۃ احزاب میں ہے تَرْجِي مَن تَشَاءُ مِّنْهُمْ وَتَوْوِي إِلَيْكَ مَن تَشَاءُ (۳۳)۔ یہاں تَرْجِي کے معنی ہیں پیچھے رکھنا۔ الگ ہٹا دینا۔ کنارے کی طرف ڈال دینا۔ بمقابلہ تَوْوِي۔ اپنے پاس جگہ دینا۔

روح ب

رَحْبَ الشَّيْ رَحْبًا - وسیع ہونا۔ اَرَحْبَةً - اس نے اسے وسیع کر دیا۔ ابن فارس نے بھی اس مادے کے بنیادی معنی وسعت اور کشادگی بتائے ہیں۔ طَرِيقٌ رَحْبٌ - وسیع راستہ۔ مَرَحِبًا بیک - تو کشادہ جگہ میں آیا ہے۔ تجھ سے یہاں وسعت اور کشادہ ظرفی کا سلوک ہوگا۔ رَحْبَةً - مکان کا صحن *۔ قرآن کریم میں ہے وَضَاقَتْ عَلَیْکُمْ اِلَّا رُضٌ بِمَا رَحَبْتَ (۹/۲۵)۔ ”زمین اپنی فراخیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی“۔ سورۃ ص میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا مَرَحِبًا بِکُمْ (۳۸/۱)۔ ”تمہارے لئے کشادگی نہیں“۔ تمہیں کوئی خوش آمدید نہیں کہتا۔ یہ ہے جہنم کی زندگی جس میں کوئی ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش نہ ہو۔ جہاں کوئی کسی آنے والے کو مرحبا نہ کہے۔ جہاں نہ دل میں کشادگی ہو نہ نگاہوں میں وسعت۔ نہ کسی کے لئے پیشانی خندہ ہو نہ لب متبسم۔ اگر ہوں بھی تو محض دکھاوے کے لئے۔ دل میں ہر ایک، دوسرے کیلئے کہے کہ لَا مَرَحِبًا بِکُمْ۔ یہ مصیبت کہاں سے آگئی؟

روح ق

رَحِیقٌ - خالص پرانی، عمدہ خوشبو والی، بہترین شراب۔ وہ شراب جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو۔ اسی جہت سے ہر خالص شے کو رَحِیقٌ کہتے ہیں۔ مثلاً حَسَبٌ رَحِیقٌ - خالص حسب۔ مِسْکٌ رَحِیقٌ - وہ مشک جس میں کچھ ملاوٹ نہ ہو *۔

قرآن کریم نے اہل جنت کے سلسلہ میں رَحِیقٌ مَخْتُومٌ (۸۳/۲۵) کہا ہے۔ یعنی خالص مشروب، اور پھر اس طرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے۔ زندگی کی پاکیزہ سرور اور خوشگواریاں۔

روح ل

الْقَرْحُلُ - (جمع رَحَالٌ) - کجا وہ۔ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اسلئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہو کر سفر کیا جائیگا۔ پھر یہ لفظ خود اونٹ کے لئے، نیز جس چیز پر بیٹھا جائے، یا جہاں اترا جائے، نیز مکان کے لئے بولا جاتا ہے * اس لفظ کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن میں سامان وغیرہ رکھ کر لادا جاتا ہے۔ مثلاً خرجیں۔ یا پوریاں *۔ سورۃ یوسف میں ہے فِی رَحَالِہِمُ (۱۲/۱)۔ ”ان کی پوریوں میں“۔

السَّرْحَةُ* - سفر* - نیز وہ جگہ جہاں کا انسان سفر کرے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سفر جاری رکھنے اور سفر کرتے رہنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے رَحْلَةً الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶)۔ ”گرمی اور سردی کے سفر“۔ اَلْمَرَّحَلَةُ* - وہ مسافت جسے آدمی ایک دن میں عادتاً طے کر لیتا ہو* - منزل۔

ر ح م

رَحْمٌ و رَحِيمٌ* - بطن عورت کا وہ خانہ جس میں بچہ پرورش پاتا ہے اور اس غلاف میں خارجی اثرات سے محفوظ رہتا ہے* - اس معنی میں رُحْمٌ بھی بولا جاتا ہے (راغب)۔ رَحْمَةً وہ عطیہ جو کسی کی ظاہر و باطن کمی کو پورا کر دے (اور جسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے)* - عطیہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز بغیر قیمت اور بلا مزد یا بے معاوضہ دی جائے۔ لہذا رَحْمَتٌ وہ سامانِ نشو و نما ہے جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ روم میں ہے وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا - وَإِنْ تُصِيبْهُمْ سَيْئَةٌ بِمَا قَدْ سَمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ (۳۶) ”اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے لطف اندوز کراتے ہیں تو وہ اس پر اترا جاتے ہیں۔ اور جب ان پر ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں،،۔ یہاں رحمة بمقابلہ سیئة آیا ہے۔ لہذا اس سے مراد زندگی کی تمام خوشگواریاں مراد ہیں۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں رزق کی بسط و کشاد کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں رحمة سے مراد رزق (سامانِ زیست) ہے جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں والدین کے سلسلہ میں اولاد کی آرزو بتائی گئی ہے کہ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا (۱۳۳)۔ ”اے میرے رب تو ان کی نشو و نما کر جیسا انہوں نے مجھے اس وقت پالا تھا جب میں چھوٹا سا تھا،،۔ سامانِ رزق جو بارش سے پیدا ہوتا ہے، یعنی فصلیں، رَحْمَتٌ ہیں (۳۶ و ۲۲)۔ زندگی کی خوشگواریاں (نعماء) جو بلا معاوضہ ملتی ہیں، رَحْمَتٌ ہیں۔ (۹۱۰)۔ قصہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ جو دیوار کے نیچے مدفون تھا، اسے اللہ کے حکم سے اس طرح محفوظ کر دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بلوغت کے بعد ملے۔ اس خدائی انتظام کو رَحْمَتٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸۸)۔

نیز رَحْمَةً کے معنی کسی کو ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں*۔ اسی لئے قرآن کریم میں ضَرَرٌ کے مقابلہ میں رَحْمَةً آیا ہے (۱۰۱ و ۱۰۲) اور سَيِّئَةً کے مقابلہ میں بھی (۳۶)۔ اور اَهْلَکَ کے مقابلہ میں رَحِیمٌ بھی (۶۷)۔

چونکہ خدا کی ربوبیت کے معنی صرف انسانی جسم کی نشو و نما نہیں بلکہ اس کے شرفِ انسانیت (انسانی ذات - Self) کی نشو و نما (Development) بھی ہے جو اُس ضابطہٗ حیات کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے، اسلئے وحی کو بھی رَحْمَتٌ کہا گیا ہے۔ (۱۰۵ و ۱۰۶)۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کی راہ نمائی سب سے بڑا ذریعہ نشو و نما ہے جو یکسر وہی طور پر ملتا ہے، اس لئے رحمتِ خصوصی ہے۔

چونکہ خدا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہے (یعنی تمام کائنات کو نشو و نما دینے والا اور نوعِ انسانی کی صلاحیتوں کی تکمیل کرنے والا) اس لئے اس نے سامانِ نشو و نما کا وہی طور پر عطا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِکُمُ الرَّحْمَةَ (۶۷)۔ ”تمہارے رب نے سامانِ نشو و نما کا بہم پہنچانا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے،“۔ اس طرح وہ کائنات کی ہر شے کو اپنے دامنِ ربوبیت و پردہٗ رحمت میں لئے ہوئے ہے (۳۰)۔ اسی لئے سورۃ فاتحہ میں، رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے ساتھ ہی۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ بھی آیا ہے (۱-۲)۔ زبان کے قاعدے کے لحاظ سے رَحِیْمٌ کے معنی ہونگے عمومی طور پر مسلسل سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا۔ اور رَحْمٰنٌ وہ جو کسی ہنگامی ضرورت کے وقت شدت اور غلبہ کے ساتھ سامانِ رحمت بہم پہنچائے**۔ اول الذکر طریق کو نشو و نما کا عام ارتقائی ذریعہ اور ثانی الذکر کو انقلابی ذریعہ کہا جاسکتا ہے۔ یا دَوْرِ حاضر کے علمِ الحیات (Biology) کی اصطلاح میں اول الذکر (Progressive Evolution) ہوگی۔ اور آخر الذکر فجائی ارتقاء (Emergent Evolution)۔ یہ فرق تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔ سورۃ الرحمن میں ہے یَسْئَلُهُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ کُلُّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵)۔ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے (اپنی

* تاج۔ ** المنار۔ رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے (جیسے عَطَشَانٌ۔ غَصْبَانٌ) اور رَحِیْمٌ کا وزن فَعِیْلٌ ہے (جیسے عَلِیْمٌ۔ حَکِیْمٌ وغیرہ)۔ فَعْلَانٌ ان صفات کے لئے آتا ہے جو شدید اور ہنگامی ہوں اور فَعِیْلٌ ان کے لئے جو لازم و ثابت ہوں۔

نشو و نما کے لئے) خدا (کے ذرائع ربوبیت) کا محتاج ہے۔ پھر، ان چیزوں کا یہ عالم نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی ہیں اس لئے انہیں ایک ہی قسم کا سامانِ نشو و نما ملتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ان کی حالت میں ہر وقت تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ان کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ رحم مادر کے اندر جنین کی نشو و نما کا تقاضا کچھ اور۔ بچے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ بڑے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ جب تک کوئی شے ایک حالت میں رہتی ہے، خدا کی صفت رحیمیت کے مطابق اس کی نشو و نما ایک انداز سے ہوتی جاتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی حالت بدلتی ہے اس کی صفتِ رحمانیت کے مطابق اس کی نشو و نما کے انداز و طریق میں بھی ہنگامی تبدیلی آجاتی ہے۔ یوں عمومی ارتقاء اور ہنگامی ارتقاء کے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر شے اپنے نقطہ آغاز سے منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے رب۔ رحمٰن اور رحیم سے مراد۔

رَحْمٌ کے اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق قرابت (رشتہ داری) پر بھی کیا جاتا ہے*۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ بَيْنَهُمَا رَحْمٌ (ان دونوں کے درمیان قریبی قرابت داری ہے)۔ اَرْحَامٌ۔ رَحْمٌ کی جمع ہے (۳/۵) یعنی رحم مادر۔ نیز اس کے معنی رشتہ داری کے آتے ہیں۔ (۶/۳)۔ نیز (۳/۱)۔ اُولُوْاْ رَحَامٍ کے معنی رشتہ داروں کے ہیں (۸/۵)۔

چونکہ رَحْمٌ میں نرمی ہوتی ہے اس لئے یہ لفظ سختی کے مقابلہ میں نرمی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَشِدَّاءُ عَلٰی الْكَفَّارِ رَحْمَاءُ بَيْنَهُمْ (۳/۹)۔ مخالفین کے مقابل میں سخت اور باہمدگر بہت نرم۔ سورۃ کہف میں اَقْرَبَ رَحْمًا (۱۸/۱) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں رشتے داری کا زیادہ پاس کرنے والا۔ لیکن ابن فارس نے اَلرَّحْمَةُ اور اَلرَّحْمَةُ ہم معنی بتائے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زیادہ مہربان اور ہمدردی کرنے والا، نرم خواہ و فاکیش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رِقَّت (نرمی) اور تعطف و میلان کے ہیں۔

چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ (اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں) گنہگار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہو سکتا، اس لئے ان کے نزدیک نجات صرف خدا کے رَحْم (Mercy) سے ملتی ہے۔ رَحْمٌ کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فلاح و فوز (کامیابی و کامرانی) اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ خدا

کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے جسے قانونِ مکافات عمل کہتے ہیں۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِنَاسٍ اِلَّا نَسِآنِ اِلَّا مَآ سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ جد و جہد کرے۔ البتہ اس سعی و عمل کے لئے، انسان کو مختلف صلاحیتیں، خارجی کائنات میں سامانِ نشو و نما اور عقل کی راہنمائی کے لئے وحی کی روشنی، خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے، اس لئے یہ سب رَحْمٌ مِّنْ دَاخِلٍ ہے۔ یعنی یہ تمام نشو و نما خدا کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ اب جو شخص ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر خدا کے قانون کے مطابق اپنی ذات کی نشو و نما کرلیگا (جو ایک صحیح معاشرہ کے اندر دوسروں کی ربوبیت سے ہوتی ہے) وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے بہرہ یاب ہو جائیگا۔ جو ایسا نہ کریگا، وہ ان سے محروم رہ جائے گا۔ اسے خدا کا قانون مکافات کہتے ہیں۔ لہذا انسان اپنی منزلِ مقصود تک خدا کی (Grace) سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق پہنچتا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

اَن بَہِشْتِیْ کَہ خدائے بتوبخشند ہمہ ہیچ

تا جزائے عملِ تست، چناں چیزے ہست

اسی بنیادی تصور سے قرآن کریم ایسی قوم تیار کرتا ہے جو اپنی جنت کے گل و لالہ اپنے خون جگر سے کھلاتی ہے۔ اور اپنا جہانِ نو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اپنی قوت بازو سے پیدا کرتی ہے۔

ر خ و

الرَّخْوُ - نرم چیز۔ رَخَّوَالشَّيْءُ وَرَخِيَ - رَخًا - کسی چیز کا نرم یا ڈھیلا ہو جانا۔ اسْتَرَخِيَ کے بھی یہی معنی ہیں۔ اَرُخَاهُ - رَاخَاهُ - اسنے اسکو نرم کر دیا اَرُخِيَ دَا بَلَّتَهُ : اسنے اپنے جانور کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے اسکی حسب مرضی چلنے دیا۔ اَلرَّخَاءُ - نرم رفتار ہوا*۔ قرآن کریم میں ہے تَجَرَّيْ بِأَمْرِهِ رُخَاءً (۳۸/۳۶) - وہ (ہوا) اُس کے حکم سے نرمی اور سبک رفتاری اور آزادی سے چلتی تھی - فَرَسٌ رَّخْوَةٌ - سبک رفتار اور نرم خو گھوڑے کو کہتے ہیں*۔

رد ا

الرَّادُّعُ - بھاری بوجھ جو ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں۔ رَدَّأَ الشَّيْءُ بِيْہ - اس نے کسی چیز کے ذریعے کسی چیز کو سہارا دیا۔ تقویت

دی۔ مددگار بنایا۔ اصل میں اَلرَّدُّ دُءٌ مددگار، معین اور ناصر کو کہتے ہیں*۔ جب کسی جانور پر اس طرح بوجھ لادا جائے کہ اس کے دونوں طرف کے بوجھ ہم وزن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو رَدُّءٌ کہتے ہیں۔ وہ اس طرح ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے فَارْجِلُهُ مَعِيَ رَدًّا (۲۸/۳۳)۔ ”اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بیٹھ دے“۔

رَدِّیٌّ*۔ پیچھے پیچھے آنے والے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں اسے مذموم شے کیلئے استعمال کرنے لگ گئے** (کیونکہ عموماً پیچھے لگنے والی چیز اگلی سے کمتر ہوتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دو بنیادی معنی ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن ہیں (۱) کسی چیز کا خراب یا ردی ہو جانا۔ اور (۲) مدد کرنا۔

ر د د

رَدَّةٌ۔ يَرْدُّہُ۔ کسی کو لوٹا دینا۔ واپس کر دینا۔ رَدَّہُ عَنِ الْاَمْرِ۔ اس نے اسے اس بات سے لوٹا دیا۔ رَدَّةٌ کے بعد اگر عَلٰی آئے تو اس میں تحقیر اور اہانت کا پہلو ہوتا ہے۔ مثلاً رَدَّہُ عَلَیْہِ الشَّیْءُ۔ اس نے اس کی چیز قبول نہ کی اور حقارت کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔ لیکن اگر اس کے بعد اِلٰی ہو تو اس میں عزت و اکرام کا پہلو ہوتا ہے۔ فَرَدَّدْنَاہُ اِلٰی اُمِّہِ (۲۸/۳۳) ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کی طرف (عزت و اکرام کے ساتھ) واپس کر دیا۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں) اَلرَّدُّ۔ ردی شے۔ دَرُّہُمْ رَدًّا۔ کھوٹا سکھ۔ لَا مَرَدَّةَ فِیْہِ۔ اسمیں کوئی فائدہ (Return) نہیں۔ اِرْتَدَّ الشَّیْءُ۔ چیز واپس ہو گئی، پلٹ گئی۔* راغب نے لکھا ہے کہ اِلَّا رَدَّ اَدُّ اُسی راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو**۔ تَرَدَّدَ اِلَیْہِ۔ وہ اس کے پاس بار بار آیا گیا۔ یہیں سے تَرَدَّدَ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی معاملہ میں مذبذب رہنا اور کسی فیصلہ تک نہ پہنچ سکرنا**۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَبَعَثُوْا لَتَّہُنَّ اَحَقَّ بِرَدِّہُنَّ (۲۲۸/۲) ان کے خاوندوں کا زیادہ حق ہے کہ انہیں واپس لے لیں۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے یَوْمَ لَا مَرَدَّ لَہُ (۲۲/۲) وہ دن جو آکر پھر واپس نہیں جائیگا۔ جسے ٹالا نہیں جاسکیگا۔ (۱۹/۱) میں خَیْرٌ مَرَدًّا آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں انجام کار کے لحاظ سے نفع بخش۔ سورۃ شوریٰ میں ہے هَلْ اِلَّا مَرَدًّا مِّنْ سَبِیْلٍ (۲۲/۲)۔ ”کیا اس کے واپس چلے جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے“؟ [فَرَدَّدُوْا اَیْدِیْہُمْ فِیْ اَفْوَاهِہِم] (۱۹/۱) کیلئے

دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی [اس لفظ میں مآل اور انجام کار کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے ، اسلئے اعمال کے نتائج کے لئے اس کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔

سورة حم السجده میں ہے اَلَيْسَ يَرْدُّهُمُ السَّاعَةُ (۳۱) انقلاب کس وقت آئیگا ، اسکا علم خدا ہی کیلئے مخصوص ہے۔ اس کا علم اُسی سے متعلق ہے۔ اُسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے ، اور کسی کی طرف نہیں جاتا۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اوروں کو صرف قیاس اور اندازہ ہو سکتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ و۔ ع)

مَرْدُوْدٌ۔ واپس کیا ہوا ، لوٹایا ہوا (۹۱)۔ سورة هود میں ہے عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ (۱۱)۔ جسے واپس نہ کیا جا سکے۔ جو آکر رہے۔

سورة نحل میں ایک آیت ہے جو قرآنی نظام ربوبیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی مختلف استعداد ہوتی ہے [اسکا مقصد ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے معاشرہ کے چھوٹے بڑے، ہر قسم کے کام چلتے رہتے ہیں دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ر] لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اس کے ماحصل (رزق) کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لیں۔ یعنی وہ یہ سمجھ لیں کہ چونکہ یہ ہماری ہنر مندیوں سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہم ہی اس کے مالک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلُوْا بِرَادِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا سَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ (۱۶)۔ ”جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اپنے رزق کو اپنے زیر دستوں کی طرف نہیں لوٹاتے (اس ڈر سے کہ) اس طرح یہ سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے“؟ ”برآدِی“ کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انہیں بطور خیرات کے دیدیں۔ کہا یہ ہے کہ یہ فالتو رزق ، درحقیقت اُن کیلئے ہے جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور جنہیں اسکی ضرورت ہے، اسلئے جسکے لئے یہ ہے اُسی کی طرف اسے لوٹا دینا چاہیئے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ تم اس سے انکار کرتے ہو کہ کمانے کی استعداد اور رزق کے اسباب و ذرائع خدا کی نعمتیں ہیں جو اسکی طرف سے مفت ملی ہیں۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶)۔ ”کیا یہ لوگ جو اپنی زائد از ضرورت دولت کو ان کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اسکی ضرورت ہے، خدا کی نعمت سے انکار کرتے ہیں“؟ یہ ہے قرآن کریم کا سوشل آرڈر۔ عمرانی اور معاشی نظام۔ (اسکی تفصیل میری کتاب ”نظام ربوبیت“، میں ملیگی)۔

ر د ف

الرَّادِفُ - الرَّادِفُ - سوار کے پیچھے جو دوسرا شخص سوار ہو وہ اس کا رَدِیْفُ یا رَدِیْفُ کہلاتا ہے۔ ایسے ہی ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے پیچھے ہو۔ رَدِیْفَہُ و رَدِیْفَہُ - اس کے پیچھے پیچھے ہونا* - قرآن کریم میں ہے عَسَىٰ أَنْ يَكُونَنَّ رَدِیْفَ لَكُمْ (۲۴)۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آ رہی ہو“۔ تمہارے بالکل قریب ہو۔ ساتھ لگی ہوئی ہو۔ مُرَدِیْفُ - اپنے پیچھے کسی کو سوار کرنے والا نیز کسی کے پیچھے لگنے والا* - مِّنَ الْمُتَلَاكِيَةِ مُرَدِیْفِیْنِ (۹)۔ ”یکے بعد دیگرے مسلسل آنے والے“۔ راغب نے کہا ہے کہ الْمُرَدِیْفُ اگلے سوار کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے دوسرے شخص کو بٹھالے**۔ رَادِفُ - پیچھے (یا قریب) آنے والا۔ تَتَّبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۹)۔ ”پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئیگی“۔ یعنی جزا و سزا کی ساعت۔ خدا کا قانون مکافات۔ ظہور نتائج کا وقت۔ ہر عمل کا نتیجہ جو اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

ر د م

الرَّدْمُ - کسی خلا یا شگاف کو بند کر دینا۔ سَدٌّ بھی اس کا مترادف ہے۔ لیکن رَدْمٌ میں سَدٌّ سے کچھ زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے۔ رَدْمُ الْبَابِ - دروازہ بند کر دینا۔ اس کا ایک تمہائی حصہ بند کر دینا***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شگاف کے بند کر دینے کے ہوتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا (۱۸)۔ اس سے پہلی آیت میں سَدًّا کہا گیا ہے (۱۸)۔ یعنی اس قوم نے ذوالقرنین سے کہا کہ ہمارے لئے ایک روک سی (سَدٌّ) بنا دے۔ اس نے کہا کہ روک سی کیوں! میں تمہارے لئے اچھی خاصی اونچی دیوار (رَدْمٌ) بنائے دیتا ہوں۔

ر د ی

رَدَّی و تَرَدَّی - (فی البیئر) وہ کنویں میں گر پڑا (اس معنی میں رَدَّی کے ساتھ رَدَّی بھی بولا جاتا ہے)۔ نیز پہاڑ سے گر کر مر گیا*۔ مَایَغْنِی عَنْہُ مَالُہُ إِذَا تَرَدَّی (۱۲)۔ جب وہ تباہیوں کے جہنم میں سر کے بل

گریگا تو اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہ آسکیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ تَرَدَّی کے معنی ہیں اپنے آپ کو تباہیوں کے سامنے پیش کر دینا۔ یعنی جو شخص مال سمیٹ کر رکھتا ہے اور اسے انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتا وہ تباہیوں کو آواز دیکر اپنے گھر بلاتا ہے۔ اَلْمُتَرَدِّیَّةُ۔ اس جانور کو کہتے ہیں جو گر کر مر جائے۔ اسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے (۵/۳۸)۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنی عام ہلاکت کے بھی لئے جاتے ہیں۔ رَدِیَ فُلَانٌ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ فَهُوَ رَدٍ۔ وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ اَرْدَاهُ غَیْرُهُ۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا۔ اَلرَّادِیُّ۔ تباہی بربادی۔ ہلاکت۔ (اَلرَّادِیُّ۔ چادر)۔ سورۃ طہ میں ہے فَتَرَدِّی (۲۰/۱۶)۔ تو ہلاک ہو جائے۔ سورۃ حٰم السجدہ میں ہے اَرْدَاکُمْ (۲۱/۳)۔ اس کے معنی تباہ و برباد کر دینا ہیں۔ اَلْمَرْدِیُّ۔ پھینکے ہوئے پتھر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں بنیادی معنی پھینکنے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے اَلتَّرْدِی کے معنی لا ابالی پن سے کسی ہلاکت گاہ میں گر جانا بھی لکھے ہیں۔ رَادِی عَنِ الْقَوْمِ کے معنی ہیں اس نے قوم کی مدافعت میں پتھر پھینکے۔ (رَدِیُّ۔ کے لئے عنوان دیکھئے رد)۔

ر ذ ل

اَلرَّذَلُ۔ وہ چیز جس سے اس کے ردی اور نکما ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔ اَلرَّذَلُ۔ اَلرَّذَالُ۔ اَلرَّذِیْلُ۔ وہ آدمی جو دوسروں سے کمتر درجہ کا ہو۔ حقیر اور کم مرتبہ انسان۔ نیز ردی اور نکمی چیز جس میں سے اچھی چیزیں نکال لی گئی ہوں۔

اَلرَّذَلُ۔ بہت زیادہ حقیر گھٹیا اور نکما۔ اس کی جمع اَرْدَالُوْنَ اور اَرَادِلُ آئیگی۔ قرآن کریم میں ہے کہ قوم نوح کے سرداروں نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا کہ جو لوگ تیری جماعت میں شامل ہوئے ہیں ”ہُم“ اَرَادِلُنَا“ (۱۱/۱)۔ وہ ہمارے معاشرے کے حقیر اور رذلیل لوگ ہیں۔

اَرْدَالِ الْعُمَرِ (۱۶/۱) عمر کا ردی حصہ۔ بڑھاپے کا وہ حصہ جس میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لَا یَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمِ (۱۶/۱)۔ انسان ان چیزوں کو بھی بھول جاتا ہے جن کا اسے پہلے علم ہوتا ہے۔ حافظہ جاتا رہتا ہے۔

رزق

رزق^۱ - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - یا جو غذا خدا کی طرف سے ذی حیات کو بطور سامان نشو و نما ملے - بارش کو بھی رزق^۲ کہتے ہیں اور مقررہ آمدنی کو بھی - چنانچہ مَرَّتْ رِزْقَتَہ^۳ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کی تنخواہیں یا راشن اور روزینے مقرر ہوں - نیز رِزْقَتَہ^۴ اس سامان خوراک کو کہتے ہیں جو فوجی کو بطور راشن دیا جاتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو وقت مقرر پر دینا - اس کے بعد بلا قید وقت ہر عطیہ پر اس کا اطلاق ہونے لگ گیا -

قرآن کریم نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رِزْقُ اللہ (۱۶۰) کہا ہے - سورۃ حجر میں مَعَايِشَ اور رِزْقُہم^۵ معنی استعمال ہوئے ہیں - (۱۶۰) - لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ زندگی موت کے بعد بھی مسلسل آگے چلتی ہے اس لئے اس کے نزدیک سامان نشو و نما کی ضرورت صرف طبعی جسم کی پرورش ہی کے لئے نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی ہے - اس لئے قرآن کریم نے مرنے کے بعد انسانی ذات کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع کو بھی رِزْقُہ^۶ سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵۸) - اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جنت زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے - وہاں بھی انسانی ذات کی نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا - (تفصیل ج - ن - ن کے عنوان میں ملیگی) -

لہذا رِزْقُہ^۷ سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے - حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں سامان زیست (ضروریات زندگی) کی تقسیم قانونِ وحی کے تابع ہو (جسے نظام ربوبیت کہتے ہیں) تو انسانی جسم کی نشو و نما اور اس کی ذات کی نمود و بالیدگی بلا مشقت ہوتی چلی جاتی ہے - یہ نظام ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جن کے متعلق فرمایا کہ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۲/۲۸۰) - جو کچھ سامان نشو و نما ہم انہیں دیتے ہیں، وہ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں - اسے سمیٹ کر نہیں بیٹھ جاتے، اور نہ ہی تسالے لگا دیتے ہیں، بلکہ اسے کھلا رکھتے ہیں (دیکھئے عنوان ن - ف - ق) - چونکہ یہ نظام قانونِ خداوندی کے تابع متشکل ہوتا ہے اس لئے اس نظام کی وساطت سے تقسیم رزق کے متعلق

اللہ نے کہا ہے کہ یہ رزق ہماری طرف سے ملتا ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاٰیٰتِہُمْ (۱۵۲ و ۱۵۱)۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی“۔ اس طرح خدا کی یہ ذمہ داری کہ وہ ہر متنفس (چلنے والے) کو رزق دیتا ہے (۱۶) بطریق احسن پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ (اگر ایسا معاشرہ قائم نہ ہو اور رزق کی تقسیم انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ہو تو جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں) لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ غلط معاشرہ میں رزق کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جاتی ہے اور نچلے طبقہ کے لوگ نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں (۱۰)۔ اس لئے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے اس میں انسان کی صرف محنت (Labour) ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ لہذا انسان صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ باقی سب کچھ خدا کا ہے اور اسے اس کے احکام کے مطابق تقسیم ہو جانا چاہئے۔ (۱۳ و ۱۴)۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی جس میں قرآنی معاشرہ میں تقسیم رزق کے اہم مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔) بہر حال اسے ایک مرتبہ پھر سن رکھنا چاہئے کہ جو حکومت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے (اسے اسلامی حکومت کہتے ہیں) اس کا بنیادی منشور یہ ہوتا ہے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی (سامان رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے۔ اس نظام میں، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اُست کی تحویل میں رہتے ہیں اور فاضلہ دولت بھی کسی کے پاس نہیں رہتی۔ یعنی اس میں ہر شخص پوری پوری محنت سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ یوں مملکت ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتی ہے۔ خدا کے دئے ہوئے رزق کی، خدا کے بندوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم، یہ ہے اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد۔

سورۃ واقعہ میں ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ (۵۶)۔ راغب نے کہا ہے کہ یہاں اس کے معنی نَصِیْب یعنی حصہ کے ہیں۔ لیکن اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم قرآن جیسی کتاب کو اس لئے جھٹلاتے ہو کہ اس سے تمہاری روٹی چلتی رہے!

ر س خ

رَسَخَ - يَرَسُخُ - رَسُوْخًا - کسی چیز کا اپنے مقام پر محکم اور جائے گیر ہو جانا۔ رَسَخَ الْمَطَرُ - بارش کا پانی زمین میں جذب ہو گیا*۔ یہ اسوقت بولینگے جب بارش کا پانی اس حد تک زمین کے اندر چلا جائے کہ وہ زمین کی نمی سے جا ملے۔

قرآن کریم میں الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ آیا ہے (۳/۶)۔ اس کے معنی ہونگے وہ لوگ جو علم میں پختگی حاصل کر لیں اور علم کی تہہ میں اتر جائیں۔ راغب نے کہا ہے کہ رَسِخَ فِي الْعِلْمِ وہ ہے جو علم میں اس حد تک تحقیق کر چکا ہو کہ اس کا کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو**۔

قرآن کریم اپنی دعوت علی وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اسے غور و فکر اور علم و تحقیق کی رو سے ساننے کی تلقین کرتا ہے۔ لہذا رَسِخَ فِي الْعِلْمِ وہ شخص ہے جو اپنی تحقیق کی رو سے یقینی نتائج تک پہنچ جائے اور اس طرح اس کا ایمان علی وجہ البصیرت محکم ہو جائے۔ (آیت ۶ کے مفہوم کے لئے، عنوان ح۔ ک۔ م کے تحت، محکمات و متشابہات کی بحث دیکھئے)۔

ر س س

الرَّسَّ - کھودنا - دبا دینا - یہیں سے میت کے دفن کرنے کو بھی رَسَّ کہتے ہیں۔ پرانا کنواں خواہ پختہ ہو یا نہ ہو۔ نیز الرَّسَّ کسی چیز کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں۔ رَسَّ الْجُمْلَى وَرَسَّيْسُهُ - بخار کی ابتدائی علامات - جیسے انگڑائیاں آنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس تھوڑے سے اثر کے ہوتے ہیں جو کسی چیز میں موجود ہوتا ہے**۔ اَهْلُ الرَّسَّ - ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ابتداءً خود ہی کوئی جھوٹ گھڑیں اور پھر اس کی تشہیر کریں۔ یہ دراصل رَسَّ بَيْنَ الْقَوْمِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی فساد اور عداوت پیدا کرنے کے ہوتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی جم جانے کے ہیں۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ الرَّسَّ (۲۵/۸) عاد اور ثمود کے ساتھ کسی سابقہ قوم کے لئے آیا ہے۔ اس کے متعلق لغت میں بہت سے اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ الرَّسَّ ایک وادی کا نام ہے۔ ممکن ہے اس وادی میں کوئی پرانا کنواں ہو جس سے اس کا نام ایسا مشہور ہو گیا ہو۔** لیکن اگر معنوی

خصوصیت مراد لی جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ قوم غلط باتیں وضع کر کے لوگوں میں فساد ڈلوایا کرتی تھی۔ یا ایسی قوم تھی جس میں انکے نبی کی تعلیم کا یونہی سا اثر باقی رہ گیا تھا۔

ر س ل

رَسُولٌ کے اصلی معنی ہیں (کسی چیز کے سامنے جو رکاوٹ ہو اس کا دور ہو جانا اور اس طرح اس کا) اطمینان اور نرمی و سکون کے ساتھ چل پڑنا۔ * چنانچہ نَاقِیۃٌ رَّسُولۃٌ۔ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں۔ اَبِیلٌ مَّرَّاسِیلٌ۔ نرم رفتار اونٹوں کو۔ اسی سے رَسُوْلٌ ہے، جس کے معنی ہیں چل پڑنے والا، روانہ ہونے والا۔ پھر کبھی صرف نرمی اور سکون کے لحاظ سے علی رَسُوْلِکَ کہہ دیتے ہیں، یعنی تم اپنے حال پر سکون اور اطمینان سے جس طرح جی چاہے رہو۔ اور کبھی صرف چل پڑنے کے لحاظ سے رَسُوْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ * نرمی کے اعتبار سے الرَّسُوْلُ۔ نرم رفتار کو کہتے ہیں۔ اَلَا سَتَرَ سَالٌ کے معنی ہیں جانور کی رفتار میں آہستگی۔ **

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انبعاث ہیں۔ یعنی چل پڑنا۔ اسی اعتبار سے جماعت اور گٹھ کو الرَّسُوْلُ کہتے ہیں۔ جَآءَتِ الْخَیْلُ اَرُسَالًا۔ گھوڑے ڈکڑی ڈکڑی آئے۔ ** (اس میں تسلسل کا پہلو بھی ہے)۔ اَلَا رَسَالٌ۔ (کسی کی طرف) بھیجنا۔ اَرُسَلَهُ عَلَیْہِ۔ اس نے اسے کسی پر مسلط کر دیا۔ اَلرَّسُوْلُ۔ جو شخص خدا کی طرف سے بندوں کی طرف بھیجا جائے۔ خود وہ شخص بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے اور اسکا پیغام بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے۔ یعنی لفظ رَسُوْلٌ۔ رَسَالۃٌ اور مَّرَّسَلٌ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ** یعنی پیغام اور جسے پیغام دیکر بھیجا گیا ہو، وہ۔ اَلتَّرْسِیْلُ فِی التَّقْرِاعَةِ کے معنی ہوتے ہیں آہستہ آہستہ سنوار کر پڑھنا۔ ** لہذا الرَّسُوْلُ کے معنی ہوئے جو شخص اپنے بھیجنے والے کی طرف سے مسلسل، بتدریج، نہایت نرم روی سے پیغام دے۔ نیز خود اسکا پیغام بھی الرَّسُوْلُ ہے۔

وہ حضرات جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور اس وحی کو وہ انسانوں تک پہنچاتے ہیں خدا کے رسول کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں اَنْبِیَآءٌ بھی کہا ہے اور رَسُوْلٌ بھی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی ذات کے دو منصب ہیں۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا

ملنا ہے اور رسالت اس وحی کا آگے پہنچانا۔ نہ نبوت بغیر رسالت کے ہو سکتی ہے اور نہ رسالت بغیر نبوت کے۔ (تفصیل اس اجمال کی ن۔ ب۔ ا کے تحت ملیگی جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی بلا شریعت، یہ خیال غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے رسول اور نبی میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ ہر نبی صاحب کتاب تھا (۲۱۳) اور ہر رسول بھی (۲۵) (۵۴)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے رسول ہوں۔ اُبَلِّغُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي (۶۲)۔ ”میں اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں“۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۵)۔ ”جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے تیری طرف نازل ہوا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے“۔ لہذا رسول اللہؐ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملا تھا آپ اسے خود اُمت کو دیکر گئے تھے۔ اسے دوسروں پر نہیں چھوڑا تھا۔

رسول، جنہیں انسانوں تک پیغام پہنچانے کے لئے چنا جاتا تھا، انسان ہوتے تھے (۱۱۰) اور انسانوں میں سے بھی مرد (۱۱۲؛ ۱۱۹؛ ۲۱)۔ رسول سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا کہ وہ من جانب اللہ ہے اور صداقتوں سے معمور (۲۸۵) اور سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ یعنی اس جماعت کا سب سے پہلا رکن ہوتا تھا جسے وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور نظام خداوندی کی تشکیل کے لئے وجود میں لاتا تھا (۶۶)۔ وہ خود بھی اپنی وحی کا اتباع کرتا تھا (۱۰۹؛ ۵) اور اس وحی کو ایک عملی نظام زندگی بنانے کیلئے دوسروں سے اسکی اطاعت کراتا تھا (۶۳)۔ وہ اپنے حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتا تھا۔ نہ ہی یہ چیز کسی رسولؐ کے شایان شان تھی کہ وہ انسانوں کو قوانین خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۳۸-۳۹)۔ اس طرح رسول کی وساطت سے قوانین خداوندی کی اطاعت، خود خدا کی اطاعت قرار پاتا جاتی تھی (۸۰)۔ لہذا یہ اطاعت اس نظام کی اطاعت ہوتی تھی جو رسول کے ہاتھوں قوانین خداوندی کی عملی تنفیذ کیلئے متشکل ہوتا تھا۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ اسکے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کی رو سے قائم ہوا تھا۔ اس نظام میں

خليفة الرسولؐ وہ فرائض سرانجام دیتا تھا جنہیں اپنی زندگی میں رسولؐ سرانجام دیتا تھا۔ یعنی منظم اور اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا۔ اس طرح ”اطاعت خدا و رسولؐ“ کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ اب اگر پھر اسی قسم کا نظام قائم ہو جائے جس میں قرآنی قوانین عملاً نافذ ہوں تو پھر اُسی اطاعت کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے جسے ”خدا اور رسولؐ“ کی عملی اطاعت کہا جاتا ہے۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب ”اسلامی نظام“،* میں ملیگی جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ”اللہ اور رسولؐ“ کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے بعد ضمیر یا صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ”اللہ اور رسولؐ“ کی اطاعت دو الگ الگ اطاعتیں نہیں ہوتیں۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانین خداوندی کی اطاعت جو اس نظام کی وساطت سے کی جاتی ہے جسے رسول متشکل کرتا ہے اور جو رسول کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کے ذریعہ آگے چلتا ہے)۔

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ آل الرسولؐ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو تیر اندازی میں تمہارا ساتھی اور موافق ہو۔**۔ اگرچہ لسان العرب میں ہے کہ اس معنی میں رَسِيْلٌ آتا ہے۔ رَسُوْلٌ نہیں۔***۔ لیکن خدا اور اس کا رسول، درحقیقت ”تیر اندازی“، میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کے احکام رسول (اور اس کے متبعین کی جماعت) کے دست و بازو کی قوت سے عملاً نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لئے بدر کی جنگ کے موقع پر خدا نے کہا تھا کہ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (۱۷۱)۔ ”وہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے خود خدا چلا رہا تھا“۔ خدا اور رسول (اور اس کی جماعت) کی یہی باہمی رفاقت ہے جس سے دنیا میں نظام خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ (اس کی مزید تفصیل قَابِ قَوْسَيْنِ (۵۳/۹) میں دیکھئے۔ عنوان ق۔ و۔ س)۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے نبی یا رسول کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ نبی اور رسول کی الگ الگ خصوصیات نہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کو

* نیز ”سلیم کے نام خطوط“ (جلد دوم) میں اطاعت رسول سے متعلق خطوط ہیں۔

** تاج و محیط۔ *** لسان العرب

دیکھئے جہاں نبی یا رسول کی خصوصیات یا تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً رسول کسی سے اپنا حکم نہیں منواتا، صرف کتاب خداوندی کی اطاعت کراتا ہے (۳۸)۔ وہ اگر کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہے تو وہ اسکی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ صحیح راستہ وحی کے ذریعے دکھاتا ہے (۳۳)۔ رسول خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا (۱۹)۔ وہ کسی سے اجر رسالت نہیں مانگتا (۱۲)۔ رسولوں کے بیوی بچے ہوتے تھے (۳۸)۔ تمام رسول اپنے اپنے وقت پر آئے اور تشریف لے گئے (۳۳)۔ لیکن نبی آخر الزمانؐ کی بعثت کے بعد، نجات و سعادت حضورؐ پر ایمان اور قرآن کریم پر عمل کرنے ہی سے مل سکتی ہے (۵۸)۔ رسول ہمیشہ مرکزی مقامات میں آیا کرتے تھے (۵۹)۔ رسول کو رسالت ملنے سے پہلے قطعاً علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے رسالت ملنے والی ہے (۵۲؛ ۸۶)۔ نبی اکرمؐ نبوت ملنے سے پہلے ان پڑھ تھے (اس کے بعد نہیں)۔ (۲۹)۔ نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی تھے (۳۱)۔ اس لئے اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے نہ رسول۔ رسول صرف خدا کا راستہ دکھاتے تھے۔ دوسروں کو اس راستے پر لگانا ان کے ذمے یا اختیار میں نہیں تھا (۵۶)۔ بعض رسولوں پر ایمان لانا اور بعض پر نہ لانا کفر ہے (۵۰)۔ یہ اور اس قسم کی دیگر خصوصیات، انبیاء کرام اور رسولوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ حتکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر (بفرض محال) رسول بھی مداہنت برتے یا اپنی وحی میں کسی قسم کی تبدیلی کر لے تو اس پر خدا کا عذاب آجائے (۶۸؛ ۱۵؛ ۱۱۳؛ ۱۷)۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ہے اور وہ دین کا مکمل ضابطہ ہے، اس لئے نبوت کے ختم ہو جانے سے انسانی راہ نمائی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سوال صرف اس نظام کے قائم کرنے کا ہے جسے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔

اُرْسَال کے معنی چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اُرْسَلَ الْخَيْلَ فِي الْغَارَةِ۔ حملہ میں گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اِمْسَاک (روک لینے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵) جہاں اس کے معنی کھلا چھوڑ دینے کے ہیں۔ اُرْسَلَ عَلٰی کے معنی ہیں کسی پر مسلط کرنا (۱۹)۔

ر س و

رَسَا الشَّيْءُ يَرُسُوْ - اَرُسَى - اِرْسَاءٌ - کسی شے کا قرار گیر ہو
 جانا - جم جانا - رَسَتْ السَّفِيْنَةُ تَرُسُوْ - کشتی لنگر انداز ہو گئی -
 اَرُسَى السَّفِيْنَةُ : کشتی کو لنگر انداز کیا - ٹھہرایا - اَلْمِرْسَاةُ - کشتی
 کا لنگر* - مَجْرَاهَا وَ مَرْسَاهَا (۱۱/۳۱) - کشتی کا چلنا اور اس کا لنگر انداز
 ہونا - سورة اعراف میں اَلسَّاعَةُ کے متعلق ہے اَيَّانَ مَرْسَاهَا (۱۸/۱۸) -
 اس کا وقوع کب ہوگا - وہ کب رُک کر ہمارے سامنے آئے گی - مَرُسَى
 اسم مفعول ہے جو ظرف کے معنوں میں بھی استعمال ہو سکتا ہے - اس کے معنی
 رکنے کا وقت اور رکنے کا مقام دونوں ہو سکتے ہیں - قُدُوْا رَّاسِيَّاتٍ
 (۳۳/۱۳) - دیگیں جو ایک جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہوں - رَوَّاسِيٍّ (۱۳/۱۳) -
 جمے ہوئے پہاڑ (واحد رَاسِيَّةٌ) -

ر ش د

رَشَدَ - يَرُشِدُ - رُشِدًا - نيز رَشِيْدٌ - يَرُشِدُ - رَشَدًا وَ رَشَادًا -
 معاملہ کا صحیح حل ، یا صحیح راستہ ، پالینا** - الرُّشْدُ - سختی سے راہ راست
 پر استقامت کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی راستہ پر
 پختگی سے جسم جانے کے ہیں - الرُّشْدُ والرُّشْدُ - غَيِّی کی ضد ہے - یہ
 صحیح راہنمائی اور ہدایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*** - (۲۵۶/۲) - سورة
 نساء میں رُشِدًا (۳/۲) آیا ہے جس کے معنی معاملہ فہمی کی صلاحیت یا
 عقل کی پختگی کے ہیں - اِسْتَرَشِدَ فُلَانٌ لَا مَرَمَ - اس شخص نے اپنے
 معاملہ کا صحیح حل پا لیا - اَرُشِدْتُہ - میں نے اسے ٹھیک راہ بتائی -
 اَلرُّشِيْدُ (۱۱/۸) - صحیح راستہ بتانے والا - نیز وہ شخص جو معاملات کا
 ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائے یا جس کے اندازہ کئے ہوئے معاملات پوری طرح
 بغیر کسی کی مدد اور رہنمائی کے انتہا تک پہنچ جائیں** -

سورة کہف میں ہے کہ ان نوجوانوں نے خدا سے دعا کی کہ ہماری
 اس انقلابی مہم میں ہمیں سامانِ رحمت و ربوبیت عطا کر دے اور ہمارے
 معاملہ میں ہماری راہنمائی کا سامان فراہم کر دے - وَ هَتَّيْی لَنَا مِیْنُ
 اَمْرِیْنَا رَشَدًا (۱۸/۱۸) - اس کے بعد ہے کہ تمہارا نشو و نما دینے والا
 تمہیں سامانِ رحمت بھی دے گا - وَ یُھتَّیْی لَکُمْ مِیْنُ اَمْرِکُمْ
 مِرْفَقًا (۱۸/۱۸) - اور تمہارے مقصد کی کامیابی کے لئے آسانیاں بھی بہم پہنچا

دے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رَشَدًا صرف صحیح راستے کی طرف راہنمائی ہی نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری تدابیر اور انکی کامیابی کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے۔ چنانچہ اَلْمُرَاشِدُ ان راستوں کو کہتے ہیں جو منزل مقصود تک پہنچادیں۔ قرآن کریم میں رَشَدًا ۱۔ ضَرَّۃً (نقصان) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۱/۲۰)۔ لہذا رَشَد ایک جامع لفظ ہے جس میں ہدایت، حکمت و بصیرت سے لیکر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے سامان سب آ جاتے ہیں۔ اسی لئے انبیائے کرامؑ (انقلاب خداوندی کی طرف دعوت دینے والوں) کو رَشَدٌ عطا ہوتا تھا (۲۱/۵)۔ اور جماعت مومنین رَاشِدُونَ کی جماعت ہوتی ہے (۹/۳)۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ملتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ خدا کے سوا نہ کوئی وَلِیٌّ ہے اور نہ کوئی مُرَشِدٌ (۱۸/۱)۔ لیکن ہم ہیں کہ انسانوں کو اپنا پیر و مرشد بناتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہے ہیں!

ر ص د

رَصَدَہُ۔ وہ اسکے انتظار میں رہا۔ اَلرَّاصِدُ۔ منتظر اور کسی کی نقل و حرکت پر نگرانی کرنے والا۔ اَلرَّصِیْدُ۔ درندہ جو حملہ کرنے کا منتظر رہے*۔ قرآن کریم میں ہے یَجِیْدُ لَہُ شَیْءًا رَّصَدًا (۹/۲)۔ وہ ایک شعلہ کو اپنے انتظار یا گھات میں بیٹھا ہوا پائیگا۔ اِرْصَادٌ کے معنی ہیں کسی کا انتظار کرنا اور (انتظار میں) تیاری کرنا*۔ اِرْصَادًا لِّلْمَنِّ حَارَبَ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہُ (۹/۱) ”خدا و رسول“ (نظام خداوندی) کے خلاف جنگ کرنے والے کے لئے گھات بنانے اور تاک میں رہنے کے لئے۔ نیز مخالفانہ کاروائیاں کرنے کے لئے۔ اَلْمَرْصَدُ۔ اَلْمِرْصَادُ (۵/۹ و ۱۳/۸) وہ راستہ یا جگہ جہاں بیٹھ کر دشمن کی تاک لگائی جائے*۔

خدا کے مِرْصَادٌ (گھات) میں ہونے (۸۹/۱) کے یہ معنی ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک پر نگاہ رکھتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آتا ہے تو اسے فوراً دبوچ لیتا ہے۔ کوئی شخص اُس قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس سادہ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس راستے سے کسی چیز کو گزرنا ہو وہاں اس کی تاک میں بیٹھنا۔ انسان

کا ہر عمل ، قانونِ خداوندی کے معین کردہ راستے سے گذر کر اپنی منزل و منتہی تک پہنچتا ہے، جسے اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے۔ لہذا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا۔

ر ع ص

رَصَقَ - يَرْصُقُ - رَصًا - اس نے کسی چیز کے اجزا کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انہیں باہم دگر مضبوطی سے جوڑ کر ملا دیا، جیسے انہیں سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ الرِّصَاصُ سیسے کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے کہ مومن خدا کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں كَانَتْهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوعٌ^(۱۱)۔ گویا وہ ایک ایسی محکم دیوار ہیں جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب قلوب ایک دوسرے سے پیوست ہوں۔ اور قلوب کی پیوستگی، مقصدِ زندگی اور ضابطہٴ حیات کے ایک ہونے سے ہوتی ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ جس جماعت (امت مسلمہ) کی کیفیت یہ ہونی چاہئے تھی وہ آج کس طرح فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو حاملِ قرآن سمجھ رہی ہے!

رض ع

رَضِعَ يَرْضَعُ - رَضَعٌ يَرْضَعُ - رَضْعًا وَ رَضَاعًا وَ رَضَاعَةً - بچہ کا ماں کے پستان کو چوس کر دودھ پینا**۔ أَخَوَاتُكُمْ مِّنَ الرِّضَاعَةِ^(۳۳) تمہاری دودھ شریک بہنیں (جن سے نکاح حرام ہے)۔ أَرْضَعُ - دودھ پلانا۔ الاِسْتِرْضَاعُ - دودھ پلوانا چاہا**۔ وَأُمِّهِتُكُمْ الشَّتَّى أَرْضَعُنَّكُمْ^(۳۳)۔ تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے (ان سے بھی نکاح حرام ہے)۔ مَرَأَضِعٌ - دودھ پینے کی جگہ۔ چھاتیاں***۔ (واحد - مَرَضِعٌ) سورة قصص میں ہے۔ وَ حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ^(۲۸) - یعنی ہم نے موسیٰ کو دودھ پینے سے روک دیا۔ اس میں مَرَأَضِعٌ - مَرَضِعٌ کی جمع بھی ہو سکتی ہے اور مَرَضِيعَةٌ کی بھی۔ پہلی شکل میں اس کا مفہوم چھاتیاں، اور دوسری شکل میں دودھ پلانے والیاں، ہوگا۔ مَرَضِيعَةٌ - دودھ پلانے والی عورت۔ اَنَّا - (۲۲)۔ اس کی جمع بھی مَرَأَضِعٌ ہے۔ اِسْتِرْضَاعٌ - بچے کو (انٹا سے) دودھ پلوانا چاہا - (۳۳)۔

رضی

رَضِیَ یَرْضِی رَضُوْا نَا وَرَضَا کے معنی ہوتے ہیں کسی سے متفق ہونا۔ کسی کی بات کی تصویب کر دینا۔ (Approve) کر لینا۔ لیکن اس میں دل کی رضامندی اور رغبت و خوشی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی کراہت اور جبر نہ ہو۔ تَرَاضِیَہ۔ دونوں نے کسی بات پر آپس میں برضا و رغبت اتفاق کر لیا۔ اسے باہمی (Agreement) سے کیا۔ اس پر دونوں کی رضامندی ہو گئی۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ (۲/۲۳۲) ”جب وہ (میاں بیوی) قاعدے کے مطابق ایک دوسرے سے رضامندی کے ساتھ متفق ہو جائیں، *۔ رَضِیَہ لَیْہِذَا اِلَّا مَرًّا۔ اسے اس کام کا اہل سمجھا۔ اِرْتَضَاہ لَیْصَحْبَتِہِ وَخِیدُ مَتِہِ۔ اسے اپنی صحبت اور خدمت کا اہل سمجھا اور اس کے لئے منتخب کر لیا۔ رَضِیْتُ الشَّیْءَ وَبِہِ۔ میں نے اس چیز کو پسند کر لیا اور اسے اختیار کر لیا *۔ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَہُودُ وَلَا النَّصْرٰی (۱۲۰)۔ ”تجھ سے یہود اور نصاریٰ کبھی متفق نہ ہونگے،۔ تجھ سے کبھی راضی نہ ہونگے۔

قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۱/۱)۔ اس کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے ”اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے،“۔ چونکہ راضی ہو جانا اور ناراض ہو جانا انسانی جذبات ہیں اس لئے اس سے ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہی جذبات خدا میں بھی ہیں۔ وہ بھی کسی بات سے خوش ہو جاتا ہے اور کسی سے ناراض ہو جاتا ہے۔ خدا خوشی اور ناراضگی کے ان انسانی جذبات سے مبرا ہے۔ اس لئے رَضِیَ اللہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا یا خدا کا تصور ایسا ہی پیدا کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی (بادشاہ کی طرح) ایک تخت پر بٹھایا۔ پھر یہ سمجھا کہ بادشاہ کے امراء و وزراء کی طرح خدا کے بھی مقربین ہیں جنہیں اس کے کاروبار میں عمل دخل ہے۔ نیز اس کے حاجب و دربان بھی ہیں۔ بندے اس کی رعایا ہیں جنہیں اس

کے سامنے دم مارنے کی جا نہیں۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اُس کے حضور پیش کرنی ہو تو اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نیز اس درخواست کو، بادشاہ کے مقربین میں سے کسی کی وساطت سے وہاں تک پہنچانا ہوگا تا کہ وہ سفارش کرے۔ ان درخواستوں کے فیصلے (یا بادشاہ کے دیگر احکام) کسی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش ہو گیا تو گاؤں بخش دیا۔ اگر ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دے۔ بادشاہ کی خوشی اور ناراضگی بھی کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ سعدی کے الفاظ میں، مزاج شاہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ”گاھے بہ سلامے برنجند و گاھے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند“۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام دیتے ہیں۔ لہذا بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی رکھیں۔ اسے خوش کر لیں۔ ایشور کی بھگتی۔ ڈنڈوت۔ پوجا پاٹ۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں دینا سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور پر ماتما کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھگتوں سے راضی رہے۔

قرآن کریم نے (اور اس سے پہلے انبیاء سابقہ^۴ کی طرف وحی نے) اس توہم پرستانہ تصور کو مٹا کر، اسکی جگہ خدا کا صحیح تصور دیا۔ اس تصور کی رو سے بتایا گیا کہ خدا مستبد حکمرانوں کی طرح نہیں۔ اس نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر رکھا ہے اور کائنات کے تمام امور اس کے متعین کردہ قوانین و اصول کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے بھی اس نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں (جن کا علم انسان کو انبیاء کرام^۴ کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے اور اب وہ قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ وہ (بادشاہوں کی طرح) یونہی خوش ہو کر نہ کسی کو انعام دیتا ہے، نہ یونہی ناراض ہو کر عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا نے انسانی زندگی کے سامنے ایک مقصد رکھا ہے اور اس نے جو قوانین عطا کئے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انسان ان کے مطابق زندگی بسر کر کے، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ انسانوں کے لئے یہ راستہ خدا کا پسندیدہ ہے۔ یعنی اگر انسان اس راستے پر چلتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر اس کے

خلاف جاتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں ”خدا کی رضامندی“، (یا اس کے خلاف، غضب وغیرہ) کے الفاظ آئے ہیں تو وہ اسی مفہوم کے ترجمان ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے ”وَرَضِیْتُمْ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دَرِیْنًا“ (۵/۳۳)۔ میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور ضابطہ حیات پسند کیا ہے،۔ اگر انسان اس ضابطہ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ خدا کے پسندیدہ راستے پر چلتا ہے۔ اسے ”رَضِیَ اللَّهُ عَنْهُ“، سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف، ایک مومن کے دل کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ راستے کو محبوب رکھتا ہے اور اس کے خلاف دوسرے راستوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَٰرِشُونَ - فَضَّلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً - وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۳۹/۸) ”لیکن اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین بنادیا ہے اور کفر و فسق و عصیان کو نا مرغوب۔ ایسے ہی لوگ صحیح راستے پر چلنے والے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے“۔ ایمان کا دلوں میں اس طرح مرغوب بن جانا، ”رَضُوا عَنْهُ“ ہے۔

اس سے رَضِیَ اللَّهُ عَنْهُمْ ”وَرَضُوا عَنْهُ“ (۱/۹) کا مفہوم سمجھ میں آجائیگا۔ یعنی ”اللہ کے راضی ہونے“، سے مراد یہ ہے کہ خدا کے پسندیدہ راستہ (قرآن کریم) کے مطابق چلا جائے۔ اور انسانوں کے خدا سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا تجویز کردہ راستہ، ان کے دلوں میں محبوب و مرغوب بن جائے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ توبۃ میں منافقین کے متعلق ہے کہ یُرْضُوا نَفْسَهُمْ بِآفَاةٍ وَتَأْتِي قُلُوبُهُمْ (۹/۸) ”وہ اپنے منہ سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں“،۔ یہاں اِرْضَاءٌ بمقابلہ اَبی آیا ہے۔ اَبی کے معنی ہیں سختی سے انکار کرنا۔ لہذا رَضِیَ کے معنی برضا و رغبت موافقت کرنے اور دلی طور پر ہم آہنگی کے ہونگے۔ یہ مفہوم سورۃ بقرہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے منکرین کے متعلق ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اَتَّبِعِ اللَّهَ (۲/۲۱۶)۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، تو وہ ایسا نہیں کرتے۔ اس کے بعد مومنین کا ذکر ہے کہ وہ اِبْتَغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ (۲/۸۸) کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سے آگے ہے اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۸۸)۔ خدا کی اطاعت شعاری میں پورے کے پورے داخل

ہو جاؤ۔ یعنی لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (۲۰۸)۔ غیر خدائی قوتوں کے احکام و قوانین کا اتباع مت کرو۔ ان تمام ٹکڑوں کو سامنے رکھنے سے مَرْضَاتِ اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کے احکام و قوانین کی پوری پوری اور برضا و رغبت اطاعت۔ یہی معنی رَضِيَ اللہ عَنْهُمْ وَرْضَوْا عَنْهُ کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ بطیب خاطر پوری ہم آہنگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ان قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اور قوانین خداوندی کے خوشگوار نتائج ان سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی سعادتیں اور برکتیں ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے دلوں میں قوانین خداوندی کی محبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اسی کو اتَّبَعَ رِضْوَانُ اللہ (۱۶۶) سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں بَاءً بِسَخَطٍ مِّنَ اللہ کہا ہے (دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ط)۔ سورۃ محمد میں واضح کر دیا ہے کہ رِضْوَانُہ کے معنی ہیں مَا نَزَّلَ اللہ یعنی قرآن۔ پہلے کہا گیا ہے کَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللہ (۲۶)۔ اور اس کے بعد ہے کَرِهُوا رِضْوَانُہ (۲۸)۔ یعنی رِضْوَانُہ قرآن کریم (مَا نَزَّلَ اللہ) کا اتباع ہے اور سَخَطٌ غیر قرآنی احکام کا اتباع۔ لہذا مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ قرآن کریم (مَا أَنْزَلَ اللہ) کا پورا پورا اتباع کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اس سے پورے طور پر ہم آہنگ اور متفق رکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون مکافات کے مطابق زندگی کی خوشگواریاں اور شادایاں ان کے ہمرکاب ہو جاتی ہیں۔ اسی زندگی کا نام عِيشَة رَّاضِيَةً (۱۰۱) ہے۔

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خدا سے بیٹے کی دعا مانگی اور کہا وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِيًّا (۱۹)۔ یہاں رَضِيًّا کے معنی یا تو محبوب و مقبول کے ہیں۔ اور یا یہ کہ وہ تیرے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو۔ تاج میں رَضِيَ اللہ کے معنی مطیع بھی لکھے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومنین سے جَنَّاتٍ اور مَسَاكِينٍ طَيِّبَاتٍ کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللہ اکْبَرُ ذَالِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹)۔ اللہ کی ”رضوان“ ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ ایک عظیم کامرانی (Achievement) ہے۔

یہ آیت جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟

انسان نام ہے اس کی طبعی زندگی (Physical Life) اور انسانی ذات (Self) کا۔ زندگی کی کامیابی سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی بھی خوشگوار رہے اور اس کی ذات کی بھی نشو و نما ہو جائے۔ انسان کی نشو و نما سے مراد یہ ہے کہ اس میں جس قدر مضمحل صلاحیتیں ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے جس میں اس کی تمام صفات بطریق احسن جلوہ فرما ہیں۔ وہی صفات انسان کی ذات میں بھی ہیں لیکن علی قدر بشریت۔ یعنی چھوٹے پیمانے پر۔ انسانی ذات کی نشو و نما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ان صفات کی نمود ہوتی جائے۔ اب ظاہر ہے کہ انسانی ذات کو جس قدر زیادہ نشو و نما حاصل ہوگی یہ اتنی ہی زیادہ صفات خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی جائے گی۔

ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا یہ ہے کہ انسانی ذات کی اس طرح نشو و نما ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے زندگی کی خوشگواریاں بھی ملتی چلی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ زندگی کی یہ خواشگواریاں بڑی خوش آئند اور مبارک ہیں اور ان کا حاصل ہو جانا بھی بڑی چیز ہے۔ لیکن حقیقی کامرانی و کامیابی یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات، صفات خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ذَٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ ان اعمال کا بدلہ (یا نتیجہ) ایک تو اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ انسان کی خارجی دنیا حسین و خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے۔ یہ انقلاب (یعنی انسانی ذات کا نشو و نما پا جانا) بہت بڑی کامرانی ہے۔ یہی چیز ہے جسے باندازِ دیگر یوں کہا گیا ہے کہ لَہُمْ مَآبِشَاؤُنَ فِیہَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (۱۵۳) ”جنت میں ان کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس (اس سے بھی) بڑھ کر (کچھ اور) ہے“۔ یعنی انسان کی خواہش اس کے علم و جذبات کی موجودہ سطح کے مطابق ہی ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب جنت کی زندگی میں یہ سطح ہی بلند ہو جائیگی تو وہاں جو کچھ ملیگا وہ ان کی موجودہ خواہشوں اور آرزوؤں سے کہیں زیادہ ہوگا۔ اس کی ذات کی نشو و نما بایں نمط ہوگی کہ اس کے شعور کی موجودہ سطح اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی ذات کی یہ نشو و نما صرف اس معاشرہ کے اندر ہو سکتی ہے جو قرآن کریم متشکل کرتا ہے۔ خانقاہوں کی مجرد گاہوں میں نہیں ہو سکتی۔ لہذا بات پھر وہیں آجاتی

ہے کہ رضوان من اللہ یا مرضات اللہ ، قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے خوشگوار نتائج کا نام ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَرَادَتْصَلٰی (۲۱/۲۸) ۔ اس کے لئے عنوان ش ۔ ف ۔ ع دیکھئے ۔

ر ط ب

الرَّطْبُ - يَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے ۔ یعنی تر و تازہ چیز جس میں نمی ہو ۔ نرم و نازک شاخ ۔ ہری بھری گھاس ۔ سرسبز زمین ۔ الرَّطْبُ - گدڑی کھجور* ۔ قرآن کریم میں رَطْبًا جَنِيًّا (۱۹/۱۵) آیا ہے ۔ چنی ہوئی گدڑی کھجوریں ۔ سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۵۹/۶) ۔ اس کے معنی تازہ اور خشک پھل کے بھی ہو سکتے ہیں ، لیکن اس کا مطلب ہر تر اور خشک چیز ہے ۔ یعنی کائنات کی مختلف چیزیں ۔ اور کتاب مبین صحیفہ فطرت یا کائناتی قوانین کا ضابطہ ہے ۔

(رَطْبٌ وَ يَابِسٌ کے لئے ی ۔ ب ۔ س کا عنوان بھی دیکھئے) ۔

آیت (۱۹/۱۵) کو سامنے لائیے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر پکی ہوئی کھجوریں لٹک رہی تھیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ، دسمبر کے مہینے میں نہیں ہوئی تھی ۔ اس زمانے میں فلسطین میں سخت سردی ہوتی ہے اور تازہ کھجوروں کا موسم نہیں ہوتا ۔ اب عیسائی مورخ خود اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ ۲۵ دسمبر حضرت عیسیٰؑ کا یوم پیدائش نہیں ۔ عیسائیوں نے بعد میں یہ عقیدہ ایرانیوں سے مستعار لیا تھا جن کے ہاں ۲۵ دسمبر متھرا کا یوم پیدائش تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اور ۲۵ مارچ اس کے مر کر جی اٹھنے کا دن ۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ متھرا آخری زمانے میں پھر دنیا میں آئے گا ۔ (دیکھئے معراج انسانیت صفحہ ۵۱) ۔

ر ع ب

رَعَبَ الْحَوْضَ - حوض کو بھر دیا ۔ رَعَبَ السَّيْلِ - الوادی - سیلاب نے وادی کو بھر دیا ۔ اس کے ایک معنی تو ہیں بھر دینا اور دوسرے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا ۔ رَعَبَ السَّيِّئَاتِ - اس نے کوہان کو کاٹ لیا ۔ اَلِتَّرْعِيْبَةُ - کوہان کا کٹا ہوا ٹکڑا* ۔

اس اعتبار سے راغب کے نزدیک الرَّعْبُ کے معنی ہیں خوف سے بھر جانے کی وجہ سے بول چال سے منقطع ہو جانا*۔ صرف ڈر کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَمَّا لَبِثْتُ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸)۔ ”تو ان کی وجہ سے خوف کھا جائے“۔

جماعت مؤمنین کو اسقدر قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ میدان جنگ میں مخالفین ان کو دیکھ کر رعب سے کانپنے لگ جائیں۔ لیکن یہ چیز صرف اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دنیا میں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف بتایا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الذِّیْنَ كَفَرُوْا الرَّعْبَ بِمَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ.... (۱۵۰)۔ ”ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دینگے اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں“۔

رع د

رَعْدٌ بادل کی گرج۔ اس کے معنی کپکپانے اور تھرتھرانے کے بھی آتے ہیں۔ مجازاً زجر و توبیخ کو بھی کہتے ہیں۔ الرَّعَادُ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت باتیں بناتا ہو۔ زیادہ بڑبڑ کرتا ہو۔** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بادلوں کی آواز کے معنوں میں آیا ہے (۱۹؛ ۱۳)۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ (۱۳)۔ رَعْدٌ اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے اور اپنے تعمیری نتائج سے خدا کی حمد و ستائش کی زندہ پیکر بن جاتی ہے۔ (دیکھئے عنوانات س۔ ب۔ ح اور ح۔ م۔ د)۔ کائنات کی ہر قوت اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کیلئے سرگرداں رہتی ہے۔ اور ان کی نقل و حرکت کا مجموعی نتیجہ کائنات میں تعمیری اضافے ہوتا ہے۔ ہم جب ان قوتوں کو الگ الگ دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض قوتیں محض ڈر اور خوف کا موجب نظر آتی ہیں (جیسے بجلی کی کڑک) لیکن یہ ہیئت مجموعی ان سب کا نتیجہ تعمیری ہے۔ اور یہی چیز خدا کی حمد و ستائش کی مظہر ہے۔

رع ن

الرَّعْوْنَةُ۔ حماقت کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رَعْوْنَةُ فکر کی کمی کو کہتے ہیں اور حُمُقٌ بطلانِ فکر کو***۔

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط

آلَا رُعْنٌ* - وہ شخص جس کی بیاتوں میں بے تکا پن ہو۔ احمق - سست اور ڈھیلا - رَعْنُ السَّجَل* - وہ احمق بے تکا اور ڈھیلا ہوا۔ رُعْنٌ - وہ بیہوش ہو گیا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) آگے کو اُبھرا ہوا اور اُونچا ہونا (۲) بے تکا پن، پریشانی اور اضطراب کے ہوتے ہیں۔

رَاعِنًا (۳/۶) - ایک کلمہ تھا جس سے یہودی رسول اللہؐ کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد رسول اللہؐ کو رعونت سے متہم کرنا ہوتا تھا لیکن وہ اسے اس طرح بولتے تھے جس سے یہ ایہام پیدا ہو کہ وہ رَاعِنًا کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ہماری رعایت فرمائیے۔ ہمارا خیال رکھئیے**۔ (یوں سمجھئیے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں (I beg your Pardon) - (رَاعِنًا کے لئے عنوان ر - ع - ی بھی دیکھئیے)

ر ع ی

الرَّعِي* - گھاس - الرَّعْي* - اَلْمَرْعَى* - گھاس چرانا - اَلْمَرْعَى* - چراگاہ نیز گھاس جو چری جائے - رَعَى* - يَرْعَى* - رَعِيًا* - جانوروں نے چرا، یا جانوروں کو چرایا اور چرنے کے لئے چھوڑا (لازم و متعدی) - اَلرَّاعِي* - چرواہا - اس کی ایک جمع رِعَاءٌ بھی ہے دیکھئیے (۲/۸۳)* - راغب نے لکھا ہے کہ رَعَى* در اصل حیوان کی دیکھ بھال نگرانی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ غذا دیکر اس کی زندگی کی حفاظت کرنا ہو یا دشمنوں سے بچا کر**۔ لیکن بعد میں یہ ہر چیز کی حفاظت، نگرانی اور خیال رکھنے کے لئے بولا جانے لگا۔ مثلاً رَعَى امْرَأَةً: اپنے معاملہ کا خیال رکھا اور اس کی حفاظت کی۔ رَعَى السَّنَجُومَ وَرَاعَاهَا: اس نے تاروں اور انکی رفتار میں غور کیا اور ان کا خیال رکھا*۔ اس سے مَرَاعَاةٌ کے معنی ہیں کسی بات کا خاص خیال رکھنا۔ کسی کی حفاظت و نگرانی کرنا۔ رَاعَى امْرَأَةً - اس نے اپنے معاملہ کی اچھی طرح نگہداشت کی اور اس کے مآل پر نگاہ رکھی۔ اَلرَّاعِيَّةُ* - وہ مویشی جن کی نگہداشت کی جائے اور انہیں چرایا جائے۔ نیز وہ لوگ جنکے امور کا کوئی منتظم و نگران ہو اور جن پر کوئی نگہبان و فرمانروا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حفاظت اور نگہبانی کرنے کے ہیں۔

سورة طه میں ہے وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ (۲۰/۵۴)۔ ”اپنے مویشیوں کو چارہ کھلاؤ“۔ اور اَلْمَرْعَى (۸/۴) کے معنی ہیں گھاس یا چارہ۔ سورة حدید

میں رہبانیت کے مسلک کے متعلق ہے فَمَارَعَوْهُمَا حَقًّا رِعَايَتِيهَا (۵۷/۲۳) ”وہ اس کی نگہداشت نہ کر سکیں جیسا کہ اس کی نگہداشت کا حق تھا۔“
سورة المومنون میں ہے وَالَّذِينَ هُمْ لَا يُخَالِفُوا عَهْدَهُمْ رَاعُوا (۲۳/۸)۔ ”جو لوگ اپنی امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے وعدوں کی نگہداشت رکھتے ہیں۔“

سورة بقرہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم (یہودیوں کی طرح) رَاعِينًا مت کہو (۱۰۳/۲)۔ اور (۳۶/۲) میں ہے کہ وہ لوگ (یہودی) رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے وقت الفاظ کو توڑ مروڑ کر کہا کرتے تھے جس سے ان کا مفہوم بدل جائے۔ انہی الفاظ میں رَاعِينًا کا لفظ بھی شامل تھا۔ یہ ان کی دناوت کی انتہا تھی کہ جوشِ مخالفت میں عام آدابِ معاشرت کو چھوڑ کر بالکل بازاری سطح پر اتر آتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ رَاعِينًا کہہ دیا کرتے تھے جو رُعُونَت سے ہے۔ (دیکھئے عنوان ر۔ ع۔ ن)۔ لیکن صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رَاعِينًا، مُرَاعَاة سے ہے (جو باب مفاعلہ سے ہے) اور اس باب کی خصوصیت اشتراک ہے۔ اس طرح رَاعِينًا کے معنی یہ ہوئے کہ تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ اس قسم کے کلمات رسول ﷺ خدا کی شان میں استعمال کرنا کھلی بے ادبی اور گستاخی ہے۔** یعنی انہیں غیر مشروط طور پر اطاعت رسول کا اقرار کرنا چاہئے، جو دراصل اطاعت خدا ہے اور یہی ان کا فریضہ حیات ہے۔ انہیں رسول سے کہنا یہ چاہئے کہ اُنْظُرْنَا آپ ہم پر نگاہ رکھئے کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے بعد ان کا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ کے تمام احکامات کو سن کر ان کی اطاعت کریں۔
وَأَسْمَعُوا (۱۰۳/۲)۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو ایسے قول (لہذا ایسے فعل سے بھی) روکا گیا ہے جس میں غلط اور صحیح ملتبس ہو جائیں اور حق و باطل کا امتیاز واضح نہ ہو۔ اگر کسی قول یا عمل سے اہانتِ رسول یا تنقیصِ توحید کا شائبہ تک بھی پیدا ہوتا ہو تو اس سے بچنا چاہئے اور محض نیک نیتی کو اس کے جواز کے لئے اڑ نہیں بنانا چاہئے۔ مسلمان کی ہر بات اور ہر عمل کو صاف، واضح اور بین ہونا چاہئے۔ ان امور میں (بالخصوص) شاعری جس قسم کا لائسنس لے لیتی ہے اس کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

ر غ ب

رَغْبَةً کے اصلی معنی کسی چیز کے وسیع ہو جانے کے ہیں۔ رَغْبَ الشَّيْءِ - چیز وسیع ہو گئی۔ حَوْضٌ رَغِيْبٌ - وسیع حوض۔ الرِّغْبَةُ و الرِّغَابُ - بہت زیادہ چاہنا، ارادہ کی وسعت*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) طلب کرنا۔ چاہنا (۲) وسعت بتائے ہیں۔ وَاَدِ رَغِيْبٌ - بڑی کشادہ وادی جس میں بہت زیادہ پانی سما جائے۔ تَرَ اَغْبَ الْمَكَانُ - جگہ وسیع ہو گئی۔ اَرُغْبَ اللّٰهُ قَدْرَ كَت - خدا تیرے مرتبہ کو بڑھائے۔ اَلرَّغَابُ بہت دودھ دینے والے اور کثیر المنفعت جانور۔ نیز ہر وسیع و کشادہ چیز کو رَغِيْبٌ کہتے ہیں**۔ اسی سے راغب نے کہا ہے کہ جب رَغِيْبٌ فِيْہِ یا رَغِيْبَ اِلَیْہِ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ (ارادے کی وسعت کے ساتھ) کسی چیز کو چاہنا اور اس کی حرص کرنا۔ اِنَّا اِلٰی اللّٰهِ رَاغِبُوْنَ (۹۹) میں بھی یہی معنی ہیں۔ (نیز ۱۳۸) میں۔ اور جب رَغِيْبٌ عَنْہُ کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے رغبت کہ اس سے پھیر لینا*۔ جیسے وَمَنْ یَّرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰہِیْمَ (۱۳۰)۔ نیز (۱۹۱) میں رَاغِبٌ کے بعد عَنْ آیا ہے۔ ان مقامات میں اس کے معنی پھر جانا۔ رغبت ہٹا لینا ہیں۔

سورة نساء میں ہے لَا تَتَوَلَّوْا نَهْنٌ مَّا کُتِبَ لَہُنَّ وَتَرَ غَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْہُنَّ (۱۲۷)۔ یہاں تَرَ غَبُوْنَ کا صلہ کوئی نہیں (نہ اِلٰی نہ عَنْ) لیکن سیاق عبارت کا تقاضا ہے کہ اس کا صلہ اِلٰی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم بیوہ عورتوں اور یتیم لڑکیوں کو وہ کچھ تو دینا نہیں چاہتے جو قانون خداوندی کی رو سے انہیں ملنا چاہئے اور چاہتے یہ ہو کہ ان سے نکاح کرلو۔ تاج نے صراحت کی ہے کہ رَغِيْبٌ فِيْہِ کے معنوں میں رَغْبَہُ بَغِيْرِہِ کے بھی آتا ہے۔ یعنی اُسے چاہا۔ اس کا ارادہ کیا۔

سورة انبیاء میں رَغَبًا بِمَقَابِلِہِ رَهَبًا آیا ہے (۹۱) رَهَبٌ کے معنی

خوف کے ہیں۔

ر غ د

عِیشَۃٌ رَّغِدٌ و رَغَدٌ - خوشگوار کشادہ اور فراخ روزی۔ بافراغت روزی۔ رَغِدَ عِیشَہُمْ - انکی زندگی خوشگوار اور روزی کشادہ ہو گئی۔ اَرُغِدُوا مَوَاشِیَہُمْ - انہوں نے آزادی سے اپنے مویشی چرنے کے لئے چھوڑ دئے۔

*راغب - **تاج -

أَرْغَدُوا: وہ سرسبز و شاداب جگہ پہنچے * - أَلْأَرْغَدُ مال، پانی، گھاس، روزی وغیرہ کا وافر، کثیر اور باافراط حصہ جو طبیعت میں تکدر نہ پیدا کرے اور وجہ پریشانی نہ ہو ** -

سورة بقرہ میں جَنَّتِ آدَم کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں رزق کی کیفیت رَغَدًا حَيِّثُ شَيْئُتُمَا (۲/۳۵) تھی۔ یعنی جہاں سے جی چاہے نہایت فراغت سے سامان زیست مل جائے۔ اسی کے متعلق سورة طہ میں ہے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان۔ لباس اور مکان (یعنی انسان کی بنیادی ضروریات زندگی) بغیر جگر پاش مشقت کے مل جاتے تھے (۲/۱۸)۔ وہ ان ضروریات سے محروم نہیں رہتا تھا۔ سورة نحل میں ہے يَا تِيْهًا رَّزَقْنَاهُ رَغَدًا آمِنًا "کلَّ سَكَّانٍ" (۱۶/۱)۔ یہ اس دنیا میں جنتی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں ہر فرد کو سامان زیست نہایت فراوانی سے مل جاتا ہے۔ ہر جگہ اور باافراط۔ اس میں لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں نہیں لے سکتے۔ تمام سامان و ذرائع رزق، نوع انسان کی پرورش اور اسکی صلاحیتوں کی نشوونما کیلئے کھلے رہتے ہیں اور یہ اس نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد سامان زیست سے محروم نہ رہنے پائے اور اسے ہر شے افراط اور فراوانی سے ملے۔ رَغَدًا حَيِّثُ شَيْئُتُمَا۔ جہاں سے چاہے نہایت فراغت سے مل جائے۔

ر غ م

الْأَرْغَمُ: (راع کی تینوں حرکتوں۔ زیر۔ زیر۔ پیش کے ساتھ)۔ ناپسندیدگی۔ کراہت۔ جبر۔ اصل میں الْأَرْغَمُ۔ الْأَرْغَمُ۔ خاک کو کہتے ہیں۔ أَرْغَمَ الشَّذْلُ۔ ذلت نے اسے خاک میں ملا دیا۔ اس سے اسکے معنی کسی سے زبردستی اطاعت کرانے کے آتے ہیں۔ ویسے أَلْمَرَّغَمُ ناک کو کہتے ہیں **۔ أَلْمَرَّغَمُ۔ وہ جگہ جہاں کوئی، کسی سے ناراض ہو کر یا بھاگ کر چلا جائے۔ اس کے بعد اسکے معنی قلعہ نیز راستہ اور وسعت اور فراخی کے بھی لئے جانے لگے **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) مٹی اور (۲) راستہ یا بھاگنے کی جگہ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو شخص نظام خداوندی کے لئے اپنی جگہ سے ہجرت کرے گا۔ يَجِدُ فِي الْأَرْضِ مَرًّا غَمًّا (۱۰۰/۱)۔ اسے دنیا میں بہت سی پناہ گاہیں مل جائیں گی جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی ***۔ اگر

دشمنوں نے اس پر ایک راستہ بند کر دیا ہے تو اسے کئی راستے کشادہ مل جائیں گے۔

ر ف ت

رُفَاتٌ - بھوسہ یا سوکھی چیز میں سے جھڑ جانے والا چورا۔
بوسیدہ ٹکڑے اور ریزے۔ نیز رسی کے ٹکڑے۔ اِرْفَاتُ الْحَبْلِ - رسی ٹکڑے
ٹکڑے ہو گئی۔ رَفَّتْ - يَرْفُتْ - کسی چیز کو توڑنا، کوٹنا یا ہاتھ
سے بٹھرا دینا۔ جیسے مٹی کے ڈھیلے یا بوسیدہ ہڈی کو بھر بھرا
دیا جاتا ہے *۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے عَاِذَا كُنَّا عِظًا مَّأْوَرُفَاتًا (۱۶)۔ کیا جب
ہم ہڈیاں ہو جائیں گے اور ایسے بوسیدہ کہ یونہی بھر بھرا جائیں یا چورا
چورا ہو جائیں (تو اس کے بعد بھی اٹھائے جائیں گے)؟ - عصر حاضر کے مادہ پرستوں
(Materialists) کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی صرف طبیعی عناصر
کے سہارے قائم رہ سکتی ہے۔ اگر یہ سہارے ٹوٹ جائیں تو پھر زندگی کا امکان
نہیں رہتا۔ ان کے اس خیال خام کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ جس خدا
نے زندگی کو پہلی مرتبہ بلا طبیعی سہاروں کے پیدا کر دیا تھا وہ اس پر
قادر ہے کہ اسے موجودہ طبیعی سہاروں کے بغیر (بلا سہارا یا کسی اور نوعیت
کے سہاروں کے ساتھ) قائم رکھے۔ (۱۶)۔ اسی کو حیات بعد الممات
کہا جاتا ہے۔

ر ف ث

السَّرَفَتْ - یہ ایک جامع لفظ ہے جو ان تمام باتوں کو محیط ہوتا ہے جو
جنسی اختلاط کے سلسلہ میں سرزد ہوتی ہیں۔ یعنی ابتدائی گفتگو سے لیکر
انتہائی منزل تک کی تمام تفصیل اس میں آجاتی ہیں **۔ محیط میں ہے کہ
لغت میں اس کے اصلی معنی ہیں وہ گفتگو جو جماع کی طرف داعی ہو۔ نیز
مقدمات جماع - راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ فحش باتیں ہیں جن کا
ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً جماع اور دواعی جماع کا ذکر۔ ابن فارس
نے کہا ہے کہ السَّرَفَتْ کے اصلی معنی جماع ہیں لیکن یہ ہر اس بات کے لئے
آتا ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان شرمائے۔ نیز السَّرَفَتْ فحش کلامی کو
کہتے ہیں۔ چنانچہ حج کے ضمن میں ہے فَلَا رَفَثَ (۱۶)۔ اس سے مراد یہ

ہے کہ حج کے اجتماع میں کوئی فحش خیال یا ایسی بات یا حرکت سرزد نہیں ہوئی چاہیئے جس میں جنسی میلان پایا جاتا ہو۔ روزوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ (۱۸۷)۔ ”تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رفث حلال کیا گیا ہے“۔ یہاں قرآن کریم نے ’إِلَى نِسَائِكُمْ‘ کا ٹکڑا بڑھا کر واضح کر دیا ہے کہ اس سے کنایہ جماع ہے۔

ر ف د

الرَّفْدُ - عطا - صلہ - ایسی چیز جس سے کسی کو سہارا دیا جائے۔ مدد، حصہ و نصیب - رَفْدَةٌ - يَرْفِدُهُ - رَفْدًا - اسنے اسکی مدد کی۔ اسے دیا۔ اَلْاِرْفَادُ - مدد دینا - عطا کرنا - اصل میں اَلْاِرْفَادُ زین یا کجاوہ کے نیچے کپڑا وغیرہ (رَفَادَةٌ) رکھنے کو کہتے ہیں تا کہ جانور کی پیٹھ زخمی نہ ہو جائے۔ اَلرَّفَادَةُ - کپڑے کا ٹکڑا یا پھاہا جس سے زخم کا مداوا کیا جائے۔ نیز وہ عطیہ اور چندہ جو (زمانہ جاہلیت میں) قریش اکھٹا کر کے اس سے محتاج حاجیوں کے لئے کھانے پینے کا سامان خرید کر لے تھے۔ اَلْاِرْفَادُ - کسب کرنا - کمانا *۔

سورۃ ہود میں ہے بَشِّرْ الرَّفْعُ اَلْمَرْفُودُ (۱۱۱) کتنا برا عطیہ اور صلہ ہے۔ کتنی بری مدد ہے جس سے ان کا مداوا کیا گیا ہے اور جس کا انہیں سہارا دیا گیا ہے۔

ر ف ع

رَفَعَ - يَرْفَعُ - بلند کرنا - راغب نے کہا ہے کہ رَفَعَ کبھی تو مادی چیز جو پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی تعمیر کے وقت دیوار وغیرہ کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے۔ کبھی ناموری اور شہرت یا ذکر بلند کرنے کے لئے اور کبھی مرتبہ بلند کرنے کے لئے آتا ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، اونچا کرنا اور اٹھا لینا۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کو قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ نیز پھیلانے اور ظاہر کرنے کے۔

رَفَعَ - متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی مفہوم میں شدت یا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کام کرنا اسے تیزی اور شدت سے کرنا۔

مثلاً رَفَعَ السَّبْعِيْرُ فِي سَيْرِهِ - اونٹ نے اپنی رفتار (بہت تیز) کر دی -
 رَفَعَ الْقَوْمُ - لوگ ملک کے بلند علاقوں پر چڑھ گئے - بَرَقَ رَافِعٌ -
 بلندی پر چمکنے والی بجلی - الرَّفَاعَةُ (را کی تینوں حرکتوں کے ساتھ)
 آواز کی سختی اور شدت - رَفَعَ - رَفْعَةٌ - شریف اور عالی مرتبہ ہونا* -
 قرآن کریم میں ہے رَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ (۲/۱۳) - ہم نے
 تمہارے سر پر طور کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا - یعنی تم اس کے دامن میں تھے
 اور پہاڑ تمہارے اوپر تھا - عمارت کی بلندی کے لئے تعمیر کعبہ کے ضمن میں
 ہے اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ (۲/۱۲۷) - ”جب ابراہیم (اس گھر کی)
 بنیادیں اٹھاتا تھا“ - رَفَعَ صَوْتًا - آواز بلند کی - رَفَعَ صَوْتَهُ فَوْقَ
 صَوْتِهِ کے لفظی معنی تو کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہیں لیکن اس
 سے مراد کسی کی رائے پر اپنی رائے کو فائق کرنا بھی ہوتا ہے (۳/۲۹) -
 درجات کی بلندی کے لئے حضرت ادریسؑ کے متعلق ہے وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا
 عَلِيًّا (۱۹/۱) - ”ہم نے اسے بلند درجات عطا کر دئے“ - خود اللہ تعالیٰ نے
 اپنے آپ کو رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ (۳۰/۱۵) کہا ہے - اس میں اگر رَفِيعٌ کو
 مَرْفُوعٌ کے معنی میں لیا جائے تو مطلب ہوگا مَرْفُوعٌ عَنِ الدَّرَجَاتِ -
 یعنی وہ بتدریج اپنے مقام بلند تک نہیں پہنچا بلکہ وہ ہے ہی اسی مقام پر
 مستوی - مطلب یہ ہے کہ وہ تدریج اور ارتقاء کی منازل سے بلند اور بالاتر ہے -
 اس سے اقتدار اعلیٰ اور بالا دستی بھی مراد ہے - نیز رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ کے
 معنی عالی الدَّرَجَاتِ بھی ہو سکتا ہے - یعنی بلند مرتبوں والا - اور اگر ہم
 رَفِيعٌ کو بمعنی فاعل (یعنی رَافِعٌ) لیں تو اس کے معنی ہونگے ”درجات
 کا بلند کرنے والا“ - سورۃ واقعہ میں جہاں خَافِضَةٌ کے مقابلہ میں رَافِعَةٌ
 آیا ہے (۵۶/۳) وہاں بھی یہی مفہوم ہے - یعنی بلند مدارج و مقام پر لے جانے
 والی - یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا
 گیا ہے کہ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۱۵۸/۳) تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ
 اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیے اور اس طرح اپنا مقرب بنا لیا - ورنہ اگر
 رَفَعَ کے معنی جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَيْهِ (خدا کی
 طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑیگا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے - اس لئے
 کہ جب بھی کسی جسمانی شے کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ فلاں کی طرف
 گئی ہے تو جس کی طرف وہ چیز جائیگی اس کا کوئی مقام متعین کرنا ضروری
 ہوگا - خدا کو کسی ایک مقام میں محدود سمجھنا قرآن کریم کے خلاف ہے -

اس لئے بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ کے معنی یہی ہیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کر کے اسے اپنا مقرب بنا لیا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”شعلہ“ مستور“ میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ جلیلہ میں ملیگی)۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴) ہم نے تیری عظمت کو تیرے لئے بہت بلند کر دیا۔ (رَفَعَ اور صَعِدَ کے لئے دیکھئے ص۔ ع۔ د۔ ۳۵/۱۰)

ر ف ف

رَفَّتْ کے بہت سے معنی ہیں لیکن قرآن کریم میں (۵۵/۲۶) صرف رَفَّتْ کا لفظ آیا ہے (جو ثلاثی نہیں رباعی ہے) اس لئے ہم رَفَّتْ کی بحث کو ضروری نہیں سمجھتے۔ رَفَّتِ الطَّيَّائِرُ و رَفَّتْ - پرند نے فضا میں پر کھولے اور انہیں ہلایا۔ الرِّفَّتْ - منتشر پتے۔ الرِّفَّتْ - فرش، بچھونے، گدے تکیے، نیز سبز رنگ کے گدیلے جو سونے کے لئے دری وغیرہ پر بچھائے جاتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد (خیمہ کے پردے وغیرہ کا) وہ زائد حصہ (جھالر) ہے جو لٹکا رہے لیکن عام طور پر اس کے معنی فرش یا بچھونے ہی کے ہیں*۔ ابن فارس نے رَفَّتْ کے معنی باغیچے، بچھونے اور سبز کپڑے کے لکھے ہیں۔

ر ف ق

الرِّفْقُ (جمع مَرَافِقُ) کہنی۔ نیز نرمی و سہولت۔ رَفَقَ النَّاقَةَ۔ اونٹنی کے بازو (کہنی) کو باندھ دیا تاکہ وہ بھاگ نہ جائے۔ وہ رسی جس سے اس کے بازو کو (پچھلی ٹانگ کے ساتھ) باندھا جاتا ہے رِفَاقٌ کہلاتی ہے۔ اسی سے الرِّفْقَةُ کے معنی ہم سفر جماعت کے ہیں (کیونکہ چلتے وقت ان کی کہنیاں ایک ساتھ ہلتی ہیں) لیکن جب وہ جماعت ایک دوسرے سے الگ ہو جائے تو پھر ان کے لئے رِفْقَةُ کا لفظ نہیں بولا جاتا، البتہ ان میں سے ہر ایک ساتھی کو رَفِيقٌ کہا جاسکتا ہے۔ الرِّفَاقَةُ۔ جماعت۔ اِرْتَفَقَ۔ اس نے کہنی پر ٹیک لگائی۔ الرِّفْقُ تَفَقُّقٌ۔ جس چیز پر ٹیک لگائی جائے۔ تکیہ، سہارا***۔ چونکہ اس طرح ٹیک لگانے سے راحت ملتی ہے اس لئے اِرْتَفَقَ بـ کے معنی ہیں اس سے فائدہ اٹھایا۔ رَفَقَ بـ یا رَفَقَ عَلَيْهِ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تشدد کے بغیر ایک دوسرے کے قریب اور ہمنوا ہونے اور باہم

مواقت کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے حَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا (۳۹)۔ ”یہ اچھے ساتھی ہیں“۔ ایسے رفقاء سفر جن کی رفاقت سے انسان کی خامیاں پوری ہو کر اس کی ذات کا اور معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ اور یہ سب کچھ بطیب خاطر ہو۔ کُھنی کے لئے یہ لفظ (۵/۶) میں آیا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے يٰٓهَٰٓئِیْنَ لَکُمْ مِّنْ أَمْرِ کُمْ مِیْرٌ فَقًّا (۱۸/۱۶)۔ وہ تمہارے پیش نظر مقصد میں آسانیاں پیدا کر دیگا۔ اسی سورۃ میں جہنم کو مَسَاعَتْ مِرٌ تَفَقًّا (۱۸/۲۹) اور جنت کو حَسُنَتْ مِرٌ تَفَقًّا (۱۸/۳۱) کہا گیا ہے۔ یعنی ٹیک لگانے کی جگہ۔ جس کے آمرے سے اوپر اٹھا جائے۔ جہنم کی زندگی ایسی ہے جس کے سہارے انسان، زندگی کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ جنت کی زندگی ایسی ہے جو انسان کے اوپر اٹھنے اور بلندیوں کی طرف جانے کا بہترین سہارا بنتی ہے۔ ایسا سہارا جس سے کبھی توازن نہیں بگڑتا (حَسُنَتْ مِرٌ تَفَقًّا)۔ انسان اُسی سہارے سے اوپر اٹھ سکتا ہے جو اُس کے توازن کو قائم رکھے۔ توازن بگڑ جانے سے انسان لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ (سَاعَتْ مِرٌ تَفَقًّا)۔ سہارے تو جہنمی معاشرہ میں بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے ناہموار ہوتے ہیں اس لئے انسان ان کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ان سے اس کی ذات کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جنتی معاشرے کے سہارے ہیں جن سے افراد کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ر ق ب

الرَّقَبَةُ۔ گردن کو کہتے ہیں۔ رَقَبَهُ۔ اس کی گردن میں رسی ڈالی*۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی گردن میں رسی ڈال دی جائے تو وہ تابع و منقاد ہو جاتا ہے، چنانچہ عرف عام میں الرَّقَبَةُ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی جمع الرِّقَابُ ہے۔ آیت (۲/۱۷) میں الرِّقَابُ کے معنی غلام ہی ہیں۔ واحد کے لئے رَقَبَةٌ (۹۲/۲) وغیرہ میں بمعنی غلام آیا ہے*۔ رَقَبَ۔ یَرْقُبُ۔ کے معنی انتظار کرنا، اور حفاظت و نگہداشت کرنا، دونوں آتے ہیں۔ جیسے وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (۲۴/۲۴) میں اس کے معنی جہاں انتظار کرنے کے لئے جا سکتے ہیں وہاں نگہداشت کرنا، پاس اور لحاظ رکھنا بھی ہو سکتے ہیں۔ اور (۲۸/۱۸) میں یَتَرَقَّبُ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن باب کی خاصیت کے لحاظ سے اس میں بار بار کوشش اور تجسس سے

کسی چیز کا انتظار کرنا اور نگہداشت کرنا مراد ہوگا۔ تاج میں اس کے معنی کسی چیز کی توقع کرنا اور اس کا انتظار کرنا لکھے ہیں۔ راغب نے اس کے معنی انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں بار بار اس کا خیال آتا تھا اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ الرَّقِيبُ کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت اور نگہداشت کرنے والا اور کسی چیز کا انتظار کرنے والا۔ نگران اور حفاظت کرنے والا۔ ان معنوں میں وَكَانَ اللَّهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيبًا (۳۳/۱ و ۳۱/۱) آیا ہے۔ (۱۸/۵) میں رَقِيبٌ بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے کھڑے رہنے کے ہیں۔ گردن کو بھی الرَّقَبَةُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایستادہ رہتی ہے۔

بات کا لحاظ رکھنے اور پاسداری کرنے کے لئے یہ لفظ (۹/۸) میں آیا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، (۲۳/۱) میں بھی اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ اِرْتَقَبَ الشَّيْءُ - کسی چیز کا انتظار کیا۔ اِرْتَقَبَ الْمَكَانَ - کسی جگہ کے اوپر چڑھنا۔ بلند ہونا۔ مَرَقَبَةً - چڑھنے کی جگہ۔ الرَّقَبَةُ تحفظ اور ڈرنے گھبرانے، دونوں معنوں میں آتا ہے *سورة دخان میں فَارْتَقِبْ آیا ہے (۳۲/۱ و ۳۲/۵)۔ اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ سورة یونس میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے قُلْ فَاَنْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰۴/۱)۔ ”ان سے کہو کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔“

رق د

الرَّقْدُ - اَلرَّقَادُ - الرَّقُوْدُ - سونا (نَوْمٌ) *۔ قرآن کریم میں یہ مادہ یَقَظُ (بیداری) کے مقابلہ میں آیا ہے۔ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ (۱۸/۱)۔ ”تو خیال کرتا ہے کہ وہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں،“۔ مَرَقَدٌ - خوابگاہ (سونے کی جگہ)۔ سورة یس میں هَیْ مَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَّرَقَدِنَا (۳۶/۵۲)۔ ”ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا،“۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلرَّقَادُ تھوڑی سی خوشگوار نیند کو کہتے ہیں **۔ ان معانی کے اعتبار سے سورة کہف کی آیت (۱۸/۱) کا مفہوم واضح ہو

جاتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ دیر تک نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی سی نیند کر لیتے تھے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ باہر سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

رق ق

الَّرَّقُ ۖ - الرَّقُّ ۖ - باریک جھلی یا کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔ الرَّقُّ ۖ - سفید صحیفہ۔ سفید ورق جس پر لکھا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پتلا پن اور نرمی ہیں۔
الَّرَّقُ ۖ - الرَّقِيقُ ۖ - پتلی اور باریک چیز۔ الرَّقِيقَةُ ۖ - طبیعت کی نرمی۔
الَّرَّقُ ۖ - غلامی*۔

قرآن کریم میں ہے وَكِتَبَ مَسْطُورٍ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ (۵۲/۳)۔ ”لکھی ہوئی کتاب‘ پھیلی ہوئی باریک جھلی پر“۔

رق م

رَقَمَ - يَرْقُمُ ۖ - رَقْمًا - لکھنا۔ رَقَمَ الْكِتَابَ : کتاب کو اس طرح لکھا کہ حروف، نقاط، اعراب وغیرہ کے لحاظ سے وہ واضح اور مبین ہوئی**۔
قرآن کریم میں ہے كِتَابٌ مَّرْقُومٌ (۸۳/۹)۔ واضح عبارت میں لکھی ہوئی کتاب یا نشان زدہ کتاب، کیونکہ رَقَمَ الشُّوْبَ کے معنی ہوتے ہیں کپڑے پر دھاریاں بنانا اور قیمت کے تعین کے لئے نشان لگانا۔ دَابَّةٌ مَّرْقُومَةٌ۔
وہ جانور جس کے پاؤں پر داغنے کے نشانات اور دھاریاں موجود ہوں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحریر اور لکیریں کھینچنے کے ہیں۔
وہ خلیل کے حوالے سے لکھتا ہے کہ الرَّقْمُ کے معنی ہیں عبارت کو علامات کے ذریعے واضح کرنا۔ اور كِتَابٌ مَّرْقُومٌ کسی کتاب کو اس وقت کہیں گے جب اس کے حروف پر نقطوں کے ذریعے علامات لگا دی جائیں۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ الْكُتُبِ وَالرَّقِيقِ (۱۸/۹) آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کہئے جاتے ہیں کہ ان غار والوں کے حالات ایک دھات کی تختی پر لکھ کر ان کے غار کے باہر لگا دیئے گئے تھے اسلئے انہیں اصْحَابُ الرَّقِيقِ کہنے لگ گئے۔ چنانچہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی کہا ہے کہ الرَّقِيقُ فَعِيلٌ کے وزن پر بمعنی مَفْعُولٌ یعنی

مَرَقُومٌ آیا ہے۔ یعنی لکھی ہوئی۔ لیکن حال کی تحقیقات کا رخ اس طرف گیا ہے کہ یہ لفظ وہی ہے جسے تورات میں رَاقِیْمٌ کہا گیا ہے۔ یہ ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرہ کہنے لگے۔ یہ جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ کے شمال کی طرف سطح مرتفع پر واقع تھا۔ جب دوسری صدی عیسوی میں رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کیا ہے تو اس شہر نے رومی نوآبادی کی حیثیت سے بڑی شہرت اختیار کر لی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقہ کے اثری انکشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں بڑے بڑے وسیع غار ملے، جن کے اندر اور باہر عمارات کے نشان ملتے ہیں۔ خیال غالب یہی ہے کہ أَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۹۸) انہی غاروں میں سے ایک غار میں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے جہاں بعد میں انکی یادگار کے طور پر معبد بنایا گیا تھا۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الکھف والرقیم)۔

ر ق و

الرَّقُومُ۔ ریت کا چھوٹا سا ٹیلہ۔ اَلَّتَرَقُومَةُ۔ حلق کے نیچے سینے کا بالائی حصہ جہاں سانس پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ ہنسلی (کی ہڈی)۔ اسکی جمع تَرَاقٍ اور اَلَّتَرَاقِیُّ آتی ہے *۔ اِذَا بَلَغْتَ التَّرَاقِیَّ (۲۶۵) قرآن کریم میں آیا ہے۔ یعنی ”جب جان سینے کے اوپر کے حصے تک آ پہنچے گی“۔ آخری وقت آ پہنچے گا۔ اصل مفہوم اس میں اوپر چڑھنے کا ہے۔ چنانچہ رَقَا الطَّيَّائِرُ کے معنے ہیں پرندہ اپنی اڑان میں بلند ہو گیا۔ (اس کے لئے عنوان ر۔ ق۔ ی بھی دیکھئے)۔

رقی

رَقِیَ۔ یَرَقِی۔ رَقِیًّا۔ رُقِیًّا اوپر چڑھنا۔ نِزَارُ تَقِی و تَرَقِی۔ اوپر چڑھنا *۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ تَرَقِی فِی السَّمَاءِ (۱۳۳) ”یا تو آسمان پر چڑھ جائے“۔ اَلَّتَرَقُومَةُ۔ ہنسلی، نیز سینے کے اوپر حلق کے آگے کا حصہ جہاں سانس چڑھتا ہے۔ جمع تَرَاقٍ اور التَّرَاقِیُّ **۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا بَلَغْتَ التَّرَاقِیَّ (۲۶۵)۔ نیز دیکھئے عنوان (ر۔ ق۔ و)۔ اَلرَّقِیَّةُ۔ جھاڑ پھونک۔ رَقَاهُ رَقِیًّا۔ وَرَقِیًّا۔ اسنے اس پر جھاڑ پھونک کی۔ رَاقٍ۔ جھاڑ پھونک کرنے والا۔ * قرآن کریم میں ہے مَن رَاقٍ (۲۶۵)۔

* تاج و محیط۔ ** بعض اہل لغت نے لفظ التراقی کی ت کو اصلی مانا ہے لیکن ہمارا راجح خیال یہ ہے کہ اس میں ت زائد ہے اور اس کا مادہ ر۔ ق۔ و ہے۔

کون ہے جو جھاڑ پھونک سے اسکی جان بچا لے؟ ابن فارس نے کہا ہے کہ رَقِيٌّ کے بنیادی معنی میں (۱) چڑھنا اور (۲) تعویذ منتر وغیرہ شامل ہیں۔
الْمَرُّ قَاةٌ وَالْمِرُّ قَاةٌ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں *۔ اَلْثَرَقَاءُ۔ پہاڑوں پر چڑھنے والا *۔

ر ک ب

رَكِبَهُ يَرْكَبُهُ۔ رَكُوبًا۔ کسی چیز پر چڑھا، بلند ہوا، سوار ہوا *۔ خواہ جانور پر ہو یا کشتی وغیرہ پر۔ اِذَا رَكَبْنَا فِي السَّيْفِيْنَةِ (۱۸/۱)۔ ”جب وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے“۔ رَاكِبٌ۔ سوار۔ اسکی جمع ہے اَلرَّكَبُ (۸۲/۱) اور رُكَبَانٌ (۲۳۹/۲) بمقابلہ رَجَالًا۔ یعنی پیدل۔ اَلرَّكَابُ۔ وہ اونٹ جن پر سواری کی جائے (۵۹/۶) (اسکا واحد رَاكِبَةٌ ہے جو اس سادہ سے نہیں ہے)۔ اَلْمَرُّ كَبٌ (جمع اَلْمَرَّ اَكِبٌ)۔ جس پر سواری کی جائے۔ رَكُوبٌ۔ سواری کا جانور (۳۶/۲)۔

رَكِبَ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھنا۔ جمانا *۔ چڑھانا **۔ ترکیب دینا۔ (۸۲/۸)۔ مُتَرَاكِبًا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا (۱۰۰/۶)۔

انسان کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہے اور اب اسکے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا اور اوپر کواٹھتا جائیگا۔ اسکے لئے سورۃ انشقاق میں ہے لَتَرَكِبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹/۸)۔ ”تم ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے ہوئے درجہ بدرجہ اوپر کواٹھتے جاؤ گے“۔ انسانی زندگی کا موجودہ مقام اسکا منتہی نہیں۔ اسے ابھی بہت آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اس لئے موت سے سلسلہ حیات ختم نہیں ہو جاتا۔ خاک کے ذرے حیاتیاتی طور پر (Biologically) ارتقائی منازل طے کرتے پیکر انسانی تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس پیکر میں انسانی ذات طبعی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ ارتقاء (Evolution) کی اگلی منزل شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کے بجائے انسانی ذات (Human Personality) کا ارتقاء۔ یہ ارتقاء اسی زندگی میں شروع ہو کر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کے راستے میں طبعی موت (Physical Death) کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ خود انسانیت (Humanity) تہ بہ تہ اوپر کواٹھتی چلی آرہی ہے۔ تاریخ انہی تہوں کا ریکارڈ ہے۔

ر ک د

الرَّكُودُ - ساکن ہونا۔ اَلرَّاکِدُ - ٹھہری ہوئی ساکن چیز جو چلتی نہ ہو*۔ رَكَدَتِ السَّيْفُ نَتَةً - کشتی لنگر انداز ہو گئی**۔

الرَّوَاكِدُ - چولہے کے تین پتھر جو خانہ بدوش عرب استعمال کرتے ہیں (کیونکہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں)**۔

قرآن کریم میں کشتیوں کے متعلق ہے رَوَاكِدَ عَلٰی ظَهْرِهِ (۳۲)۔ ”سمندر کی پشت پر کھڑی کی کھڑی رہ جائیں“۔ چل نہ سکیں۔ یعنی اگر خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوائیں ساکن ہو جائیں تو بادبانوں سے چلنے والی کشتیاں ساکن رہ جائیں۔

ر ک ز

الرَّكَزُ - دھیمی سی آواز، آہٹ، یا آواز جو زور دار نہ ہو۔ یا انسان کی وہ آواز جو دور سے سنائی دے، جیسے شکاری کی اپنے کتوں کے لئے آواز**۔ سورة مریم میں ہے اَوْ تَسْمَعُ لَهْمُ رَكَزًا (۱۹)۔ ”یا ان کی دھیمی سی آواز (بھنک) بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟“۔ ”خفی“ کے اعتبار سے رَكَزَتْ كَذَا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا۔ اور الرِّكَازُ مال مدفون کو کہتے ہیں۔ اور معدنیات کو بھی جنہیں خدا نے زمین میں مدفون رکھا ہے***۔ چونکہ جس چیز کو دبایا اور گاڑ دیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بالکل قائم اور ثابت رہتی ہے اسلئے اِرْتَكَزَ کے معنی ہیں وہ اپنی جگہ قائم اور ثابت ہو گیا**۔ اسی سے رَكَزَ الشَّرْمُحُ کے معنی ہیں اسنے نیزہ کھڑا کر کے زمین میں گاڑ دیا۔ اور اَلْمَرَّكَزُ - نیزہ گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو دوسری چیز میں اس طرح اتار دینا (گاڑ دینا) کہ وہ اس میں مستحکم ہو جائے۔ (۲) آواز۔ آہٹ۔

ر ک س

الرَّكُوسُ - کسی چیز کو اس طرح پلٹانا یا موڑنا کہ اسکا اگلا سرا مڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ جا ملے۔ کسی چیز کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا****۔ رِكَاسٌ - اس رستے کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا

* تاج و محیط و راغب - ** تاج - *** راغب - **** محیط -

اونٹ کی نکیل میں باندھ دیا جاتا ہے اور دوسرا سر اس کے پاؤں سے اور اسے اتنا تنگ رکھا جاتا ہے کہ اونٹ کا سر بری طرح جھکا رہے اور وہ اس طرح سخت تکلیف میں رہے۔ یہ کچھ اسے سدھانے کیلئے کرتے ہیں۔ اُرْتُكَسَ۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ الٹ گیا*۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اُرْتُكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا (۸۸)۔ ”اللہ نے انکے اعمال کی وجہ سے انکا سر جھکا دیا“۔ انہیں ذلیل و خوار کر دیا۔ انہیں سخت مصیبت میں ڈال دیا۔ یا انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا۔ یہی معنی (۹۱) میں بھی ہیں۔

ر ک ض

الرُّكُضُ۔ گھوڑے کو تیز دوڑانے کیلئے ایڑھ لگانا۔ پرندے کا اڑنے کیلئے پروں کو متحرک کرنا۔ الرُّكُضُ۔ تیز دوڑنا۔ قرآن کریم میں ہے مِّنْهُمَا يَرُ كُضُوْنَ لَا تَرُ كُضُوْا (۱۳۱-۱۳۲)۔ اس کے معنی تیزی سے بھاگنے کے ہیں۔ اَلْمِرُّ كُضُ۔ وہ چیز جس سے آگ کو حرکت دیکر بھڑکایا جائے**۔ سورۃ ص میں حضرت ایوبؑ کے قصہ میں ہے اُرُ كُضُ بِرِجْلِكَ (۳۸)۔ اس کے معنی چلنے کے ہیں۔ اپنے پاؤں کو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی ٹانگ کو (پانی میں ڈال کر اسے) حرکت دے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ر ک ض کے بنیادی معنی آگے کی طرف متحرک ہونا یا متحرک کرنا ہیں۔

سورۃ انبیاء کی آیت (لَا تَرُ كُضُوْا - ۲۱) ایک عظیم حقیقت کی ترجمان ہے۔ ماسبق آیت میں ہے کہ جو قومیں اپنے معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھنے کی بجائے اپنی تدابیر کے تابع رکھتی ہیں وہ معاشرے میں فساد پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سے دولت کی تقسیم سخت ناہموار ہو جاتی ہے جس کا آخر الامر نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ دولت کے نشے میں بدست اس کا احساس نہیں کرتیں کہ وہ کس تباہی کی طرف کشاں کشاں چلی جا رہی ہیں۔ تاآنکہ جب وہ تباہی محسوس طور پر ان لوگوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو وہ اس سے بچنے کے لئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت خدا کا قانون مکافات انہیں آواز دیتا ہے کہ لَا تَرُ كُضُوْا۔ مت بھاگنے کی کوشش کرو۔ تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وَاَرْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتُّرْتُمْ فِيْهِ وَاَسْكِنِيْكُمْ۔ چلو واپس اپنے عظیم الشان محلوں میں اور آسائش کے مقامات میں جنہیں تم نے غریبوں کے

خون کی رنگینی سے مزین بنا رکھا تھا۔ وہیں واپس چلو۔ لَعَلَّاکُمْ تَسْئَلُونِ (۲۱/۱) تاکہ تم سے وہاں جا کر پوچھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے آئی تھی اور ان عیش سامانیوں پر تمہارا کیا حق تھا؟۔

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے انجام کا نقشہ کس قدر بین انداز میں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے؟

ر ک ع

رَکْعَ کے معنی ہوتے ہیں منہ کے بل جھکنا یا گر جانا۔ خواہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں۔ البتہ سر ضرور جھک جائے۔ راغب نے کہا ہے کہ رُکُوعٌ کے معنی جھکنے کے ہیں۔ یہ لفظ کبھی بالخصوص جسمانی شکل میں جھکنے کے لئے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے لئے بولا جاتا ہے، خواہ وہ عبادت ہو یا بغیر عبادت۔ یعنی کسی کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کے۔ ویسے بھی بوڑھے شخص کے لئے جو کمزور و نحیف ہو جائے رَکْعَ الشَّيْخُ کہتے ہیں، کیونکہ ایسی کمزوری میں انسان ذرا جھک جاتا ہے۔ یا جس شخص کی حالت سقیم و خستہ ہو جائے اس کے لئے بھی رَکْعَ فُلَانٌ بولا جاتا ہے۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی جھکنے کے لکھے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں عرب، حنیف شخص کو رَاکِعٌ کہا کرتے تھے جبکہ وہ بتوں کی پرستش نہ کرتا ہو اور کہا کرتے تھے رَاکِعٌ اِلٰی اللّٰہ۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کے معنی تھے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مطمئن ہو گیا*۔ رَاکِعٌ کی جمع رُکُعٌ آتی ہے۔

رُکُوعٌ وَ سُجُودٌ (دیکھئے عنوان س۔ ج۔ د) در حقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی کامل اطاعت۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے وَ اَقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ وَ ارْکَعُوا مَعَ الرَّاٰکِعِیْنَ (۲/۳)۔ یعنی جو جماعت مومنین، قوانین خداوندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے، تم بھی ان میں شامل ہو کر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو۔

چونکہ انسان کے جسم کی حرکات اس کے دل کے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ (مثال کے طور پر جب ہم ”نہیں“ کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا سر خود بخود

دائیں بائیں هل جاتا ہے اور جب ”ہاں“ کہتے ہیں تو اس کی حرکت خود بخود اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ اس لئے قوانین خداوندی کے سامنے مرتسلیم خم کرنے کی محسوس ترجمانی اجتماعاتِ صلوٰۃ میں رُکُوع اور سَجْدۃ کی شکل میں ہوتی ہے۔ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا۔۔۔ سَيُمَاہُمْ فِي وُجُوہِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُودِ (۳۸)۔ ”تو انہیں رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔۔۔ اطاعت کے اثر سے ان کی قلبی کیفیات ان کے چہروں پر (ظاہر) ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں رکوع اور سجدہ تو کرے لیکن اپنی زندگی غیر خدائی قوانین کے تابع بسر کرے، تو اس کے یہ رکوع و سجود منشاء خداوندی کے مطابق نہیں ہونگے۔ یعنی وہ چند منٹ کے لئے (اور وہ بھی بظاہر) خدا کے سامنے جھکتا ہے لیکن اپنی پوری زندگی میں عملاً غیر اللہ کے سامنے جھکتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے یہ رکوع اور سجود خدا کی اطاعت کی علامات نہیں ہیں۔ سچا رکوع اور سجدہ یہ ہے کہ انسان کا دل قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائے، اور دل کے جھکنے کے ساتھ اس کا سر بھی تعظیماً جھک جائے۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ کی محسوس حرکات سے یہی مقصود ہے۔

رک م

الرَّكْمُ۔ کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا اور جمع کرنا، حتکہ وہ تہ بہ تہ ڈھیر کی شکل اختیار کر جائے*۔ فَيَرُكْمُهُ (۱۳۷)۔ ”وہ ان سب کو اوپر تلے ڈھیر بنا دیگا“۔ رُكْمًا۔ اوپر تلے رکھی ہوئی چیزوں کا ڈھیر*۔ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكْمًا۔ (۲۳)۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر دییز بادل کی شکل دیدیتا ہے۔ سورۃ طور میں ہے سَدَحَابٌ مَّرْكُومٌ (۵۲)۔ تہ بہ تہ بادل۔ نَاقَةٌ مَّرْكُومَةٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت فریبہ ہو۔ جس پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی ہوں*۔

رک ن

رَكْنٌ۔ يَرْكُنُ (إِلَيْهِ)۔ کسی کی طرف مائل ہونا اور سکون پانا*۔ سورۃ ہود میں ہے وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا (۱۱۳)۔ جو لوگ سرکش ہیں ان کی طرف مت جھکو۔ ان کی طرف مائل مت ہو۔

* تاج و محیط و راغب۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَ لَوْ لَا اَنْ تَبْتَئِنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكُنْ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا (۱/۲۴)۔ ”اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو توتھوڑا سا ان کی طرف جھک جاتا“۔ رسول کا مقام یہ ہوتا ہے کہ جہاں عام انسان (اپنے مشن کی خاطر ہی سہی) کچھ نہ کچھ دوسروں کی خاطر جھک جاتے ہیں، رسول ایسا کبھی نہیں کرتا۔ (دیکھئے ۶۸/۱ و ۱۵/۱)

الرَّكُنُ۔ وہ چیز جس سے کسی کو تقویت پہنچتی ہو۔ سہارا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت کے ہیں۔ رُكُنٌ کسی چیز کے قوی ترین پہلو کو کہتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ہے اَوْرٰی اِلٰی رُكُنٍ شَدِيدٍ (۱۱/۸) میں ایک محکم سہارے کی پناہ لے لوں۔ ابن فارس نے رُكُنٌ شَدِيدٌ کے معنی عزت و غلبہ بتائے ہیں جس کی وجہ سے کسی کو تائب مخالفت نہ ہو سکے۔ اَرُكَانُ الشَّيْءِ۔ چیز کے اطراف و جوانب۔ وہ سہارے جن پر وہ چیز قائم ہو*۔

رم ح

الرَّمْحُ۔ (جمع رِمَاحٌ)۔ نیزہ*۔ قرآن کریم میں ہے تَنَالَتْهُ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ (۵/۹۴)۔ ”جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں“۔

(مجازاً عربوں میں فقر و فاقہ کو بھی الرَّمْحُ کہتے ہیں**۔ تاج میں اس معنی کے لئے بجائے رُمَحٌ کے رِمَاحٌ لکھا ہے)۔

رم د

الرَّمَادُ۔ راکھ کو کہتے ہیں۔ خاکستر*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلَا رَمَدٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا رنگ غبارِ آلود اور گدلا ہو، یعنی خاکستری رنگ۔ رَمَادَةٌ۔ ہلاکت۔ تباہی۔ اَرْمَدَ الْقَوْمُ۔ لوگ خشک مالی میں مبتلا ہوئے اور ان کے مویشی تباہ ہو گئے*۔

قرآن کریم میں غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو ایسی رَمَادٌ سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر سخت تیز ہوا چلے (۱۷/۱۸)۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھکڑ میں اس خاکستر کا نام و نشان تک باقی نہیں رہ سکتا۔ غلط نظام اور غلط عمل، زمانے کے تند و تیز تقاضوں اور شدید حوادث کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے، اگرچہ (راکھ کے ڈھیر کی طرح) وہ بہت بڑے اور زیادہ نظر آتے ہیں۔

رم ز

الرَّمْزُ کے معنی جنبش و حرکت کے ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حرکت و اضطراب بتائے ہیں۔ الرَّمْيُ - کثیرالحرکت کو کہتے ہیں۔** اسی سے اس کے معنی اشارے کے ہیں خواہ وہ ہونٹوں سے کیا جائے یا آنکھوں سے یا ابروؤں سے یا منہ، ہاتھ اور زبان سے۔ اور اس کے ساتھ آواز نہ ہو۔ اور اگر آواز ہو تو ہلکی سی، جیسے کانٹا پھوسی میں ہوتی ہے۔**

سورة آل عمران میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے..... آ لَّا تَكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا (۳/۳۶)۔ ”تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات نہ کرے گا،“۔ شریعت یہود میں، روزے میں بات کرنا بھی منع تھا۔ یا ایسے روزے بھی رکھے جاتے تھے جن میں چپ رہنے کی نیت کی ہو (دیکھئے، ۲۶/۱۹)۔

رم ض

الرَّمَضُ - ریت وغیرہ کا سخت دھوپ سے تپ جانا۔ الرَّمَضُ - الرَّمَضَاءُ - سخت گرمی اور تپش**۔ شَهْرُ رَمَضَانَ - (رمضان کا مہینہ) قدیم عربی میں اس مہینے کو نَاتِقٌ کہتے تھے۔ جب مہینوں کے نام بدلے گئے (یہ بھی زمانہ قبل از اسلام کی بات ہے) تو چونکہ یہ مہینہ (اس تبدیلی نام کے وقت) سخت گرمی میں پڑتا تھا اسلئے اسکا نام رَمَضَانَ ہو گیا**۔ اس مہینے میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا (۱۸۵/۲)۔

قمری مہینوں کے لحاظ سے کوئی مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں نہیں آسکتا۔ اسلئے اب رمضان کا مہینہ سخت سردی میں بھی آجاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہلاتا رمضان ہی ہے۔ (مہینوں کی تبدیلی کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان ن - س - ا)۔

رم م

رَمَّ الْعَظْمُ : ہڈی گل سڑ گئی اور بوسیدہ ہو گئی۔ رَمَّ الشَّيْءُ رَمًّا وارتَمَّہ۔ اس نے اس چیز کو مکمل طور پر کھا لیا۔ الرَّمَّةُ - بوسیدہ ہڈیاں۔ الرَّمَّةُ - بوسیدہ رمی۔ الرَّمِيمُ - گذشتہ سال کے پودوں میں سے جو کچھ بچ جائے۔ نیز ہر پرانی اور بوسیدہ چیز کو بھی کہتے ہیں۔ الرَّمَّ -

خشک گھاس کا چورا۔ بھوسہ۔ پانی کے اوپر بہ جانے والا کچرا۔ اَلَا رُمَامٌ۔
خاموش ہو جانا۔ سکوت۔ اَلرَّمَمُ۔ بوسیدہ چیز کو درست کر دینا*۔
ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہوتے ہیں۔ (۱) چیز
کو درست کرنا۔ (۲) چیز کا بوسیدہ ہو جانا۔ (۳) خاموش رہنا۔ اور
(۴) باتیں کرنا (اضداد میں سے ہے)۔

قرآن کریم میں ہے مَن يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۳۶/۷۸)۔
”ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے“۔ سورۃ ذاریات
میں اُس تباہ کن آندھی کے متعلق ہے جو قوم عاد پر چلی تھی کہ مَا تَذَرُ
مِن شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ (۵۱/۲۴)۔ ”وہ کسی
شے کو نہیں چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی بجز اس کے کہ اسے چورا کر کے
رکھ دیتی تھی“۔

ر م ن

اَلرَّمَّانُ۔ انار۔ (درخت ہوں یا پھل، واحد رُمَّانَةٌ)۔ غالباً انار
کی تاثیر کی وجہ سے (جو دل کو قرار دیتی ہے) رَمَنَ بِالْمَكَانِ کے معنی
ہیں وہ اس جگہ مقیم ہو گیا**۔ قرآن کریم نے انگور۔ زیتون۔ اور اناروں کے
باغات کا ذکر کیا ہے۔ وَجَنَّاتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَ الزَّيْتُونِ
وَالرَّمَّانِ (۱۰۰/۶)۔

رمی

رَمَى الشَّيْءَ۔ رمی بیہ۔ کسی چیز کو پھینک دینا یا ڈال دینا۔ یعنی
گرادینا۔ رَمَى السَّهْمَ عَنِ الْقَوْسِ۔ کمان سے تیر پھینکا۔ اَلْمِرْمَاةُ چھوٹا
تیر۔ خَرَجَ يَرْتَمِي۔ وہ تیر سے شکار کرنے کے لئے نکلا۔ اَلْمَرْمَى۔ وہ
نشان (هَدَفٌ) جسکی طرف تیر پھینکے جاتے ہیں***۔

سورۃ مرسلات میں ہے اِنْتَهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ (۳۴/۷۴)۔ ”وہ چنگاریاں
پھینکتی ہے“۔ سورۃ فیل میں ہے تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ (۱۰۵/۱) ”تو ان
پر پتھر پھینکتا تھا“۔ سورۃ انفال میں ہے وَمَا رَمَيْتْ اِذْ رَمَيْتْ وَلٰكِنَّ
اللَّهَ رَمَى (۸/۱)۔ جنگ بدر میں جو تیر اندازی تیری طرف سے ہو رہی تھی وہ
تیری طرف سے نہیں بلکہ درحقیقت اللہ کی طرف سے تھی۔ اس لئے کہ یہ تمام

لڑائیاں خدا کے حکم کے ماتحت اس کے نظام کو بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔ کمانڈر جب حکومت کے حکم سے فوج کشی کرتا ہے تو وہ جنگ اُس حکومت کی طرف سے سمجھی جاتی ہے۔ یا جب فوج کمانڈر کے حکم سے حملہ کرتی ہے تو وہ حملہ کمانڈر کی طرف سے متصور ہوتا ہے۔

اس آیت میں رَمَيْتَ کا کوئی مفعول بہ مذکور نہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ رَمَى کے بعد مختلف مفعول بہ آنے سے ان کے مطابق ہر جگہ الگ معنی ہوتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں میدان جنگ کا ذکر ہے اور پہلے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ کہہ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں دشمنوں کے قتل کا تذکرہ ہے۔ اس لئے رَمَيْتَ سے تیر اندازی ہی مراد لیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی (لین نے مختلف اسناد سے لکھا ہے کہ) جب تنہا رَامَيْتُہُ یا مَرَامَاۃً کہا جائے تو اس کے معنی تیر اندازی یا سنگ باری کے ہوتے ہیں۔

رَمَاهُ بِقَبِيْحٍ۔ اس نے اسے برائی کے ساتھ متہم کیا*۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ (۲۴)۔ ”جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں“۔ کسی پا کدامن کے خلاف تہمت لگانا، ”تیر اندازی“ یا ”سنگ باری“ کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس کی سزا بھی سخت تجویز کی ہے (۲۴)۔

روح

رَاحٌ۔ رَوْحٌ۔ رُوحٌ۔ رِيْحٌ۔ سب ایک ہی مادہ کے الفاظ ہیں۔ اور انہی سے رَاحَةٌ۔ رَوْحَةٌ۔ اسْتِرَاحَةٌ۔ تَرَوْحَةٌ۔ رِيْحَانٌ۔ وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ رَاح کے بنیادی معنی ہیں ہوا کا چلنا، ہوا کا آنا، ہوا کا محسوس کرنا*۔ چونکہ ہوا انبساطِ زندگی، حرکت اور قوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس مادہ سے بننے والی مختلف شکلوں میں یہ تمام مفہوم مضمر ہو گئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی وسعت اور فراخی کے ہیں۔

الرَّوْحُ۔ راحت۔ سرور۔ خوشی۔ رحمت۔ وسعت۔ مَكَانٌ رَوْحَانِيٌّ۔ عمدہ اور پاکیزہ مکان*۔ الرِّيْحُ۔ ہوا۔ الرِّيْحَةُ۔ ہوا کا کچھ حصہ۔ رِيْحٌ۔ اس کی جمع ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں اِرسالِ رِيْحٍ بیشتر مقامات میں رحمت و شادمانی کے لئے استعمال ہوا ہے اور اِرسال

رَّيْحٌ عَذَابٍ كَلِّمَ* - صاحب لطائف اللغات نے لکھا ہے کہ جب ہوا (الرَّيْحُ) تند و تیز ہو تو اسے الْعَاصِفُ کہا جاتا ہے۔ جو ہوائیں بادل لاتی ہیں وہ مُبَشِّرَاتٌ کہلاتی ہیں۔ جو بارش لاتی ہیں انہیں الْمُعْصِرَاتُ کہا جاتا ہے۔ میدانوں اور صحراؤں میں ہلاکت انگیز ہوا کو بھی عَاصِفُ کہا جاتا ہے۔ لیکن سمندر میں طوفان لانے والی ہواؤں کو الْقَوَاصِفُ کہتے ہیں۔

الرَّيْحُ - نصرت - غلبہ و قوت - گردش - انقلاب - اور باری* - وَ تَذْهَبَ رِيحُكُمْ (۱۶) - تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔ تمہاری قوت چلی جائے گی۔ تَرَوْحَةً - دراصل یہ بیٹھنے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں یعنی سستانے کو۔ پھر نماز تراویح کی ہر چار رکعت کو کہتے ہیں کیونکہ چار رکعتوں کے بعد تھوڑا سا راحت کا وقفہ ہوتا ہے۔ الرِّوْحَةُ - تنگی کے بعد فراخی مل جانا - رَاحَةٌ - شام کے وقت مویشیوں کا گھروں کو واپس آنا۔ چنانچہ الرِّوْحُ - شام یا زوالِ آفتاب کے بعد سے رات تک کا وقت* - سورۃ سبا میں رَوَّاحٌ (شام کا سفر) بمقابلہ غَدُوٌّ (صبح کا سفر) آیا ہے۔ (۱۳)۔

صاحب محیط نے الرُّوْحُ کے معنی فرحت و مسرت، راحت و رحمت کے علاوہ، بادِ نسیم، مدد - انصاف و عدل جس سے فریادی کو راحت و سکون نصیب ہو جائے، بھی لکھے ہیں۔ اور الرُّوْحُ کے معنی (عام انسانی روح کے علاوہ) رحمت، خدا کی طرف سے وحی اور خود قرآن کریم** - مثلاً قرآن کریم میں ہے يَنْزِلُ الْمَلَكُ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۱۶) - یہاں الرُّوْحُ سے مراد وحی ہے۔ اور سورۃ شوریٰ میں ہے وَ كَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحَنَا مِنْ أَمْرِنَا (۲۲) - یہاں رُوحًا سے مراد خود قرآن کریم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں کہا گیا ہے وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (۱۸) - ”تجھ سے الرُّوْحُ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ الرُّوْحُ میرے رب کے امر سے ہے“۔ تو وہاں روح سے مراد انسانی روح (Soul) نہیں بلکہ وحی ہے۔ اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی ہے جہاں أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ کہا گیا ہے۔ (۱۹) - مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وحی کی مہارت سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ دنیائے محسوسات سے نہیں۔ اس لئے تم اس کی مہارت کو نہیں سمجھ

سکتے۔ اس پر ایمان لانا ہوگا۔ البتہ اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہو۔ ”ماہیت“ کے معنی یہ ہیں کہ وحی کیسے ہوتی ہے۔ خدا اور نبی کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اسی بنا پر صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رُوحُ الْقُدُّسِ (۲/۸۷)۔ جسکی تقویت حضرت عیسیٰؑ کو حاصل تھی، تورات اور انجیل کے احکام تھے جو انہیں بذریعہ وحی عطا کئے گئے تھے اور جو نفوس انسانیہ کو مقدس بنا دینے کا موجب تھے۔ بعض نے رُوحُ الْقُدُّسِ سے مراد جبریل لی ہے اور یہی مفہوم سورۃ الشعراء میں الشَّوْحُ الْاَلَامِیْنُ (۲۶/۱۹۳) کا لیا ہے * جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الشَّوْحُ الْاَلَامِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ (۲۶/۱۹۳)۔ اور اسکی تائید سورۃ بقرہ کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں جبریل کے متعلق ہے فَارٰنَّهٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۲/۹۷) اس سے ظاہر ہے کہ الروح الامین جبریل ہی کا لقب ہے۔ سورۃ نحل میں ہے قُلْ نَزَّلَہٗ رُوحُ الْقُدُّسِ (۱۰۲/۱)۔ لہذا روح القدس بھی جبریل ہی کو کہا گیا ہے۔ ہم چونکہ وحی کی کنہ و ماہیت کو نہیں جان سکتے اسلئے جبریل کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں ہو سکتے۔ رُوح کے لفظ سے اس طرف اشارا ملتا ہے کہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جو نبی کے قلب پر انکشاف حقائق کرتی ہے۔ اور ملائکہ وہ کائناتی قوتیں ہیں جو قانون خداوندی کو مشہود بناتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَلٰئِکَۃٌ اور رُوحٌ کا الگ الگ بھی ذکر آیا ہے (۲۴/۳۸ ; ۲۴/۳۹ ; ۲۴/۴۰)۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی کڑیاں تو وہی ہیں جو عام حیوانات کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ لیکن اسکے بعد انسان کو دوسرے حیوانات سے یہ کہہ کر ممتاز کر دیا گیا ہے کہ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہِ (۳۲/۹)۔ اس میں خدا نے اپنی ”روح“ پھونکی۔ اور اسکا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ وَجَعَلْ لَّکُمْ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ (۳۲/۹)۔ انسان کو سمع و بصر یعنی ذرائع علم اور قلب عطا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ”روح خداوندی“ سے مراد وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں اور جس سے انسانی خصوصیات وابستہ ہیں۔ یہ (انسانی خودی) ہر انسان کو یکساں طور پر ملی ہے۔ اسکے بعد دیکھنا یہ ہوگا کہ انسان اسے کس حد تک نشوونما دیتا ہے۔ اسکی کتنی

(Development) کرتا ہے۔ روحانیت سے یہی مراد ہے اور یہ نشوونما قرآنی معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ”توانائی“ یعنی ”روح“، کو ”روحنا“ (ہماری روح) کیوں کہا ہے؟ کیا یہ چیز ”ذاتِ خداوندی“ کا جزو ہے؟ اس سوال کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے ”مادی توانائی“، کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس ”توانائی“ کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے ”روحنا“ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہ راست ملی ہے۔ یہ ”انسانی ذات“، ہے۔ اسی کو ”الوہیاتی توانائی“، سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ”الوہیاتی“، ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں ”اللہ (خدا) کی طرف منسوب۔ لہذا ”الوہیاتی توانائی“ سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی ”غیر از خدا“ کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ ”انسانی توانائی“، کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ ”مادی توانائی“، سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ ”ذات“، کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ اسے ذاتِ خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفہٴ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ”توانائی“، ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نہ اس کا منتہی اس کی ذات سے جا کر مل جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ توانائی، غیر نشوونما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشوونما

دینا، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اسکی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات اس کے طبعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

مادی تصور حیات (Materialistic Concept Of Life) اور قرآنی تصور حیات میں فرق ہی یہ ہے کہ اول الذکر کی رو سے، انسان عبارت ہے صرف اس کے طبعی جسم سے۔ اس جسم کی مشینری، طبعی قوانین کے تابع سرگرم عمل رہتی ہے اور جب انہی قوانین کے مطابق وہ چلنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے، انسان عبارت ہے اس کے طبعی جسم اور اسکی ذات سے۔ اسکی ذات، طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی اس لئے جب طبعی قوانین کے مطابق انسانی جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اس سے اس کی ذات کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔

جسطرح انسانی جسم کی نشو و نما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جسم اور ذات کی نشو و نما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشو و نما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی ذات جوں جوں نشو و نما پاتی جاتی ہے اس میں صفات خداوندی (حدود بشریت کے اندر) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ (مزید تفصیل ن۔ ف۔ م کے عنوان میں ملیگی)۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی جگہ بھی ”انسانی روح“ کا ذکر نہیں کیا۔ ”روح خداوندی“، ہی کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ ”روح خداوندی“، (الوہیاتی توانائی) انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو اسے، قرآن کریم کی اصطلاح میں، نفس کہا جاتا ہے۔ (۹۱-۹۲)۔

اسی کو انسانی ذات (Human personality) یا خودی (Self) یا انا

(I) کہتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم اور اسکی نشوونما کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کی وساطت سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جسم کا توانا ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح انڈے کے اندر جیتا جاگتا چوزہ بننے کے لئے، انڈے کے خول کا صحیح و سلامت رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے (مستقل اقدار) میں تصادم ہو۔ ان میں (Tie) پڑ جائے، تو اسوقت، جسم کے تقاضے کو ذات کے تقاضے پر قربان کر دینا، شرط انسانیت (ایمان کا تقاضا) ہو جاتا ہے۔ جس طرح، جب انڈے کے اندر چوزے کا ”دم گھٹنے لگے“، تو وہ انڈے کے خول کو چونچیں مار مار کر توڑ دیتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہی یہی ہے۔ یعنی جب طبعی تقاضوں میں اور مستقل اقدار میں (Tie) پڑے تو مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبعی تقاضوں کو قربان کر دینا۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں الْقَرِیْحَانُ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ رحمن میں ہے وَالْحَبْ ذُو الْعَصْفِ وَالْقَرِیْحَانُ (۵۵/۱۲)۔ الْقَرِیْحَانُ۔ ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے۔ یا ہر خوشبودار گھاس۔ نیز سبزی کے تختے بشرطیکہ ان میں سے خوشبو آرہی ہو اور ان پر ابتدائی پھول آرہے ہوں۔ فراء نے کہا ہے کہ کھیتی کے تنہ کو عَصْفٌ کہتے ہیں اور اسکے پتوں کو رَیْحَانٌ۔ الْقَرِیْحَانُ اولاد کو بھی کہتے ہیں اور رزق کو بھی۔

أَرَاحَ۔ اس نے آرام کیا۔ موشیوں کو شام کے وقت باڑے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑا (۱۶/۱)۔

رو د

رَوْدٌ۔ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی طلب میں چلتے رہنا۔ پیہم حرکت میں رہنا*۔ الرَّائِدُ۔ چکی کے دستہ کو کہتے ہیں۔ رَائِدُ الْعَيْنِ۔ آنکھ میں پڑ جانے والا تنکا یا کچرا جو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر جاتا رہے۔

الْمَرَادُ۔ وہ جگہ یا راستہ جہاں اونٹوں کی آمد و رفت ہوتی رہے، اونٹوں کی اس آمد و رفت کو رِیَادُ الْبَلِّ کہتے ہیں۔ اَلرَّائِدُ۔ وہ شخص جسے پانی یا چارہ کی تلاش میں قافلہ سے آگے بھیج دیا جائے*۔ چونکہ رَوْدُ کے بنیادی معنوں میں کسی کام کے لئے حرکت اور تگ و دو کا تصور نمایاں طور پر رہتا ہے لہذا اِرَادَةُ کے معنی کسی چیز کی خواہش یا طلب کے ہو گئے، لیکن پھر اِرَادَةُ اور طَلَبُ میں فرق یہ ہو گیا کہ طَلَبُ تو انسان کی کسی بات یا عمل سے ظاہر ہو جاتی ہے اور اِرَادَةُ کبھی پوشیدہ ہوتا ہے اور کبھی ظاہر***۔ اِرَادَةُ در حقیقت دل کے کسی طرف کھینچنے اور رجحانِ دروں کی وجہ سے کسی چیز کی طرف جھکنے کا نام ہے۔ یا یہ ایسے میلان کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں نفع کی توقع ہو***۔ راغب نے لکھا ہے کہ ارادہ ایسی قوت کو کہتے ہیں جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں۔ پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھینچنا ہے، اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے۔ ازاں بعد یہ کبھی صرف دل کے کسی طرف کھینچنے کے لئے اور کبھی محض فیصلہ کے لئے بولدیا جاتا ہے****۔ اس سے رَاوَدَہ کے معنی ہوئے اسے چاہا، بار بار کسی سے کسی چیز کو طلب کیا۔ اس کے بعد عَنّ آنے سے یہ کسی کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی چیز طلب کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً (۱۲/۱) میں جہاں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ۔ ”ہم اسے، اس کے باپ سے اس کی مرضی کے خلاف طلب کرینگے“۔ یعنی ہمارا باپ تو نہیں چاہتا کہ یوسفؑ کے بھائی کو ہمارے ساتھ جانے دے لیکن ہم اس کی مرضی کے خلاف اسے اس سے مانگیں گے۔ اِرَادَ۔ اس نے ارادہ کیا، چاہا۔ یُرِيدُ۔ وہ ارادہ کرتا ہے۔ ان معنوں میں یہ (۳۶/۳) میں آیا ہے۔ یعنی اِنْ یُرِدْ دُنِ الرَّحْمٰنِ بَیْضَرٍ۔۔۔ ”اگر رحمن مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے“۔

رَاوَدَہ عَنّ نَفْسِہِ وَعَلٰیہَا۔ کے معنی ہیں فریب دینا۔ دھوکا دینا۔ پھسلانا*۔ نیز اس کے معنی ہم بستری کی خواہش کے بھی ہوتے ہیں*۔ اس سے قرآن کریم کی آیات (مثلاً ۱۲/۱ و ۵۲/۳) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں عزیز کی بیوی کے غلط ارادے کی طرف اشارہ ہے۔ اور دوسری میں قوم لوط کی غلط روش کی طرف۔ اُرُوْدَ فِی السَّیْرِ۔ کے معنی ہیں وہ سفر میں پر سکون رفتار سے چلا*۔

یہیں سے رُوَیْدَ کے معنی مہلت دینے کے ہو گئے۔ قرآن کریم میں رُوَیْدَ ا مہلت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَمِیْهِلِ الْكَافِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا (۸۶)۔ ”پس تو کافروں کو مہلت دے۔ تھوڑی سی مہلت“۔

قرآن کریم میں جہاں ”خدا کے ارادوں“ کا ذکر آیا ہے، انہیں انسانی ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں۔ صحیح بھی ہوتے ہیں، غلط بھی۔ قابل عمل بھی ہوتے ہیں اور محض ”شاعرانہ“ بھی۔ لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ فیصلے ہیں جو عالم امر سے، اس کے قوانینِ مشیت کے مطابق سرزد ہوتے ہیں اور جن کے مطابق کائنات سرگرم عمل ہے۔

ر و ع

الرَّوْعُ۔ حیرت و دہشت جو کسی چیز کی کثرت یا جمال کو دیکھ کر پیدا ہو۔ الرَّوْعَةُ۔ دہشت، نیز حسن اور جمال کا اثر۔ الرَّوْعُ۔ دل۔ خوف اور گھبراہٹ کا مقام*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ (۱۱)۔ جب ابراہیم کے دل سے حیرانی اور گھبراہٹ جاتی رہی۔

ر و م

الرُّومُ۔ سلطنت رومۃ الکبریٰ (Roman Empire)۔ سورۃ روم (۳۰) میں ہے کہ رومی مغلوب ہو گئے۔ یہ اس شکست کا ذکر ہے جو ایران کے بادشاہ، خسرو پرویز، کے ہاتھوں رومیوں کو پہنچی تھی۔ جس میں رومیوں کا صوبے پر صوبہ فتح ہوتا چلا گیا تھا اور جس کا سلسلہ سنہ ۶۱۵ء تک جاری رہا تھا۔ قرآن کریم نے عین اس وقت جب رومی انتہائی کمزوری میں تھے، کہا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ پھر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ سنہ ۶۲۷ء میں ہرقل نے نہ صرف اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لئے بلکہ ایران کے اندر داخل ہو کر ان کے بڑے آتشکدے کو تباہ کر دیا۔ یہ اس سال (سنہ ۶۲۷ء میں) ہوا جب مسلمانوں کو مخالفین عرب پر، بدر کے میدان میں، پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ عربوں کا قریب ترین حریف ایران تھا۔ ایران کا اتنی قوت حاصل کر لینا کہ رومن ایمپائر بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر

سکے ، عربوں کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ، انہی عربوں کو، قرآنی نظام کی بدولت اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ ان کے سامنے نہ ایرانی سلطنت ٹھہر سکی ، نہ رومن ایمپائر۔ یہ سب ”نکتہ“ ایمان کی تفسیر، تھا۔

رہب

رَهَبٌ - رَهْبٌ - رَهَبٌ - رَهْبٌ - رَهْبَةٌ - رَهْبَةٌ - رَهْبَانٌ -
 کے معنے ہیں ایسا خوف جس میں احتیاط بھی شامل ہو۔ (جیسے ہم جلنے کے خوف سے آگ سے محتاط رہتے ہیں)۔ اَلْمَرْهُوبُ - اَلْمَرْهُوبُ - اَلْمَرْهُوبُ - شیر کو کہتے ہیں *۔ نیز اس کے معنے کمزور ہو جانے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اَلْمَرْهُوبُ وَاَلْمَرْهُوبِي۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سفر میں تھک کر لاغر ہو گئی ہو۔ رَهَبٌ اَلْجَمَلُ کے معنے ہیں اونٹ اٹھا لیکن کمر کے کمزور ہونے کی وجہ سے پھر بیٹھ گیا۔ * اَلْمَرْهُوبَانِيَّةُ - (مسلک خانقاہیت) میں خوف، احتیاط، کمزوری، کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ یعنی (بزعم خویش) خوفِ خدا کی وجہ سے لذاذِ دنیوی کو ترک کر دینا (أَلَا رَهَبٌ - اُن پرندوں کو کہتے ہیں جو شکار نہیں کرتے) * اور اس طرح کمزور اور لاغر ہو جانا۔ اس قسم کے زاہد کو اَلْمَرْهُوبُ - کہتے ہیں۔ رَهْبَانٌ اس کی جمع آتی ہے (۱۳۱)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رَهْبَانٌ فارسی کا لفظ ہے۔ اور یہ مرکب ہے رَهٌ اور بَان سے، جس کے معنے ہیں صاحبِ زہد *۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہو کیونکہ مجوسیوں کے ہاں بھی مسلک خانقاہیت رائج تھا۔
 قرآن کریم میں ہے وَاسْتَرَّ هَبْوُ هُمُ (۱۱۶)۔ ”انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا چاہا،“

سورة حشر میں ہے لَا اَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِ هِمُ (۵۹)۔
 ”تمہارا ڈر ان کے سینوں میں بہت زیادہ ہے،۔ یہاں بھی رَهْبَةٌ کے معنے ڈر کے ہیں۔“

بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اِيقَايَ فَاَرُ هَبْوُنِ (۲۱) تم صرف مجھ سے ڈرنا۔ خدا سے ڈرنے کے معنے یہی ہیں کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈر کر ان کی نگہداشت کی جائے اور ان سے سرکشی اختیار کرنے سے احتیاط کی جائے (رہب کے بنیادی معنے ڈرنے اور احتیاط

کرنے کے ہیں)۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ يَدُ عَوْثِنَا رَغَبًا وَرَهَبًا (۲۱)۔ وہ زندگی کی خوشگوار یوں کو حاصل کرنے (رَغَبًا) اور اسکی ناخوشگوار یوں سے بچنے (رَهَبًا) کیلئے خدا کو پکارا کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں اُسی کے قانون کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے انسان کے لئے دفع مضرت اور جلب منفعت ہی وہ بنیادی جذبات ہیں جو عمل کیلئے محرک (Incentive) بنتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام ان دونوں حالتوں میں قانون خداوندی ہی کا اتباع کرتے تھے۔ یہی مسلک مومنین کا ہونا چاہیئے۔ باقی رہا رَهَبَانِيَّت کا مسلک۔ یعنی ترک دنیا کا مسلک۔ سو قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے عیسائیوں نے خود ہی وضع کر لیا تھا۔ ہم نے اسے ان کے لئے تجویز نہیں کیا تھا (۵۷)۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (۵۷)۔ پھر وہ (اپنے اس خود ساختہ مسلک) کو بھی پوری طرح نباہ نہ سکے۔ یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ مسلک خانقاہیت کے متعلق جو تصوف کی بنیاد ہے اور جسے (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں ”مغزِ دین“ قرار دیا جاتا ہے۔ جب مسلمان کے ہاتھ سے قرآن کریم کا دامن چھوٹا تو وہ تمام غیر قرآنی عناصر جنہیں قرآن کریم مٹانے کے لئے آیا تھا، ایک ایک کر کے اسلام کا جزو بنتے گئے۔ روم کی ملوکیت۔ ایران کی نسل پرستی۔ یہودیوں کی پیشوائیت اور روایت پرستی۔ اور عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلک خانقاہیت۔ سب اسلام کے اجزا بن گئے۔ اور اب اسلام انہی کے مجموعہ کا نام قرار پا چکا ہے۔ یا للعجب! لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ دین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ، بغیر کسی آمیزش کے، ہمارے پاس موجود ہے۔ لہذا ہم دین خالص کو ان آمیزشوں سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی نیت ہو۔

رہط

الرَّهْطُ۔ کسی آدمی کی قوم۔ قبیلہ۔ بعض نے کہا ہے کہ رَهْطُ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تین سے دس تک یا سات سے دس تک کی تعداد ہو۔ دوسروں نے کہا ہے اس سے کم پر بھی بولا جاتا ہے اور زیادہ پر بھی، لیکن اس میں مرد ہی ہوں، عورتیں شامل نہ ہوں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی انسانوں وغیرہ کے اجتماع کے لکھے ہیں۔ سورۃ ہود میں رَهْطُ (۱۱)۔ برادری یا قبیلہ کے لئے آیا ہے۔

سورۃ نحل میں قوم ثمود کے سلسلہ میں آیا ہے۔ وَكَانَ فِي الْمَدْيَنَةِ تِسْعَةٌ رَهْطٍ يَتَّبِعُونَ فِي الْأَرْضِ (۲۴/۳۸) اور شہر میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے،، ظاہر ہے کہ اس سے ان اکابرین قوم کی طرف اشارہ ہے جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ ہر قوم۔ ملک۔ حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ باقی ملک انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتا ہے۔

رہق

رَهَقَهُ۔ يَرْهَقُهُ۔ رَهَقًا۔ اسے ڈھانپ لینا اور اس پر چھا جانا (راغب نے اس میں بزور و جبر چھا جانے کا اضافہ کیا ہے)۔ کسی چیز سے مل جانا۔ اسے آ لینا اور اس سے لاحق ہو جانا *۔ وَلَا يَرْهَقُ وَجُوهُهُمْ قَتَرٌ (۱۶/۱۶)۔ ان کے چہروں پر ذلت اور سیاہی نہیں چھا جاتی۔ أَرْهَقَهُ۔ اسے اسکی طاقت سے بالاتر کسی کام کی تکلیف دی اور اس پر مجبور کیا، مشکل میں ڈالا **۔ سورۃ کہف میں ہے يَرْهَقُهُمْ مَا طُغِيَانَا (۱۸/۱۸)۔ ان پر سرکشی کو چھا دے۔ یا انہیں سرکشی میں مبتلا کر دے۔

رَهَقٌ۔ بیوقوفی۔ حماقت۔ بد خلقی۔ تندہی و طراری۔ شرکارتکاب*۔ ابن فارس نے اس کے معنی دھاندلی، جلد بازی اور ظلم بتائے ہیں۔ فَزَادُواهُمْ رَهَقًا (۲۴/۲۴)۔ سو انہوں نے انہیں جہالت میں بڑھایا۔ ازہری نے کہا ہے کہ یہ دراصل اِرْهَقٌ سے اسم ہے، جسکے معنی ہیں انسان کو کسی ایسے کام کے لئے مجبور کرنا جسکی اس میں طاقت نہ ہو*۔ سَأَرْهَقُهُ صَعُودًا (۱۲/۱۲)۔ میں اسے سخت مشقت میں مبتلا کرونگا۔

رہن

الرَّهْنُ۔ (جمع رِهَانٌ) وہ چیز جو بطور ضمانت تمہارے پاس، اس چیز کے بدلے میں رکھ دی جائے جسے تم سے عاریتاً لے لیا گیا ہو۔ رَهْنٌ لغت میں ثبوت اور استقرار (ٹھہرنے اور جم جانے) کے معنوں میں آتا ہے، لیکن راغب کے نزدیک رَهْنٌ و رِهَانٌ وہ چیز ہے جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔ لیکن الرَّهْنُ خاص طور پر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے۔ یہ زیادہ تر گھوڑ دوڑ کے لئے مستعمل ہے۔

* تاج و راغب۔ ** محیط۔

الرَّاهِنُ* - ثابت اور تیار۔ موجود اور دائم - رَهْنُ الشَّيْءِ* - چیز دائم اور ثابت رہی* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر رہنا، خواہ وہ حق کے عوض ہو یا نا حق -

رَجُلُهُ رَهِيْنَةٌ* - اس کا پاؤں مقید ہے* - اَنَا رَهِيْنٌ بِكَذَا - میں فلاں بات میں ماسخوذ ہوں** - قرآن کریم میں ہے "كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ" (۵۲/۲۱) - ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہے، یعنی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کے اعمال کے نتائج پر ہے - سورۃ بقرہ میں قرضہ کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کاتب نہ ملے تو فَرَّهْنٌ مَقْبُوْضَةٌ* (۲۸۳/۲) مستعار دی ہوئی چیزوں کے عوض کچھ چیزیں بطور ضمانت اپنے قبضے میں رکھ لینی چاہئیں۔ اس سے ہمارے ہاں کے "رهن بالقبضہ" کا جواز نکالنا (جو سود ہی کی دوسری شکل ہے) بڑی زیادتی ہے - "رهن بالقبضہ" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ (مثلاً) ایک کسان نے کسی سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور قرض دینے والے نے اس کی کچھ زمین بطور رهن لے لی - اس کے بعد اس زمین پر قرض دینے والے کا قبضہ ہوگا اور جب تک قرض ادا نہیں ہو جائے گا وہ اس کی پیداوار کھاتا جائے گا - (اور اس پیداوار کو قرض میں محسوب نہیں کرے گا) - اگر یہ رہو* نہیں تو اور کیا ہے؟

ر ھ و

الرَّهْوُ* - دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی - پانی کے جمع ہونے کی جگہ، نیز سکون، جس میں جوش و خروش نہ ہو - الرَّهَاءُ* - ہموار اور کشادہ زمین - عَيْشٌ رَامٍ* - آسودہ و پرسکون زندگی - الرَّهْوَانُ* - نشیبی زمین - وہ گھوڑا جس کی پشت دوڑتے وقت نرم ہو*** - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور ہبوط (نیچے آنا) اور ارتفاع (اوپر جانا) دونوں کے لئے آتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) اطمینان اور سکون اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست - قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لیکر چلے تو ان سے کہا گیا کہ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۲۳/۲۳) - اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تو سمندر کو پرسکون حالت میں چھوڑ دے - یعنی جب حضرت

موسىؑ وہاں پہنچے ہیں تو سمندر سکون کی حالت میں تھا۔ اس میں جوش و خروش نہیں تھا۔ وہ اترا ہوا تھا اور اس طرح اس نے خشک راستہ چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ سورۃ طہ میں ہے **فَاضْرِبْ لَهُم مِّنْ طَرَفَيْكُمَا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا** (۲۰)۔ ”ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ اختیار کر۔“ اور اگر رُہوؑ کے معنی کشادگی کے لئے جائیں تو بھی یہی مفہوم ہوگا کہ سمندر نے (پیچھے ہٹ کر) جو راستہ کشادہ کر دیا ہے انہیں وہاں سے لے چل۔ جس جگہ پہلے سمندر ہو وہ پست (نشیب) ہوگی اور جب وہاں سے سمندر ہٹ جائیگا تو وہ، دوسری زمین کے مقابلہ میں (جو ہنوز زیر آب ہے) بلند ہو جائیگی۔

ر و ض

رَوْضَة۔ وہ زمین جہاں خوشنما پھول، درخت اور پانی ہو۔ خوشنما باغ جس میں نہر ہو۔ سرسبز و شاداب جگہ جس میں، یا جس سے متصل پانی ہو۔ اس کی جمع **رَوَاضٍ** و **رَوَاضَاتٍ** ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو اسے **رَوْضَة** نہیں کہتے۔ نیز پانی جمع ہو جانے کی جگہ۔ **أَرْضَ الْقَوْمِ**۔ اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا۔ **الْأَرْضِ يَاضَة**۔ کسی سے بکثرت کوئی کام لیکر اسے اس کام میں ماهر و مشاق بنانا اور سدھانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) وسعت اور فراخی (۲) کسی چیز کو نرم یا کسی کام کو آسان کرنا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔ **فَتَهُمُّ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ** (۳۵)۔ ”وہ سرسبز مقام میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونگے“ اس کی جمع **رَوَاضَاتٍ** (۳۲) میں آئی ہے۔

ر و غ

رَاغَ الرَّجُلُ رَوْغًا۔ کسی تدبیر کی خاطر چپکے سے ایک طرف ہٹایا مائل ہونا اور کترانا**۔ پھر بقول ابن فارس، جھکنے اور ایک حالت پر نہ رہنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ **رَاغَ فُلَانٌ إِلَى فُلَانٍ**۔ فلاں آدمی فلاں کی طرف چھپ کر مائل ہوا۔ فراء نے کہا ہے **رَاغَ إِلَى أَهْلِهِ** کے معنی ہیں وہ اپنے اہل کی طرف اس طرح لوٹا کہ (سامنے والوں سے) اپنی واپسی یا اس کی غرض کو پوشیدہ رکھا۔ **أَرَاغَ**۔ **أَرَاغَةً**۔ **وَأَرَاغَ**۔ اس نے ارادہ کیا اور طلب کیا۔ **رَوَاغَةً**۔ **رِیَاغَةً**۔ اکھاڑہ**۔

* تاج و راغب۔ ** تاج و محیط و راغب

قرآن کریم میں قصہ حضرت ابراہیمؑ میں ہے فَرَاغَ إِلَىٰ إِلَهِتِهِمْ (۹۱/۳۷)۔ اور فَرَاغَ عَلَيْهِمْ (۹۳/۳۷)۔ رَاغَ إِلَىٰ کے معنی ہیں اپنے ارادے کو دل میں رکھ کر کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ اور رَاغَ عَلَىٰ کے معنی ہیں غلبہ کے ساتھ کسی پر ٹوٹ پڑنا*۔ لہذا حضرت ابراہیمؑ کی تدبیر ایسی تھی جس میں ارادے کی پوشیدگی کا پہلو بھی تھا اور قوت و غلبہ کا بھی۔

ری ب

رَيْبٌ۔ یہ اصل میں نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس کے معنوں میں آتا ہے**۔ نیز شک و شبہ اور بے چینی کو بھی رَيْبٌ کہہ دیتے ہیں***۔ نیز گمان اور تہمت کو بھی***۔ اس کے علاوہ حوادثِ روزگار گردشِ زمانہ اور ضرورت و حوائج کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شک کے ہیں یا شک اور خوف کے۔ الرَّيْبُ۔ جو چیز شک و اضطراب پیدا کر دے۔ نیز حاجت اور ضرورت کو بھی کہتے ہیں۔ رَابَنِي الْأَمْرُ رَيْبًا کے معنی ہیں مجھے فلاں معاملہ نے شک و شبہ میں ڈالا***۔

سورة توبہ میں (مسجدِ ضرار کے ضمن میں) رَيْبَةً رَفِيٍّ قُلُوبِهِمْ (۹۱/۱۰) آیا ہے۔ اس کے معنی اضطراب اور بے چینی کے ہیں۔ سورة ابراہیم (۱۳/۹) اور سورة السبا (۳۳/۵۳) نیز دیگر مقامات میں مَرَّيْبٌ، شَكَّ کی صفت بن کر آیا ہے۔ شَكَّ مَرَّيْبٌ۔ یعنی اضطراب اور بے چینی پیدا کر دینے والا شک۔ (۳۳/۲۰) میں مَرَّيْبٌ تَابٌ آیا ہے۔ یعنی شک کرنے والا۔ اور (۲۹/۲۸) میں اَرْتَابَ بمعنی شک کیا۔ سورة الطور میں رَيْبَ الْمُؤْمِنُونَ (۵۲/۵۲) کے معنی ہیں حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کر سکتے ہیں، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کر سکتی۔

لہذا رَيْبٌ کے بنیادی معنی شک و شبہ کی وجہ سے اضطرابِ نفس کے ہونگے۔ قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں کہہ دیا ہے کہ ذَالِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲)۔ یہ وہ ضابطہٗ حیات ہے جس میں کوئی بات ایسی نہیں جو شک و شبہ والی ہو اور اس کی وجہ سے انسان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش باقی رہے۔ اس میں کامل سکون و اطمینان دینے والی تعلیم ہے۔ اضطراب اور بے چینی کے لئے اس میں کوئی

* تاج و محیط و راغب** محیط۔ لیکن اقرب الموارد میں یہ معنی الریبة کے دئے ہوئے ہیں۔*** تاج۔

گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہ یکسر علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براہین پر قائم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اطمینان علم و براہین ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اندھی عقیدت مندیوں اور توہم پرستیوں سے نہیں۔

ری ش

الرَّيْشُ - الرَّاشُ - پرندے کے پر جن سے خدا ان کے جسم کو چھپاتا ہے *۔ انسانوں کے لباس فاخرہ اور زینت کو بھی الرَّيْشُ کہتے ہیں۔ نیز خوشحالی اور معاش کی فراخی کو۔ چنانچہ رَاشٌ فُلَانًا کے معنی ہیں معاش کے سلسلہ میں اسکی مدد کی اور اسے تقویت پہنچائی۔ اسکی حالت کو درست کر دیا اور اسے نفع پہنچایا۔ رَاشٌ الرَّجُلُ - آدمی آسودہ و مالدار ہو گیا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی خوش حالی کے ہیں۔ نیز وہ عمدہ چیزیں جنہیں انسان حاصل کرتا ہے۔

قرآن کریم میں لباس کے متعلق ہے کہ وہ تمہارا ستر بھی ڈھانپتا ہے اور رِيْشًا (۲۶) باعث زینت بھی ہے۔ قرآن کریم اشیائے کائنات کے صرف افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی کی اہمیت پیش نہیں کرتا، ان کے جمالیاتی گوشوں (Aesthetic Aspects) کو بھی برابر کی اہمیت دیتا ہے۔ حسن فطرت کی تمام رعنائیاں اور دل ربائیاں، خالق فطرت کے اسی انداز تخلیق کی مظہر ہیں۔ یعنی ہر شے میں افادی اور جمالیاتی پہلو۔ مومن کی زندگی بھی ان دونوں گوشوں کی مظہر ہونی چاہیئے۔

ری ع

رَيْعٌ - ہر چیز کا بڑھا ہوا اور زائد حصہ۔ نیز ہر چیز کا اول اور افضل حصہ۔ رَاعِ الطَّعَامِ وَغَيْرُهُ - غلہ وغیرہ زیادہ ہوا، بڑھا، بکثرت ہوا۔ رَيْعٌ - رَيْعٌ - بلند زمین یا بلند جگہ۔ كَمِ رَيْعٌ اَرْضِيكَ - تمہاری زمین کی بلندی کس قدر ہے۔ ہر راستہ یا دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ، نیز پہاڑ۔ الرَّيْعُ - بلند ٹیلہ۔ وادی کی بلند جگہ جہاں سے پانی بہ کر نیچے آتا ہو۔ گرجا۔ رَيْعَانُ الشَّجَرِ - جوانی کا ابتدائی حصہ۔ نَاقَةٌ رَيْعَانَةٌ - بہت دودھ دینے والی اونٹنی *۔

قرآن کریم میں ہے اَتَبْنُونُ بَيْكُلٍ رَيْعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ (۲۶/۱۲۸) ”کیا تم ہر بلند مقام پر (اپنی عظمت کی یادگار کے طور پر) کوئی نہ کوئی نشان

بنا لیتے ہو؟ اور وہ بھی بلا ضرورت۔ اس سے مراد بلند عمارتیں ہیں جنہیں بطور یادگار (Memorials) بنایا جاتا ہے۔ اور جن کا مصارف کچھ نہیں ہوتا۔ یادگار وہی بہتر ہو سکتی ہے جو آنے والوں کے لئے نفع بخش ہو۔

ری ن

رَیْنٌ - وہ زنگ جو کسی صاف چیز پر لگ جائے*۔ میل کچیل کو بھی کہتے ہیں**۔ رَانَ هَوَاهُ عَلَى قَلْبِهِ رَیْنٌ - اسکی خواہشات اسکے دل پر غالب آگئیں۔ رَیْنٌ بِالرَّجُلِ - آدمی ایسے میخمصہ میں گرفتار ہو گیا جس سے نکلنا اسکے بس میں نہیں رہا۔ الرَّیْنَةُ - شراب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر غالب آجاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانکنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۳/۱۵)۔ اُن کے اعمال اُن کے دل پر زنگ بن کر چھا گئے۔ غور کیجئے۔ دلوں پر مہریں کہیں باہر سے نہیں لگتیں۔ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ اور مہریں بن جاتے ہیں۔ اسی کو خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (۲/۲) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں کے اعمال، جن کا نتیجہ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی رو سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ سطحی جذبات میں ایسا ڈوبتا ہے کہ غور و فکر کے راستے اس پر مسدود ہو جاتے ہیں۔

ز

ز ب د

الْزَبْدُ - پانی وغیرہ کے اوپر آجانے والے جھاگ *۔ قرآن کریم میں
 ہے زَبَدًا رَابِعًا (۱۳۱)۔ اوپر آئے ہوئے جھاگ - الْزَبْدُ - مسکھ جس سے گھی
 بنایا جاتا ہے - تَزْبِدُهُ - اس نے اس کا خلاصہ لے لیا *۔
 ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز سے دوسری چیز
 پیدا ہونے کے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ بطور استعارہ زَبَدٌ کثیر شے کے
 لئے بولا جاتا ہے۔

ز ب ر

الزُّبُرُ - لکھنا - اَلتَّزْبِيرُ - لکھائی یا تحریر - مِزْبَرٌ - قلم -
 الزُّبُورُ - بمعنی مِزْبُورٌ - یعنی لکھی ہوئی چیز - کتاب * - اسکی جمع
 زُبُرٌ ہے۔

سورۃ نحل میں ہے کہ رسولوں کو اَلْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ دیکر بھیجا گیا
 (۱۶۱) نیز (۲۱۶)۔ یہاں زُبُرٌ کے معنی کتابیں ہیں - دوسرے مقامات پر
 بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۳۵؛ ۱۸۳) آیا ہے - یہاں
 زُبُرٌ کی تفسیر کتاب منیر سے کی گئی ہے - سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ
 كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ (۲۱۵) - بعض نے کہا ہے کہ
 یہاں زَبُورٌ سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہے اور ذِکْرٌ سے مراد
 تورات ہے - لیکن سعید بن جبیر کا قول ہے کہ زَبُورٌ، تورات - انجیل -
 قرآن کریم - ہر ایک کتاب الہی کو کہتے ہیں * - اسکی تائید اس سے
 بھی ہوتی ہے کہ سورۃ نساء میں ہے وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (۱۶۳) اگر
 زبور سے مراد وہ خاص کتاب ہوتی جو حضرت داؤدؑ کو دی گئی تھی تو

زَبُورًا (ایک کتاب) نکرہ نہ ہوتا بلکہ القرآن اور الانجیل کی طرح الزبور ہوتا۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر وہ کتاب جس کی کتابت بڑی سوئی ہو زَبُورٌ کہلاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) لکھنا پڑھنا اور (۲) کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا ہیں۔ اَلزَّبْرَةُ - لوہے کا بڑا ٹکڑا *۔ اسکی جمع زُبُرٌ اور زَبْرٌ آتی ہے۔ (۱/۹۶)۔ اسی سے اس کے معنی فرقے۔ الگ الگ گروہ، کے آتے ہیں۔ (۲/۵۳)۔

(چونکہ زُبْرٌ - زَبُورٌ کی بھی جمع ہے اس لئے (۲/۵۳) میں اس کے معنی الگ الگ کتابیں بھی ہو سکتے ہیں)۔

ز ب ن

اَلزَّبْنُ - دھکا دینا۔ دفع کرنا۔ کسی چیز کو کسی چیز سے دور کر دینا اور ہٹا دینا۔ اَلزَّبْنُ - سخت دھکا دینے والا۔ نَاقَةٌ زَبُونٌ - وہ اونٹنی جو دودھ دوہنے والے کیولات مار دے اور دھکا دیدے۔ حَرْبٌ زَبُونٌ - شدید جنگ جس میں سخت ٹکراؤ ہو *۔ لڑائی کو اسکی صعوبتوں کی وجہ سے زَبُونٌ کہتے ہیں ***۔ اَلزَّبْنِيَّةُ - ہر متمرّد آدمی۔ سخت آدمی۔ سپاہی۔ اسکی جمع زَبَانِيَّةٌ آتی ہے *۔ (۹/۱۸)۔ وہ مجاہدین جو حق کی مدافعت کے لئے میدان میں نکلیں۔

ز ج ج

اَلزَّجُّ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریک ہونے کے ہیں۔ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ نیز کہنی کا نوکیلا سرا۔ اَلزَّجَّاجُ - کانچ اور شیشے اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں۔ واحد زُجَّاجَةٌ ہے ****۔ قرآن کریم میں چراغ کے متعلق ہے "فِي زُجَّاجَةٍ" (۲۳/۳۵)۔ اس سے مراد ہے شیشے کی چمنی یا فانوس۔

جب پیالہ بھرا ہوا ہو تو اسے "كَأْسٌ" کہتے ہیں اور جب خالی ہو تو زُجَّاجَةٌ کہلاتا ہے *****۔

ز ج ر

زَجَرَهُ - يَزْجُرُهُ - زَجْرًا نیز اَزْدَجَرَهُ - اسنے اسکو روکا اور منع کیا اور جھڑکا۔ دراصل اس کے معنی آواز کے ساتھ کسی کو ہنکا دینا اور

* تاج - ** راغب - *** کتاب الاشتقاق - **** تاج و راغب - ***** لطائف اللغہ نیز فقہ اللغہ - (لشعالی)۔

دھتکارنا ہیں۔ زَجَرَ الْبَعِيرَ۔ اسنے اونٹ کو ڈانٹ کر ہانکا۔ اَلتَّزَجُّوْرُ۔ وہ اونٹنی جو بلا ڈانٹ کھائے دودھ نہ دیتی ہو*۔ اس لئے اس لفظ میں ڈانٹنے اور جھڑکنے کا پہلو ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا (۳۷/۳۷)۔ اس سے مراد وہ جماعت مجاہدین ہے جو سرکش اور مستبد قوتوں کو ان کی دست درازیوں سے ڈانٹ کر روکتی ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے فَالْنَّصَاہِیَّ زَجْرًا (۳۷/۳۸) وَأَحِیْدَةً (۳۷/۳۹) ”وہ صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی“۔ سورۃ القمر میں ہے مَا فِیْہِ مَزْدَجَرٌ (۵۴/۵۴)۔ جس میں ایسی باتیں ہیں جو مفساد سے روکتی ہیں۔ اس سے ذرا آگے ہے مَجْنُوْنٌ وَأَزْدُجِرٍ (۵۴/۵۴)۔ انہوں نے اسے مجنوں قرار دیا اور ڈانٹ کر نکال دیا۔ مفاد پرست گروہ اپنی قوت اور اقتدار کے نشہ میں ہر داعی الی الحق کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔

زج و

زَجَاہُ۔ یَزْجُوْہُ۔ زَجَّوْا۔ وَأَزْجِیْ اِزْجَاً۔ کسی چیز کو نرمی اور آہستگی سے ہانکنا۔ نرمی سے چلانا**۔ قرآن کریم میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَزْجِیْ سَحَابًا (۲۳/۲۳)۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ بادلوں کو آہستگی اور سہولت سے چلاتا ہے۔ زَجَا اِلَا مَرٌّ۔ معاملہ آسان اور سیدھا ہو گیا۔ اَلْمُرُّ جِی۔ قلیل چیز**۔

بِضَاعَةٌ مَزْجَاةٌ (۱۲/۸۸)۔ قلیل سرمایہ۔ تھوڑی سی پونجی**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بغیر کسی روک ٹوک کے پھینکنا اور چلا دینا ہیں۔ یعنی جسے آسانی سے نکالا اور روانہ کر دیا جائے۔ بِضَاعَةٌ مَزْجَاةٌ سے مراد ہوگی ایسی پونجی جسے آسانی سے نکال کر دیا جاسکے۔

زح زح

زَحْزَحَہُ عَنّہُ کے معنی ہیں اسے اس سے دور کر دیا، ہٹا دیا، ایک طرف کر دیا۔ هُوَ یَزْحِزْحُ مِیْنَہُ۔ وہ اس سے دوری پر ہے۔ اَلزَّحْزَاحُ دور۔ بعید۔***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا هُوَ بِمُزَحَّزٍ حِيَهٗ مِّنَ الْعَذَابِ (۹۶) وہ (طولِ عمر) اس کو عذاب سے دور نہیں رکھ سکتا۔ سورۃ آل عمران میں ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۱۸۳) جو تباہیوں سے دور رکھا گیا۔

ز ح ف

زَحَفَ إِلَيْهِ زَحْفًا - اس کی طرف آگے بڑھا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے کی طرف بڑھتے چلے آنا ہیں۔ اصل میں زَحَفَ بچے کے کولہے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلنے کو کہتے ہیں*۔ گھٹنوں کے بل چلنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے**۔ زَحَفَ الْبَعِيرُ - اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے لگا*۔ الزَّحَافَةُ - وہ حیوانات جو زمین پر گھسٹ کر چلتے ہوں۔ جیسے کچھوا وغیرہ**۔ پھر زَحَفَ فُجُوجُوكے چلنے کے لئے بولا جانے لگا کیونکہ وہ کثرت و گرانباری کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہیں۔ چنانچہ اَزْ حَفَّ لَنَابِنُو فُلَانٍ کے معنی ہیں، فلاں قبیلہ ہم سے لڑنے کے لئے مذکورہ بالا کیفیت سے آیا۔ تَزَاحَفُوا فِي الْقِتَالِ - وہ جنگ میں ایک دوسرے کے قریب اور بالمقابل ہو گئے۔ مَزَاحِفُ الْقَوْمِ - قوم کی لڑائیوں کے مقامات*۔ الزَّحَفُ - جرار لشکر کو بھی کہتے ہیں جو دشمن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ سورۃ انفال میں ہے اِذَا لَقِيْتُمْ الذِّينَ كَفَرُوْا زَحَفًا (۱۵) - جب تمہارا کفار کے ساتھ آئنا سامنا ہو درآنحالیکہ وہ تمہاری طرف بڑھ رہے ہوں۔

ز خ ف

الزُّخْرُفُ - سونا (جسکے زیورات بنتے ہیں)۔ یہ اس کے اصلی معنی ہیں۔ اس کے بعد زیبائش، زینت و آرائش کو بھی زُّخْرُفٌ کہنے لگ گئے۔ اور پھر بطور تشبیہ ہر ملمع کی ہوئی جھوٹی بات کو***۔ محیط نے سونا یا زینت دونوں میں سے ایک کے اصلی معنی ہونے میں شک کیا ہے**۔ زُّخْرُفٌ کے معنی کسی چیز کے حسن کا کمال بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں زُّخْرُفُ الْقَوْلِ (۱۳) آیا ہے، جس کے معنی ملمع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اور حَتَّى اِذَا اَخَذَتْ اِلَآرْضُ زُّخْرُفَهَا (۲۴) میں اس کے معنی سنگھار اور آرائش کے ہیں۔ سورۃ زخرف میں زُّخْرُفًا (۳۳) کے معنی سامانِ آرائش ہیں یا خود آرائش و نقش و نگار۔ راغب نے زُّخْرُفٌ کے معنی مصنوعی زینت کئے ہیں****۔

* تاج - ** محیط - *** تاج و محیط - **** راغب -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی زینت کے ہیں اور سونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

ز ر ب

الزَّرْبُ - داخل ہونے کا راستہ - بکریوں وغیرہ کے لئے لکڑیوں کا باڑہ - الزَّرَّارِیُّ (واحد زُرَّابٍ یا زَرُّبِیَّةٌ ہے) گدے - بچھونے - ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے - فراء نے کہا ہے کہ زَرَّابِیُّ - روئیں دار غالیچوں کو کہتے ہیں - ممکن ہے کہ یہ معنی الزَّرَّارِیُّ مِّنَ النَّبَاتِ سے تشبیہ کے باعث پیدا ہو گئے ہوں جو ایسے زرد سرخ پودوں کو کہتے ہیں جن میں سبزی ہو* - الزَّرُّبِیَّةٌ - عمدہ بچھونا یا قالین** - قرآن کریم میں زَرَّابِیُّ مَبْشُوثَةٌ آیا ہے (۱۶۸) - اعلیٰ درجے کے بچھائے ہوئے فروش - ابن فارس نے کہا ہے کہ زَرْبٌ کے بنیادی معنوں میں راحت کدہ یا آرامگاہ کا تصور مضمر ہے۔

ز ر ع

زَرَاعٌ - یَزْرَعُ - زَرْعًا وَ زَرَاعَةً - زمین میں بیج ڈالنا۔ الزَّرْعُ اُگنا* - ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما دینے اور بڑھانے کے ہیں۔ لہذا، جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے معنی بیج ڈالنے کے نہیں بلکہ کھیتی اُگلنے کے ہونگے۔ انسان زمین کو تیار کر کے اس میں تیخ ریزی کرتا ہے اور مناسب احتیاطیں برتتا ہے لیکن دانے میں سے کونپل پھوٹنا اور اس کا پودا اور پیڑ بن جانا، یہ سب کچھ خدا کے قانون ربوبیت کے ماتحت ہوتا ہے جس میں انسان کے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہُ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (۵۶)۔ ”کیا کھیتی کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں!“ تم صرف حَرَث کرتے ہو (۵۶)۔ یعنی تم صرف کھیتی بونے ہو۔ اُگاتے ہم ہیں۔ لہذا تم ساری کی ساری فصل کے مالک کیسے بن سکتے ہو! تم اپنی محنت کا حصہ لے لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ یعنی اُن لوگوں کو دے دو جنہیں اس کی ضرورت ہے (۵۶)۔

الزَّرَّاعُ (۳۸) - کھیتی کرنے والے - باغبان - (واحد زَارِعٌ) زَرْعٌ - کھیتی - بونے سے جو کچھ اُگ آئے* - (۱۳ و ۱۳۲)۔

ز ر ق

الزَّرَقُ - نیلا رنگ - الزَّرْقَةُ : نیلا ہٹ - سفیدی - آنکھ کی سیاہی میں سبزی - آنکھ کی سیاہی پر سفیدی کا چھا جانا - زَرَقَ - اس کی آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چڑھی - ایسا شخص آزُرَقُ کہلائیگا۔ اس کی جمع زُرُقُ ہے - الزَّرَقُ - اندھے پن کو کہتے ہیں - زَرَقَتْ عَيْنُهُ تَزُرُقُ - آنکھوں کا نیلا ہو جانا* - قرآن کریم میں ہے نَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرُقًا (۱۰۲) - (زُرُقُ جمع ہے۔ اس کا واحد آزُرَقُ ہے) - حشر میں ہم مجرمین کو اندھا اٹھائینگے ، ان کی آنکھوں کی سیاہی پر سفیدی چھائی ہوگی - راغب نے بھی لکھا ہے کہ زُرُقًا کے معنی ہیں اندھے - جن کی آنکھوں میں نور نہ رہے** - اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عربوں کی رومیوں سے قدیم دشمنی تھی اور انکی آنکھیں نیلی تھیں اس لئے ہر مبغوض اور دشمن کو آزُرَقُ الْعَيْنِ کہا جانے لگا، خواہ اس کی آنکھ نیلی نہ ہو*** لیکن ہم اول الذکر توجیہ کو بہتر تصور کرتے ہیں، اس لئے کہ اسے قرآنی تائید بھی حاصل ہے - چنانچہ اسی سورت میں کچھ آیات کے بعد نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰی (۱۰۲) ہے - یعنی ”ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے“ -

ز ر ی

زَرَى عَلَيْهِ عَمَلَهُ - اس کے کسی کام پر اسے ملامت کرنا ، برا بھلا کہنا - عتاب کرنا - حقیر جاننا اور اس پر عیب لگانا - اِزْدَرَاهُ - اسے حقیر و بے وقعت گردانا - اَلْمُزْدَرٰی - حقیر جاننے والا**** -

قرآن کریم میں ہے تَزْدَرٰی اَعْيُنُكُمْ (۱۱) - وہ لوگ جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں - (باب افتعال ہے - تاء ، دال سے بدل گئی ہے)

ز ع م

الزَّعْمُ - الزَّعْمُ - الزَّعْمُ - بات - قول - جو حق بھی ہو سکتی ہے اور باطل بھی - لیکن اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن کے بارے میں شک کیا جاتا ہو اور وہ متحقق نہ ہوں - لیث نے کہا ہے کہ جب عرب کہتے ہیں ذَكَرَ فُلَانٌ تو یہ ایسے معاملات کے متعلق بات ہوتی ہے جس کی بابت یقین

ہو کہ وہ حق ہے۔ لیکن اگر شک ہو اور اس کا یقین نہ ہو کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے یا جھوٹ، تو ایسی جگہ زَعَمَ فُلَانٌ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زَعَمَ کے معنی ہی جھوٹ ہیں۔ اَلتَّزَعُّمُ۔ جھوٹ گھڑنا۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ زَعَمُوا ایسی باتوں کو کہتے ہیں جن کی نہ کوئی سند ہو نہ ثبوت، بلکہ یونہی زبانی نقل ہوتی چلی آرہی ہوں، کہ اس نے اس سے کہا اور اس نے اس سے*۔ اصل میں اس کے معنوں میں ظن اور توقع کا پہلو شامل ہوتا ہے۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلزَّعْمُ۔ اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن میں شک ہو یا جن کے جھوٹا ہونے کا عقیدہ دل میں ہو۔ بعض لوگوں نے قول بلا دلیل کو زَعَمَ کہا ہے۔ بعض نے ادعائے علم (یعنی کسی بات کے جاننے کا دعویٰ کرنے) کو کہا ہے۔ بعض کے نزدیک زعم کا تعلق اعتقاد سے ہے، خواہ صحیح ہو یا غلط**۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہو***۔

قرآن کریم میں ہے زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّنْ يُبْعَثُوا (۶۳)۔ ”حقیقت سے انکار کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے“۔ سورۃ انعام میں ہے بِزَعْمِهِمْ (۱۳۷)۔ اس کے معنی گمانِ باطل کے ہیں۔ زَعَمَ بِهِ: اس کی ذمہ داری لی، ضامن ہوا۔ اسی سے اَلزَّعِيْمُ۔ ذمہ دار اور کفیل کو کہتے ہیں (۱۲۰ و ۶۸)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) بغیر صحت اور یقین کے کوئی بات کہہ دینا۔ اور (۲) کسی چیز کا ذمہ دار اور کفیل بن جانا۔

ز ف ر

زَفَرَ۔ يَزْفِرُ۔ زَفِيرًا۔ سانس کو کھینچ کر نکالنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں سانس کا بار بار پلٹنا تا آنکہ اس کی وجہ سے سینہ پھول جائے***۔ (جیسے سسکیاں بھرنے میں ہوتا ہے) اس کا بیشتر استعمال گدھے کے رینکنے کی ابتدائی آواز پر ہوتا ہے اور اس کے برعکس شہیق اس کی آواز کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، اس لئے کہ زفير سانس اندر کی طرف

کھینچنے کو کہتے ہیں اور شَہِیقٌ سانس کے باہر نکالنے کو*۔ قرآن کریم میں زَفِیْرٌ وَ شَہِیقٌ (۱۱۰/۱) اکٹھا آیا ہے۔ اس کے معنی (آہیں بھرتے، سسکتے اور واویلا کرتے ہوئے) چیخنے چلانے کے ہیں (۲۱۰/۱)۔ اَلزَّفِیْرُ۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو بھی کہتے ہیں*۔ (۲۵/۱۳) ”اور اس کا اطلاق ناگہانی مصیبت کے لئے بھی ہوتا ہے*۔ اَلزَّفِرُ۔ جو بوجھ کمر پر لدا ہو اسے کہتے ہیں۔ مسافر کا سامانِ سفر۔ مشکیزہ جس میں چرواہا اپنے لئے پانی لے جاتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بوجھ اور آواز دونوں لکھے ہیں۔

ز ف ف

اَلزَّفِیْفُفُ۔ کے اصلی معنی ہوا کے تیز چلنے کے ہیں۔ نیز شتر مرغ کی وہ تیز رفتار جس میں وہ چلنے کے ساتھ اڑنے کو بھی ملا دیتا ہے**۔ زَفَفَ البَعِیْرُ۔ اونٹ نے چلنے میں تیزی کی۔ اَلزَّفَفُوفُ۔ تیز رفتار شتر مرغ، نیز خوش رفتار اونٹنی۔ اَلزَّفِیْفُفُ۔ بجلی کی چمک کو بھی کہتے ہیں۔ زَفَفَ الْعَرُوسُ اِلٰی زَوْجِیْہَا زَفًّا وَ زَفَافًا۔ اس نے دلہن کو شوہر کے پاس پیش کیا*۔ (اس میں پیش کرنے والوں کے شدتِ شوق کا پہلو نمایاں ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہر چیز میں پھرتیلا پن اور تیز خرامی کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَاَقْبِلُوْا اِلَیْہِ یَزِزْ فُتُوْنًا (۳۶/۹)۔ ”وہ اس کی طرف تیزی سے آئے“۔ (اس میں جذبات کی شدت کا پہلو نمایاں ہے)۔

ز ق م

اَلزَّقْمُ۔ لقمہ بنانا۔ نگل لینا۔ اَزَقَمَہُ الشَّیْءُ۔ اس نے اسے کوئی چیز بطور لقمہ دی اور اسے نگلائی*۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَقَمَ اور تَزَقَّمَ سے مراد کسی ناپسندیدہ چیز کو نگلنا ہے**۔ اَلزَّقْمُومُ۔ ایک جنگلی پودہ کا نام ہے جس میں کڑوی سی تیز بو ہوتی ہے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدھیئت ہوتے ہیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے طَلْعُہَا کَانَ نَّہْہُ رُءُوسُ الشَّیْطَانِ (۳۵/۶)۔ اس کے خوشہ کا خول ایسا ہے جیسے سانپ کا پھن ہو۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ پودا ناگ پھنی تھوہر کا ہوگا۔ لیکن پودا کوئی بھی ہو، قرآن کریم نے جس کیفیت کے لئے تشبیہاً اس لفظ کا استعمال کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ ثعلب نے کہا کہ اَلزَّقْمُومُ۔ ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو زہریلا اور قاتل ہو*۔ اور

صاحب محیط نے لکھا ہے *۔ کہہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ایسی چیز کھا لے یا کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لئے وبال جان بن جائے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ (۳۷/۶۳)۔ وہ ایک ایسا درخت ہے جو جہنم (جحیم) کی جڑوں میں اگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی سچ مچ کا درخت نہیں، کیونکہ جہنم کی جڑ میں کونسا درخت اُگ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اس قسم کا رزق ہے جس سے انسانیت جل کر راکھ ہو جائے۔ اس کے خوشے بڑے بڑے سرکش و مستبد لوگوں (شیاطین) کے سروں جیسے ہونگے۔ یعنی ظلم و استبداد سے حاصل کردہ رزق۔ اسی کو شَجَرَةٌ مَلْعُونَةٌ بھی کہا گیا ہے (۱۶/۶۰) اور طَعَامٌ لَّاتِيْمٍ بھی (۳۳/۳۳)۔ یعنی ایسا رزق جس سے انسان کی قوتیں مضمحل اور صلاحیتیں افسردہ ہو جائیں اور وہ زندگی کی صحیح خوشگوار یوں سے محروم رہ جائے۔ یہ ان لوگوں کا رزق ہے جو اپنے آپ کو (بزعم خویش) بڑا صاحبِ عزت و تکریم سمجھتے ہیں (۳۹/۳۹)۔ یعنی مُتْرَفِيْن کا طبقہ (۵۶/۳۵) جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت اور حکومت کرنے کے خوگر ہوں۔ اس رزق سے پیٹ تو ضرور بھر جاتا ہے (۳۷/۶۶) لیکن انسانیت نشو و نما نہیں پاسکتی (۳۷/۶۸)۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جو الشَّجَرَةُ الْمَلْعُونَةُ (۱۶/۶۰) آیا ہے اور جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا، ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد وہ شَجَرَةُ خَبِيثَةٍ ہو جس کا ذکر (۱۳/۱۶) میں آیا ہے۔ یعنی باطل نظریہ حیات۔ بھر حال یہ تمام بیانات تشبیہی ہیں۔

زکریا علیہ السلام

قرآن کریم نے انبیائے بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت زکریاؑ کا نام بھی لیا ہے (۸۵/۱)۔ ان کے متعلق سورۃ آل عمران (۳۰/۳۷)۔ سورۃ مریم (۱۹/۱۵) اور سورۃ انبیاء (۲۱/۸۹) میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور ان کی بیوی عقیم۔ لیکن ان کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بیدار کر دی گئی (۲۱/۹) اور ان کے ہاں حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ حضرت مریمؑ کو انہی کی کفالت میں دیا گیا تھا (۳۷/۳۷)۔

لوقا کی انجیل میں ہے کہ ”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیہا کے قبیلہ میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں

سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا۔ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی۔“

تورات (عہد نامہ قدیم) میں ذکرِ یاء نام کے ایک نبی کا ذکر آیا ہے۔ اسرائیلیوں کے ہاں ہیکل کے ایک بہت بڑے منصب دار کو نبی کہتے تھے جس کا ترجمہ کاہن کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے نبی کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے۔ حضرت زکریاؑ کو قرآن کریم نے زمرہٴ انبیاء کرام میں شمار کیا ہے۔

زک و

زَكَاَ الْمَالُ وَالْزَّرْعُ - يَزُ كُوْ - زُ كُوًّا وَآزُكِي - جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا - پھولنا - بڑھنا - نشوونما پانا - آزُكِي 'اللَّهُ الْمَالُ وَزَكَاهُ' - خدا نے مال کو نشوونما دی - بڑھایا - زَكَاَ الرَّجُلُ يَزُ كُوْ - آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا - اسکی صلاحیتوں میں نشوونما آگئی - اسکی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی*۔

لہذا زَكَاَ کے بنیادی معنی نشوونما پانا - بڑھنا - پھولنا - پھلنا ہیں۔ راغب نے اس کے یہ معنی لکھ کر اسکی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے۔ فَلْيَنْظُرْ آيَتَهُآ آزُكِي طَعَامًا (۱۸/۱) یہ دیکھو کہ کونسا کھانا ایسا ہے جو حلال اور خوش انجام ہے، یعنی جس میں نشوونما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے، جو زیادہ (Nutritious) ہے۔

الْزُّكُوَّةُ کے معنی ہیں نشوونما - بالیدگی - پھولنا - پھلنا*۔ اسکے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں۔ غالباً اسلئے کہ درختوں کی نشوونما کے لئے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اسکے بنیادی معنی نہیں۔ خود قرآن کریم میں (ایک ہی آیت میں) آزُكِي اور أَطْمَهَرُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ آزُكِي لَكُمْ وَأَطْمَهَرُ (۲۳/۲)۔ اس میں أَطْمَهَرُ تو پاکیزگی کے لئے ہے اور آزُكِي نشوونما کے لئے۔ پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت (Negative Virtue) ہے۔ یعنی نقائص اور خرابیوں سے دور رہنا۔ لیکن زَكُوَّةٌ ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے۔ یعنی بڑھنا - پھولنا - پھلنا - نشوونما اور بالیدگی حاصل کرنا۔ صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے آلِزِکِی کے معنی لکھے ہیں خیر و خوبی کے ساتھ بڑھنے والا۔ عمدہ

صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا۔ یعنی اس میں بالیدگی اور ارتقا کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ اَرْضُ زَكِيَّةً کے معنی ہیں سرسبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو۔ اَرْضُ کی معنی ہیں اَنْفَعٌ۔ زیادہ منفعت بخش۔**۔ اسی اعتبار سے زکاؑ اس عدد کو کہتے ہیں جو زوج (جوڑا) ہو۔**۔

سورۃ کہف میں ہے کہ خدا انہیں ایسا بیٹا دیگا جو انکے پہلے بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاوَةً (۱۸)۔ نَفْسًا زَكِيَّةً (۱۸) کے معنی ہیں اچھا، عمدہ، جوان، نشوونما یافتہ لڑکا۔ دوسری جگہ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹) آیا ہے۔ سورۃ الشمس میں زَكَّاهُمْ کے مقابلہ میں دَسَّاهُمْ کا لفظ آیا ہے (۱۰:۹)۔ تَدْسِيَةً کے معنی ہوتے ہیں دبا دینا۔ کسی کو زندہ دفن کر دینا (۱۶:۱)۔ اُسکی نشوونما کو روک دینا۔ لہذا تَزْكِيَّةً کے معنی ہونگے ان تمام موانع کو دور کر کے جو کسی کی راہ میں حائل ہوں، اسکی نشوونما کیلئے حالات کو مساعد کرنا۔

قرآن کریم میں اَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہی دو ستون ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کے مفہوم کے لئے (ص۔ ل۔ و کے عنوان میں) ”صلوٰۃ“ کا لفظ دیکھئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے ”ایتائے زکوٰۃ“۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا۔ اور (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس ”نشوونما“ میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۲۲)۔ ”یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے“۔ یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ ”ایتائے زکوٰۃ“ ہوگا۔ یعنی دوسروں کو نشوونما دینا۔ اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ اسی کے

متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ مومن وہ ہیں ھُمُ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ (۲۳) جو زکوٰۃ (یعنی نوع انسان کی نشوونما) کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مملکت اسلامی (یا نظام خداوندی) اپنے اس عظیم فریضہ (نوع انسان کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کس طرح سے دیگی؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے (اولاً) ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہینگے تاکہ وہ رزق کی تقسیم لوگوں کی ضرورت کے مطابق کر سکے۔ اور (دوسرے یہ کہ) افراد معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اسے اس طرح کھلا رکھیں کہ مملکت اس میں سے جس قدر ضرورت سمجھے، ”ایتائے زکوٰۃ“، (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے۔ حتکہ اس ضمن میں یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ افراد کی ضروریات پورا ہونے کے بعد بچ جائے، عندالضرورت وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں لیا جاسکتا ہے۔ (دیکھئے ۲۱۹)۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو مملکت اسلامی کی تمام آمدنی ”ایتائے زکوٰۃ“ کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

لیکن اس قسم کا اسلامی نظام، بتدریج قائم ہوگا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیر تشکیل ہوگا، اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائینگے۔ یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائینگے۔ ان کے لئے قرآن کریم نے ”صدقات“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ”صدقات“، اور ”زکوٰۃ“ کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ حتکہ قرآن کریم نے ”صدقات“ کے خرچ کی جو مدات بتائی ہیں (۶۰) انہیں بھی زکوٰۃ کے مصرف کی مدات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلامی نظام مملکت کے شعبے ہیں۔ انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسان جو کچھ ضرورت مندوں کو دیگا وہ خیرات ہوگی۔ اسلامی نظام میں خیرات لینے یا دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ حکومت لیتی ہے وہ مملکت کا ٹیکس ہوتا ہے، اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس ہے۔ ”قیصر اور خدا“ کی یہ تقسیم، عیسائیت کی ثنویت۔

(Dualism) کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام میں اسکی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام میں ، جو مملکت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے ، اسے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا ہی کو دیا جاتا ہے۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے عنوانات ” ر - ب - ب “ - ” ن - ف - ق “ اور ” ص - د - ق “، بھی دیکھئے)۔

سورة النجم میں ہے فَلَا تَزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ - هُوَ اعْلَمُ بِمَنْ اتَّقٰی (۵۳/۳۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ نہ کر لو کہ تمہارا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو رہا ہے۔ اس کے لئے معیار ، خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ الَّذِیْ یُّؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكٰی (۹۲/۱۸)۔ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (نوع انسان کی پرورش کے لئے) دیتا ہے۔ یعنی مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی (۹۲/۵)۔ ”جو دیتا ہے اور تقویٰ شعار بنتا ہے.... اس کے لئے راستے آسان ہو جاتے ہیں (۹۲/۶)۔

زل ف

الزَّلَفُ وَالزَّلْفُی وَالزَّلْفَةُ - قرب - درجہ و مرتبہ - الزَّلْفَةُ - شروع رات یا مطلقاً رات کا ایک حصہ (چھوٹا ہویا بڑا)۔ جمع زُلْفٌ ہے۔ اَلْمَزَالِفُ - سیڑھیاں ، جن سے انسان بلند بھی ہو جاتا ہے اور اپنی منزل سے قریب بھی - اس میں قرب اور مدارج دونوں آ جاتے ہیں (دَرَجَةٌ - بھی سیڑھی کو کہتے ہیں جو اوپر کی طرف لیجائے)۔ زَلَفَ إِلَیْهِ - وہ اس کی طرف قریب ہوا۔ اَزْلَفَهُ - اسے قریب کیا ، اکٹھا کیا - ابن فارس نے اس سادہ کے بنیادی معنی کسی چیز سے قریب ہونے کے لئے آگے بڑھتے جانا بتائے ہیں* - راغب نے کہا ہے زُلْفٌ رات کی منزلوں کو کہتے ہیں** - صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک الزَّلْفَةُ - منزل کو کہتے ہیں -

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً (۶۷/۱)۔ ”جب وہ اسے قریب دیکھینگے“ - سورة سبا میں ہے تَقَرَّبْ بِكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰی (۳۳/۳۳) ”جو مرتبہ میں تمہیں ہم سے قریب تر کر دے“ - سورة شعراء میں ہے وَاَزْلَفْنَا ثُمَّ اِلَّا خَرٰیْنِ (۲۶/۱۶) ”اور ہم وہیں دوسروں کو قریب لے آئے“ - سورة هود میں ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَی النَّهَارِ وَزُلْفًا مِّنَ اللَّیْلِ (۱۱/۱۱) یعنی دن کے دونوں سرے اور رات کے کچھ حصے۔ (نیز دیکھئے عنوان د - ل - ک نیز ط - ر - ف)

زل ق

زَلِقَ - يَزْلُقُ - زَلَقَ - يَزْلُقُ - زَلَقًا - پھسل جانا - لغزش
 کھا جانا - اپنی جگہ سے ہٹ جانا - الزَلَقُ - سپاٹ زمین جس پر قدم پھسل
 جائیں - جس پر کوئی پودا نہ ہو - الزَلَقَةُ - چکنی چٹان - آئینہ* - سورة کہف
 میں ہے فَتَصْبِيحُ صَعِيدًا زَلَقًا (۱۸/۱۸) - ”وہ صاف اور چکنا میدان رہ
 جائے جس میں کوئی سبزی وغیرہ نہ ہو“ - آئینہ کی طرح صاف اور چٹیل ہو
 جائے - اَزْلَقَ فَلَانًا بَبَصَرِهِ - اس کی طرف بہت تیز (ناراضگی کی) نگاہ
 سے دیکھا - اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ آنکھوں آنکھوں ہی میں اسے
 اس کے مقام سے ہٹا دیگا* - سورة القلم میں کفار کے متعلق ہے لَيَزْلُقُونَكَ
 يَا بُصَّارَ هِيمَ (۶۸/۵۱) - ”وہ تمہیں اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں گویا
 اپنی نگاہوں سے تجھے اپنے مقام سے پھسلا دینگے“ -

زل ل (زلزل)

زَلَّ - زَلِيلٌ - مَزَلَّةٌ - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اَلْمَزَلَّةُ
 والمَزَلَّةُ - جس جگہ انسان پھسل جائے - اَزَلَّه : اسے پھسلا یا (۲۶/۲۶) -
 اَلزَّلَّةُ - لغزش کو کہتے ہیں - یعنی اپنی جگہ سے ہل جانا - چنانچہ قرآن
 کریم میں یہ لفظ ثَبَتَ کے مقابل میں آیا ہے (۱۶/۱۶) - ابن فارس نے کہا ہے
 کہ ہر وہ لفظ جس میں زاء کے بعد لام آتا ہو، اُس کے بنیادی معنی ہٹنے کے
 ہوتے ہیں - گفتگو میں لغزش کر جانے یا اپنی رائے سے ہٹ جانے نیز غلطی
 کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - راغب نے کہا ہے کہ زَلَّةٌ -
 اُس لغزش کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو - اِسْتَزَلَّ کے معنی ہیں کسی
 کو اس کے مقام سے ہٹا دینے اور پھسلا دینے کا قصد و ارادہ کرنا (۱۵۳/۳۰) -
 زَلِيلٌ کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کے بھی آتے ہیں -
 قَوْسٌ زَلَّاءٌ - وہ کمان جس سے تیر بڑی تیزی کے ساتھ نکل جائے -

زَلْزَلَةٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو تیزی کے ساتھ حرکت دیکر ہلا
 دینا یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا** - زَلْزَلٌ - يَزْلُزِلُ - زَلْزَلَةٌ
 وَزَلْزَالٌ - اسے ہلایا** - اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹/۱) -
 ”جب زمین ہلا دی جائیگی جیسا کہ اس کا ہلانا (ہوگا)“

زل م

الزَّلَامُ - الزَّلَامُ - تیر کی لکڑی جس کے پچھلے سرے میں پر نہ لگائے گئے ہوں - (جمع آزَلَامٌ) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دبلا پتلا اور سپاٹ یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں - پھر آزَلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانہ جاہلیت میں فال نکالتے تھے - تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دئے جاتے - ان میں سے ایک پر اِفْعَلٌ (کر) دوسرے پر لَا تَفْعَلٌ (نہ کر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے - جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو - چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے - اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے - بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے* - اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی - اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا (۵/۳۳) - (قرعہ اندازی کے لئے عنوان ق - ل - م بھی دیکھئے) - قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع کر دیا - اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے - اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے - قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے - اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے - وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ (قوانین خداوندی - قرآن کریم کے ضوابط) کے اندر رہتے ہوئے اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے - یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم - لیکن اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ہاں فال لینا - قرعے ڈالنا "استخارے کرنا" (یعنی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تسبیح کے دانوں کے سپرد کر دینا) عام روش زندگی ہو گیا ہے - گری ہوئی قومیں اپنی قوت بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں ، عقل و فکر کو بھی ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں - اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں - ایک مرد مومن اچھی طرح جانتا ہے

کہ خاکِ زندہ ہوں میں تابع ستارہ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتفاقات اور حوادث کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اتفاقات اور حوادث کو اپنے پروگرام کے تابع لاتا ہے۔

ز م ر

زَمْزَمْ - آواز۔ اَلزَّمْزَمَارَةُ* و اَلْمِيزْمَارُ* - بانسری۔ زَمْزَمْ - یَزْزَمْزَمْ و یَزْزَمْزَمْ زَمْزَمْ - بانسری بجانا۔

اَلزَّمْزَمَةُ* (جس کی جمع زَمْزَمْ ہے) منتشر فوج اور جماعت۔ کیونکہ کوئی جماعت شور سے خالی نہیں ہوتی*۔ یا انہیں یک جا کرنے کے لئے عموماً بگل (یا صور) سے کام لیا جاتا ہے۔ راغب نے اس کے معنی تھوڑی سی جماعت کئے ہیں**۔

قرآن کریم میں ہے وَ سَيُوقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زَمْزَمًا (۳۹/۱)۔ جنہوں نے انکار کی روش اختیار کر رکھی ہے انہیں جہنم کی طرف گروہ درگروہ لے جایا جائیگا۔ (زَمْزَمْ کے لفظ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے)**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہونے ہیں (۱) چیز کی کمی۔ اور (۲) آواز۔

ز م ل

اَلزَّمْلُ*۔ اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی۔ نیز تمہارا رفیق سفر جو معاملات میں تمہاری مدد کرتا ہے۔ زَمَلَهُ*۔ یَزْمِلُهُ*۔ زَمَلًا*۔ اس نے اسے اپنے پیچھے سوار کر لیا یا کجاوے میں اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھا لیا۔ اَلزَّمْلُ*۔ بوجھ۔ اس سے اَزْدَمَلَ اَلْحِمْلُ کے معنی ہیں اس نے ایک بار میں سارا بوجھ اٹھا لیا۔ اَلْمَزْمَلَةُ*۔ اونٹ پر دونوں طرف هموزن سواروں کا بیٹھنا یا هموزن بوجھ لادنا۔

ایک اونٹ پر بالعموم دو سواریاں بیٹھتی ہیں۔ ایسے سفر میں سب سے اہم اور پہلا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک اونٹ پر ایسی دو سواریاں بٹھائی جائیں جو ہم وزن بھی ہوں اور ہم خیال بھی تاکہ ان دونوں میں طبعی اور ذہنی، دونوں انداز سے ہم آہنگی ہو۔ اگر ان کا وزن برابر نہ ہو تو سفر میں اونٹ کو اور خود سواروں کو بھی تکلیف ہوگی۔ اور اگر وہ ہم خیال نہ ہوں تو یہ سفر، مَقَر (دوزخ) بن جائیگا۔ سب سے اچھا سالار کارواں وہ ہوتا ہے جو زَمْلُ* چننے میں ماہر ہو۔

رسول اللہ ﷺ کو جب وحی کے ذریعہ قرآنی نظام کا نقشہ سمجھا دیا گیا تو اس کے بعد ان کا سب سے اہم فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ فقائے کار کی تلاش کریں اور ان کے انتخاب میں زمیلاً نہ انداز اختیار کریں۔ اس لئے کہ ایسے عظیم پروگرام کی کامیابی کا راز فقائے سفر کے صحیح انتخاب میں تھا۔ یہ تھا وہ فریضہ جس کی طرف آپ کی توجہ یا یٰٰیٰہَا الْمُزَّمِّلُ (۳۱) کہہ کر دلائی گئی۔ اس کے بعد جس قسم کی تَزْمِیْل رسول اللہ ﷺ نے کی، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

إِزْدَمَلَّ - تَزَمَّلَ - وَازَمَّلَ فِي ثِيَابِهِ - کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کپڑوں میں لپٹ گیا۔ اس اعتبار سے الْمُزَّمِّلُ اسے کہتے ہیں جو معاملات میں لا پرواہی برتے اور کاموں میں کوتاہی کرے۔** ظاہر ہے کہ یا یٰٰیٰہَا الْمُزَّمِّلُ میں الْمُزَّمِّلُ کے یہ معنی نہیں لئے جاسکتے، اگرچہ حیرت ہے کہ راغب جیسے بالغ نظر نے بھی لکھ دیا ہے کہ یہ لفظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور کنایہ ہے کوتاہی کرنے والے اور معاملات میں لا پرواہی برتنے والے سے۔** ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بوجھ اٹھالینے کے لکھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ الزَّمَمِلُ اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جب کوئی مشکل معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے بدن پر مزید کپڑے ڈال لے اور اس طرح کپڑوں کی گٹھڑی سی بن جائے اور الْمُزَامِلَةُ کے معنی ہیں اونٹ کے دونوں طرف ہم وزن بوجھ لادنا۔ اس اعتبار سے الْمُزَّمِّلُ کا صحیح مفہوم یہی ہوگا کہ جو فریضہ تَزْمِیْل میں بہت زیادہ احتیاط برتے اور سرگرمی دکھائے۔ الزَّمَمِلُ بوجھ کو بھی کہتے ہیں اور إِزْدَمَلَّ الْحِمْلُ کے معنی ہوتے ہیں اس نے سارے بوجھ کو ایک دم لاد دیا۔* اس اعتبار سے مُزَمِّلٌ وہ ہوگا جو بار رسالت کو نہایت حسن و خوبی سے اٹھائے۔ کشاف میں عکرمہ کے حوالہ سے ہے کہ یا یٰٰیٰہَا الْمُزَّمِّلُ کے معنی ہیں اے امر عظیم اٹھالینے والے۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے والے۔ تفسیر خازن نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ تستری نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ الْمُزَّمِّلُ کے معنی ہیں وہ شخص جس نے اپنے آپ کو خدا کا ہم رنگ کر لیا ہو۔ یہ رفاقت کی انتہائی شکل ہے۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) میں ہے کہ اس کے معنی مُزَمِّلٌ بِالْقُرْآنِ ہیں۔ یعنی قرآن کا بار اٹھانے والا۔ حامل قرآن۔ یہ معنی قرطبی نے بھی دئے ہیں اور کہا ہے کہ اسے حضرت ابن عباس رضی نے روایت

کیا ہے۔ بہر حال، نبی اکرمؐ کو جو یَا یَسَّهَاتِ الْمُؤْمِنَاتِؑ کہہ کر پکارا گیا ہے تو اس میں حضورؐ کے عظیم القدر فرائض رسالت کی طرف اشارہ ہے جن کا مقصد جماعتِ مومنین کو ساتھ لیکر دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کرنا تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ لفظ مُؤْمِنَاتِؑ باب تَفَعُّل سے ہے۔ اصل اس کی مُتَزَّزِ مِتْل تھی۔

ز م ر

الزَّمْهَرِ یُرُ - سردی کی شدت - نیز چاند کو بھی کہتے ہیں*۔
 اِزْمَهَرَ الْیَوْمُ - دن سخت سرد ہو گیا۔ اِزْمَهَرَ الرَّوْجُ - چہرہ بری طرح بگڑ گیا اور دانت دکھائی دینے لگے۔ اِزْمَهَرَ الْیَوْمُ - دن سخت سرد ہوا۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے کہ لَا یَرَوْنَ فِیْہَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرًا یُرًا (۶۱)۔ اس میں نہ تو سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی۔ ویسے اَلْمُزْمِہَر کے معنی ہیں ہنستے ہوئے دانتوں والا*۔ غالباً سردی سے دانت بجنے سے طنزاً لیا گیا ہے۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے ”ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ زَهْر سے ہو جس میں میم زیادہ کر لی گئی ہو۔ زَهْر کے معنی چمکنے کے ہوتے ہیں۔ اِزْمَهَرَّتِ الْکَوَکِبُ - ستارے چمکے، جب سردی زیادہ ہو تو ستارے زیادہ روشن اور چمکدار ہو جاتے ہیں۔

زنجبیل

الزَّنْجَبِیْلُ - ادراک یا سونٹھ کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ اعلیٰ درجہ کی خوشبودار چیز شمار ہوتی تھی**۔ صاحب محیط کا خیال ہے کہ یہ فارسی لفظ شَنْجَبِیْل کا معرب ہے***۔ (یہ لفظ شَنْجَبِیْل نہیں بلکہ شَنْجِیویر ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کَانَ مِزَاجُہَا زَنْجَبِیْلًا (۶۱) ”اسکی مِلوئی سونٹھ کی ہوگی“۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (م۔ ز۔ ج) دیکھئے۔

ز ن م

ابن فارس نے کہا ہے کہ زَنْم کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ لٹکا دینے کے ہیں۔

الزَّانِيَةُ - وہ شخص جو کسی قبیلہ سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اسکے ساتھ یونہی ملحق ہو*۔ جیسے بکری کے گلے میں جونک کی طرح دو تھن سے لٹک رہے ہوتے ہیں جنہیں زَنَمَتَا الْعَنْزِ کہتے ہیں۔ عربوں میں نسب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کا نسب کچھ اور ہو (یا معلوم ہی نہ ہو) اور وہ یونہی کسی قبیلہ کے ساتھ متمسک ہو جائے، وہ ذلیل اور کمینہ شمار ہوتا تھا۔ اسی لئے الزَّانِيَةُ کمینے آدمی کو کہتے تھے جو اپنی کمینگی اور شرارت میں بدنام ہو*۔ الزَّانِمَةُ - ایک درخت جس پر پتے نہیں ہوتے*۔ قرآن کریم میں زَنِيْمٌ کا لفظ (۶۸/۱۳) میں آیا ہے۔

ز ن ی

زَنَى - يَزْنِي - زَنَى - وزِنَاءً - اس نے بدکاری کی**۔ بلا عقد معروف کسی سے جنسی اختلاط کیا۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانِيَةَ (۱۳۴)۔ ”زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ،“۔ یعنی یہی نہیں کہ زنا نہ کرو بلکہ مبادیات زنا تک کے بھی پاس نہ جاؤ۔ سورۃ فرقان میں ہے وَلَا يَزْنِ نَوْنٌ (۲۵/۱۸)۔ ”زنا نہیں کرتے،“۔ الزَّانِيَةُ - زنا کرنے والا مرد۔ الزَّانِيَةُ (۲۴/۲۳) زنا کرنے والی عورت۔ ان میں سے ہر ایک کی سزا سو سو کوڑے ہیں۔ (۲۴/۲۳)۔ البتہ اگر یہ جرم ایسی شادی شدہ عورت سے سرزد ہو جو پہلے لونڈی رہ چکی ہو (زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق***) تو اس کی سزا اس سے نصف ہے (۲۵/۳)۔ اس لئے کہ لونڈیوں کی پرورش اور ترتیب جس پست ماحول میں ہوتی تھی اس سے ان میں اس بلندی کردار کی توقع رکھنا جو بلند، شریف اور پاکیزہ ماحول میں پیدا ہوتا ہے، زیادتی تھی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انسان کی اضطراری کمزوریوں پر کس قدر نگاہ رکھتا ہے۔

سنگساری (رجم) کی سزا قرآن کریم میں نہیں۔

ہمارے زمانے میں اس مسئلہ پر بڑی تحقیق ہوئی ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کے عروج و زوال پر کس قدر گہرا اثر پڑتا ہے اور جو قومیں مردوں اور عورتوں کی عفت کی پرواہ نہیں کرتیں وہ تہذیب و تمدن کی کس پست سطح پر آجاتی ہیں۔ (اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب میری کتاب سلیم کے نام خطوط، جلد سوم میں متعلقہ خط ملاحظہ فرمائیں)۔

* تاج ** تاج و راغب۔ *** قرآن کریم نے غلام اور لونڈیوں کے وجود (Institution) ہی کو ختم کر دیا۔ تفصیل م۔ ل۔ ک کے عنوان میں ملیگی۔

ز ہ ر

زَهْدٌ (رَفِیْ وَعَنٌ) یَزْهَدُ - زَهْدًا - بے رغبت ہونا * - کسی چیز سے اعراض برتنا اور اسے چھوڑ دینا * - اس سے فاعل زَاهِدٌ ہے - سورۃ یوسف میں ہے کہ اہل قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا - اس لئے کہ وَكَانُوا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ (۱۲۰) - وہ حضرت یوسفؑ میں کچھ زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے - اَلْزَهِيْدُ - قلیل اور حقیر * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی کمی کے ہیں - اَلْزَاهِدُ وَالْزَهِيْدُ - تنگ اخلاق آدمی - کم خور آدمی * - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ زَهْدٌ دراصل کسی چیز کی طرف میلان چھوڑ دینے کو کہتے ہیں ** -

زَهْدٌ یا زَاهِدٌ کا لفظ جن معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا - یہ تصوف کی اصطلاح ہے جس میں دنیا سے بے رغبتی کو بڑی فضیلت قرار دیا گیا ہے - یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے - (خود تصوف ہی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے) قرآن کریم کی رو سے مومن کا فریضہ دنیا کی تسخیر ہے اور اس کی خوش گواہیوں سے متمتع ہونا اس کا حق - قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ”ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے“ (۲۴۳) - مومن صرف ان چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جن سے خدا نے روکا ہے - ان کے علاوہ، وہ دنیا کی ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے کام میں لاتا ہے -

ز ہ ر

اَلْزَهْرَةُ - اَلْزَهْرَةُ - پودا - پودے کا پھول - بعض نے کہا ہے کہ زَهْرَةُ صرف کیہلے ہوئے پھول کو کہا جاتا ہے - اَلْزَهْرَةُ مِنَ الدُّنْيَا - دنیا کی سرسبزی و تازگی - حسن و زیبائش - شگفتگی و شادابی - سامان زیب و زینت - (۱۳۱) - اَلْزَهْرَةُ - مفیدی * - حسن - درخشندگی - اَلْزَهْرِيَّاتُ مِنَ الْاَلْبَتَامِ - بہار کے دن ** -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن - روشنی - اور صفائی پر دلالت کرتے ہیں -

زہق

زُہُوْقٌ - صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی دشواری کے ساتھ نکلنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ زَهَقَتْ النَّفْسُ کا مطلب یہ ہے کہ جان بمشکل نکلی *۔ الزَّاهِقُ - مرنے والے جانور کو کہتے ہیں جس میں گودا ہو **۔ نیز اس جانور کو بھی جو بہت لاغر ہو۔ اس طرح یہ لفظ اضمداد میں سے ہے۔ الزَّهْوُوقُ - گہرے کنویں کو بھی کہتے ہیں اور بلند پہاڑوں کے درمیانی راستے کو بھی **۔ لیکن تیزی سے ہو یا دشواری اور سستی سے، اسکے معنی کسی چیز کے نکل جانے کے ہوتے ہیں **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے۔ گزر جانے اور تجاوز کر جانے کے ہوتے ہیں۔ زَهَقَتْ الرَّاحِلَةُ زُہُوْقًا - اونٹنی گھوڑوں سے آگے نکل گئی۔ زَهَقَ السَّهْمُ زُہُوْقًا - تیر نشانے سے آگے نکل گیا۔ زَهَقَتْ نَفْسُهُ - اسکی جان نکل گئی **۔ تَزَهَقُ أَنْفُسُهُمْ (۹/۵۵)۔ ”ان کی جانیں نکلیں“۔ الزَّاهِقُ - شکست خوردہ آدمی کو کہتے ہیں **۔ الْمُزْهَقُ مقتول کو کہتے ہیں۔ زَهَقَ الشَّيْءُ: کوئی چیز تباہ و برباد ہوئی، مضمحل ہوئی **۔

قرآن کریم میں باطل کے متعلق ہے فَادَّٰهَاقُ (۲۱/۱۸)۔ ہر وہ نظریہ یا پروگرام جو حق کے خلاف، تخریبی نتائج کا حامل ہو، ناکام و نامراد رہتا ہے۔ مٹ جاتا ہے۔ شکست کھا جاتا ہے۔ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ - إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زُہُوْقًا (۱۸/۱) اور کہو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل ہوتا ہی مٹنے والا ہے۔ یہاں زُہُوْقٌ کے معنی زَاہِقٌ ہی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ۔ باطل اسوقت تک رہتا ہے جب تک حق (خدا کا تعمیری نتائج پیدا کرنے والا پروگرام) نہیں آتا۔ اس کے آنے سے باطل شکست کھا کر مٹ جاتا ہے۔ اس کے اندر حق کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ مزید تفصیل (ح۔ ق۔ ق) اور (ب۔ ط۔ ل) کے عنوانات میں دیکھئے۔

أَزْهَقْتُ الْأَنْعَامَ کے معنی ہیں، میں نے برتن کو الٹ دیا **۔ اس سے بھی اس کے معنی واضح ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَهَقَتْ نَفْسُهُ کے معنی ہیں رنج و غم سے اسکی جان نکل گئی ***۔

زوج

زَوْجٌ - دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں (جیسے جوتے کے دونوں پاؤں)۔ یا ایک دوسرے کے مقابل ہوں (جیسے دن اور رات) وہ زَوْجَانِ

کہلاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی زَوْجٌ ہوتی ہے۔ زَوْجٌ کے اصلی معنی جوڑ کے ہیں۔ فَرْدٌ (اکیلا) کے خلاف۔ لہذا زَوْجٌ اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑ (یا ساتھی) ہو۔ خواہ اس کی مثل یا اس کے مقابل۔ زَوْجُ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو اس جیسی چیز کے ساتھ ملا دیا (باندھ دیا)۔ وَ إِذَ النَّفُّوسُ زَوْجَتِ (۸۱) کے معنی ہیں جب ہر انسان اپنے ہمجماعت یا ہم مذاق کے ساتھ مل جائیگا۔ اور زَوْجَنَاہُمْ بِحُورٍ عِیْنِ (۲۳) کے معنی ہیں انہیں حور عین کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائیگا۔ ساتھی بنا دیا جائیگا۔ (حُورٌ کے معنی (ح۔ و۔ ر) کے عنوان کے تحت دیکھئے)۔ اسی اعتبار سے ہر شے کے امثال و نظائر (یعنی ایک ہی قسم کی چیزوں کو) اَزْوَاجٌ کہتے ہیں*۔ اَحْشَرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۴) کے معنی ہیں ظلم کرنے والوں کو اور ان کی ہم کار پارٹیوں کو اکٹھا کرو۔ (یعنی ان کے مثل و نظیر اور لوگوں کو جو ان جیسے ہیں)۔ اسی طرح قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق مختلف مقامات میں آیا ہے کہ لَہُمْ فِیْہَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۵۷) تو اس کے معنی نیک بیویاں ہی نہیں بلکہ اس کے معنی ہیں پاکیزہ خیالات رکھنے والے ہم مشرب ساتھی۔ جنتی معاشرہ میں قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ چونکہ اس معاشرہ میں مرد بھی ہونگے اور عورتیں بھی، اس لئے اَزْوَاجٌ میں میاں بیوی بھی شامل ہونگے۔ واضح رہے کہ جو جنتی معاشرہ دنیا میں قائم ہوگا اس میں میاں بیوی کے تعلقات میں افزائش نسل کا مقصد بھی شامل ہوگا۔ لیکن جنتِ آخرت میں میاں بیوی کی مواصلت یا افزائش نسل کا تصور قرآن کریم سے نہیں ملتا۔ لہذا وہاں کی (مردوں اور عورتوں کی) زوجیت، باہمی رفاقت (Companionship) کی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنتِ آخرت کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے وہاں کی نعمتوں کا تمثیلی بیان ہے۔ اسے یہاں کے اندازِ زیست پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ وہاں کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔

انہی معانی کی بنا پر زَوْجٌ۔ ہر شے کی قسم اور نوع و صنف (Species) کو کہتے ہیں*۔ اَزْوَاجًا مِیْنُہُمْ (۱۳۱) کے معنی ہیں قسم قسم کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ۔ یا طرح طرح کی چیزیں جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ کَمَ اَنْبَتْنَا فِیْہَا مِیْنٌ کُلٌّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ (۲۱) کے معنی ہیں ہم نے زمین میں ہر عمدہ نوع کی کتنی چیزیں پیدا کی ہیں۔ (ویسے

نباتات میں نرمادہ کا ہونا ثابت ہے اور بعض جمادات کے متعلق بھی ایسا خیال کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ آخِرُ مِّنْ شَيْءٍ كَلِيلُهُ آزُوجٌ ^(۳۸/۵۸) اس کے معنی ہیں اس کے علاوہ اسی قسم کی اور رنگا رنگ سزائیں۔ وَ مِّنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ ^(۵۱/۳۹) کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہم نے ہر نوع کی ایسی چیزیں تخلیق کی ہیں جو ایک دوسرے سے وابستہ اور ملتی جلتی ہیں۔ خواہ ایک دوسرے کے ہم رنگ ہوں اور خواہ ایک دوسرے کی ضد۔ مثلاً آسمان زَوْجٌ ہے زمین کا۔ سردی زَوْجٌ ہے گرمی کی۔ اور جوڑے کا ایک پاؤں بھی زَوْجٌ ہے دوسرے پاؤں کا۔ زَوْجٌ کے معنی ایسے فرد کے بھی ہیں جس کا ساتھی یا نظیر و مشیل ہو۔ یعنی یہ لفظ دو ساتھیوں میں سے ہر ایک فرد کے لئے بھی اسی طرح مستعمل ہے جس طرح ان دونوں کے لئے۔ کبھی دونوں کے لئے زَوْجَانِ بھی بولتے ہیں*۔

ازْدَوْجَ۔ اور تَزَاوَجَ۔ وزن یا سجع بندی کے لئے کسی فقرے کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنا، یا دو قضیوں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا*۔ زَوْجٌ (جمع آزُوجٌ)۔ رفیق۔ ایک دوسرے کے ساتھی*۔ زَوْجٌ (جمع آزُوجٌ) کے معنی شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زَوْجٌ** ان میں سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کا نام ہے ازدواجی زندگی۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان (ل۔ ب۔ س) ^(۳۸/۱۳) میں آزُوجًا کے معنی بیویاں ہیں۔ تَزَاوَجْتُ امْرَأَةً کے معنی ہیں ”میں نے ایک عورت سے شادی کی“۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن کریم کی رو سے ازدواجی زندگی کس قسم کی زندگی ہوتی ہے تو اس کے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ تَزَاوَجْتُ النِّسَاءَ کے معنی ہیں نیند آنکھوں میں گھل مل گئی***۔ لہذا میاں بیوی کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے۔ (نیز دیکھئے عنوان، ن۔ ک۔ ح)۔ اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں (بیویاں) بھی ہونگی لیکن وہ بھی قلب و نگاہ کی پاکیزگی کو لئے ہوئے ہونگی اور سفر زندگی میں ایک رفیق کی طرح ساتھ چلنے والیاں۔ قرآن کریم نے ان رفقاء حیات کی خصوصیات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ باقی رہی مرنے کے بعد کی جنت، سو (جیسا کہ اجمالاً اوپر کہا گیا ہے اور تفصیلاً ج۔ ن۔ ن کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر

اسکی کیفیات کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے ساتھیوں کی کیسی کیفیت ہوگی۔ لیکن اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم رنگ اور ہم آہنگ ساتھی کا مل جانا، جنت ہے۔

ز و د

الزَّادُ۔ موجودہ ضرورت سے زائد چیز کو کہتے ہیں جسے دوسرے وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لیا جائے*۔ نیز اس کے معنی کھانے کے ہیں خواہ سفر کا ہو یا حضر کا**۔ بالخصوص وہ کھانا جو سفر کے لئے تیار کیا جائے، توشہ***۔ اَلْمِزْوَدُ۔ توشہ دان کو کہتے ہیں**۔ زَوْدٌ تَشْہُ تَزْوِیدًا۔ میں نے اسے زاد راہ دیا۔ تَزْوِیدٌ : اس نے توشہ ساتھ لیا**۔

قرآن کریم میں حج کے سلسلہ میں ہے وَ تَزَوَّدُوا (۱۹۷)۔ جانے سے پہلے اپنے زاد سفر کا انتظام کر لیا کرو۔ (یونہی اٹھ کر نہ چل دیا کرو) اس لئے کہ فَانْ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۱۹۷)۔ جب تم زاد سفر لے کر چلو گے تو اس سے تم دوسروں کے دست نگر ہونے سے بچ جاؤ گے۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تَزَوَّدَ کے معنی کسی اچھی چیز کو ادھر سے ادھر لے جانا ہیں۔

ز و ر

الزَّوْرُ۔ سینے کا بالائی حصہ جہاں سینے کی تمام ہڈیاں آکر مل جاتی ہیں۔ جو شخص کسی کو ملنے کے لئے آتا ہو اسے بھی الزَّوْرُ کہتے ہیں۔ زُرْتَّہُ۔ میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا، توجہ سے اس کا قصد کیا، اس سے ملا۔ الزَّوْرُ۔ اَلزَّیَّارَةُ۔ اَلْمِزَارُ۔ ملاقات کرنا۔ زیارت کرنا۔ الزَّوْرُ۔ سینے کا ٹیڑھا پن اور ایک طرف کو جھکا ہونا۔ اَلْاَزْوَرُ۔ وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ہو۔ جو چلنے میں سینہ کو ایک طرف زیادہ جھکا کر چلتا ہو۔ نیز کنکھیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اس لفظ کے معنی ایک طرف جھک جانے کے آتے ہیں۔ نیز سیدھے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو جانے کے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف کو ہٹ جانے کے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے تَزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ (۱۸)۔ ”سورج ان کے غار سے ایک

طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے۔ “زَوَّارٌ عَنْهُ”۔ وہ اس سے ہٹ گیا۔ اسی سے الزَّوُّورُ جھوٹ کو کہتے ہیں۔ حَبْلٌ لَّهِ زُوْرٌ۔ رسی جس میں ہٹ ہو*۔ سورۃ حج میں ہے وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جھوٹی اور بناوٹی بات سے بچو۔ لیکن اصل کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی حرکت۔ انسان کا ہر وہ قدم جو صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے، زُوْرٌ میں آجائیگا۔ اسلام، حرکت کا نام ہے۔ یہ ایک تحریک ہے۔ لیکن یہ حرکت بلا تعین منزل نہیں کہ جس طرف جی چاہا قدم اٹھا دیا۔ یہ حرکت ہے ایک متعین منزل کی طرف۔ اسلئے اس میں زُوْرٌ کا کوئی کام نہیں۔ اس کی تشریح اگلی آیت نے کر دی جہاں فرمایا حُنْفَاءَ لِلّٰہِ (۲۲)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اُس نصب العین کی طرف چلنا جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ غَيْرَ مُشْرِئٍ بِہِ (۲۲)۔ اس میں کسی اور خیال، جذبہ اور میلان کی آمیزش نہ کرنا۔ اسی کو سورۃ فرقان میں ظُلُمًا وَّ زُوْرًا (۲۵) کہا ہے۔

کَلَامٌ مُّزَوَّرٌ۔ بنائی ہوئی اور جھوٹ کا ملمع کی ہوئی بات۔ زَوَّارُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنا دیا۔ باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے۔ اس لئے تَزْوِيرٌ کے معنی زُوْرٌ کو دور کرنے کے بھی ہیں اس کو اصلاح کہتے ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ کسی چیز کو سدھا رنا، خواہ وہ خیر ہو یا شر، تَزْوِيرٌ کہلائیگا**۔ ملنے کے معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۱۰۲) میں آیا ہے۔ جہاں کہا ہے حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملو۔

زول (زیل)

زَالَ۔ يَزُولُ وَ يَزَالُ۔ زَوَالٌ۔ کسی چیز کا جاتے رہنا۔ تبدیل ہو جانا۔ مضمحل ہو جانا۔ ایک طرف ہٹ جانا۔ دور ہو جانا۔ جدا ہو جانا۔ باز آ جانا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اُمْسَكَتْ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵) جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا۔ ”یقیناً اللہ (کا قانون) آسمانوں کو اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں۔ الگ الگ نہ ہو جائیں“۔ زَيْقَلٌ۔ الگ الگ کر دینا*۔

لَا يَزَالُ تَوْنُ (۲۱) - وہ ہمیشہ اس حالت میں رہینگے - کبھی باز نہیں آئینگے۔ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ (۱۸) - ہم ان میں جدائی ڈال دینگے۔ لَوْ تَزَيَّلُوا (۲۵) - اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

راغب کا کہنا ہے کہ زَوَالٌ اس چیز کی حرکت کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو اور بعد میں ثابت نہ رہی ہو*۔ (اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو)۔

ز ی ت

زَيْتٌ (۲۲) - زیتون کا تیل - زَيْتُونَةٌ (۲۳) - زیتون کا ایک درخت - یا اس کا ایک پھل** - (۲۹) - اسے بڑا نفع بخش اور مفید درخت سمجھا جاتا ہے***۔

قرآن کریم میں ہے وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ مِیْنِیْنِ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِیْنِ (۹۵) - اس میں الزَّيْتُونُ - زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے****۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اور آلِ تِیْنِ*۔ حضرت نوحؑ کی بعثت کا مقام ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی دعوت - اور حضرت موسیٰؑ اور محمد عربیؐ کی دعوت - یہ سب آسمانی دعوتیں اس حقیقت کبریٰ کی شاہد ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ..... الْخ (۹۶)۔

ز ی د

زَيْدٌ کے معنی ہیں نشو و نما پانا - بڑھنا اور پھولنا پھلنا۔ یعنی زیادہ ہونا - نیز یہ متعدی بھی آتا ہے۔ زَادَ اللَّهُ خَيْرًا - اور زَيْدٌ کے معنی زیادہ دینا اور زیادہ کرنا ہیں**۔ اَزْدَادٌ اَزْدَرِيَادًا - زیادہ ہونا یا زیادہ کرنا (لازم و متعدی)***۔

سورۃ رعد میں اَزْدَرِيَادٌ کے مقابل غِيْضٌ کا لفظ آیا ہے (۱۳)۔ غِيْضٌ کے معنی کم ہو جانے یا اندر چلے جانے اور جذب ہو جانے کے ہیں۔ سورۃ یونس میں زِيَادَةٌ کا لفظ آیا ہے (۱۶)۔ اور (۵۵) میں مَزِيْدٌ ہے۔ یعنی وہ اضافہ اور زائد چیز جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد اس میں بڑھائی جائے۔ سورۃ آل عمران میں ہے ثُمَّ اَزْدَادُوا كُفْرًا (۳۹)۔ اس کے معنی زیادہ ہونے، بڑھ جانے کے ہیں۔

* راغب - ** تاج - *** محیط - **** لطائف اللغۃ نے اسے جبل الشام لکھا ہے۔

سورة احزاب میں (حضرت) زَیْدؑ کا نام آیا ہے (۳۳/۳۷)۔ یہی ایک صحابی رضی اللہ عنہ ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ یہ حارثہ کے فرزند اور نبی اکرمؐ کے خادم اور محبوب متبنیؑ تھے جن سے آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح کر دیا تھا۔

الشَّزَاد کے لئے عنوان ”ز۔و۔د“ دیکھئے۔

زی غ

زَاغٌ - یَزِیْغُ - زَیْغًا - ایک طرف کو جھک جانا۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ - سورج مائل بزوال ہوا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اگرچہ زَالٌ - مَالٌ اور زَاغٌ قریب قریب ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن زَاغٌ صرف اس ہٹ جانے اور جھک جانے کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف ہو*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں زَیْغٌ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی ایک طرف جھک جانے کے ہیں سوائے زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے کہ اس میں نگاہوں کے اوپر اٹھے یا کھلے رہ جانے کے معنی ہیں**۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّمَا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَہُمْ (۶۱/۵)۔ جب وہ صحیح راستے سے ہٹ گئے تو خدا کے قانون مکافات نے ان کے دلوں کو اُسی طرف جھکا دیا۔

یہ آیت قرآنی تعلیم کی ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اس نے جنہیں گمراہ کرنا ہوتا ہے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم اور خدا کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے کہ اسے سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے یا کجروی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس قسم کا وہ فیصلہ کرتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کجروی اختیار کرتا ہے تو اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں غلط طریق پر چل کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے یُؤَفِّکُ عَنْہُ مَنْ اُفِّیْکَ (۵۱/۸) ”حق سے اس کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہتا ہے“۔ خدا کا قانون یہ نہیں کہ ایک شخص حق سے پھرنا چاہتا ہے لیکن خدا اسے زبردستی حق پر قائم رکھتا ہے۔ یا

ایک شخص حق پر قائم رہنا چاہتا ہے اور خدا اسے حق سے پہرا دیتا ہے۔ حق سے اسی کو پہرایا جاتا ہے جو خود اس سے پہرنا چاہے۔ دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا قانون اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا انسان کا فیصلہ، ویسا خدا کا قانون۔ اقبال کے الفاظ میں

خاک شو نذر ہوا سازد تر سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

جیسا انسان خود، ویسا خدا کا قانون۔ آنکھیں بند کر لو، اندھیرا ہو جائے گا۔ کھول لو، نظر آنے لگ جائیگا۔

سورة النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى (۱۳۳) نہ تو آپکی نگاہ، حقیقت سے کسی اور طرف کو ہٹی اور نہ ہی حد سے تجاوز کر گئی،۔ مَا طَغَى نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں رسولؐ کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ جو حد خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے وہ اس سے آگے نہیں جاسکتا۔ سورة سبا میں ہے وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا (۱۳۴)۔ یہاں اسکے معنی حکم سے پھرنے یا حکم عدولی کرنے کے ہیں۔

عذاب کے وقت آفراتفری کے سلسلہ میں زَاغَتْ الْأَبْصَارُ کے الفاظ آئے ہیں (۱۳۵)۔ اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ خوف کے وقت نگاہیں ایک مقام پر جمی نہیں رہتیں بلکہ ادھر ادھر ہٹ جاتی ہیں۔ اور یا (جیسا کہ صاحب محیط نے لکھا ہے) اسکے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں اوپر کو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ بہر حال مقصد خوف و ہراس کی کیفیت بیان کرنا ہے۔

کسی کی طرف سے نگاہیں پھر جانے کیلئے یہ الفاظ (۱۳۸) میں آئے ہیں۔ اور زَيَّغٌ بمعنی کجی، باطل کی طرف جھکاؤ، کجروی، (۱۳۹) میں۔ یعنی قرآنی تعلیم کے نقطہء ماسکہ پر مرتکز رہنے کے بجائے، ادھر ادھر ہٹ جانا۔ کسی اور طرف نکل جانا۔ اپنے میلانات اور رجحانات کے پیچھے چلے جانا۔ یہ روش زندگی بڑی تباہ کن ہے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ہمارے قلبی اور ذہنی میلانات و عواطف کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں قرآن کریم کے مرکز سے ادھر ادھر کبھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔ حق وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمارے جذبات و میلانات چاہتے ہیں۔ جو شخص پہلے سے کچھ خیالات یا عقائد ذہن میں رکھ کر قرآن کریم کی طرف اس مقصد سے جائے کہ قرآن کریم سے ان عقائد کی تائید حاصل کرے (خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں) اسے قرآن کریم سے کبھی صحیح راہ نمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن کریم سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے ادراک کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زَیْنٌ کو ہدایت کی ضد قرار دیا ہے (۳۰)۔ (مزید تشریح ح۔ ک۔ م کے عنوان میں مُحْكَمَات کے تحت دیکھئے)۔

زی ل

دیکھئے عنوان ”ز۔ و۔ ل“۔

زی ن

الزَّيْنَةُ۔ وہ چیز جس سے آرائش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ خود کسی چیز کا نگاہ میں حسین معلوم ہونا بھی زینت کہلاتا ہے۔ زَیْنٌ۔ کسی چیز کو آراستہ کرنا۔ کسی چیز (یا بات) کو خوشنما بنا کر دکھانا*۔ ابلیس نے کہا تھا کہ لَا زَیْنَتَ لَہُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۵)۔ میں (انسان کو) اسکی طبعی زندگی (حیات ارضی) اسقدر خوشنما بنا کر دکھاؤنگا کہ یہ اسی کو نصب العین حیات بنا کر بیٹھ جائیگا۔ یعنی اسکا تصور حیات بالکل مادہ پرستانہ (Materialistic) ہو جائیگا۔ اَزَّیْنٌ۔ آراستہ پیراستہ ہونا۔ مزین ہونا۔ (۱۶)۔ یَوْمُ الزَّیْنَةِ (۱۷) بناؤ سنگھار کا دن۔ تہوار۔ روز جشن۔ قصہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ اَوْ زَارًا مِّنْ زَیْنَةِ الْقَوْمِ (۱۸) آیا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن سے وہ قوم اپنی آرائش کرتی تھی۔ دوسری جگہ اسی کو حُلَیِّیْمٌ (۱۹) کہا گیا ہے۔ یعنی ان کے زیورات۔

قرآن کریم، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اسلئے وہ انسان کو نہ صرف اجازت دیتا ہے کہ وہ زیبائش و آرائش کی چیزوں سے اپنے اور کائنات کے حسن میں اضافہ کرے بلکہ اسکا حکم دیتا ہے کہ خُذُوا زَیْنَتَکُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (۲۰)۔ ہماری اطاعت گزاروں میں حسن و زینت کو اختیار کرو۔ جو لوگ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق بڑی سختی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَن حَرَّمَ زَیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ (۲۱)۔ ان سے کہو کہ زیبائش و آرائش کی جن چیزوں کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے؟ اس نے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ

اِنَّا جَعَلْنٰهَا مَاعَلٰی الْاَرْضِ زَيْنَةً لَّهَا (۱۸)۔ جو کچھ زمین میں ہے سب اس کے لئے وجہ زینت ہے۔ اس لئے زمین میں جو کچھ بھی زینت و آرائش کا سامان ہے، سب انسان کے حسن و زیبائش کے لئے ہے۔ کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ البتہ اس اہم حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہی چیزیں زندگی کا نصب العین نہیں بن جانی چاہئیں (۱۸)۔ انہیں اصل نصب العین کے حصول میں مددگار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ یا یوں سمجھئے کہ دنیوی متاع حیات اور زیب و زینت کی اشیاء سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ ان چیزوں میں اور قرآن کی متعین کردہ حدود اور اقدار میں ٹکراؤ ہو، اُس وقت ان چیزوں کو، ان اقدار کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینا ہوگا۔ یہی دین کا مغز اور قرآنی تعلیم کا ماحصل ہے۔

قرآن کریم میں (پردے کے احکام کے سلسلہ میں) کہا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں (۲۴)۔ اور عورتیں لَا يَبْدِيْنَ زَيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴)۔ اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں، ہاں جو ان میں سے خود بخود ظاہر ہو جائیں (تو اس کا مضائقہ نہیں)۔ یہاں زینت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں اپنا بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ مثلاً زیورات وغیرہ۔ اسکی تائید اگلے الفاظ سے ہو جاتی ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفَيْنَ مِنْ زَيْنَتِهِنَّ (۲۴)۔ وہ اپنے پاؤں کو اس طرح زمین پر نہ ماریں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہو جائے۔ پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے، چھپے ہوئے زیور (جہانجھن یا چھاگل وغیرہ) کی آواز نمایاں ہو جاتی ہے۔ باقی رہی جسم کے اوپر کے حصہ کی اشیائے زینت، سو اس کیلئے کہدیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں (۲۴) یا جلباب اوڑھ لیا کریں (۲۴)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اشیائے زینت کی نمائش نہ کرتی پھریں۔ البتہ افراد خاندان کے سامنے ان کی نمائش کر لیں تو اس میں ہرج کی بات نہیں (۲۴)۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ قرآن کریم اس باب میں بھی کہاں تک احتیاط برتتا ہے۔ جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں۔ عورت کی طرف سے غیروں کے سامنے نمود حسن یا اظہار زینت، سب سے بڑا محرک ہے۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے۔

س

س (حرف)

س - یہ حرف مضارع کے شروع میں آتا ہے - عربی میں فعل مضارع حال اور استقبال دونوں زمانے اپنے اندر رکھتا ہے، جب اس سے پہلے ”س“ آ جائے تو اس میں صرف مستقبل کے معنی باقی رہتے ہیں - جیسے سَيَفْعَلُ وہ کام کریگا - ”س“ عموماً مستقبل قریب کے معنی دیتا ہے - لیکن یہ قریب اور بعید محض اضافی چیزیں ہیں - بعض کے نزدیک یہ استمرار (ہمیشگی) کا مفہوم بھی پیدا کر دیتا ہے - مثلاً سَيَقُولُ السَّفَّهَاءُ (۱۳۲) یہ بیوقوف کہتے رہیں گے کہ . . . - بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب یہ کسی ایسے فعل کے ساتھ آئے جس میں وعدہ یا وعید پایا جائے تو اس سے تاکید کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے - مثلاً فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ (۱۳۷) - اللہ یقیناً ان کے مقابلہ میں تیرے لئے کافی ہوگا -

س آل

سَأَلْتَهُ الشَّقِیْیَ - کے معنی ہیں میں نے اس سے وہ چیز مانگی - اور سَأَلْتَهُ عَنِ الشَّقِیْیِ و بیه کے معنی ہیں میں نے اس سے اس چیز کے متعلق دریافت کیا - أَسْأَلُهُ سَأَلَهُ - اس کی ضرورت کو پورا کر دیا - أَسْأَلُیْلَ - سوال کرنے والا - ضرورت مند * - أَلْمَسْتُكَ - ضرورت - حاجت ** -

قرآن کریم میں ہے أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳) - ضرورت مند، صاحب احتیاج کو (ذلیل و حقیر سمجھ کر) مت ڈانٹو -

سورة الرحمن میں ہے يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۵۵) - کائنات میں ہر شے اپنی ضروریات کے لئے خدا کے سامنے جھولی پھیلائے ہے - ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے اس کے نظام ربوبیت کی محتاج ہے - سورة

سجدہ میں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ یہ سَوَاءٌ
لِلرَّسَّائِلِیْنَ (۱۰۱) ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر
کھلا رہنا چاہئے۔ یہ انسانی رزق کا سرچشمہ ہے اس لئے اس سے ہر شخص
کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ یہی اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ نہ یہ کہ
مختلف لوگ اس پر حد بندی کر کے اسے اپنی اپنی ملکیت تصور کر لیں۔ خدا
نے ان تمام چیزوں کو، جن کی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے
ضرورت ہے، خود مہیا کر دیا ہے۔ وَآتَاکُمْ مِّنْ کُلِّ مَسَاۗءَلٍۭتُمُوْہُ
(۱۰۳)۔ یہ اس کا نظام ربوبیت ہے۔ لہذا اس کی ربوبیت عامہ کو افراد کی
ملکیت سمجھ لینا بہت بڑا جرم ہے۔

باہم ایک دوسرے سے دریافت کرنے کے معنوں میں سورۃ النبا میں ہے
عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ (۹۸)۔ مَسْئُوْلُوْنَ (۱۰۴) جن سے پوچھ گچھ کی
جائے۔ سورۃ طہ میں ہے قَدْ اُوتِیْتَ سْؤَالَکَ یٰمُوسٰی (۲۰)۔ اس میں
سْؤَالَ بمعنی مسئلہ ہے۔ یعنی جس چیز کی تجھے احتیاج ہے۔ تیری مانگ۔
طلب۔ تیری مانگی ہوئی چیز۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ”سوال“ کے بنیادی معنی ضرورت اور
احتیاج کے ہیں۔ جب ہم کسی سے کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت بھی
ہمیں ان باتوں کے معلوم کرنے کی احتیاج ہوتی ہے جن کی بابت ہم دریافت
کرتے (پوچھتے) ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا
کہ کس جگہ اس کا ترجمہ دریافت کرنا ٹھیک ہوگا اور کس جگہ طلب کرنا۔

س ا م

سَئِمٌ - یَسْأَمٌ - اکتا جانا - اَسْأَمَہُ - اس نے اسے اکتا دیا*۔
بعض نے کہا ہے کہ مَسَامٌ - کنایۃً کسل کو بھی کہتے ہیں اور بعض نے
کہا ہے کہ یہ کسل (سستی) سے اوپر کی چیز ہے**۔ لَا یَسْئِمُ الْاِنْسَانُ
مِنْ دُعَاۃِ الْخَیْرِ (۱۰۹)۔ انسان مال اور دولت کی طلب سے اکتاتا ہی
نہیں۔ اس کی یہ طلب، اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ
جذبہ منافست کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے
جذبہ کی بنا پر۔ اور اس طلب کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا حَتّٰی زُرْتُمْ
الْمَقَابِرَ (۱۰۲) تا آنکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا
تَسْئَمُوْا اَنْ تَکْتُبُوْہُ (۲۸۲)۔ قرض کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ اکتا
نہ جاؤ۔ دل برداشتہ نہ ہو جاؤ۔

سبأ

سَبَأٌ^۴ - یمن کی ایک قدیم سلطنت کے دارالخلافت کا نام تھا جس پر عہد حضرت سلیمان^۴ میں ایک ملکہ حکمران تھی۔ قرآن کریم میں اس قوم، اس کے ملک اور ملکہ سبأ کا ذکر آیا ہے۔ (دیکھئے ۲۴/۱۵ و ۳۳/۱۵)۔ اس میں اس ملک کی سرسبزی اور زرخیزی کا خاص طور پر ذکر ہے اور پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی عبرت انگیز تباہی کا۔ اُنہوں نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کر کے پانی کو روکا تھا جس سے ان کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ یہ سیلاب اسی بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ایک امریکن مسافر حفریات (Archaeologist) نے ان آثار قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب، بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کئے تھے۔ اس کی کتاب کا نام (Qataban and Sheba) ہے اور مصنف کا نام (Wendell Phillips)۔ ان تفصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں۔ (۳۳/۱۹)۔

السَّبَّاءُ^۵۔ شراب کے کاروبار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سَبَأُ السَّخْمَرِ کے معنی ہیں اس نے شراب خریدی*۔ اگر سبأ کے شہر کا نام اسی نسبت سے تھا تو اس سے ذہن ان تا کستانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی وہاں افراط تھی۔ لیکن السَّبَّاءُ^۵ کے معنی لمبے سفر کے بھی ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ رَبَّنَا بَعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا (۱۹/۳۳)۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفر کو لمبا کر دے تاکہ ہمارا تجارتی کاروبار وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ ممکن ہے اسی نسبت سے ان کے دارالسلطنت کا یہ نام ہو۔ ملکہ سبأ اور حضرت سلیمان^۴ کے روابط کے متعلق عنوان ”سلیمان“^۴ دیکھئے۔

س ب ب

سَبَّهْ^۶ سَبَّأً۔ اس کو قطع کر دیا۔ کاٹ دیا۔ السَّبَّ^۷۔ گلی دینا۔ (کیونکہ اس سے ایک دوسرے کی کاٹ ہوتی ہے یا تعلقات منقطع ہوتے ہیں)**۔

السَّبَبُ^۸ اور السَّبَبُ^۹۔ رسی۔ مضبوط اور لمبی رسی جس سے درخت وغیرہ پر اترا اور چڑھا جائے۔ یا جس سے پانی تک پہنچا جائے۔ اسی سے اس کے

معنی ہر اس ذریعہ کے ہو گئے جس سے کسی تک پہنچا جائے *۔ اس جہت سے راستے کو بھی سَبَب کہہ دیا جاتا ہے ** کیونکہ وہ ایک منزل کو دوسری منزل کے ساتھ ملاتا ہے۔ نیز قرابت کا تعلق۔ رشتہ داری *۔

قرآن کریم میں ہے وَتَقَطَّعْتَ بِرِيمٍ الْأَسْبَابَ (۱۶۶)۔ ”ان کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائیں گے، وہ مفاد اور ذرائع جن سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں ختم ہو جائیں گے۔ سورۃ کہف میں ہے ثُمَّ آتَبَعَ سَبَبًا (۱۸۹)۔ ”پھر اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا“۔

سورۃ الحج میں ہے فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ (۲۲)۔ یہاں اس کے معنی ذریعہ، سبب، یا سیڑھی کے ہیں *۔ سورۃ المؤمن میں آسْبَابِ السَّمَوَاتِ (۳۳) آیا ہے۔ صاحب تاج کے نزدیک اس کے معنی آسمان کی سیڑھیاں یا دروازے ہیں۔ ابو زید نے کہا ہے کہ اس کے معنی منازل کے ہیں *۔ اور صاحب محیط نے اس کے معنی سیڑھیاں، راستے، اطراف و جوانب یا دروازے لکھے ہیں **۔ لیکن ذرائع کا لفظ بڑا جامع ہے۔ ہمارے ہاں بھی اسباب و ذرائع کہتے ہیں۔ اور اس مقام پر یہی معنی زیادہ موزوں بھی نظر آتے ہیں۔

سورۃ کہف میں ہے وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (۱۸)۔ اس کے معنی سامان و ذرائع ہی کے ہیں۔ گالی دینے کے معنوں میں یہ سادہ (۱۶۹) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطل کو گالی مت دو، ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے، جہالت کی بناء پر خدا کو گالی دیدیں۔ اس قسم کے مظاہرے، مذہبی مناظروں کے میدانوں میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔

س ب ت

السُّبُتَاتُ۔ نیند۔ اس کے اصلی معنی راحت و سکون کے ہیں۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں)۔ اور چونکہ راحت و سکون کا مطلب یہ تھا کہ انسان حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرے اس لئے اس کے معنی ترک عمل اور قطع کرنے کے ہو گئے *۔

چنانچہ سَبَتَ۔ يَسْبُتُ۔ وَيَسْبُتُ سَبْتًا۔ کے معنی ہیں اس نے راحت و آرام کیا *۔ راغب نے لکھا ہے کہ سَبَتَ کے معنی کاروبار چھوڑنا

بھی ہیں اور سنیچر کے دن میں ہونا 'سنیچر کا دن' گزارنا 'سنیچر کے دن میں داخل ہونا' بھی**۔ سَبَتَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں اس چیز کو قطع کر دیا۔ اَلَسَّبْتُ - بال مونڈنے اور سر منڈانے کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمَسْبُوتُ - میت کو یا بیہوش آدمی کو کہتے ہیں۔ نیز اس بیمار کو بھی جو آنکھیں بند کئے پڑا رہے*۔

يَوْمُ السَّبْتِ - ہفتے کا وہ دن جسے سنیچر کہتے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے*۔ اس معنی میں یہ لفظ (۲۵/۱) میں آیا ہے۔ اور راحت و آرام کے معنوں میں سَبَاتٌ (۹۱/۲) میں، جہاں کہا ہے وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا - نیند کو موجب استراحت بنایا۔ سورۃ فرقان میں بھی یہی کہا ہے اور اس کے مقابلہ میں نَشْوُرًا (۲۵/۲۵) کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی چلنا پھرنا۔ منتشر ہونا۔ اٹھ کھڑے ہونا ہیں۔

یہودیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اپنے سَبَت کی پابندیوں کو توڑا (۲۵/۱ و ۱۵۳/۳)۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ یہ اس دن مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے (۱۶۳/۱)۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی (۳/۳)۔ اور یہ وبال اس لئے آیا کہ وہ سب ایک مسلک پر چلنے کے بجائے باہمی اختلاف کرنے لگ گئے تھے (۱۱۲/۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عائد کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندیوں پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہفتے میں ایک دن کا کاروباری ناغہ بڑی معمولی سی پابندی ہے لیکن اس سے سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اتنی سی طمع (Temptation) کا مقابلہ نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں وہ بھلا زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اترینگے؟ کیریئرنگز نام ہی ضبط خویش (Self Discipline) اور ترغیبات کے مقابلہ کا ہے۔ واقعہ سبت کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود یہی ہے۔ (اس ضمن میں بنی اسرائیل پر جو عذاب آیا تھا اس کی تفصیل ق۔ ر۔ د کے عنوان میں دیکھئے) ہیسٹنگز نے اپنے انسائیکلو پیڈیا*** میں، عہد نامہ عتیق اور مثنا اور تالمود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سبت، جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا تھا اور سنیچر کا پورا دن رہتا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ، قریب ۳۸ اور امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا۔

س ب ح

سَبَّحٌ کے معنی ہیں تیرنا۔ سَبَّحَ بِالنَّهْرِ وَ فِي النَّهْرِ سَبَّحًا وَ سَبَّاحَةً کے معنی ہیں نہر میں تیرا۔ اَسْبَحَ فِي الْمَاءِ۔ اسے پانی میں تیرا دیا۔ اَلَسَّابِحَاتُ۔ کشتیوں کو کہتے ہیں۔ اَلَسَّوَابِحُ۔ وہ گھوڑے جو دوڑتے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتے ہیں۔ اَلَسَّابِحَاتُ۔ اچھے پیراک کو کہتے ہیں۔ نیز اس سے مشابہت کی بناء پر تیز رفتار گھوڑے اور اونٹ کو بھی کہتے ہیں۔

تلاش معاش کے لئے تگ و دو کرنے اور دوڑنے یا چلنے میں دور تک نکل جانے کو بھی سَبَّحٌ کہتے ہیں۔ زمین میں چلنے پھرنے اور گھومنے کو بھی اَلَسَّابِحُ کہتے ہیں۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دوڑ کی ایک قسم بھی لکھے ہیں۔ لہذا سَبَّحٌ کے معنی ہوئے کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جد و جہد کرنا۔ ہر وقت سرگرم عمل رہنا۔ تاج میں ابن شمیل کا خواب مذکور ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص ان کے لئے سَبَّحَانَ اللہ کی تفسیر بیان کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی تیز رفتاری میں تیر رہا ہوتا ہے۔ یعنی سَبَّحَانَ اللہ کے معنی ہیں خدا کی طرف تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا۔ راغب نے بھی کہا ہے کہ سَبَّحٌ اصل میں ”پانی یا ہوا میں تیزی سے گذرنا“ ہے۔ پھر استعارۃً فلک میں تاروں کی تیز خرامی کے لئے بولا گیا ہے۔ التَّسْبِيحُ خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔ ازاں بعد اس کا استعمال وسعت اختیار کر گیا اور اسے قولی یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لئے بولنے لگ گئے۔ حَتَّاکَ اب سَبَّحَةَ اُنْ دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پرو لئے جاتے ہیں حالانکہ یہ چیز عربوں میں غیر معروف ہے۔ (تسبیح عیسائی راہبوں کے ہاں ہوتی تھی جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا)۔

قرآن کریم میں اجرامِ سماوی کے متعلق ہے کُلُّ شَيْءٍ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونُ (۳۶)۔ ”وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں۔“ رسول اللہ کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۲۳)۔ تیرے لئے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ تجھے بڑی جد و جہد کرنی ہوتی ہے۔ پرندوں کے متعلق ہے کُلُّ شَيْءٍ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَ تَسْبِيحَهُ (۲۴)۔ ان میں سے ہر ایک، فضا کی پہنائیوں میں، اپنے اپنے راستے سے بھی واقف

*تاج۔ **راغب۔ ***لطائف اللغة۔ ****صلاة کے لئے دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و۔

ہے۔ (حالانکہ وہاں کوئی نشانِ راہ نہیں لگا ہوتا) یا اپنے اپنے مقاصد کے پیچھے جانے سے واقف ہے، اور اپنی اپنی جسد و جہد کے دوائر اور حصولِ معاش کے طور طریق سے بھی۔ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۶) کے معنی ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانون خداوندی کی رو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروفِ عمل ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ خارجی کائنات کی چیزیں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے از خود (Instinctively) سرگرم عمل رہتی ہیں (اسی کو قصہٴ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے ۲/۳۱۔ یا مثلاً رعد کی تسبیح ۱۳/۱۳)۔ لیکن انسان کو اس کیلئے اپنے اختیار و ارادہ سے سرگرم عمل رہنا ہے۔ اس لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ سَبِّحُوْہُ بِکُرۡۃٍ وَّ اَصۡیَلًا (۳۳/۲)۔ تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہو۔ یہ پروگرام کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ (۹۶/۱) اپنے نشو و نما دینے والے کی صفتِ ربوبیتِ عظمیٰ کو، جس پر ساری کائنات کی عمارت استوار ہے، انسانی معاشرہ میں عملاً متشکل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہنا۔ اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جد و جہد کو بھی ”ذکر و تسبیح“ کہا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف جانے لگے ہیں تو انہوں نے اپنی اس مہم کے لئے بھی کہا تَہَا کَیْ نُسَبِّحُکَ کَثِیْرًا وَّ نَذْکُرُکَ کَثِیْرًا (۲۰/۲)۔

قرآن کریم جو نظامِ زندگی جماعتِ مومنین کے لئے تجویز کرتا ہے اس میں صلوٰۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس جماعت کے جذبہ اطاعتِ خداوندی کے عملی مظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس کا اظہار رکوع و سجود کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ رکوع و سجود میں ایک عبدِ مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اُس کے قوانین کی اطاعت اور اُس کے بتائے ہوئے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے جد و جہد میں صرف کریگا۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام اصطلاح میں انہیں بھی خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کے اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کر کے نہ دکھائے، تو یہ زبانی قول و اقرار ایک بے نتیجہ رسم سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ صلوٰۃ میں حرکات و سکنات اور الفاظ، انسان کے جذبہ عمل کے بیتابانہ اظہار کی شکلیں ہیں۔ اگر عمل نہ رہے اور انسان ان شکلوں ہی کو مقصود و منتہی سمجھ لے تو اس کا نتیجہ

ظاہر ہے۔ بہر حال، یہ تو ظاہر ہے کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام گنا، قرآنی تعلیم کا مقصود نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے تسبیح سے مفہوم، قوانین خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جد و جہد اور سرگرمی عمل ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ تَسْبِيْحٌ کے معنی تنزیہ کے ہیں۔ نیز یہ لفظ ”سبحان اللہ“ کہنے، یا صلوة اور ذکر اللہ، حمد و مجد و ثنا، کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لئے تنزیہ کے معنی ہونگے، خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا۔

اس مادہ میں تیزی۔ مضبوطی۔ شدت کا پہلو ہوتا ہے۔ اسی لئے کِسَاءٌ مُّسَبِّحٌ کے معنی ہیں بہت مضبوط اور سخت بنا ہوا کمبل۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے معنی ہونگے، صفات خداوندی کو نہایت تیزی، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا۔ مطلب وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

سورة صَفَّات میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنا لیا۔ فَلَوْ لَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۱۳۳) اگر یہ لفظ (مُسَبِّحِينَ) سَبِّح سے ہوتا تو اس کے معنی تیراک ہوتے۔ لیکن سَبِّح کے اعتبار سے اس کے معنی ہونگے پوری قوت اور شدت سے جد و جہد کرنے والا۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لئے پوری جد و جہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خود بخود آ جاتا ہے۔

اسی سورة میں ذرا آگے چل کر ہے وَ إِنَّا لَنَجِّنُ الْمُسَبِّحِينَ (۱۳۶)۔ ہم یقیناً (اسی راہ میں) انتہائی قوت کے ساتھ جد و جہد کرنے والے ہیں۔ ان مقامات سے بھی تَسْبِيْحٌ کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ شدت، مضبوطی، تیزی کے ساتھ خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مصروف جد و جہد رہنا۔

سُبْحَانَ مِّنْ كَذَا۔ تعجب کے موقع پر بولتے ہیں*۔ دوری کے اعتبار سے سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (۱۵۹) کے معنی ہیں، خدا ان تمام غلط تصورات سے بہت دور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں۔ نیز سُبْحَانَ (مصدر) کے معنی ہیں، سرگرم عمل رہنا*۔

فَسَبَّحْنِ اللَّهَ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تَصْبِحُونَ (۳۰/۱) - شام و پگاہ تمہارے لئے ان فرائض کی سر انجام دہی میں مصروف رہنا ہے جو تمہارے لئے اللہ نے مقرر کئے ہیں۔

س ب ط

اس سادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں زیادتی اور کثرت کے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں۔ اسی سے السَّبَطُ - ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہیں سے اس کے معنی نسل اور خاندان کے ہو گئے۔ یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے۔ السَّبَطُ - پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ یہود کے قبیلہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اَسْبَاطُ کا لفظ بنو اسحاق (حضرت اسحاقؑ کی اولاد) کے لئے خاص تھا اور قَبَائِلُ کا لفظ بنو اسماعیل کے لئے۔ عربوں نے یہ تخصیص اس لئے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے اولادِ حضرت ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں میں امتیاز ہو جائے**۔ قرآن کریم میں بھی قوم حضرت موسیٰؑ کے لئے اَسْبَاطُ - کا لفظ آیا ہے (۱۶۰/۱)۔ نیز عرب السَّبَطُ - عجمی آدمی کو کہتے تھے۔ جس طرح جَعْدٌ عربوں کو کہتے تھے**۔

قرآن کریم میں اولادِ حضرت یعقوبؑ کے لئے اَسْبَاطُ کا لفظ آیا ہے (۱۳۶/۲)۔

س ب ع

سَبْعٌ - سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اسکی اصل سَبْعَةٌ ہے جسکے معنی شیرینی کے ہیں۔ یہ اسلئے کہ وہ شیر سے بھی زیادہ تیز حملہ کرتی ہے اور عربوں کے ہاں سات کا عدد تامہ (Perfect Number) ہوتا ہے۔ السَّبْعُ - یا السَّبْعُ - درندہ کو کہتے ہیں (۵/۳۰)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسلئے کہ اتفاق سے عرب میں سات جانور درندے ہوتے تھے۔ لیکن راغب کا خیال ہے کہ انہیں سَبْعٌ اسلئے کہتے ہیں کہ ان کی قوت مکمل ہوتی ہے اور سات کا عدد بھی مکمل ہے**۔ لین نے (بیضاوی کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ عربوں میں سَبْعَةٌ سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں "کئی

* محیط - ** تاج - ثعالبی نے فقہ اللغہ میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔

ایک (Several) یا ”متعدد“ (Many) - اسی طرح سَبْعُونَ (ستتر) سَبْعُمِائَةٍ - (سات سو) بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ** - جیسے ہماری زبان میں بیسیوں - پچاسوں - سینکڑوں - کے الفاظ بولے جاتے ہیں - اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا - یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں - اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی - چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً (۹۰) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دینگے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دیدی جائیگی - اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ان کے لئے چاہے کتنی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی - ان معانی کے پیش نظر سَبْعَ سَمَوَاتٍ (۲۹) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی متعدد اجرام فلکی - ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ”سات سمندر پار“ - (۲۹) میں متعدد کے معنی واضح ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ - فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ.....“ ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنی دولت کو کھلا رکھتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگلے اور ایک بال میں سو سو دانے ہوں“ - ظاہر ہے کہ یہاں سَبْعَ سَنَابِلَ سے مراد متعدد (کئی) بالیں ہے -

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۱۵) - اس کے لئے دیکھئے - عنوان (ث - ن - ی -) میں لفظ مثنی -

س ب غ

السَّبْغَةُ - وسعت - فراخی - کشادگی - سَبَغَ الشَّيْءُ سَبْغًا - کسی چیز (کپڑے - زرہ وغیرہ) کا لمبا اور لٹکتا ہوا ہونا - السَّبْغَةُ - وہ زرہ جو ٹخنوں تک آجائے یا لمبائی کی وجہ سے زمین پر گھسٹنے لگے - (سَبْغَاتٌ اس کی جمع ہے - ۳۳) - اَسْبَغَ شَعْرَهُ - اس نے اپنے بالوں کو لمبا کیا اور خوب بڑھایا - شَيْءٌ سَابِغٌ - بھر پور چیز *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - سَبَغَتِ النِّعْمَةُ - نعمت کا وسیع اور بھر پور ہونا *** - قرآن کریم میں ہے وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ (۳۱) - خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھر پور، کثرت اور فراوانی سے دیا -

* تاج - ** لین - *** تاج - راغب - محیط -

س ب ق

سَبَقٌ کے بنیادی معنی ہیں دوڑنے میں آگے بڑھ جانا۔ اس کے بعد ہر شے میں آگے بڑھ جانے کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا *۔ سَبَقَهُ۔ وہ اس سے آگے بڑھ گیا، بازی لے گیا۔ سَبَقَ رَسُولُ اللَّهِ وَصَلَّى أَبُو بَكْرٍ۔ سب سے پہلے رسول اللہ (دنیا سے) تشریف لے گئے اور ان کے پیچھے پیچھے (حضرت) ابوبکرؓ چلے گئے۔ اَلَسَّبَقُ۔ اس شرط یا انعام کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ وغیرہ میں اول آنے والے کیلئے مقرر کر دیا جاتا ہے **۔

اِسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲/۱۵) وہ دونوں دروازہ کی طرف لپکے اور ہر ایک نے کوشش کی کہ وہ آگے بڑھ جائے **۔

محیط میں ہے کہ جب اس کے بعد علیٰ آتا ہے تو آگے بڑھنے اور پہلے آنے والی چیز نقصان دہ ہوتی ہے اور جب اس کا صلہ لام آتا ہے تو اس میں پہلے آنے والی چیز فائدہ بخش ہوتی ہے ***۔ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی (۲۱/۱)۔ ہماری طرف سے خوشگوار یوں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَاسْتَبَقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۱۳۸) خوشگواریاں پیدا کرنے والے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ نفسیاتی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے لئے عمل اور جدوجہد کا جذبہ محرکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ (Competition) اور مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ہی وہ مہمیز ہے جس سے انسان دیوانہ وار مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ قرآن کریم بھی انسان کے اس جذبہ کی رعایت کرتا ہے اور اس کی پرورش چاہتا ہے۔ لیکن وہ اس کا رخ بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ذاتی مفاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، نوع انسانی کے لئے خوشگواریاں پیدا کرنے والے امور میں سبقت کرو۔ اس سے تمہارے جذبہ مسابقت کی بھی تسکین ہو جائیگی اور معاشرہ میں وہ فساد بھی برپا نہیں ہوگا جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں سے آگے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورۃ حجر میں ایک جگہ یہ لفظ (تَسْبِقُ) يَسْتَأْخِرُ (پیچھے رہ جانے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵/۱) اور دوسری جگہ مُسْتَأْخِرٌ يُّنَ کے مقابلہ میں مُسْتَقْدِرٌ مِّينَ آیا ہے (۱۵/۲)۔ لہذا سَبَقٌ۔ اِسْتِخَارٌ (پیچھے رہ

جیائے) کی ضد اور اِسْتَقْدَامٌ (آگے بڑھنے) کے مرادف ہے۔ سورۃ واقعہ میں مَسْبُوتٌ قِيَمٌ (۵۶/۶) بمعنی مَغْلُوبٌ آیا ہے۔ یعنی جس سے کوئی آگے بڑھ جائے۔

سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَہُمْ مِیْنًا الْحُسْنٰی (۲۱/۱)۔ اسکے معنی کئے جاتے ہیں جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی آچکی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے کہ فلاں آدمی اچھے کام کرے گا اور فلاں برے کام۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون پہلے سے بنا رکھا ہے کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہوگا اور فلاں کا نتیجہ برا۔ اور اس کے بعد انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس قسم کا کام جی چاہے کرے۔ وہ جس قسم کا کام کریگا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائیگا۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحیح روش پر چلیں ان کیلئے خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز (کہ اُس روش کا نتیجہ یہ ہوگا) پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ ہم نے محض ان کی خاطر یہ اصول نہیں اختیار کیا۔

سورۃ حدید میں ہے سَابِقُوا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّکُمْ (۵۷/۲۱) اپنے رب کی مغفرت کیطرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

س ب ل

اَسْبَلَ - لٹکانا - چھوڑ دینا - اَسْبَلَ اِلَّا زَارَ - ازار کو لٹکا دیا - اَسْبَلَ دَمْعَهُ - اپنے آنسوؤں کو جاری کر دیا ، چھوڑ دیا تا کہ وہ آنکھوں سے بہ نکلیں - اَسْبَلَتِ السَّمَاءُ - آسمان سے موسلا دھار بارش برسنے لگی - اَلَسَّبَلُ - بارش - لیکن وہ بارش جو آسمان سے لٹک کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو - اَلَسَّبَلَةُ - وسیع پیمانے پر ہونے والی بارش - اَسْبَلَ الزَّرْعُ - کھیتی میں خوشے لٹکنے لگ گئے* - لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی لٹکانے - چھوڑنے اور لمبا کرنے کے ہیں (ابن فارس) - اس سے اَلَسْبِيلُ و اَلَسَّبِيلَةُ کے معنی ہیں راستہ - نرم راستہ جس میں سختی نہ ہو ، راستہ کا واضح حصہ - سَبِيلٌ - مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن مونث زیادہ مستعمل ہے - اس کی جمع سَبُلٌ آتی ہے* - ابن

فارس نے لکھا ہے کہ لمبائی اور دور تک چلے جانے کی وجہ سے راستہ کو سَبَّیْلٌ کہتے ہیں۔ اَلْسَبَّابِلَةُ مِّنَ الطُّرُقِ۔ وہ راستہ جس پر لوگ عام طور پر چلتے رہیں یا وہ لوگ جو اپنی ضروریات کے لئے راستے پر آتے جاتے رہیں۔ راہرو۔ مسافر*۔

قرآن کریم میں فی سَبَّیْلِ اللّٰهِ (۲/۱۹۰) کی اصطلاح متعدد بار آئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فی سَبَّیْلِ الطَّاغُوتِ (۳/۶) آیا ہے۔ ”مومنین کی جماعت فی سَبَّیْلِ اللّٰهِ جنگ کرتی ہے اور کفار فی سَبَّیْلِ الطَّاغُوتِ جنگ کرتے ہیں“ (۳/۶)۔ اس سے فی سَبَّیْلِ اللّٰهِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ طاغوت وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو اپنے احکام کے تابع چلائیں اور دنیا میں باطل کا نظام قائم کریں۔ لہذا سَبَّیْلِ اللّٰهِ کے معنی ہوئے قسوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے، نظام خداوندی کے قیام کی خاطر، اس راستہ پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لئے جو خدا نے مقرر کیا ہے، ذاتی مفاد پرستیوں کے بجائے نوع انسانی کی فلاح و بہبود (رب العالمینی) کے لئے، انسانی بھلائی کے کاموں کے لئے، مخالفت کی قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مومنین اسی مقصد کے لئے جیتے اور اسی کے لئے اپنی جان دیتے ہیں۔ اسی سے انفاق فی سَبَّیْلِ اللّٰهِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی حق کے اثبات اور نوع انسانی کی بہبود کی خاطر اپنا مال کھلا رکھنا، کہ جتنا ضروری ہو اس میں سے لے لیا جائے۔

اِبْنُ السَّبَّیْلِ۔ مسافر جو بہت سفر کرے۔ بعض کے نزدیک اس سے ایسا مسافر مراد ہوتا ہے جس کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہو*۔ قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا ہے کہ وہ ”اِبْنُ السَّبَّیْلِ“ کی مدد کرے۔ حتیٰ کہ صدقات کا ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے۔ (۹/۶)۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے جو اسلامی مملکت میں سفر کرے سفر کی سہولتیں بھی آ جاتی ہیں اور جو لوگ سفر میں کسی وجہ سے نادار ہو جائیں انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانا بھی۔ محیط نے اس کے معنی مہمان کے بھی دئے ہیں۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں ”ابن السبیل“ وہ لوگ ہونگے جو اسلامی مملکت میں عارضی طور پر آئیں جائیں اور رہیں سہیں (Non - Citizens)۔

سورة آل عمران میں اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ کہتے تھے کہ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاِلَہِیَّیْنِ سَبَّیْلٌ (۳/۶۳)۔ یعنی ہم ان غیر اہل کتاب

عربوں کے خلاف جو جی میس آئے کسریں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس کے مطابق جو جرم اپنے قبیلہ کے اندر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے لیکن جو جرم قبیلہ سے باہر کیا جائے وہ جرم نہیں کہلاتا۔ قبائلی زندگی تو ایک طرف، خود اہل روم کے ہاں قانون موجود تھا کہ اپنی قوم کے فرد کی چوری جرم ہے اور غیر قوم والوں کے ہاں چوری جرم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سازی کہیں بھی ہو (خواہ وہ مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی قومیت کی گروہ بندی) اس سے یہی ذہنیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمدردیاں اور نفع رسانیاں صرف اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں۔ اس سے باہر جتنے افراد انسانیہ ہیں ان سے نفرت کی جائے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور آج سے چار ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا۔ عصر حاضر کی نیشنلزم اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ اور اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ جرم بھر نوع جرم ہے خواہ اپنوں کے خلاف کیا جائے یا دوسروں کے خلاف۔ اس میں انسان اور انسان، اور قوم اور قوم میں کوئی فرق نہیں۔ اسی لئے اس کے نزدیک اچھا کام وہی ہے جو فی سبیل اللہ کیا جائے۔ یعنی اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند ہو کر، نوع انسانی کی بہبود کی خاطر۔

قرآن کریم میں جنتی زندگی کے سلسلہ میں ہے عَيْنًا فِيْهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيْلًا (۶۱/۶)۔ ”اس میں ایک چشمہ ہے جسے سَلْسَبِيْلٌ کہتے ہیں“۔ محیط نے اس کی اصل سَلْ سَلْ سَلْسَبِيْلًا بتائی ہے جس کے معنی ہونگے راستہ دریافت کرنا**۔ (پوچھتے ہوئے آگے چلتے جاؤ)۔ اسی کو دوسری جگہ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۱۱۲/۸) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاری چشمہ۔ ہر وقت بہتا رہنے والا چشمہ۔ یعنی خود زندگی کی جوئے رواں جو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ حیات جاوداں جو ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ جو حرکت مسلسل سے عبارت ہے اور جس میں کہیں انقطاع اور حد بندی نہیں۔ کوئی روک اور رکاوٹ نہیں۔ اپنے زورِ دروں سے انسانی ذات کا مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا۔ ”سَلْسَبِيْلٌ اللہ“، بھی یہی راہ ہے۔ وہ راستہ جس میں انسان ”مَائِنْفَع النَّاسِ“ (۱۱۳/۱) پر عمل پیرا ہوتا اور خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہی وہ راہ تھی جس کی طرف رسول اللہ ﷺ علی وجہ البصیرت دعوت دیتے تھے (۱۱۲/۸)۔ یہ قرآن

کریم کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انسانی صلاحیتیں بھرپور طور پر نشو و نما حاصل کر سکتی ہیں اس لئے کہ مَسَلًا الْكَاسُ إِلَى أَسْبَابِهَا : پیالے کو لبالب بھر دینے کو کہتے ہیں *۔

سورة نحل میں شہد کی مکھی سے کہا گیا ہے فَاسْلُكِي سَبِيلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶۱)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے راستوں پر فرمان پذیری سے چلی جا۔ اس سے واضح ہے کہ قوانینِ فطرت بھی ”اللہ کے راستے“ ہیں جن پر اشیائے کائنات چلی جا رہی ہیں۔ اور انسانوں کی راہنمائی کے لئے حضراتِ انبیاء کرام کی وساطت سے ملی ہوئی وحی صحیح راستے ہیں (۱۳)۔

سورة عنکبوت میں ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ وَ إِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹)۔ اس کا مادہ ترجمہ یہ ہے کہ ”جو لوگ ہمارے لئے جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں“۔ یوں تو خدا کی طرف جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے ”الصراط المستقیم“ کہہ کر پکارا ہے (۱) لیکن انسان کے سامنے، نت نئے دن زندگی کے نئے مسائل آتے رہتے ہیں جن کا حل اسے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصول دئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا، جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خارجی کائنات کے احوال و کوائف، اقوامِ عالم کی تمدنی زندگی، اپنے زمانے کے مقتضیات اور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر گہرے غور و خوض اور فکر و تدبیر کی ضرورت ہوگی۔ اس طریق کار سے، معاملات پیش نظر کے متعلق قرآنی راہ نمائی کے لئے جد و جہد کرنا، (اصطلاح میں) اجتہاد کہلاتا ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اجتہاد کریں گے، ہم ان کے سامنے زندگی کی صحیح راہیں کشادہ کرتے چلے جائیں گے۔ انہی راہوں کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ”سبیل السلام“ یعنی امن و سلامتی کی راہیں قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ يَخْرُجْهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ۔ اس طرح کاروانِ انسانیت، تاریکیوں سے روشنی کی طرف آ جاتا ہے۔ اور آخر میں ہے وَ يَهْدِيْهِمُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۱۶)۔ اور یوں انہیں ”صراطِ مستقیم“ کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام راستے اُسی صراطِ مستقیم میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ تمام جزئیات و تفصیل جنہیں جماعتِ مومنین، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتی ہے، قرآنی اصل کی شاخیں ہوتی ہیں اس لئے یہ تمام پگڈنڈیاں اُسی شاہراہِ مقصود میں جا کر مل جاتی ہیں۔

س ت ت

اَلِیْسَتْ - اَلِیْسَتْ - چھ - اصل میں سیدس تھا * - قرآن کریم میں ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۵۴) - ”زمین اور آسمانی کُروں کو چھ ادوار میں پیدا کیا“، اس میں ان ارتقائی ادوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر ہماری زمین اور دیگر اجرام اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچے ہیں - (یَوْمٌ کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ی - و - م) - سِتُّوْنَ اور سِتِّیْن - ساٹھ - (۵۸) -

س ت ر

سِتْرٌ - اوٹ - آڑ - پردہ جس سے کوئی چیز چھپائی جائے ** - سورة کہف میں ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهْمُ مِنْ دُونِهَا سِتْرًا (۹۸) - وہ قوم (کھلے میدان میں رہتی تھی اس طرح کہ) ان کے اور سورج کے درمیان کوئی اوٹ یا آڑ نہیں تھی - اَلِیْسَتْ - پردہ - سِتْرَ الشَّیْءِ - اسنے اس چیز کو چھپا دیا - اِسْتَتَرَ - چھپ جانا ** - قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۲۲) - تم نہیں چھپتے تھے - سورة بنی اسرائیل میں ہے کہ جب تو قرآن کریم پڑھتا ہے تو تجھ میں اور ان لوگوں میں جو حیات مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے حِجَابًا مَسْتُورًا (۱۶) حائل ہو جاتا ہے - یعنی ایک ایسا پردہ حائل ہو جاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے - ان کے قلب و دماغ پر ایسا پردہ چھا جاتا ہے جو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے - ان کی نفسیاتی کیفیت کو حِجَابٌ مَسْتُورٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی غیر مرئی پردہ - نیز مَسْتُورٌ بمعنی سَاتِرٌ بھی ہے (چھپانے والا) جیسے مَسْجُورٌ بمعنی سَاحِرٌ - خدا کا ایک نام اَلِیْسَتْ - بھی مشہور ہے - لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا -

س ج د

اَلسَّجَّوْدُ کے معنی ہیں ، سر کو جھکا دینا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ، پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں - نَخْلَةٌ سَاجِدَةٌ - جھکا ہوا کھجور کا درخت ، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے * - سَجَدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے * -

لہذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کار فرما ہے جسے دور حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیات یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہہئیے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے، اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے، اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جسو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے ”سر جھکا دیا“، تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے اس کے سامنے ”سر کشی“، اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ، اطاعت اور فرماں پزیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورہ نحل میں ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مِمَّنْ دَابَّةٌ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶) اور جسو جان دار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب خدا کے سامنے سر بسجود ہیں اور وہ سر کشی اختیار نہیں کرتے،۔ یہاں يَسْجُدُ کا مفہوم لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سر کشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶) ”انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں“۔ اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ ج۔ د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پزیری کے) معنوں میں۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) ”حواس“ کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اُس زمانے کا مذہب*، محسوسات کے دائرے میں گہرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ”خدا“ کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔ یہ اسلئے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لئے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اسی طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے)۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اسقدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع و سجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسول اللہؐ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے۔ فَاِذَا سَجَدُوْا (۱۰۴)۔ ”پھر جب وہ سجدہ کر چکیں“ تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔

* مذہب اور دین کے فرق کے لئے (ذ۔ ہ۔ ب) اور (د۔ ی۔ ن) کے عنوانات دیکھئے۔

ظاہر ہے کہ یہاں ”سجدہ“ سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ سچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں، نبی اکرمؐ اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں، صلوٰۃ اور حج ہی وہ ”تقاریب“ ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، حرکات و سکنات کرے تو اس سے جس قدر انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلوٰۃ کے عنوان (باب ص۔ ل۔ و) میں ملیگی۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس پر خلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا کہ لَیْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولِیُّوْا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ..... (۲/۱۷۷)۔ ”نیکو اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکو اور کشادگی کی راہ اسکی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود، قرابتداروں، یتیموں، مساکین۔ ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے.....“۔ یعنی صلوٰۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرمان پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے، تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱/۵)۔ ”ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشمہوں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہئے،

(بند لگا کر) روک رکھتے ہیں ،، - اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے -

الْمَسْجِدُ - پیشانی کو کہتے ہیں جو زمین پر رکھی جاتی ہے - اور الْمَسْجِدُ اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے* - یہ اسم ظرف ہے جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت، دونوں ہو سکتے ہیں - سورة كهف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنا دی (۱۱۱) - یعنی وہ مجاہدین تھے - لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہو گیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ اناہ بن گیا - سورة بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۷۰) - سورة التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (۱۰۹) اور اسکا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ہے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ کہہ کر پکارا ہے (۱۰۹) - قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۱) اور واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ”اللہ کی مسجدوں“ کو آباد کریں - اس نے اعلان کر دیا کہ اِنَّ الْمَسْجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۸) ”مسجدیں صرف اللہ کے لئے ہیں - سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو“ - فرقہ بندی شرک اس لئے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی - خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں -

جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے، اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے - اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے - کعبے کو جو مسجد الحرام کہہ گیا ہے (۲۸) تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے - وہ اُس اُمت کا مرکز محسوس ہے

جسکی خصوصیت مُسْلِمَتَ لَکَکَ (۱۲۸) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا اس لئے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهِ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَلَا قُصَا الَّذِیْ بُرَکْنَا حَوْلَہٗ لِیُنْرِیْہٗ مِّنْ اٰیٰتِنَا (۱۴) ”وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجد الحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے با برکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیوں) دکھائیں،،۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ سورۃ طہ میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لَیْنُرِیْکَ مِّنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۲)۔ ”تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں“۔ یہ آیات، آویزش حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لئے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دئے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”عبادت“ اور عام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ ب۔ د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ”عبادت“ کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جاسکے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبَنِیْ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِندَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۱۳۱) اس میں ”مسجد“ (ظرف) کو مصدری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے*۔ یعنی اطاعت کرنا۔ اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رہبانیت

* لسان العرب سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

کو اطاعت و عبادت کا منتہی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترک دنیا۔ ترک لذت۔ ترک زیبائش و آرائش۔ قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش، خدا کی اطاعت کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لئے اسے ترک کرنا، اطاعت نہیں۔ ان چیزوں سے ضرور متمتع ہونا چاہیئے۔ صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ اس آیت کے اگلے حصے، اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے۔ ”وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا“۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۲۶۷)۔ ”تم کھاؤ پیو۔ لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،“۔ اس سے اگلی آیت میں ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَاَلَطِيْٓبَاتِ مِّنَ الرِّزْقِ... (۲۶۸)۔ ”ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے،؟۔ دو آیتیں پہلے ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِمُوا وُجُوْهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لِّهِ الدِّیْنَ... (۲۶۹)۔ ”ان سے کہدو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو۔ اور اطاعت کو خالص اسی کے لئے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو،“۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے۔

سورة الفتح میں محمد رسول اللہؐ والذین معہ کے متعلق ہے تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۲۷۰)۔ ”تو انہیں رکوع کرتے ہوئے۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھیگا،“۔ یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلوٰۃ کے رکوع و سجود ہونگے۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں مرتسلیم خم کئے ہونگے۔ اس کے بعد ہے سَيِّمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثْرِ السُّجُوْدِ (۲۷۱)۔ اس کے عام معنی ہیں ”ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجود کے اثرات سے ظاہر ہیں“۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے يَتَعَرَّفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسَيِّمَاهُمْ (۲۷۲) مجرم اپنی

علامات سے پہچانے جائیں گے۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینائے رخ سے جھلک کر باہر آجاتی ہے۔

س ج ر

سَجَرَ التَّنُّورِ - يَسْجُرُهُ - سَجَرًا - اس نے تنور جلا دیا۔ اُسے گرم کرنے کے لئے اس میں پورا پورا ایندھن ڈال دیا۔ اسے ایندھن سے بھر دیا۔ اسی لئے سَجَرَ النَّهْرِ کے معنی ہوتے ہیں۔ اس نے نہر کو بھر دیا۔ اَلْسَجُورُ - وہ چیز جس سے تنور کو جھونکا جائے۔ اَلْمِسْجَرُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے تنور میں ایندھن کو الٹا پلٹا جائے تاکہ وہ جلدی گرم ہو جائے۔ اَلْسَّاجِرُ - اَلْمَسْجُورُ - ساکن اور بھری ہوئی چیز۔ (نیز اس کے معنی خالی چیز کے بھی آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اضداد میں سے ہے**)۔ وہ دریا جس کا پانی اُس کے ظرف سے زیادہ ہو۔ سَجَرَتُ الْاِلَٰ نَاءِ - میں نے برتن کو بھر دیا۔ اَلْسَّاجِرُ - وہ مقام جہاں سے سیلاب گزرے اور اسے پُر کرتا ہوا چلا جائے۔ بَسْرُ سَجِرٍ - پُر کنواں*۔

سَجَرَ الْمَاءِ - پانی کا جدھر جی چاہے راستہ پہاڑ کر نکل جانا*۔ لہذا اس لفظ کے معنی آگ بھڑکانے کے بھی ہونگے اور بھر دینے اور لبریز ہو جانے کے بھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) بھرنا۔ (۲) ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا اور (۳) بھڑکانا، ہیں۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ (۲۴)۔ پھر وہ آگ میں جھونکے جائیں گے۔ سورۃ طور میں اَلْبَحْرِ الْمَسْجُورِ (۵۲) آیا ہے۔ یعنی بھرا ہوا سمندر۔ یا ایک سے دوسرا ملا ہوا سمندر۔ سورۃ تکویر میں ہے اِذَا الْبَحَارُ سُجِّرَتْ (۱۱)۔ سمندر (آمد و رفت کی کثرت سے) ہر وقت بھرے بھرے نظر آئیں گے۔ (اور اگر بَحَارُ کے معنی کناروں کی بستیاں لیا جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بندرگاہیں آباد ہو جائیں گی۔ مقصد بھر حال دونوں کا ایک ہی ہے)۔

س ج ل

اَلْسَّجِلُ - پانی سے بھرا ہوا بڑا ڈول - سخی آدمی*۔ اَلْسَّجِلُ - کتاب - صحیفہ - نیز کاتب*۔

السَّجَّيْلُ۔ یہ لفظ معرب ہے فارسی لفظ سَنَگِ گل سے۔ یعنی وہ مٹی جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے۔ زمانہ قدیم میں (جب لکھنے کی ابتدا ہوئی تھی تو) مٹی کی تختیوں کو آگ میں تپا کر پختہ کر لیا کرتے تھے اور انہی پر لکھا جاتا ہے۔ اسی کو السَّجَّيْلُ کہتے تھے۔ بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے السَّجَّيْلُ کہنے لگے۔**

قرآن کریم میں ہے کہ قوم لوط پر حِجَارَةٌ مِّنْ سِجِّيلٍ (۱۱/۸۲) برسائے گئے۔ انہی کو سورۃ ذاریات میں حِجَارَةٌ مِّنْ طِينٍ (۵۱/۳۳) کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سنگ گل متحجر تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں مقامات پر انہیں مُسَوَّمَةٌ عِندَ رَبِّكَ (۱۱/۸۳ و ۵۱/۳۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ تھے۔*** لیکن السَّجَّيْلُ میں لکھنے کا جو عنصر شامل ہے، اس اعتبار سے بھی مُسَوَّمَةٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ [ہو سکتا ہے کہ یہ تہ تہ تہ (مَنْضُودٌ ۱۱/۸۲) تختیاں ہی ہوں جو پہاڑ پر کسی لائبریری میں رکھی ہوں اور اس کی آتش فشانی سے سب سے پہلے یہی اڑ کر ان کی بستی پر گری ہوں]۔

سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السَّجِّيلِ۔ لِلْكُتُبِ (۲۱/۱۳)۔ یہ وہ دور ہوگا جس میں بلندیوں (یا بلند طبقے کے لوگوں) کو کاغذ کے فائل کی طرح لپیٹ کر رکھ دیا جائیگا کہ ان کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس دور میں معاشرتی ہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ (۳۹/۶)۔

اگر ان آیات میں کسی کائناتی حادثہ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مقصود آسمانی کُتُب کا لپیٹے جانا ہوگا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بھر کر الٹ جانا یا گر جانا ہیں۔ اس سے مفہوم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

س ج ن

سَجَنَ - يَسْجُنُ سَجْنًا - کسی کو قید کر دینا* (۱۲/۳۵ و ۱۲/۳۵)۔
السَّجْنُ - قید خانہ (۱۲/۳۵)۔

* تاج - ** راغب - *** اقوام سابقہ پر جو عذاب طبعی حوادث (سیلاب، آندھی، زلزلہ، آتش فشاں مادہ) کے ذریعے آتا تھا، اسے اس قوم کے اعمال زندگی سے کیا تعلق تھا، اس کے لئے مصنف کی کتاب ”جوئے نور“ دیکھئے۔

ہے کہ انہوں نے خیال کیا کہ گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ لیکن یہ چیز اور ہے اور کسی کا جادو کے اثر سے مسحور ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جانا اور بات۔ نبی پر اس قسم کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا۔

(قصہ حضرت موسیٰؑ میں اگر سحر کے معنی باطل پرستی لئے جائیں تو پھر بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے)۔

س ح ق

سَحَقَهُ - يَسْحَقُهُ - سَحَقًا - اسنے اسے کوٹ کر، پیس کر، باریک کر دیا - اِنْسَحَقَ - وہ پیس گیا - سَحَقَتِ الرِّيحُ - اَلْاَرْضُ - ہوائ نے زمین کے نشانات مٹا دئے - وہ اس تیزی سے چلی جیسے زمین کی مٹی کو پیس رہی ہو - سَحَقَتِ الدَّابَّةُ - جانور تیز دوڑا - اسی سے اَلْسَحَقُ - اَلْسَحَقُ کے معنی ہیں دور ہونا - اَسْحَقَ فُلَانًا - اس نے اسے دور کر دیا - ہلاک کر دیا * - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) بَعْد اور دوری (۲) کسی چیز کو اس قدر کمزور کر دینا کہ وہ خستہ ہو جائے، بتائے ہیں - اَسْحَقَ الضَّرْعُ : تھن دودھ سے خشک ہوئے اور مرجھا گئے - راغب نے سَحَقُ کے معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا کئے ہیں -

قرآن کریم میں ہے فَسَحَقًا لِّاَصْحَابِ السَّعِيرِ (۱۱) - اہل جہنم کے لئے (زندگی کی خوشگوار یوں سے) بَعْد اور محرومی ہے - مَكَانٌ سَحِيقٌ (۲۲) - دور دراز جگہ -

س ح ل

سَحَلَهُ - يَسْحَلُهُ - سَحَلًا - اسنے اسے چھیل دیا اور کھرچ دیا، ریتا - اَلرَّيَّاحُ تَسْحَلُ اَلْاَرْضَ - ہوائیں زمین (کی سطح) کو کھرچ دیتی ہیں - اَلسَّاحِلُ - دریا یا سمندر کا کنارہ جسے پانی چھیلتا اور کھرچتا رہتا ہے ** -

قرآن کریم میں ہے فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۹) - دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا -

س خ ر

سَخِرَ - يَسْخَرُ سَخَرًا وَ سَخَرًا وَ سَخَرًا کے معنی مذاق کرنا اور بیوقوف سمجھتے ہوئے ہنسی اڑانا ہیں - رَجُلٌ سَخِرَةٌ * -

* تاج و محیط - ** تاج و راغب

وہ آدمی جو بہت زیادہ لوگوں سے مذاق کرے اور انکی ہنسی اڑائے۔ اس سے اسم السَّخِرِ يَّةَ وَالسَّخِرِيَّ وَ السَّخِرِيَّ آتا ہے*۔ یعنی ٹھٹھول، مذاق۔ سَخِرَهُ۔ يَسْخِرُهُ سَخِرَ يَسَّ وَ سَخِرَ يَسَّ۔ وَ سَخِرَهُ تَسْخِيرًا۔ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا۔ کسی کو مجبور کر کے کسی کام پر لگا دینا۔ کسی سے کوئی کام بلا معاوضہ (بیگار کے طور پر) کرا لینا۔ کسی کو تابع فرمان کرنا۔ اپنے حکم کے مطابق چلانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حقیر سمجھنے اور ذلیل کرنے کے ہیں۔

محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ مادہ مجرد ثلاثی سے آیا ہے اس سے مراد استہزاء ہے، سوائے سورة زخرف کے کہ وہاں لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرَ يَّةَ (۳۳)۔ میں سَخِرَ يَّةَ کا لفظ تسخیر کے معنوں میں ہے**۔

سورة زخرف کی یہ آیت ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد میں کسب و ہنر کی استعداد میں جو فرق ہے وہ اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف کام مختلف افراد کرسکیں۔ اگر تمام افراد کی استعداد ایک جیسی ہوتو کوئی شخص کسی دوسرے کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق کام ہی نہ کرے۔ یا تمام افراد ایک ہی قسم کا کام کرنے لگ جائیں۔ اس طرح معاشرہ کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن اختلاف استعداد کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ استعداد والے لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کم استعداد والے لوگوں کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا کر انہیں اپنی اغراض کے حصول کا آلہ کار بنا لیں۔ اختلاف استعداد صرف تقسیم کار کے لئے ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے ہر ابن آدم واجب التکریم ہے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں ہے سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمِمَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (۱۳)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر چیز کو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چلنے کے لئے پیدا کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے (جسے قانون فطرت کہتے ہیں) ان اشیائے کائنات سے اپنے فائدے کے کام لے سکے۔ لہذا جو قوم، قوانین فطرت کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر کے اشیائے فطرت کو اپنے کام میں لائیگی وہی ان کی

تخلیق و تسخیر کے منشا کو پورا کریگی۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس اعلان سے انسانی دنیا میں کس قدر انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ انسان، کائنات کی قوتوں سے ڈرتا تھا۔ انہیں اپنا معبود بناتا تھا۔ ان کے حضور گڑ گڑاتا تھا۔ اپنے آپ کو ان سب کے سامنے کمزور و ناتواں سمجھتا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ یہ تصور یکسر باطل ہے۔ خدا نے کائنات کی تمام قوتوں کو انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھا ہے۔ یہ قوتیں اس کی معبود نہیں، اسکی خادم ہیں۔ ”ملائکہ“ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ اس سے انسان کا مقام کائنات کی ہر چیز سے بلند ہو گیا اور اس کے سامنے اشیائے فطرت کی تسخیر کے دروازے کھل گئے۔ دنیا میں جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کریگی یہ قوتیں اس کے تابع فرمان ہو جائیں گی۔ اس میں مومن اور کافر کا بھی کچھ فرق نہیں۔ البتہ مومن ان قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق انسانیت کی نشو و نما کے لئے صرف کریگا اور کافر انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے کام میں لائیگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) مقام آدم (آدمی کا مقام) یہ ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کو مسخر

کر کے اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

(۲) مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے منشاء خداوندی

کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

(۳) جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کرے، اسے مقام مومن تو ایسی

طرف مقام آدم بھی نصیب نہیں۔

آج کا مسلمان خود سمجھ لے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کا مقام کیا ہے؟

سَخِرَ (مذاق اور استہزاء کے معنوں میں) قرآن کریم کے متعدد مقامات

پر آیا ہے (مثلاً ۲۱/۳۷ و ۲۱/۳۸ و ۲۱/۳۹)۔ سورۃ مومنون میں لفظ سَخِرَ یٰۤاَیُّهَا (۲۳/۱۱۰)

انہی معانی میں آیا ہے۔

س خ ط

السَّخِطُ۔ السَّخِطُ۔ ناپسندیدگی، کراہت، ناراضماندی، غضب، غصہ۔

سَخِطَ عَلَیْہِ۔ وہ اس پر ناراض ہوا۔ سَخِطَ۔ اس نے ناپسند کیا، کراہت

کی۔ اَسْخَطَہُ۔ اس نے اسے ناراض کر دیا۔ غصہ دلادیا۔ اَلْمَسْخُوْطُ۔

مکروہ۔ ناپسندیدہ*۔ راغب نے کہا ہے کہ سَخِطَ اس شدید غصے کو کہتے

ہیں جو مزا کا مقتضی ہو**۔

لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی غصے یا ناراضگی کے نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان انسانی جذبات سے بہت بلند ہے۔ اس کے معنی سورۃ محمد کی اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے ذَٰلِکَ بِأَنَّهُمْ تَتَّبِعُوا مِمَّا آسَٰخَطَ اللّٰهُ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۳۸)۔ ان کی ہلاکت اور تباہی اس لئے ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو احکام خداوندی کے مطابق نہیں ہیں۔ جو باتیں ان احکام کے مطابق ہیں یہ انہیں ناپسند کرتے ہیں (کَرِهُوا رِضْوَانَهُ) یعنی کَرِهُوا مِمَّا نَزَّلَ اللّٰهُ (۳۶)۔ وحی خداوندی کو نا پسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرتے جن کی یہ توقع لگائے رہتے ہیں۔ لہذا مِمَّا آسَٰخَطَ اللّٰهُ کے معنی ہوئے وہ امور جو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ اس میں غصے اور ناراضگی کا کوئی سوال نہیں۔ (۳۶) میں بھی سَخَطٌ بمقابلہ رِضْوَانٍ آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں اَن سَخِطَ اللّٰهُ کی تفسیر مِمَّا قَدْ شَأَمَتْ لَہُمْ اَنفُسُہُمْ (۸۰) نے کر دی۔ یعنی مکافات عمل۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ ض۔ ی اور غ۔ ض۔ ب دیکھئے)۔

س د د

السَّدُّ۔ روک۔ ہر حائل ہونے والی چیز۔ پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے کہ السَّدُّ (س پر زبر سے) وہ روک ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہو اور السَّدُّ (س پر پیش سے) وہ پہاڑ یا روک ہے جو قدرتی طور پر بنی ہوئی ہو*۔ لیکن بعض اس فرق کو نہیں مانتے۔ خود قرآن کریم میں پہاڑ کے لئے بھی السَّدُّ آیا ہے (۱۸) اور انسانوں کی بنائی ہوئی روک کے لئے بھی (۱۸)۔ سورۃ یسین میں یہ لفظ ایسے اسباب اور عناصر کے لئے آیا ہے جو انسان کی عقل و بصیرت کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ (۳۶)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے شگاف کو بھر دینا اور اسے ہموار کر دینا۔ سَدَّدَ الرَّمْحَ۔ نیزے کو سیدھا کر دیا۔ درست کر دیا۔ سَدَّدَ الثَّلْمَ۔ شگاف بھر دیا*۔ رَجُلٌ سَدِيدٌ۔ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی۔ اَمْرٌ سَدِيدٌ۔ ایسی بات جو ہر اس خلا کو بھر دے جو حقیقت کے بارے میں رہ گیا ہو۔ متوازن اور درمیانہ بات جس میں

نہ افراط ہو نہ تفريط*۔ قرآن کریم میں قَوْلًا سَدْرًا یُذَّآ آیا ہے (۹ و ۳۳) نہایت متوازن، سیدھی، صاف بات۔ جس بات سے کوئی خلا باقی نہ رہے۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کبھی مبہم، پُر پیچ و خم، ذو معنی، ٹیڑھی میڑھی بات نہ کرو۔ ہمیشہ سیدھی، صاف، واضح، محکم، متوازن اور ٹھیک ٹھیک معنی بتا دینے والی بات کرو۔ ایسی بات جس کا تعلق براہ راست صحیح مقصد سے ہو۔ لایعنی اور بے فائدہ نہ ہو۔ سَهْمٌ سَدْرًا اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگے*۔ ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں۔

(سَدْرٌ اور رَدْمٌ کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان ردم)

س در

السَّيْدُ رٌ۔ بیری کے درختوں کو کہتے ہیں۔ (واحد سید رة)۔ جب بیری کا درخت بہت گھنا ہو جائے تو اس کا سایہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور عرب، صحرا کی سخت گرمی کے ستائے ہوئے اس کے سایہ میں آرام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے جنت کے آرام اور نعماء کے لئے اسے بطور مثال بیان کیا گیا ہے*۔ فِي سِدْرٍ مَخْضُودٍ (۵۶)۔ ایسے درخت جو پھل سے لدے ہوئے ہوں اور جن کے سایے نہایت گھنے ہوں۔ یا ایسے درخت جن کا سایہ تو ہولیکن کانٹے نہ ہوں۔ بلا خلش آرام و راحت۔ سایہ کے اعتبار سے دوسری جگہ ہے۔ وَ نَدُّ خِلْدَهُمْ ظِلَالًا (۳)۔ اس میں آرام اور خوشحالی، دونوں پہلو مضمحل ہیں۔ بیری کا درخت ریگستانی اور سخت گرمی کے خشک علاقہ میں بھی سرسبز رہتا ہے لیکن بقول راغب، اس کا پھل زیادہ مفید غذائیت نہیں رکھتا۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب سبا کا علاقہ سیلاب کے بعد بنجر ہو گیا تو وہاں سرسبز و شاداب باغات کی جگہ کچھ بیری کے درخت اُگ آئے۔ وَ شَیْئٌ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ (۳۴)۔ سَدْرٌ النِّخْلِ کھجوروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں**۔

سَدْرٌ۔ وہ متحیر ہوا۔ سخت گرمی کی وجہ سے اسے دکھائی نہ دیا۔ السَّادِرٌ۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جو شدت گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے۔ سَدْرٌ بَصَرُهُ سَدْرًا۔ شدت گرمی کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت اور اضطراب رائے کے ہیں۔ السَّادِرٌ۔ متحیر کو کہتے ہیں۔

سورة النجم میں مقام نبوت کی کیفیات کو مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ وحی کی کیفیت صرف مثلاً اور تشبیہاً ہی بیان کی جاسکتی ہے، کیونکہ کوئی غیر نبی، وحی کی کیفیت اور ماہیت کو جان اور پہچان نہیں سکتا۔ وہ صرف اس کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے)۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں انسانی عقل و فکر کے لئے سوائے انتہائی حیرت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ عقل انسانی اُس مقام کی ماہیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکتی۔ اسے وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے عِنْدَ سَيِّدُ رَةِ الْمُنتَهٰی (۵۳/۱۳) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یعنی وہ مقام جہاں تحریر اپنی انتہا تک پہنچ جائے۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی کہ اِذْ يَغْشٰى السَّيِّدُ رَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳/۱۶)۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ یعنی یہ تمہارے (غیر از نبی انسانوں کے) لئے ممکن نہیں کہ تم جان سکو کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ تمہاری نگاہ کے لئے وہ تحریر کی فراوانی تھی جس نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳/۱۷)۔ نبی کی آنکھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کھاتی۔ وہ حقائق کو بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر دیکھتی ہے۔ لیکن صرف انہی حقائق کو جو اسے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ ان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔ بڑھ سکتی ہی نہیں۔ کیونکہ اسے یہ چیزیں اس کے ذاتی کسب و ہنر سے نہیں ملتیں کہ وہ جس قدر زیادہ محنت کرتا جائے آگے بڑھتا جائے۔ اس پر حقائق منکشف کئے جاتے ہیں، جس قدر منکشف کئے جاتے مقصود ہوں۔ انسانوں کے مقابلہ میں تو علم نبوت (وحی) لا انتہا ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ راغب نے اِذْ يَغْشٰى السَّيِّدُ رَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳/۱۶) کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس میں اس مکان کی طرف اشارہ ہے جہاں رسول اللہؐ کو افاضہؑ السہیہ سے نوازا گیا تھا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہؐ نے بیعت لی تھی (۴۸/۱۸)۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مکان کے مقابلہ میں کیفیت کا مفہوم زیادہ موزوں ہے۔ ویسے السَّيِّدُ رِہٗ پانی کے منبع، نہر اور دریا کو بھی کہتے ہیں*۔ السَّيِّدُ رِہٗ سمندر کو کہتے ہیں*۔ اس اعتبار سے بھی اس کا مفہوم علم الہی کا سرچشمہ (وحی) زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لہذا سَيِّدُ رَةِ الْمُنتَهٰی وحی کا سرچشمہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے تحریر ہی تحریر ہوتا ہے لیکن چشم نبوت اسے صاف طور پر دیکھتی ہے۔

س ڈ س

السُّدُسُ - السُّدُسُ - چھٹا حصہ (۱۱/۳) - السُّدُسُ - اصل میں سِدُسُ تھا۔ آخری سین کو تاء سے بدل کر سِدُسُ کر لیا۔ پھر درمیانی دال کو تاء سے بدل کر ادغام کر کے سِتُُّ بنا لیا۔ یعنی چھ - سِتُُّونُ - سِتِّیْنُ - ساٹھ* - (۵۸/۳) سَادِسُ چھٹا (۱۸/۱۲) - (نیز دیکھئے عنوان س - ت - ت)

س ڈ ی

السُّدُی - کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں۔ قَدْ اسْدٰی الشَّوْبُ وَ سَدَّاهُ - اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا۔ السُّدُی - وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھرے۔ ذَهَبَ کَلَامُهُ سُدٰی - اسکی بات بیکار چلی گئی**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سدی کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے ادھر چلے جانا ہیں۔ خلیل نے کہا ہے کہ سَدُوٌّ - بچوں کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدٰی (۹۶/۳۶)۔ اس مادے کے بنیادی معنوں پر غور کیجئے۔ کپڑا بُننے کے لئے تانے اور بانے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنہا تانا سو گز لمبا بھی کیوں نہ ہو وہ بیکار ہوتا ہے۔ جب تک اس میں بانا نہ بُنا جائے وہ کپڑا نہیں بن سکتا۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا۔ وہ کبھی ”روحانیت“، حاصل کرنے کیلئے خاناقاہوں، تجرد گاہوں، اور سجادھیوں کی طرف چلا گیا۔ اور کبھی خالص دنیا دار بن کر حکومت و سلطنت کی طرف آ گیا۔ اس نے روح اور مادہ۔ آتما اور پراکرتی۔ دین اور دنیا۔ مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اسکی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ یا وہ تانا رہیں اور یا بانا۔ وہ ثَوْبُ (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں۔ قرآن کریم نے آ کر کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کی زندگی تانا ہی تانا ہے۔ اس میں بانے کی بھی ضرورت ہے۔ تانے اور بانے کے امتزاج سے ثَوْبُ بنیگا۔ (ثَوَابٌ اور ثَوْبُ کا مادہ ایک ہی ہے۔ دیکھئے ث - و - ب) لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ وہ یونہی شتر بے مہار نہیں

کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہ ہو۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی کڑی گرفت ہے۔ وہ اس کے احاطے سے باہر نہیں جا سکتا۔

لہذا صحیح زندگی دین اور دنیا کے تانے اور بانے سے خدا کے مقرر کردہ ڈیزائن کے مطابق کپڑا بننے میں ہے۔ یہی ثواب کا کام ہے۔ تنہا عقل انسانی کبھی کامیابی تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ صرف تانا ہی تانا رہتی ہے۔ جب اس سے وحی الہی کی روشنی میں کام لیا جائے تو پھر اس سے صحیح تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اب دوسرے معنوں پر غور کیجئے۔ یعنی اونٹوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ دینا۔ خدا نے انسان کو اس طرح شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا۔ اس کی راہ نمائی کے لئے اپنی طرف سے وحی کا ضابطہ بھیجا ہے۔ لہذا، اس کی زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ اُس ضابطہ کے مطابق چلے۔ اگر یہ اس کے مطابق نہیں چلے گا تو اس کی کوششیں بیکار چلی جائیں گی۔ کائنات میں، انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی یہ حالت ہے کہ ان کے لئے جو قوانین خدا نے بنائے ہیں، وہ ان پر چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ اسی کو ان اشیاء کی فطرت (یا جبلت) کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کے لئے بھی قوانین بنائے ہیں لیکن اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان قوانین کے خلاف جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرے۔ وہ ان قوانین کی پرواہ کرے یا نہ کرے، اس کے اعمال کے نتائج بہر حال ان قوانین کے مطابق مرتب ہونگے۔ وہ اس باب میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

س ر ب

السَّارِبُ - چرنے والا اونٹ۔ - ویشی اور چوپائے۔ السَّارِبُ - بہتا پانی۔ السَّارِبَةُ - راستہ۔ جانے کی جگہ۔ السَّارِبُ - زمین میں آزادی سے اپنی مرضی پر چلا جانے والا*۔ سورۃ رعد میں ہے سَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۳) دن میں چلنے والا*۔ سورۃ کہف میں ہے فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸)۔ اس (مچھلی) نے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔ اس نے دریا کی راہ لی۔ اس لفظ میں کھلم کھلا آزادی سے چلنے کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ ازہری نے کہا ہے سَرَبَتِ الْاِبِلُ کے معنی ہیں اونٹوں کا کھلم کھلا جدھر

چاہے آزادی سے چلے جانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں وسعت و کشادگی اور زمین پر چلنے کا مفہوم ہے۔ السَّرَبُ اور السَّرَبُ اس پانی کو کہتے ہیں جو مشکوں وغیرہ سے بہ نکلتے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ٹپکنے والا پانی۔

سَرَابٌ۔ وہ چمکتی ہوئی ریت جو صحرا میں بہتے پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور جوں جوں پیاسا اسکی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا*۔ قرآن کریم نے غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سَرَابٌ سے تشبیہ دی ہے۔ (۲۳/۳۹)۔ وہ دور سے، بہتے ہوئے پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں (بڑے دلفریب اور خوشنما نظر آتے ہیں)۔ لیکن جب پیاسا ان کے پاس آتا ہے تو وہ اسکی تسکین کا سامان بننے کی بجائے الٹا ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ السَّرَبُ نشیب کی طرف جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز نشیبی جگہ کے لئے بھی**۔ اس میں بھی آزادی سے چلنے کا پہلو موجود ہے، کیونکہ نشیب کی طرف پانی بلا رکاوٹ بہے جاتا ہے۔

س ر ب ل

سَرَابِيْلٌ (جمع۔ اس کا واحد سِرْبَالٌ ہے)۔ کرتہ۔ یا زرہ یا ہر وہ لباس جو (بدن کے بالائی حصہ میں) پہنا جائے۔ مثلاً قمیص***۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معنی میں آیا ہے۔ وَجَعَلْ لَّكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (۱۶/۸۱) اس نے تمہارے لئے پوشاک بنائی جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتی ہے اور زرہیں بنائیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ سورة ابراہیم میں سرکش مخالفین اسلام کے متعلق آیا ہے کہ جب ان کی قوتیں ٹوٹ جائیں گی تو سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطْرِ اَنْ (۱۴/۵)۔ ان کی زرہیں تارکول کی بن جائیں گی۔ یعنی وہ زرہیں جو انہیں دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے تھیں تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر وبالِ جان بن جائیں گی۔

س ر ج

السِّرَاجُ۔ چراغ کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو روشنی دے*۔ (بعض کے نزدیک یہ درحقیقت فارسی لفظ چراغ کا معرب ہے)۔ السِّرَاجُ۔

*تاج و راغب - **راغب - ***تاج و محیط۔

آفتاب کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے جَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا (۲۵/۶۱)۔ بمعنی سورج۔ اور سورۃ نوح میں ہے وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا (۱۰۱/۶۱)۔ سورج کو چراغ بنایا۔ خود نبی اکرمؐ کو بھی میراجاً مُنِيرًا (۳۳/۳۶) کہا گیا ہے۔ السِّرْجُ - زین - السِّرَّاجُ - زین ساز۔ نیز بہت جھوٹ بولنے والا *۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن، زینت اور جمال کے ہوتے ہیں۔ چراغ کو السِّرَّاجُ اسکی روشنی اور خوبصورتی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ زین کو بھی السِّرْجُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے جانور کی زینت ہوتی ہے۔ سَرَّاجٌ وَجْهَةٌ۔ اس نے اپنے چہرے کو حسین بنایا۔

س ر ح

السَّرْحُ - التَّسْرِیْحُ - جانوروں کو صبح کے وقت چراگاہ میں چرنے کیلئے کھلا چھوڑ دینا **۔ (حِیْنَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۱)۔ سَرَّاحٌ اور تَسْرِیْحٌ کے معنی ہیں قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا۔ طلاق دے کر رخصت کر دینا **۔ وَأُسْرٌ حُكْنٌ سَرَّاحًا جَمِیْلًا (۳۳/۲۸)۔ ”اور تمہیں حسن کا رانہ انداز سے رخصت کر دوں،“۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ امْسَاکٌ (روک رکھنے) کے مقابلہ میں آیا ہے۔ فَامْسَاکٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِیْحٌ بِإِحْسَانٍ (۲۲۹-۲۳۱)۔ یعنی قاعدے کے مطابق (نکاح کے ذریعے) روک رکھنا یا قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا۔ طلاق دیکر رخصت کر دینا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے اور چل پڑنے کے ہوتے ہیں۔

س ر د

السُّرْدُ - چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جوڑتے چلے جانا (ابن فارس)۔ جیسے زرہ کے حلقوں کو ایک دوسرے میں داخل کرتے ہیں۔ چنانچہ زرہ بنانے اور جوڑنے یا دوسرے چمڑے کے سینے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ السُّرْدُ - سوراخ - الْمِیْسْرَدُ - سوراخ کرنے کا اوزار۔ السِّرِیْدَةُ - چمڑے کا تسمہ جس سے جوڑتے وغیرہ کو سیا جائے **۔

قرآن کریم میں زرہ بنانے کیلئے وَقَدِّرْ رُّفِی السُّرْدِ (۳۳/۱۱) آیا ہے۔ یعنی اسکا اندازہ رکھو کہ سوراخ بالکل ٹھیک ہوں اور ان میں زرہ کی کڑیاں درست آتی جائیں۔

س ر ر ق

السَّرَادِقُ - وہ شامیانہ یا سائباں جو گھر کے صحن کے اوپر کھینچ دیا جائے۔ یا ہر وہ دیوار، قنات یا اور ایسی ہی چیز جو کسی چیز کے گرد گرد کھینچ دی جائے اور وہ اسے اپنے احاطہ میں لے لے۔ اسی بنا پر، اس دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جو بلند ہو کر کسی جگہ چھا جائے اور اس طرح اسے گھیر لے*۔ ابن فارس نے السَّرَادِقُ کے معنی غبار بتائے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہے جو معرب بنا لیا گیا ہے**۔

قرآن کریم میں ہے نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (۱۸)۔ جہنم کی آگ جس کے سائباں انہیں چاروں طرف سے گھیر لینگے۔ جہنم ان پر چاروں طرف سے محیط ہو جائیگی۔

س ر ر

السِّرُّ - جو بات دل میں چھپائی جائے*۔ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں لیکن کبھی اس کے معنی اس کی ضد (یعنی ظاہر کرنے) کے بھی ہوتے ہیں***۔ السَّرُّورُ وَالْحَبُّورُ وَالْفَرَحُ - ملتے جلتے الفاظ ہیں لیکن السَّرُّورُ اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل ہی دل میں پوشیدہ رہے اور الْحَبُّورُ اُس خوشی کے لئے آتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہو جائیں۔ یہ دونوں قابل تعریف صفات ہیں، مگر فَرَحٌ اس خوشی کو کہتے ہیں جس سے انسان میں اکڑفون پیدا ہو جائے۔ اس لئے یہ مذموم ہوتی ہے****۔ سَرَّهٌ - اسے خوش کیا (۲۹) مَسْرُورٌ - خوش (۸۳-۹۰)۔

السِّرُّ - ہر چیز کی اصل و بنیاد۔ نیز اس کا خالص حصہ، اندرونی مغز۔ اس لئے عمدہ زمین کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ سَرَارَةُ الْوَادِي - وادی کا بہترین حصہ۔ الْمَسَرَّةُ - پھولوں کا تختہ۔ السَّرَّاءُ - آسودگی و خوش حالی۔ عیش و عشرت کی فراوانی*۔ بِمَقَابِلِ الضَّرَّاءِ (۹۵)۔ السَّرَّاءُ يَتَّهِنُ - وہ لوندی جس سے جنسی تعلقات قائم کئے جائیں۔ السَّرَّاءُ - حکومت و سلطنت۔ تخت۔ پلنگ*۔ کیونکہ یہ آسودہ حال لوگوں ہی کے پاس ہوتا ہے۔

سورة انعام میں سِرٌّ بِمَقَابِلِ جَهَنَّمَ آیا ہے (۶)۔ لہذا وہاں سِرٌّ کے معنی محض راز ہیں۔ سورة بقرہ میں مَا يُسِيرُونَ وَمَا يَعْمَلُونَ (۲) آیا ہے۔ وہاں بھی اس کے معنی پوشیدہ طور پر باتیں کرنے کے ہیں۔

سورة ابراهيم میں ہے وَيُخْفِيهِمْ فَيُقْبِلُ مِنْهُمُ سِرًّا وَعَلَانِيَةً (۱۴/۱)۔ خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، خواہ وہ ان کی غیر مرئی صلاحیتیں ہوں اور خواہ وہ سامان زندگی جو سامنے نظر آ جاتا ہے، وہ ان سب کو نوع انسان کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ (یسا اس کا مطلب ہوگا) اعلان کرتے ہوئے اور خاموشی سے۔ سورة طہ میں ہے يَعْلَمُ السِّرَّ وَآخِطِي (۲۰/۲)۔ وہ راز کو بھی جانتا ہے اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو بھی۔

سورة يونس میں ہے وَاسْرُّوا السَّدَامَةَ (۱۰/۵۳)۔ وہ (عذاب کو دیکھ کر) ندامت کو چھپائینگے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ یہ اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر چھپانے کے معنی زیادہ موزوں ہیں۔

سُرُرٌ کا لفظ تختوں کے لئے آیا ہے جن پر بیٹھتے ہیں (۱۵/۳)۔ اس کا واحد سَرِيرٌ ہوتا ہے۔ اور سَرَائِرٌ کے معنی ہوتے ہیں راز کی باتیں۔ (۸۶/۹) اس کا واحد سَرِيرَةٌ ہوتا ہے۔ اسرارٌ۔ راز کی بات کرنا۔ دوسروں سے چھپا کر خفیہ بات کرنا (۳۶/۳)۔

س ر ع

السَّرْعُ۔ السَّرْعُ۔ السَّرْعَةُ۔ تیز ہونا۔ جلد واقع ہونا۔ تیزی، جلدی۔ سَرْعٌ۔ وہ تیز ہوا۔ اس نے جلدی کی۔ السَّرْعَانُ مِّنَ الْخَيْلِ۔ آگے نکل جانے والے گھوڑے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جلدی کرنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آتا ہے اللہ سَرِيعٌ الْحِسَابِ (۲۰/۲) ”اللہ جلد حساب لینے والا ہے“۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل اسی وقت اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے اس اثر اور نتیجہ کا ظہور ایک خاص وقت پر جا کر ہوتا ہے۔ جیسے بیج میں نشو و نما تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہ درخت ایک وقت کے بعد جا کر بنتا ہے اور اس میں پھل بھی ایک وقت کے بعد جا کر لگتا ہے۔ عمل کا فوراً اثر مرتب کرنے لگنا، قانون مکافات کے سَرِيعٌ الْحِسَابِ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان کی ذات اُسی وقت متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قطعاً دیر نہیں لگتی۔

سورة ق میں سِرَاعًا (۵۰/۳۴) آیا ہے۔ جس کے معنی تیزی سے (واقع ہو جانے کے) ہیں۔ سَارِعٌ - مُسَارِعَةً و سِرَاعًا - جلدی کرنا۔ ایک دوسرے سے سبقت کرنا۔ و سَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ (۱۳۲/۳۳)۔ ”حفاظت کی طرف (جانے میں) جلدی کرو،“۔

س ر ف

السَّرَفُ - جو حد مقرر کی گئی ہو اس سے آگے بڑھ جانا۔ زیادتی کرنا*۔ نادانی کرنا (ابن فارس)۔ سورة بنی اسرائیل میں ہے۔ فَلَا يُسْرِفُ فِي الْقَتْلِ (۱۶۰/۱۳۳)۔ وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی قانون نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہے۔ یا وہ نادانی سے از خود ہی قاتل کو قتل نہ کر دے۔ بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کرے۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنصُورًا سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ سورة الفرقان میں انفاق کے ضمن میں یہ لفظ قَتَرَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵/۶۷)۔ قَتَرَ - بخل اور خرچ میں تنگی کو کہتے ہیں۔ لہذا اسراف، تفریط کے مقابلہ میں افراط ہوگی۔ یعنی جس مقام پر جس قدر ضرورت ہو وہاں اس سے زیادہ خرچ کر دینا۔ اس لئے کہتے ہیں سَرَفَتْ اَلَامٌ وَلَدَهَا۔ ماں نے اپنے بچے کو بہت زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کر دی*۔ اس سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو۔ چنانچہ سَرَفَتْ اَلْمَاعِر۔ اُس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر اس طرح بہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ بیکار چلا جائے*۔ اسی لئے کسی چیز کو اس مقام میں نہ رکھنا جس کے لئے وہ بنی ہے اسراف کہلاتا ہے۔ اور ایسا کرنے والے کو مُسْرِفٌ کہا جاتا ہے۔ قوم لوط کو اسی لئے قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ (۸۱/۸۱) کہا گیا ہے، کیونکہ وہ افزائشِ نسل کے سادہ کو اس جگہ (لواطت میں) صرف کرتے تھے جس کے لئے وہ بنا نہیں اور اس طرح سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ پانی کھیتوں (حَرْثٌ) کو سیراب کرنے کے بجائے دوسری جگہ ضائع ہو جاتا تھا۔ زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو بھی مُسْرِفِينَ کہا ہے (۲۶۱/۱۵۱)۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اسراف، صرف بیجا (فضول خرچی) ہی کو نہیں کہتے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ انسانی توانائی، وقت، دولت یا کسی اور صلاحیت کا ایسے مقصد کے لئے نہ خرچ کرنا جس سے تعمیری نتیجہ مرتب ہو، بلکہ اسے تخریبی مقصد کے لئے یا بے فائدہ ضائع کر دینا۔ (اسراف اور تبذیر کے فرق کے لئے ب۔ ذ۔ ر کا عنوان بھی دیکھئے)۔

س ر ق

سَرَقَة* - کسی دوسرے آدمی کی محفوظ چیز کو خفیہ طریقہ سے لے لینا۔ اگر اسے کھلے بندوں سے لیا جائے تو یہ عمل اخْتِلَاسٌ* - اسْتِیْلَابٌ* اِنْتِهَابٌ* کہلائیگا۔ اور اگر مالک اپنی چیز کی حفاظت کے لئے مدافعت کرے لیکن پھر بھی وہ چیز اس سے بزور لے لی جائے تو اسے غَصَبٌ* کہینگے*۔ سَرَقَ الشَّيْءُ* - چیز مخفی ہو گئی۔ هُوَ يَسَارِقُ النَّظَرَ إِلَيْهِ* - وہ اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اِنْ سَرَقَ عَنْهُمْ* - چپکے سے کھسک جانا*۔

سورة يوسف میں ہے اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ (۱۲/۸۱)۔ ”تیرے بیٹے نے چوری کی ہے“۔ اَلْسِقَارِقُ* - (۵۸/۳۸) چوری کرنے والا۔ اِسْتَرَقَ السَّمْعَ* - چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا* (۱۵/۱۸)۔ اسی کو (۳۰/۱۰) میں خَطِيفَتِ الْخَطِيفَةِ کہا گیا ہے۔ یعنی اڑتی ہوئی بات کو اچک لینا۔ (ذرا سی بات کہیں سن پانا اور اس پر قیاس آرائیوں کی عمارت تعمیر کر دینا)۔ (سَارِقٌ* کی سزا قَطْعِ يَدٍ (۵۸/۳۸) کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع)۔

س ر م د

اَلسَّرْمَدُ* - دائم۔ وہ ہمیشہ رہنے والی چیز جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ لَيْلٌ سَرْمَدٌ* - طویل رات۔ رازی نے کہا ہے کہ سَرْمَدٌ* کا اشتقاق سَرْدٌ* سے ہوا ہے جسکے معنی پے در پے اور لگاتار کے ہیں۔ اس پر میم داخل کر کے مبالغہ کا فائدہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے اسکے معنی مسلسل اور لگاتار رہنے والی مدت کے ہونگے**۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلسَّرْمَدِيٌّ* اس چیز کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر***۔

قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ جَعَلَ اللهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا (۲۸/۲۸)۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ، اگر اللہ تم پر رات کو بہت طویل کر دے**۔ یا رات ہی رات رہے اور دن نہ آئے۔

س ری (و)

اَلسُّرَى* - رات کے بیشتر حصے میں چلنا۔ سَرَى* - يَسُرَى*۔ سُرَى* - رات کو چلنا۔ اَسُرَى* - اِسْرَاءٌ* - رات کو چلنا۔ اَلسَّرِيَّةُ*۔

* تاج و محیط - ** تاج و راغب - *** محیط۔

فوج کا دستہ ، کیونکہ وہ رات کو چلتا ہے تاکہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے*۔ اَلْسَرِّیُّ - چھوٹی نہر جو نخلستان کی طرف جاتی ہو***۔ سورۃ مریم میں ہے تَحْتَکِ سَرِّیَّا (۱۹)۔ تیرے نشیب کی طرف ایک پانی کی نہر ہے۔ سَرَّآةٌ - ہر چیز کا بلند حصہ۔ وسیع زمین۔

راغب نیز صاحب محیط نے لکھا ہے کہ سُبْحَانُ الَّذِیْ اَسْرٰی بَعْبُدْہ (۱۶) میں اَسْرٰی کا لفظ سَرِّی اَسْرٰی (رات کے وقت چلنا) سے نہیں بلکہ سَرَّآةٌ سے ہے۔ یعنی خدا اپنے بندے کو سَرَّآةٌ (کشادہ زمین کی طرف لے گیا) جیسے اَجْبَلْ کے معنی ہوتے ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا۔ اور اَتَّهَمَ کے معنی ، وہ تہامہ میں چلا گیا***۔ مکہ کی سرزمین حضورؐ (اور آپ کی جماعت) پر تنگ ہو چکی تھی اس لئے آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی جہاں کی فضا آپ کے مشن کے لئے وسیع اور کشادہ تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سَرِّی - یَسْرٰی ہی سے ہے اور لَیْلًا تاکید مزید کے لئے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے ہجرت رات کے وقت فرمائی تھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مردانگی و سخاوت کے معنوں میں (س۔ ر۔ ی) اور (س۔ ر۔ و) دونوں سے آتا ہے۔ نیز اَلْسَرُّو کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ سَرَّآةُ السَّنْهَارِ - دن کی بلندی کو کہتے ہیں۔

س ط ح

اَلسَّطْحُ - گھر کی چھت جو ہموار ہو۔ ہر چیز کا اوپر کا حصہ۔ سَطَحٌ - یَسْطَحُ - اسنے بچھا دیا۔ پھیلا دیا نیز ہموار کیا، لیٹا دیا۔ بچھاڑ دیا۔ اَلْمَسْطَحُ - ہموار جگہ جس پر کھجوریں خشک کی جاتی ہیں****۔ قرآن کریم میں ہے وَ اِلٰی الْاَرْضِ کَیْفَ سَطَحَتْ (۲۰)۔ زمین، کہ وہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔ اس کی اوپر کی سطح کس طرح ہموار بنائی گئی ہے۔

س ط ر

سَطْرٌ - یَسْطُرُ - سَطْرًا (میدھی لائنوں میں) لکھنا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کے صف بند ہونے کے ہیں۔ جیسے کتاب کی سطور اور درختوں کی لائن۔ اسی سے اس کے معنی لکھنے کے آتے ہیں۔ ن۔ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸)۔ ن (جسے عام طور پر

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب و محیط۔ **** تاج و راغب۔

دوات سمجھا جاتا ہے) اور قلم اور جو کچھ لکھنے والے لکھتے ہیں (یعنی قرآن کریم اور وہ تمام سرمایہ علم جسے انسان لکھ کر محفوظ کر لیتا ہے) اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کَانَ ذَالِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُورًا (۱۷۸)۔ یعنی لکھا ہوا۔ یہی معنی مَسْطَطَر کے ہیں (۵۳/۵۳)۔ اَلَا مَسَاطِیْرُ (اُسْطُورۃ کی جمع ہے) قصے کہانیاں *۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ لغت روم ہے یعنی، Story)۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ تاریخی شواہد پر غور کرو اور سوچو کہ جس قسم کے کام تم کرتے ہو، جن قوموں نے اس قسم کے کام کئے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلٰیْنَ (۲۵/۲۵)۔ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ ان سے کہا یہ جارہا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر بھی اسی طرح صادق آئیگا جس طرح اقوام سابقہ پر صادق آیا تھا۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے۔ قرآن کریم نے قانون مکافات عمل کے ضمن میں جو کچھ اپنے اولین مخاطبین کے متعلق کہا ہے، جب ان سے اُس کا ذکر کرو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کے متعلق ہے۔ یہ عیسائیوں کے متعلق ہے۔ یہ مشرکین مکہ کے متعلق ہے۔ یہ منافقین مدینہ کے متعلق۔ یعنی ان کے نزدیک سارے کا سارا قرآن انہی لوگوں سے متعلق تھا جو اُس وقت اس کے مخاطب تھے۔ اب ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم سے اگر اس کا کوئی حصہ متعلق ہے تو صرف وہ جس میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ جنت جو ان کے خیال میں محض مسلمان کہلانے سے مل جائیگی!)۔

چونکہ قصے کہانیاں عام طور پر جھوٹی ہوتی ہیں اسلئے سَطَر۔ تَسْطِیْرًا کے معنی ہیں جھوٹی باتیں جمع کرنا *۔ نیز چونکہ سَطَر سیدھی لکیر کو کہتے ہیں اسلئے اَلْسَطَر کے معنی تلوار سے سیدھی کاٹ کاٹنے کے بھی آتے ہیں۔ اَلْسَاطِیْر۔ چھری کو کہتے ہیں *۔

سَیْطَرَعَلٰیہ کے معنی ہیں کسی کے سر پر سطر کی طرح سیدھے کھڑے رہنا۔ اسی سے اَلْمُسَیْطِر ہے جس کے معنی نگران۔ محافظ۔ مسلط۔ داروغہ کے آتے ہیں **۔ قرآن کریم میں ہے لَسْتُ عَلٰیہِم بِمُصِیْطِرٍ (۲۲/۲۲) یا اَمْ هُمْ الْمُصِیْطِرُوْنَ (۵۲/۵۲)۔ اس کے معنی مَسْلَطُوْنَ کے ہیں۔ یعنی جو کسی پر مسلط ہوں۔

قرآن کریم میں اسے صَاد سے لکھتے لیکن سین سے پڑھتے ہیں۔ جو سین، طاء سے پہلے آئے اسے س اور صَاد دونوں سے لکھنا جائز ہے *۔

س ط و

سَطَاعَتِيْهِ وَبِهِ - سَطُوْا وَسَطُوْةً - کسی پر حملہ کرنا یا سخت گرفت کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا - راغب نے کہا ہے کہ کسی پر ہاتھ اٹھا کر حملہ کرنے کو سَطُوْةٌ کہتے ہیں - دراصل یہ سَطَا الْفَرَسُ سے ماخوذ ہے جسکے معنی ہیں گھوڑے کا اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر پیچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونا* - قرآن کریم میں ہے يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ (۲۲/۲۲) - قریب ہے کہ وہ ان پر حملہ کر دیں - ان پر دست درازی کریں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قہر و غلبہ اور بلندی کے ہوتے ہیں - سَطَا الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہت بڑھ گیا -

س ع د

سَعَدَهُ اللهُ - يَسْعِدُهُ - سَعِدًا - اللہ نے اس کی مدد کی اور اسے توفیق دی - سَعِدَ - يَسْعِدُ - سَعِدًا - سَعَادَةٌ - وہ مبارک اور با برکت ہوا - لَا سَعَادَ - الْمُسَاعَدَةُ - معاونت کرنا - مدد دینا - فراء نے اس کے معنی بندہ کا اپنے رب کے حکم اور مرضی کی متابعت کرنا بتائے ہیں - أَلَسَعِيدُ - کہنی سے پہنچے تک ہاتھ کا حصہ - (ساری قوت اور برکت اسی میں ہوتی ہے) - اسی سے الْمُسَاعَدَةُ کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا ہیں - یہ اس لئے کہ جب لوگ کسی کام میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں* -

قرآن کریم میں سَعِيْدٌ، شَقِيْیٌ کے مقابلہ میں آیا ہے - وَ مِنْهُمْ شَقِيْیٌ وَ سَعِيْدٌ (۱۱/۱۵) نیز شَقِيْیٌ، سَعِيْدٌ کے مقابلہ میں (۱۰۸-۱۰۶) - یعنی سعید وہ ہے جسے قانون خداوندی کی رفاقت نصیب ہو جائے اور وہ اس کی کلائی پکڑ کر چلے - اور شَقِيْیٌ وہ ہے جو اس سے محروم ہو - اس سے بڑا بد قسمت اور کون ہو سکتا ہے جسے قانون خداوندی کی تائید نصیب نہ ہو -

راغب نے أَلَسَعِيدُ وَالسَّعَادَةُ کے معنی امور الہی کا، بھلائی اور خیر تک پہنچنے میں، انسان کی مدد کرنا لکھے ہیں - ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز سعد ہے اور فلاں نحس، فلاں دن سعد ہے اور فلاں نحس - یہ محض توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا - کوئی

چیز یا کوئی دن نہ سعد ہے نہ نحس۔ جس کام کا نتیجہ (قانون خداوندی کے مطابق) اچھا ہے، وہ عمل سعد ہے۔ اور جس دن اس کام کا اچھا نتیجہ سامنے آئے وہ دن مسعود ہے۔ اسی طرح جس کام کا نتیجہ (قانون مکافات کی رو سے) مضر ہو وہ عمل منجوس ہے، اور جس دن وہ نتیجہ سامنے آئے وہ دن نحس۔ دنوں (ہفتہ۔ اتوار۔ سوموار وغیرہ) کی اپنی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ یہ تو ہم نے اپنی سہولت کی خاطر، وقت (Time) کے گز پر گرہیں لگا رکھی ہیں تاکہ حساب میں آسانی رہے۔ نہ ہی ستاروں میں کوئی سعد یا نحس ہے۔ ستارے، قوانین خداوندی کے مطابق گردش کرتے ہیں۔ ان کی گردش کا انسان کی ”قسمت“ سے کیا تعلق؟ اقبال کے الفاظ میں

تیرے مقام کو انجم شناس کیا سمجھے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

(مزید تفصیل ن۔ ح۔ س کے عنوان میں ملیگی)۔

س ع ر

السَّعْرُ۔ آگ کی حرارت۔ تپش۔ نیز بھوک۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ سَعْرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو کسی کو پھونک ڈالے۔ فراء نے اس کے معنی کوفت، مشقت اور سخت تکلیف کے کئے ہیں۔ سَعْرٌ نَاهُمْ بِالنَّجْلِ۔ ہم نے انہیں تیر مار مار کر بھون کر رکھ دیا*۔ مَسْعُورٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جسے سخت بھوک اور پیاس لگی ہو*۔ نیز جو پیٹ بھرا ہونے کے باوجود کھانے کا حریص ہو۔ جس کی نیت نہ بھرے**۔ السَّعَارُ۔ آگ کی حرارت اور سخت بھوک کو بھی کہتے ہیں۔ السَّعِيرُ۔ آگ۔ بھڑکتی ہوئی آگ*۔

سورة نساء میں ہے إِنَّ الَّذِينَ يَسَاءُ كَلُّونَ أَمْوَالِ الْيَتَامَى ظُلْمًا لَّنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا۔ وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (۱۰)۔ ”جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں۔ اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہونگے“۔ موت کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، یہ وہاں کی بات ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ شدتِ حرص سے ان کی نیت ہی نہیں بھرتی اور وہ مفت کے مال کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں۔ چنانچہ سَعْرٌ اور سَعْرٌ کے معنی دیوانگی کے بھی آتے ہیں*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مشتعل ہونے، بھڑک جانے اور بلند ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے سَعَرَ اور سَعَرَ النَّارَ وَالْجَرَبَ کے معنی ہیں آگ اور جنگ کو بھڑکا دینا*۔ وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِرَتْ (۸۱)۔ ”اور جب دوزخ بھڑکائی جائیگی“۔ اس میں عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جس قدر کسی کے جرائم زیادہ سنگین اسی قدر ان کے نتائج زیادہ تباہ کن۔

س ع ی

سَعَى کے معنی قصد و ارادہ کرنے، تیز چلنے، کے ہیں۔ کسی کام کے لئے اہتمام، دوڑ دھوپ اور کوشش کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ جانے یا دوڑنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد اِلٰی آتا ہے۔ جیسے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ۔ اور جب یہ کام کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد لام آتا ہے۔ جیسے سَعَى لَهَا**۔ اَلْسَاعِي کوشش کرنے والا۔ نیز صدقات وصول کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ دوڑنے کے معنوں میں (۲۰) میں آیا ہے نیز (۲۰) میں۔ کوشش اور محنت کرنے کے معنوں میں (۱۹) میں۔ یعنی دوڑ دھوپ۔ جد و جہد۔ تگ و تاز۔ سعی و عمل وغیرہ۔

قرآن کریم میں ایک آیت ہے لَيْسَ لِإِنْسَانٍ إِلَّا مَسْعَى (۵۳) ”انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ سعی و کوشش کرے“۔ یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ معاشیات (Economics) کی دنیا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کو صرف محنت (Labour) کا معاوضہ لینا چاہئے۔ سرمایہ (Capital) کا معاوضہ، یا یونہی بغیر محنت۔ کچھ لے لینا، جائز نہیں۔ اس اصول پر معاشیات کا جو نظام تعمیر ہوتا ہے اس کا اندازہ اہل بصیرت لگا سکتے ہیں۔

معاشرت اور تمدن کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہئے، نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے۔

”مذہب“ کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ نجات و سعادت، صرف انسان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ کسی کی سفارش سے نہیں مل

* تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

سکتی۔ نیز اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ عقیدہ کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ یا پچھلے جنم کے جرائم کی پاداش میں مبتلا ہوتا ہے، باطل ہے۔ انسان سفید لوح (Clean Slate) لے کر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ سعی و عمل کرے اسی قدر وہ زندگی کی خوشگوار یوں کا اہل بن جاتا ہے۔

نیز اس اصول نے سیاست کی دنیا میں یہ کہہ دیا کہ ہر انسانی بچے کو سعی و عمل کا یکساں میدان ملنا چاہئے۔ اس باب میں نہ کسی کو رعایات ملنی چاہئیں اور نہ ہی کسی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنی چاہئیں۔ آپ نے دیکھا کہ یہ اصول کس قدر عظیم انقلاب کا منشور ہے؟

س غ ب

سَغَبٌ - يَسْغُبُ - وَسْغِبُ - يَسْغُبُ - سَغْبًا - وَسْغَبَةً -
تھکن کے ساتھ بھوکا ہونا۔ (راغب نے پیاس کا اضافہ بھی کیا ہے) ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بھوک بتائے ہیں اور الْمَسْغَبَةُ کے معنی قحط۔ قرآن کریم نے کہا ہے اَطْعَمَ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ (۹۰/۱۴) ”ایسے وقت میں انسانوں کی خوراک کا انتظام کرنا جب بھوک اور مشقت عام ہو رہی ہو“۔ قرآن کریم نے اس پروگرام (نظام) کو پہاڑی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (۹۰/۱۴)۔ فی الحقیقت یہ چیز کہ انسان محنت اور مشقت سے کمائے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے فقط اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی ماندہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کر دے، بالخصوص ایسے زمانے میں جب چاروں طرف بھوک ہی بھوک نظر آ رہی ہو، مِّنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ہے۔ اسی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے۔ اسی کو نظام ربوبیت کا قیام کہتے ہیں۔ (سورۃ البلد کی یہ آیات)۔ (۹۰/۱۶)۔ نظام ربوبیت کے سلسلہ میں عظیم حقائق کی مظہر ہیں۔ ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ (تفصیل میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔

س ف ح

سَفَّحَ الدَّمُ - اس نے خون بہایا۔ خون گرایا۔ سَفَّحَ الدَّمَاعَ - اس نے آنسو بہائے۔ سَفَّحَ الدَّمَاعَ - آنسو بہہ پڑے (لازم و متعدی)۔ اس سے

الْمُسَافِحَةِ کے معنی زنا کرنے کے آتے ہیں ، کیونکہ اس میں مادہ منویہ کو یونہی ضائع کر کے بہا دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ جاہلیت میں جب لوگ کسی عورت کو شادی کا پیغام دیتے تھے تو ان کے حیثیتی کہتے تھے اور جب زنا کے لئے پیغام دیتے تھے تو سَافِحِیْنِی کہتے تھے ۔ اَلْسَافِیْحُ - جوئے کے تیروں میں سے چوتھا تیر جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ ہوتا تھا ۔ نہ ہی اس پر کوئی تاوان دینا پڑتا تھا ۔ یہ بلا نتیجہ رہتا تھا* ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے سلسلہ میں پہلے ان عورتوں کی فہرست دی ہے جن سے نکاح حرام ہے ۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ اس تعلق کی شکل مُحْصِنِیْنِ غَیْرَ مُسَافِحِیْنِ (۳۳) ہو ۔ مُحْصِنِیْنِ کا مفہوم (ح - ص - ن) کے عنوان میں بیان ہو چکا ہے ۔ پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔ مُسَافِحِیْنِ کے معنی ہونگے ، مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے ۔ اس سے قرآن کریم ایک عجیب حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ نکاح اور زنا کے جنسی تعلق میں فرق کیا ہے ۔ شہوانی لذت تو دونوں میں ہوتی ہے لیکن اول الذکر صورت میں یہ لذت مقصود بالذات نہیں ہوتی ۔ مقصود افزائش نسل ہوتا ہے ۔ لیکن زنا میں لذت مقصود بالذات ہوتی ہے اور زنا کار (مرد اور عورت دونوں) کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ استقرار حمل نہ ہو ۔ یہ معنی ہیں ”مادہ منویہ کو بہا دینے کی خاطر“ ۔ لہذا جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں انسان نکاح کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرے ۔ انہیں (Avoid) کرے ۔ اور مقصود محض جذبہ شہوانی کی تسکین ہو ، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں قرار پاسکتی ۔

اسی سورۃ میں اگلی آیت میں قرآن کریم نے مُحْصِنَاتٍ غَیْرَ مُسَافِحَاتٍ وَ لَا مُتَخِذَاتٍ أَخْدَانٍ (۳۵) کہا ہے ۔ اخدان کے لئے دیکھئے عنوان (خ - د - ن) ۔ مطلب اس سے چھپی آشنائی ہے ۔ (اگرچہ یہ لفظ اس زمانے کی لونڈیوں کے سلسلہ میں آیا ہے لیکن اطلاق اس کا عام ہے) ۔ ان تین اصطلاحات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا ۔

(i) مُحْصِنَاتٍ - جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں نکاح کی تمام حدود و قیود ، حقوق و فرائض ، غرض و غایت کو ملحوظ رکھا جائے ۔

(ii) اَلْسِفَاحُ - وہ جنسی اختلاط جس میں مَحْضَمِیْن کی شکل نہ ہو ، خواہ کوئی معاشرہ اسے اپنے ہاں معروف (Recognised) ہی قرار کیوں نہ دے لے ۔ اور

(iii) اِتَّخَذَ اَخْذَان - اختلاط کی وہ شکل جو اس معاشرہ میں بھی معروف نہ ہو ۔

قرآن کریم کی رو سے صرف شکل (i) جائز ہے ۔

س ف ر

اَلسَّفَرُ - کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے پردہ اٹھا کر اسے واضح اور بے نقاب کر دینا ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلسَّفَرُ کسی چیز کے ظاہری حصہ کے واضح کر دینے کو کہتے ہیں اور اَلْفَسْرُ (جس سے تفسیر ہے) کے معنی ہیں کسی چیز کے اندرونی حصہ کو کھول کر واضح کر دینا * ۔ بہر حال اس کے بنیادی معنی بے نقاب کرنا ، واضح اور روشن کرنا ہیں ۔ سَفَرَتِ الْمَرْأَةُ - عورت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے ۔ چھٹ جانے اور صاف ہو جانے کے ہیں ۔

اسی جہت سے اَلسَّفَرُ کے معنی ہوتے ہیں جھاڑو دینا ۔ اَلْمِسْفَرَةُ - جھاڑو کو کہتے ہیں ۔ نیز سَفَر کے معنی پراگندہ کر دینا ہیں ، جیسے سَفَرَتِ الرِّيحُ الْغَيْمَ - ہوا نے بادلوں کو منتشر کر دیا ۔ اسی سے اَلسَّافِرُ - سفر کرنے والے (مسافر) کو کہتے ہیں ۔ اَلسَّفَرَةُ - مسافر کا کھانا جو سفر کیلئے تیار کیا جائے ۔ اس کے بعد اسکا اطلاق توشہ دان پر ہونے لگا ۔ اور پھر دسترخوان کو بھی سَفَرَةُ کہنے لگے ** ۔

سَفِيرٌ - قوم کے درمیان صلح کرنے والے ** ۔ اس اعتبار سے کہ وہ دونوں فریقوں کے دل کی بات کو باہر نکال کر معاملہ کو صاف کرا دیتا ہے ۔ اَلسَّفَارَةُ وَالسَّفَارَةُ - قوم کے درمیان اصلاح یا صلح کی کوشش کرنا ** ۔ اَلسَّفَرُ - بڑی کتاب یا وہ کتاب جو حقائق کو روشن کرتی ہے ۔ اسکی جمع اَسْفَارٌ ہے (۱۲) سَفَرُ الْكِتَابِ سَفَرٌ - کتاب کو لکھا ** ۔ سَافِرٌ - لکھنے والا (اسکی جمع ہے اَلسَّفَرَةُ) ۔ اَسْفَرُ الصَّبْحُ - صبح روشن ہوئی ۔

قرآن کریم میں ہے وَالصُّبْحِ إِذَا اسْفَرَّ (۳۳/۴)۔ ”جب صبح اچھی طرح روشن ہو جائے“۔ دوسری جگہ ہے وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۸/۸)۔ ”کچھ چہرے اس دن تابناک ہونگے“۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے يَا يَدِيْ سَفَرَةٌ (۱۵/۸)۔ ”لکھنے والوں کے ہاتھوں میں“۔ سورۃ بقرہ میں عَلٰی سَفَرٍ (۲/۱۸۳) آیا ہے۔ یعنی حالت سفر میں۔

س ف ع

سَفَّحٌ۔ کے معنی ہیں پکڑ کر کھینچنا۔ جھلسا دینا۔ داغ لگانا۔ نشان لگانا۔ نیز تھپڑ مارنے کو بھی کہتے ہیں۔ سَفَّحَ بِنَاصِيَّتِهِ وَبِرَّ جُلِيهِ۔ اسے پیشانی کے بال یا ٹانگ پکڑ کر کھینچا*۔ قرآن کریم میں ہے لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۶۱/۱۵)۔ ہم بالضرور اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔ سختی سے گھسیٹیں گے۔ یعنی یہ بڑے بڑے مخالفین آخر الامر ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہو جائیں گے اور شکست کھا جائیں گے۔ ذلت کے لحاظ سے السَّفْعَةُ اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو کہتے ہیں جو کھنڈروں میں پڑا رہتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ سیاہی مائل رنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے*۔ راغب نے سَفَّحٌ کے معنی گھوڑے کی پیشانی کے سیاہ بال پکڑنے کے لکھے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) رنگ (سیاہی مائل) اور (۲) ہاتھ سے کسی چیز کو پکڑ لینا۔

س ف ک

سَفَّكَ۔ بہانا، عموماً خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے**۔ السَّفَّكَ۔ بہت زیادہ خون بہانے والا۔ نیز قادر الکلام آدمی کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں يَسْفِكُ السُّدْرَ مَاءً (۲۰/۳) آیا ہے۔ یعنی خونریزی کریگا۔

س ف ل

السَّفْلُ۔ (س کی زیر اور پیش سے) پستی۔ یہ عِلْوٌ اور عُلُوٌّ (بلندی) کی ضد ہے۔ اَلْاَسْفَلُ۔ بہت نیچے۔ یہ اَعْلٰی کی نقیض ہے۔ سِفْلَةُ النَّاسِ۔ کمینے لوگ۔ نیچے درجے کے لوگ*۔ نیز عرب السَّفْلَةَ خاص طور پر اُس آدمی کو بھی کہتے تھے جسے کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ میزبان کے ہاں سے کچھ چرا کر لیجائے***۔

قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق کہا ہے جَعَلْنٰهَا عَالِيَةً سَافِلَةً (۱۱/۸۳)۔ اس کے اوپر کے طبقے کو نیچے کا طبقہ بنا دیا۔ تمہو بالا

کر دیا منافقین کے متعلق ہے کہ وہ فی الدَّرْکِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۱۳۵)۔
 ”جہنم کے سب سے نیچے حصہ“ میں رہتے ہیں۔ قلبی اضطراب کی بدترین
 حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی یہ حالت ہے اور مرنے
 کے بعد بھی وہ بدترین عذاب میں ہونگے۔ فَوْقُ کے مقابلہ میں اَسْفَلُ
 (۱۳۶) میں آیا ہے۔ اَسْفَلُ سَافِلِیْنِ (۹۵)۔ پست سے پست تر۔ ذلیل ترین۔

س ف ن

سَفَنَ الشَّشِیَّ - یَسْفِنُهُ سَفْنًا۔ کسی چیز کو چھیلنا یا اوپر سے گھس
 دینا۔ سَفِیْنَةُ اسی سے مشتق ہے۔ اس کے معنی کشتی کے ہیں۔ (شاید اس
 لئے کہ شروع میں کشتیاں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ درخت کے بہت
 بڑے تنے کو چھیل چھیل کر اسمیں بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے تھے۔ یا پھر اس
 لئے کہ جب وہ چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی کو چھیلتی پھاڑتی
 جا رہی ہے۔ سَفَائِنُ الْبَرِّ۔ اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ریگستانی کشتیاں) *۔
 قرآن کریم میں ہے رَکِبْنَا فِي السَّفِیْنَةِ (۱۸)۔ وہ دونوں کشتی
 میں سوار ہوئے۔ آمَّا السَّفِیْنَةُ (۱۸)۔ باقی رہا اس کشتی (کا معاملہ)

س ف لا

سَفَہ کے معنی ہیں عقل کا ہلکا پن، نادانی، جہالت۔ سَفِیْہَہ کسی
 کو بیوقوفی اور جہالت پر آمادہ کرنا۔ کسی کو ہلاک کر دینا۔ سَفِیْہَہ
 الشَّرَّابِ سَفِیْہًا۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی پانی تو بہت پیئے لیکن
 اسکی پیاس نہ بجھے۔ ثَوْبٌ سَفِیْہٌ۔ جھرے اور خراب بنے ہوئے کپڑے کو
 کہتے ہیں۔ لیکن اس مسادہ کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے بھی
 ہیں۔ (جو کم عقلی کی علامت ہوتی ہے)۔ اس لئے زِمَامٌ سَفِیْہٌ اس مہار
 کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے ہلتے رہنے کی وجہ سے مضطرب رہے۔ حرکت
 و اضطراب اور تلون کی بنا پر ناپختگی عقل و رائے کو سَفَاہَہ کہتے ہیں **۔
 حرکت و اضطراب، نیز ناپختگی عقل کی بنا پر قرآن کریم نے ان لوگوں
 کو سَفَہَاءُ کہا ہے جن کے دل نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔
 جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ منافقانہ انداز
 سے دورخی چالیں چلتے ہیں (۱۳۰-۱۳۱)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے
 ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ ان جیسا بے عقل ہی کوئی نہیں کیونکہ
 یہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کا شعور و احساس نہیں رکھتے (۱۲)۔

دوسری جگہ سَفِيْہٌ کا لفظ عام کم عقل لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے (۲۸۲) اور (۱۳۱) میں سَفَہًا کے ساتھ بِغَيْرِ عِلْمٍ کے اضافہ نے بتا دیا کہ سَفَاہَتٌ یہ ہے کہ انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ قرآن کریم کی رو سے سَفَاہَتٌ (علم و عقل سے کام نہ لینا) بہت بڑا جرم اور سخت مذموم حرکت ہے۔ مومن وہ ہے جو وحی خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے۔

سَفَاہَتٌ (۶۶) - حماقت - بیوقوفی - جہالت -

سورۃ بقرہ میں ہے وَمَنْ يَّسَّرْ غَیْبٌ وَعَنْ مَّیْلَتِ اِبْرٰہِیْمَ الْاِسْمٰنِ سَفِیْہَ نَفْسِہٖ (۱۳۰)۔ ملت ابراہیمی سے اس شخص کے سوا کون بے اعتنائی برت سکتا ہے جس نے اپنی ذات کے بارے میں کبھی غور و فکر سے کام نہ نہ لیا ہو۔ جس نے یہ سوچا ہی نہ ہو کہ ذات کی نشوونما کیسے ہو سکتی ہے اور یہ کیوں ضروری ہے؟ محیط نے اس کے معنی اپنے نفس کو ذلیل کرنا اور حقیر و بے وقعت سمجھنا کئے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو درخور اعتنا نہ سمجھنا۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسک، انسانی ذات پر یقین اور اس کے بلند ترین قدر ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جائے، یا اسے (Seriously) نہ لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ (تفصیل اسی اجمال کی (ن۔ ف۔ س) کے عنوان میں ملیگی)

س ق ر

السَّقَرُ - آفتاب کی گرمی اور اس کی اذیت۔ سَقَرَتْہُ الشَّمْسُ - دھوپ نے اسے پگھلا دیا۔ جھلسا دیا اور اس کے دماغ کو تکلیف پہنچائی۔ السَّاقُورُ اس لوہے کو کہتے ہیں جسے تپا کر اس سے جانوروں کو داغ دیتے ہیں۔ نیز السَّقَرُ کے معنی بُعد اور دور ہونے کے بھی ہیں*۔
قرآن کریم میں یہ لفظ جہنم کیلئے آیا ہے۔ ذُو قُوَامَسٍ سَقَرٌ (۵۴)۔ سَقَر کے ان تھپیڑوں کا مزہ چکھو جو تمہیں زندگی کی خوشگوار یوں سے دور (محروم) کر دیتے ہیں۔

س ق ط

سَقَطَ الشَّیْءُ - کسی چیز کا گر جانا۔ خواہ (مثلاً) کوئی چھت سے زمین پر آگرے یا کھڑے کھڑے زمین پر گر جائے**۔ سَاقِطَہ چیز کو

لگاتار گرانا *۔ قرآن کریم میں ہے وَمَاتَسْقُطُ مِّنْ وَرَقَةٍ (۷۹)۔ کوئی پتہ نہیں گرتا۔ سورۃ مریم میں ہے تَسْقِطُ عَلَیْكَ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹)۔ وہ درخت تجھ پر تازہ کچھوئیں لگاتار جھاڑ دیگا۔ سورۃ شعراء میں ہے فَاسْقِطْ عَلَیْنَا (۲۶)۔ ہم پر گرا دے۔ ساقِطاً۔ گرنے والا (۵۲)۔

سورۃ اعراف میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَلَمَّا سَقِطَ فِيْ اَیْدِیْهِمْ (۱۳۹)۔ صاحب تاج نے اس کے معنی لکھے ہیں شرمندہ اور متحیر ہونا۔ زجاج نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں اپنے کئے پر حسرت اور شرمندگی کے احساس کا پیدا ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ندامت سے ہاتھ ملنے کے ہیں *۔ صاحب محیط نے بھی اس کے معنی ندامت ہی کے لکھے ہیں۔ اور یہی معنی قرآن کریم میں بھی واضح ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی غلطی اور حماقت کے احساس سے ندامت اور پشیمانی۔ آیت کے معنی ہونگے ”جب وہ پشیمان ہوئے“۔

س ق ف

السَّقْفُ۔ چھت (جمع سَقَفٌ)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلند ہونے اور جھکا ہوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ السَّقْفُ قِیْفَةٌ۔ ہر وہ جگہ جس پر چھت ہو۔ بالعموم باہر نکلے ہوئے چھپر کو کہتے ہیں۔ عرب آسمان کو بھی سَقْفٌ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کے خیال میں وہ زمین کی چھت ہے **۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا (۲۱)۔ ”ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا“۔ یعنی فضائے کائنات خود محفوظ ہے اور اس کا سلسلہ کچھ اس طرح رکھا گیا ہے کہ اجرام فلکی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے وہ بالعموم فضا کے چکر میں آکر پس جاتی ہے اور اس طرح ہم اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گویا یہ فضا ہمارے ارضی مکان کے لئے چھت کا کام دیتی ہے۔ ویسے، آسمان کو سَقْف کہنے میں عربی محاورہ کی بھی رعایت ہے۔ یعنی عرب اسے چھت سے تعبیر کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم نے بھی ان کے محاورہ کی رعایت سے اس کے لئے وہی لفظ استعمال کیا۔ معنی اس کے اس طرح کی چھت نہیں جس طرح مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔ سماء کے معنی بھی یہ نیلگوں ”چھت“ نہیں جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ اس سے مراد بلند فضا یا اجرام فلکی ہیں۔ تفصیل (س۔ م۔ و) کے عنوان میں ملیگی۔

س ق م

السَّتَمُ - السَّتَمُ - مرض - بیماری - هُوَ سَقِيمٌ الصَّدْرُ عَلَيْهِ - وہ اس کے خلاف دل میں کینہ رکھتا ہے - قَلْبٌ سَقِيمٌ - ناخوش اور بیزار دل کو کہتے ہیں * -

حضرت ابراہیمؑ کی قوم بت پرست اور ستارہ پرست تھی - حضرت ابراہیمؑ ان کے اس شرک کے خلاف انہیں دعوت توحید دیتے تھے - چنانچہ اس ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَنَنْظُرْ نَظْرَةً فِي النَّجْمِ - فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ (۳۸/۸۸) - انہوں نے ستاروں کے معبود ہونے پر غور و فکر کیا - اس کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ میں تمہارے ان معبودانِ باطل سے سخت بیزار ہوں - یہ وہی بات ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ إِنَّا بَرَاءٌ لِّمَنكُمُ وَمِيعَاتِ الْعِبَادِ وَنَدْوُ اللَّهِ (۶۱/۶۱) - میں تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو ان سے بیزار ہوں * - اسی کو دوسرے مقام پر لَا أُحِبُّ إِلَّا فِلِيزْنَ (۶۱/۶۱) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی میں ایسے معبودوں کو پسند نہیں کرتا جو ہر آن تغشیر پذیر ہوں -

س ق ی

السَّقْيُ - پلانا - السَّقْيَا - اس سے اسم ہے جس کے معنی ہیں ”پلائی“ - السَّقْيُ وَالْإِسْقَاءُ - تقریباً ایک ہی معنی ہیں - بعض کا خیال ہے کہ سَقْيٌ منہ کے ذریعے پلانے کو اور إِسْقَاءٌ پانی دے دینے یا پانی بتانے کے لئے بولا جاتا ہے - راغب کے نزدیک سَقْيٌ تو یہ ہے کہ کسی کو پینے کی چیز دے دینا اور پلا دینا، اور إِسْقَاءٌ یہ ہے کہ تم کسی کو پینے کی چیز دیدو خواہ وہ اسے پئے یا نہ پئے - اس لئے إِسْقَاءٌ میں سَقْيٌ سے زیادہ جامعیت ہے - السَّقْيَايَةُ - پانی پلانے کی جگہ - یا پانی پلانے کا برتن (۱۲/۱۲) - یا پانی پلانے کا بندوبست - جیسے (۹/۹) میں - آ لَا سَتَسْقَاءُ پینے کے لئے پانی مانگنا یا بارش طلب کرنا - السَّقْيُ - موسلا دھار برسنے والا بادل ** -

سورة بقرہ میں اسْتَسْقَى آيا ہے (۲/۲) جس کے معنی پانی یا بارش طلب کرنے کے ہیں - سورة شعراء میں هُوَ الَّذِي هُوَ يَطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي (۲۶/۲۶) - خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے - سورة نحل میں ہے

نَسْقِيَكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ (۱۶)۔ ”ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹ میں ہے (دودھ) پلاتے ہیں“۔ سورۃ شمس میں ناقہ حضرت صالحؑ کے متعلق ہے نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا (۹۱)۔ یعنی اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھو اور اس کے پانی پلانے کا۔ قصہ حضرت یوسفؑ میں سِقَايَةَ (۱۲) کا لفظ ایسے برتن کے لئے آیا ہے جسے صَوَاعٌ بھی کہا گیا ہے (۱۲)۔

س ک ب

سَكَبَ الْمَاءُ وَالْدَّمُ - اس نے پانی اور آنسوؤں کو بہایا۔ سَكَبَ الْمَاءُ - پانی بہا (لازم و متعدی)۔ مَاءٌ سَاكِبٌ وَ مَسَكُوبٌ - وہ پانی جو زمین کے اوپر بہ رہا ہو۔ جسے زمین کھود کر نہ نکالنا پڑے*۔ ارباب لغت نے اس کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے بھی کئے ہیں، اس لئے مَاءٌ مَسَكُوبٌ میں وہ پانی بھی آجاتا ہے جو آبشار کی طرح اوپر سے گرتا ہے۔ قرآن کریم میں مَاءٌ مَسَكُوبٌ (۵۱) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جنتی معاشرہ میں سامان زیست، جگر پاش مشقتوں کے بغیر ملیگا (وہاں پانی پینے کے لئے کنواں نہیں کھودنا پڑے گا)۔ لیکن غیر جنتی معاشرہ میں ان چیزوں کے لئے جگر پاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے (۲۰)۔

رَجُلٌ سَكَبٌ - سبک روح اور پر نشاط انسان کو کہتے ہیں**۔ فَرَسٌ سَكَبٌ تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔

س ک ت

السَّكَوْتُ - خاموش ہونا۔ نہ بولنا۔ سَكَوْتُ اور صَمْتُ میں فرق یہ ہے کہ سَكَوْتُ ان چیزوں کے خاموش ہونے پر بولا جاتا ہے جن میں بولنے کی قدرت ہوتی ہے اور صَمْتُ میں موخر الذکر شرط نہیں ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کی خاموشی پر بولا جاسکتا ہے خواہ وہ بولنے کی طاقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔۔ سَكَتَ الْغَضَبُ - غصہ ٹھنڈا پڑ گیا*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوسَى الْغَضَبُ (۱۵۳)۔ جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ راغب نے کہا ہے کہ سَكَوْتُ میں ایک گونہ سَكُونٌ پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے***۔

س ک ر

سُکَّرٌ - نشہ میں ہونا - راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے - بیشتر یہ اس قسم کی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو نشہ آور شراب سے پیدا ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی ایسی کیفیت غصہ اور عشق سے بھی پیدا ہو جاتی ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت کے ہوتے ہیں - سَکَرٌ - شراب - نشہ آور مشروب (۱۶) - سَکَرَةٌ - غنودگی - بے ہوشی - یہ بھی ایک نشہ کی سی کیفیت ہوتی ہے - قرآن کریم میں سَکَرَةُ الْمَوْتِ آیا ہے (۵۸) - یعنی موت کی بے ہوشی - سورة نساء میں ہے لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ أَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۳۳) - ”صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ جب کہ تم سکر کی حالت میں ہو“ - یہاں سُكَارَىٰ کے عام معنی حالت نشہ کے کئے جاتے ہیں - لیکن لسان العرب میں ہے کہ اس سے مراد سُکَرُ النَّوْمِ یعنی نیند کا غلبہ ہے - سورة حج میں سُکْرٰی کا لفظ ایسے مدہوش لوگوں کے لئے آیا ہے جو خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے اوسان کھوچکے ہوں - (۲۲) - اور (۱۵) میں وفور جذبات سے پیدا ہونے والی بدمستی کے لئے سَکَرَةٌ آیا ہے - السَّکَرُ - نہر کو بند کر دینا - سَکِرَتِ الرَّیْحُ - ہوا ساکن ہو گئی - الْمَاءُ السَّاکِرُ - ٹھہرا ہوا پانی - سَکَرَ الْبَابُ - دروازہ بند کر دیا* -

سَکَرَةٌ - اس کا گلا گھونٹ دیا - سورة حجر میں ہے سَکِرَتِ أَبْصَارُنَا (۱۵) - ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے - ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے -

سورة نساء کی مذکورہ صدر آیت کو پھر سامنے لائیں جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَ أَنْتُمْ سُكَارَىٰ - (سُكَارَىٰ جمع ہے سَکْرَانٌ اور سَکْرَانَةٌ کی - جب تم پر نیند کا غلبہ ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ - اس سے آگے ہے حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۳۳) - تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو - یعنی جس حالت میں تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس میں صلوٰۃ کا کچھ فائدہ نہیں - اس سے ظاہر ہے کہ اگر انسان صلوٰۃ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتا ہو تو اس صلوٰۃ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا - صلوٰۃ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ تم جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو - لہذا قرآن کریم کو بلا

سمجھے پڑھنا (خواہ وہ صلوة میں ہو یا ویسے ہی) کوئی فائدہ نہیں دیتا۔
قرآن کریم پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے
کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلا مطلب سمجھے، بعض الفاظ کو دہرانے سے یہ
سمجھنا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، عہد سحر (Magic Age) کی توہم
پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔

س ک ن

سُكُونٌ کے معنی ہیں، حرکت نہ رہنا۔ ٹھہر جانا*۔ سَكَنَ
سَكَنًا و سَكْنَى۔ بود و باش اختیار کرنے، رہائش کرنے کے لئے استعمال
ہوتا ہے**۔ راغب نے کہا ہے کہ سُكُونٌ کسی چیز کا حرکت کے بعد
ساکن ہو جانا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ کسی مقام کو وطن بنالینے یا کسی جگہ کو
گھر بنالینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلسَّكَنُ کشتی کے ہتوار
کو کہتے ہیں جس سے اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اَلسَّكِينُ (۱۲/۱)۔
چھری کو کہتے ہیں اس لئے کہ (راغب کے الفاظ میں) اس سے مذبوح کی
حرکت، سکون سے بدل دی جاتی ہے۔ مِيسْكِينٌ اُسے کہتے ہیں جس کی
حرکت کو فقر اور محتاجی نے کم کر دیا ہو۔ یہ فَقِيرٌ سے زیادہ محتاج
ہوتا ہے۔ نیز ذلیل اور کمزور کو بھی مِيسْكِينٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ
کہف میں کشتی والوں کو مَسَاكِينٌ کہا گیا ہے (۱۸/۱) کیونکہ وہ
بادشاہ کے استبداد کے مقابلہ میں کچھ نہیں کرسکتے تھے*۔ اَلْمَسْكِينَةُ۔
سیختی اور مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتی ہے***۔ نیز
فقر و ذلت اور کمزوری اور مسکینی کی حالت کو*۔

سَكْنَتُهُ تَسْكِينًا کے معنی ہیں میں نے اس کے اضطراب کو رفع
کر کے اس کے دل کو سکون دیدیا۔ یا اسے ثابت و ساکن کر دیا۔ جَعَلَ
الْثَّيْلَ سَكْنًا (۹/۶) کے معنی ہیں خدا نے رات کو ایسا بنایا جس میں
تمہیں سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لِّهَمِّ
(۱۰/۱) کے معنی ہیں تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہو جاتی ہے۔ ابن
فارس نے کہا ہے کہ اَلسَّكَنُ ہر محبوب چیز کو کہتے ہیں جس سے سکون
و قرار حاصل ہو جائے۔ اَلسَّكِينَةُ۔ اطمینان و سکون اور وقار کو بھی کہتے
ہیں۔ الرمانی نے اسے اَلتَّشَبُّتُ کا مرادف لکھا ہے***۔ یعنی جمعیت خاطر۔
اِسْتَسْكَنَ کے معنی ذلیل و کمزور ہو جانا ہیں*۔ (یہ دراصل (ک۔ و۔ ن)
سے ہے۔ (س۔ ک۔ ن) سے نہیں)۔

قرآن کریم میں یہ مادہ ، کسی جگہ بسنے کے معنی میں آیا ہے ۔ جیسے (۲/۳۵) میں (۱۳۵) میں وَهْنٌ - ضَعُفٌ اور اِسْتِكَانَةٌ - ہم معنی استعمال ہوئے ہیں لیکن جس ترتیب سے یہ الفاظ آئے ہیں (یعنی فَمَا وَهَنُوا... وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا) اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اِسْتِكَانَةٌ انتہائی کمزوری کے لئے آتا ہے ۔ (چونکہ اِسْتِكَانَت - ک - و - ن سے ہے ۔ اس لئے ہم نے اسے اس عنوان میں بھی لکھا ہے) ۔ مَسْكَنَةٌ کو خدا کا غضب قرار دیا گیا ہے (۲/۶۱) ۔ اس لئے کہ یہ اس جمود و تعطل کا نام ہے جس سے قوم ، زندگی اور حرکت سے محروم ہو جاتی ہے ۔ سورۃ توبہ میں فَقَرَاءٌ اور مَسَاكِينٌ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۹/۶۰) ۔ مسکین وہ ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے ۔ یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے ۔ قرآنی نظام میں کوئی مسکین اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا ۔ وہ ان چیزوں کو (بطور خیرات نہیں بلکہ) اپنے حق کے طور پر حاصل کرتا ہے ۔ سورۃ البلد میں يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۔ اَوْ مَسْكِيْنًا ذَا مَقْرَبَةٍ آیا ہے (۹۰-۹۱) ۔ یعنی وہ جو لوگوں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پائے ۔ اور جو ذرا کمزور ہو جانے پر ، معاشرہ کے ہاتھوں مٹی میں مل جائے ۔ غلط معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ جو ذرا نیچے گرا ، معاشرہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔ قرآنی معاشرہ گرتوں کو اٹھانے کے لئے قائم ہوتا ہے ۔

س ل ب

السَّلْبُ - کسی سے کوئی چیز زبردستی چھین لینا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کسی کو غافل پا کر اسکی چیز تیزی سے جھپٹا مار کر لینے کو کہتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو پھرتی سے لینے یا اچک لینے کے ہوتے ہیں ۔ السَّلْبُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا ہو ۔ شَجَرَةٌ سَلِيْبٌ - درخت جس کے پتے اور شاخیں سب جھڑ گئے ہوں ۔ السَّلِيْبُ - وہ عورت جس کا بچہ مر گیا ہو ۔ السَّلْبَةُ - ننگا ہونا ۔ بدن پر کپڑے کا نہ ہونا ** ۔

سورۃ حج میں ہے وَاِنْ يَسْأَلْهُمْ السَّدَبَاتُ شَيْئًا (۲۲/۲۳) ۔ اگر ان سے مکھی کوئی چیز جھپٹ کر لے جائے ۔

س ل ح

اَلِسْلَاحُ - اَلِسْلَاحُ - آلہ جنگ - یعنی ہر وہ چیز جس سے جنگ کی جائے یا وار کیا جائے - ہتھیار - نیز ہتھیار کا آہنی حصہ - تلوار یا تلوار کی دھار - کمان جس میں تانت نہ ہو - لاٹھی * - (جمع اَسْلِحَاتٌ) - وَلِيًّا خُذُوا اَسْلِحَتَهُمْ (۱۰۲) - ”چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں“ -
(سَلَحَ - يَسْلَحُ - پرندوں کے پیٹ کرنے کو بھی کہتے ہیں * - لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) -

س ل خ

سَلَخَ - يَسْلُخُ وَيَسْلَخُ - کسی جانور کی کھال کھینچ لینا - سَلَخَتِ الْحَيَّاتُ - سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی - اَلِسْلُخُ - سانپ کی کینچلی - سَلَخَتِ الْمَرْأَةُ دِرْعَهَا - عورت نے اپنی قمیص اتار دی ** - لہذا اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح الگ کر دینا کہ اس پر دوسری چیز کا نشان تک نہ رہے - چنانچہ قرآن کریم میں ہے اَللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (۳۶) - ہم دن کو رات میں سے اس طرح کھینچ لیتے ہیں (کہ رات میں دن کی روشنی کا ذرا سا نشان بھی نہیں رہتا) - اس لئے سَلَخَ الشَّهْرُ وَانْسَلَخَ کے معنی ہوتے ہیں مہینہ گزر گیا ** - (۱) اِنْسَلَخَ مِنْهُ - وہ کسی چیز کو چھوڑ کر، اتار کر اس سے خالی اور ننگا ہو گیا - سورة اعراف میں ایک شخص کی حالت کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اَتَيْنَاهُ اَيُّتَيْنَا فَاِنْسَلَخَ مِنْهُمَا (۱۷۵) - ہم نے اسے اپنے قوانین دیے اور وہ انہیں الگ چھوڑ کر اس طرح صاف نکل گیا جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے - یہ درحقیقت مسلمانوں ہی کی مثال ہے جنہیں اللہ نے قرآن کریم جیسا ضابطہ حیات دیا لیکن انہوں نے اسے اس طرح چھوڑ دیا کہ اس کا کوئی نشان تک بھی انکی ملٹی زندگی میں باقی نہ رہا - یہ اس میں سے صاف نکل گئے - انہوں نے اُسے کینچلی کی طرح اتار کر پھینک دیا - لیکن للہ الحمد کہ وہ (قرآن) اپنی اسی حالت میں صحیح و سلامت موجود ہے - اس لئے اُسے جب جی چاہے پھر اسی طرح اوڑھا جا سکتا ہے -

س ل س ل

اَلْسَلْسَلَةُ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ متصل کرنا - اَلْسَيْلَةُ - زنجیر - تَسْلَسِلُ الْمَاءُ - پانی حلق میں روانی سے اترتا

چلا گیا *۔ (سَلَّ کے معنی کسی چیز کو کھینچنے کے ہوتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (س۔ ل۔ ل)۔

قرآن کریم میں سِلْسِلَتِ (۶۹)۔ زنجیر کے لئے آیا ہے جس کی جمع سِلَّ سِلَّ ہے (۷۱)۔ زنجیر کا ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے ساتھ متصل چلا جاتا ہے اور اسی تسلسل سے وہ زنجیر بن جاتی ہے۔

س ل ط

السَّلَاطُ۔ السَّلَاطُ۔ سخت اور مضبوط۔ التَّسْلِيْطُ۔ غلب کر دینا۔ غلبہ اور اقتدار دیدینا۔ سَلَّطَهُ اللهُ عَلَيْهِ۔ خدا نے اسے اس پر غلبہ و تسلط عطا کر دیا۔ (۹۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور قوت کے ہوتے ہیں۔

سُلْطَانُ النَّارِ۔ آگ کا بھڑکنا **۔ السُّلْطَانُ۔ حجت، برہان **۔ دلیل، ثبوت، سند۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ سَلَّطُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زیتون کے تیل کے ہوتے ہیں جو روشن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہی حجت و برہان سُلْطَانُ کہلائیگا جو خود بھی روشن ہو اور بات کو بھی روشن کر دے **۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۱۵۶)۔ ”یا تمہارے پاس کوئی کھلی دلیل ہے“۔ لیکن السَّلَاطُ کے اعتبار سے اس کے معنی غلبہ و اقتدار۔ قوت اور طاقت کے بھی ہیں۔ ان معانی میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ ہم نے رسولوں کو بَيِّنٰتٌ، یعنی واضح دلائل، دیکر بھیجا (۱۲)۔ لیکن ان کے مخالفین نے یہ کہہ کر ان سے انکار کر دیا کہ جب تک تم ہم پر غالب نہ آجاؤ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ اس کے لئے سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۱۲) آیا ہے۔ یا مثلاً سورۃ حجر میں ہے کہ اللہ نے ابلیس سے کہہ دیا کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵)۔ میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہ لفظ ”مجاز قرار دینے“ کے معنوں میں بھی آیا ہے (۱۳) جس میں غلبہ کا مفہوم شامل ہے۔ سورۃ نساء میں ہے وَاَتَیْنَا مُوسٰی سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (۱۳)۔ یہاں بھی اس کے معنی غلبہ و اقتدار کے ہیں۔ سورۃ الحاقۃ میں بھی سُلْطٰنِیَّہُ اسی معنی میں آیا ہے (۶۹)۔ یعنی سلطانی (میرا سلطان) + ہ (وقف کی ہاء)۔

سورۃ رحمن میں ایک آیت ہے جو ایک عظیم الشان حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ بِمَعَشَرَ الْجِیْنِ وَالْاِنْسِ اِنْ اَسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفِذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَاَنْفِذُوْا۔ اے گروہ جن و انس!

اگر تم اسکی طاقت رکھتے ہو کہ ”اقطار السموات والارض“ سے آگے نکل جاؤ۔ تو جاؤ۔ ان سے آگے نکل جاؤ۔ (جن وانس کے معنی ہیں وحشی اور مہذب آبادیاں)۔ یہاں انسان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ اس مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکو تو جاؤ۔ اس سے آگے نکل جاؤ۔ اس سے آگے ہے۔ لَا تَنْفُذُوا وَلَا تَنْفُذُوا إِلَّا بِسُلْطَانٍ (۵۵)۔ تم سُلْطَان کے بغیر ان سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جسے سُلْطَان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُلْطَان اس قوت کا نام ہے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ [رسول اللہ کی زبان مبارک سے کہا گیا ہے وَأَجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (۱۰۸)] اور مجھے اپنے ہاں سے مدد دینے والی قوت عطا فرما دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی ”روحانی ترقی“ نہیں سمجھ لینسی چاہیئے جو انسان کو ارض و سما سے آگے لے جانا تو ایک طرف، اسے خود اس دنیا میں سربزیری اور زیر دستی سکھاتی ہے۔ اس سُلْطَان سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سرکچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام اقطار السموات والارض سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے۔ یا اس سے بھی آگے کیوں نہ نکل جائے، وہ اقطار السموات والارض کے اندر ہی رہیگا۔ ان حدود سے باہر، انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سلطان پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

س ل ف

سَلَفَ الْأَرْضَ وَ أَسْلَفَهَا - زمین میں ہل چلانا یا اسے ہموار کرنا۔
 سَلَفَ الشَّيْءُ - چیز گزر گئی۔ آگے بڑھ گئی۔ سَلَفَ فُلَانٌ - وہ آدمی پہلے گزر گیا۔ اَسْلَفَ اس نے آگے بھیجا، پیش کیا، اَلَسَّالِفُ -

پہلے گزر جانے والا - پیشرو* - السَّالِفَةُ - جنگ یا سفر میں آگے رہنے والے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہوتے ہیں -

سورة بقرہ میں ہے فَلَمَّا سَلَفَتْ (۲/۲۵) - جو پہلے لیا جا چکا ہے وہ اس کا ہے - سورة زخرف میں ہلاک شدہ قوموں کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا (۲۳/۵۶) - ہم نے انہیں پیشرو (یعنی پہلے گزر جانے والے) بنا دیا (جن کی داستانیں اب عبرت کے لئے باقی ہیں) - سورة الحاقة میں ہے بِمَآ أَسْلَفْتُمْ (۶۹/۲۳) - جو کچھ تم نے پہلے کیا -

س ل ق

السَّلَاقُ - اس مادہ کے بنیادی معنی بلند ہونے اور اوپر چڑھنے کے ہیں*** - تَسَلَّقَ الْجِدَارَ - وہ دیوار پر چڑھ گیا - تَسَلَّقَ عَلٰی فِرَاشِهِ وہ درد و غم کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اطمینان سے لیٹ نہ سکا - سَلَقَ فُلَانًا بِالسَّوْطِ - اس نے فلاں آدمی کی کسوڑوں سے کھال ادھیڑ دی - السَّلَاقَةُ - راستہ میں قدموں اور کھروں کے نشانات - پتلی اور باریک کی ہوئی روٹی - نیز طبیعت* - راغب نے لکھا ہے کہ السَّلَاقُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو زبردستی بچھا دینا - خواہ ہاتھ سے ہو خواہ زبان سے** - اور سَلَقَ فُلَانًا کے معنی ہوتے ہیں اس نے فلاں آدمی کے نیزہ مار دیا* - اسی نہج سے قرآن کریم میں ہے سَلَقُواكُمْ بِالسِّنَةِ (۳۳/۱۹) یہ لوگ تمہیں اپنی زبانوں کے طعن سے ایذا پہنچاتے ہیں - طعنوں کے تیر و نشتر مارتے ہیں - ان طعن آمیز باتوں سے تمہارے اوپر چڑھ دوڑنا چاہتے ہیں (یہی اس کے بنیادی معنی ہیں اگرچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے اس قدر مختلف معنی آتے ہیں کہ ان میں قدر مشترک متعین کرنا مشکل ہے) - لیکن ہمارے نزدیک اس مادہ میں تکلیف پہنچانے کا مفہوم غالب ہے -

س ل ک

سَلَكْتُ - اس مادہ کے اصل معنی ہوتے ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے اندر چلے جانا یا ڈال دینا - سَلَكْتُ يَدَهُ فِي الْجَيْبِ - اس نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کر لیا* - صاحب محیط نے خَيْطٌ، سَلَكْتُ اور سَمِطٌ کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ڈورا خواہ سینے کے کام آئے یا

ہار بنانے کے خَیْطٌ کہلاتا ہے ، لیکن وہ ڈورا جس میں موتی وغیرہ پروئے جاتے ہیں سِلْکُٹ کہلاتا ہے ، اور جس ڈورے میں موتی وغیرہ پروئے ہوئے موجود ہوں وہ سِیْمُطٌ کہلاتا ہے **۔ اَلْسَلُّوْکُٹ۔ راستہ میں گھس جانا ***۔ سِلْکَکَ۔ چلنا یا چلانا۔ داخل ہونا یا داخل کرنا۔ (لازم اور متعدی دونوں معنی آتے ہیں)۔ اَسْلَکَکَ۔ چلانا۔ داخل کرنا*۔

سورة حجر میں ہے کَذٰلِیْکَ نَسْلُکُکَہُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ (۱۵/۱۴)۔ اسی طرح ہم اسے مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں۔ سورة طہ میں ہے وَ سَلٰکَکَ لَکُمْ فِیْہَا مَبْلَاٌ (۲۵/۲۵)۔ اور تمہارے لئے اس (زمین) میں راستے چلائے۔ اور سورة نوح میں ہے لَیْتَسَلَّکُوْا مِنْہَا (۲۱/۲۱)۔ تاکہ تم اس میں چلو۔

س ل ل

اَلْسَلَّوْ۔ کسی چیز کو نرمی اور سہولت کے ساتھ نکال لینا۔ ابن فارس نے نرمی اور سہولت کے ساتھ چپکے سے خفیہ طور پر نکال لینے کا اضافہ کیا ہے۔ سَیْفٌ سَلِیْلٌ۔ نیام سے کھینچی ہوئی تلوار۔ اَلْسَلَّالَۃٌ۔ وہ حصہ جو کسی چیز سے نکالا جائے*۔ اَلْمَسْلُوْلٌ۔ نکالا ہوا۔ نیز وہ آدمی یا جانور جسے آختہ کر دیا گیا ہو**۔ قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے کہ اسے مَلَلٰتِ مِیْنٌ طِیْنٌ (۲۳/۱۴) سے پیدا کیا۔ یعنی وہ شے جو مٹی (جمادات۔ Inorganic Matter) سے بطور خلاصہ نکالی گئی ہو۔ اگر انسانی جسم کا تجزیہ کیا جائے تو وہ انہی جامد عناصر (مثل لوہا۔ چونا۔ فاسفورس وغیرہ) کا مرکب نظر آئے گا۔

اِنْسَلَّوْ تَسَلَّلَ۔ وہ چھپ کر چلا گیا۔ آہستہ سے کھسک گیا۔ اَلْسَلَّالَۃٌ۔ خفیہ طور پر چرانا۔ چوری۔ اَلْسَلَّالٌ۔ اَلْاَسَلٌ۔ چور کو کہتے ہیں*۔

سورة نور میں ہے اَلَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ (۲۴/۲۴)۔ جو تم میں سے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

س ل م

سَلَمٌ****۔ چونکہ یہی وہ مادہ ہے جس سے اِسْلَامٌ کا لفظ آیا ہے اس لئے اس کے بنیادی معانی کو غور سے سمجھ لینا چاہئے کیونکہ انہی معانی سے *تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔ ****اس عنوان کے تمام معانی تاج۔ محیط اور لین سے ماخوذ ہیں۔

اسلام کے مختلف گوشے واضح ہو جائیں گے۔

(۱) سَلِمَ کے بنیادی معنی ہیں وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہو گیا۔ اس کی ہر ایک کمی پوری ہو گئی۔ سَلَمَ الدَّلْوُ۔ اس نے ڈول کو پختگی کے ساتھ تیار کر دیا۔ سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے مَسَلَّمَةً لَا شَيْئَةَ فِيْهَا (۲/۱)۔ وہ جسمانی نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے۔ لہذا سَلِمَ کے بنیادی معنی ہیں اس طرح مکمل ہو جانا کہ پھر کوئی نقص اور کمی باقی نہ رہے۔ یعنی انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما اور تکمیل۔

(۲) اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی ہیں، ہر قسم کے آفات۔ خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں زیادہ معنی صحت اور عافیت سے متعلق ہیں۔ سَلِمَ مِّنَ الْآفَةِ سَلَامَةً۔ وہ آفت سے محفوظ رہا۔ سَلَّمَهُ اللهُ تَسْلِيْمًا۔ خدا نے اسے آفت سے محفوظ رکھا۔ قرآن کریم میں خدا کا ایک نام السَّلَامُ بھی آیا ہے (۵۹/۲۳) جس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے ”تمام عیوب و نقائص سے پاک“۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس کے یہ معنی کئے ہیں انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ سَلَامُ اُسے کہتے ہیں جس سے دوسری چیزیں سلامتی حاصل کریں اور سَالِمٌ وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے سلامتی حاصل کرے۔ یعنی وہ جس پر کوئی آفت آ سکتی ہو اور وہ اسکا متوقع بھی ہو لیکن اس سے محفوظ رہنا چاہے۔ لہذا خدا کا نام سَلَامُ اس لئے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال و انتشار سے محفوظ رکھا ہے اور اس کا نظام نہایت حفاظت و صیانت سے چل رہا ہے۔

لہذا سَلَامُ کے معنی ہیں آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنا۔ یہ اس مادہ کے دوسرے معنی ہوئے۔

(۳) السَّلَامُ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی بلندی تک پہنچنے کا قابل اعتماد اور محفوظ ذریعہ۔ لہذا اس مادہ کے تیسرے معنی ہیں وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت اعتماد اور حفاظت سے بلندیوں تک پہنچ جائے۔

(۴) السَّلَامُ کے معنی ہیں صلح اور صفائی کے ساتھ رہنے والا۔ السَّلَامُ کہتے ہی صلح کو ہیں۔ لہذا اس مادہ کے چوتھے معنی ہیں۔ خود بھی امن و سلامتی سے رہنا اور دنیا میں بھی امن و سلامتی قائم رکھنا۔ تَسَالَمَتِ الْخَيْلُ کے معنی ہوتے ہیں گھوڑوں کا ایک ساتھ چلنا (ہاؤں ملا کر اس طرح چلنا کہ ان میں کامل ہم آہنگی ہو) اور کسی گھوڑے کا ایسی حرکت

نہ کرنا جس سے دوسرے گھوڑے بدک جائیں یا مشتعل ہو جائیں۔ اس سے اسلامی معاشرہ کا صحیح صحیح تصور سامنے آجاتا ہے۔

(۵) اَللّٰی سَلِّمْ وَاَلَسَّلَامُ کے معنی ہیں اطاعت۔ انقیاد۔ سپردگی۔ جھک جانا۔ لہذا اس مادہ کے پانچویں بنیادی معنی ہوئے قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنا۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س۔ ل۔ م میں بنیادی طور پر نرمی اور انکسار کا پہلو مضمحل ہوتا ہے*۔

(۶) اِسْتَسْلَمَ تَكَمَّ الطَّرِيقَ کے معنی ہیں وہ راستہ کے درمیان میں چلا اور اس سے ادھر ادھر نہ ہوا۔ قَالُوا سَلَامًا کے معنی ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کوئی لغو بات نہیں کرتے۔ لہذا اس مادہ کے چھٹے معنی ہوئے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا۔

(۷) اِسْتَسْلَمَ الشَّرْعَ کے معنی ہیں کھیتی کی بسالیں نکل آئیں۔ لہذا اس مادہ کے ساتویں معنی ہیں کوششوں کا نتیجہ خیز ہونا۔

(۸) اور اَلسَّلَامَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے اعضاء نہایت نرم و نازک اور خوشنما ہوں۔ لہذا اس مادہ کے آٹھویں معنی ہوئے حسن و خوشنمائی۔

ان معانی سے ظاہر ہے کہ اَلسَّلَامُ اس نظام حیات کا نام ہے جس سے (۱) انسان کی تمام کمیاں پوری ہو جائیں اور اسکی صلاحیتیں پوری نشو و نما پالیں (۲) جس میں وہ زندگی کی تمام تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہے۔ اور (۳) اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ (۴) وہ خود اپنی ذات میں بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی سے رہے اور ساری دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کا موجب ہو۔ وہ سفر زندگی میں دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے چلے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے کوئی دوسرا مشتعل ہو اور اس طرح معاشرہ کا نظام خراب کر دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ (۵) انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے اور انکے سامنے اپنا سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھکا دے۔ اور یہ کچھ (۶) پورے پورے اعتدال اور توازن سے کرے۔ افراط و تفریط سے کام نہ لے۔ (۷) اس طرح اسکی کوششیں ثمر بار ہو جائیں گی اور اسکا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائیگا اور (۸) اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (توازن) پیدا ہو جائیگا اور پورے معاشرے میں بھی۔

یہ ہے وہ روش زندگی جس کے متعلق کہہ دیا کہ جو شخص اس روش کے خلاف کہوئی اور روش اختیار کریگا، تو وہ اس قسم کے نتائج قطعاً پیدا نہیں کر سکے گی اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائیگا (۳۸/۲)۔ یہ روش قرآن کریم کے اتباع کا دوسرا نام ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اتَّبَعَ الْهُدٰی (۲۰/۲)

قرآن کریم میں مُسْلِمٌ اور اس کے مشتقات اس کثرت سے آئے ہیں کہ اس مقام پر ان تمام کا درج کرنا مشکل ہے۔ لہذا ان میں سے جستہ جستہ مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مُسْلِمَةٌ لَا شَيْئَةَ فَيُّمَهَا (۲۱/۲) ”وہ ہر قسم کے نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے“۔ (۳۳/۲) میں اِذَا سَلَّمْتُمْ کے معنی ہیں جبکہ تم دے دو۔ سوئپ دو۔ حوالہ کر دو۔

سورة انفال میں ہے کہ تم آپس میں جھگڑنے لگ گئے تھے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۸/۳۳)۔ اللہ نے تمہیں اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھا۔ سورة الطور میں سَلَّمَ (۵۲/۳۸) کا لفظ بلند مقامات تک پہنچنے کے ذرائع کیلئے استعمال ہوا ہے۔

سورة انفال میں ہے وَ اِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ (۸/۶۱)۔ اس کے معنی صلح کے ہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری کیلئے یہ مادہ (مثلاً ۱۱۲/۲) میں آیا ہے۔

سورة روم میں ایمان اور اسلام کو الگ الگ بیان کیا ہے (۳۰/۳۰)۔ یعنی اِيْمَانٌ کے معنی ہیں کسی نصب العین کو صحیح مان لینا اور اِسْلَامٌ کا مطلب ہے اس پر پورے پورے طور پر کاربند ہو جانا۔ اس کے مقابلہ میں، وہ لوگ جو محض مطیع ہو کر اسلام لائے ہوں اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جا گزیں نہ ہو، ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مُسْلِمٌ ہیں، ابھی مُؤْمِنٌ نہیں ہوئے (۲۹/۲)۔ سورة النمل میں مسلمین کا لفظ اَلَّا تَعْلَمُوْا عَلٰی (۲۹/۲) کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی سرکشی اور حدود شکنی اختیار نہ کرنا۔ فرمان پزیر ہو جانا۔ سورة مریم میں لَفْظ (سَلَامٌ) لَغَوٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۱۹/۶)۔

ان خصوصیات کے حامل انسان کو صاحب قلب سلیم کہا گیا ہے (۲۶/۸)۔ اور ان صفات کی حامل قوم کو اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لِّاٰلِکَ (۲۸/۱۲۸) یعنی ایسی قوم جو احکامات الہی کا اتباع کرتی رہے۔ اس قوم کے ہر فرد کا فریضہ حیات یہ ہوگا کہ جس فرد سے اس کا معاملہ پڑے وہ اسے کہے سَلَامٌ عَلَیْکُمْ (۶۱/۲)۔ میں تمہارے لئے سَلَامٌ کی آرزو کرتا ہوں۔ یعنی

ان تمام سعادتوں اور خوشگوار یوں کی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور وہ بھی اس کے جواب میں اس آرزو کا اظہار کرے اور یوں ان کا سارا معاشرہ سَلَاماً سَلَاماً (۵۶) کی حیات بخش صداؤں سے گونج اٹھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔ حَنِيفاً مُسْلِماً تھے (۶۶) یہی وہ نام ہے جو دین خداوندی کے متبعین کے لئے اللہ نے تجویز کیا تھا۔ قرآن کریم سے پہلے بھی اور قرآن کریم کے بعد بھی (۲۲)۔ اپنے آپ کو فرقوں سے منسوب کرنا غیر اسلامی شعار ہے۔ اس لئے کہ فرقہ بندی شرک ہے (۳۲)۔ اور مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۶۶) اور کفر اور اسلام بھی ایک دوسرے کی ضد (۹)۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم کبھی مجرم نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے کہ أَفَنَجْعَلُ الْمُتَسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ (۶۸)۔ ”کیا ہم مسلمین کو مجرمین جیسا بنادینگے؟“۔ لہذا مسلم وہی ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔

الاسلام، وہ ضابطہ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی ضابطہ حیات خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ سورۃ آل عمران میں ہے أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ؟ کیا یہ لوگ، اللہ کے (متعین فرمودہ) ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالانکہ تمام اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۸۲) کائنات کی ہستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے، طوعاً و کرہاً سر بسجود ہیں اور وہ ہر قدم پر اس قانون کی طرف لوٹاتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (۸۳) جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کریگا اس سے وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا۔ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۸۳)۔ اور اس کا جی چاہے تو تجربہ کر کے دیکھ لے کہ وہ آخر کار ضرور نقصان اٹھائیگا۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے سابقہ کو ملتا رہا اور جو آخر الامر قرآن کریم میں آکر مکمل ہوا۔ اسی کو خدا نے تمام نوع انسان کے لئے منتخب کیا ہے (۵)۔ لہذا اب، اس آسمان کے نیچے، خدا کا تجویز کردہ ضابطہ حیات جسے اس نے الاسلام کہہ کر پکارا ہے، قرآن کریم سے باہر کہیں نہیں۔ اسی دین کے ماننے والوں کو مسلمین کہتے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو قرآن کریم کو خدا کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطہ حیات سمجھے۔

س ل و

سَلَوَىٰ - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلی دے - چنانچہ شہد کو بھی اَلَسَّلَوَىٰ کہتے ہیں* - اور گوشت کو بھی** - سَلَوَةٌ مِّنَ الْعَيْشِ - سہولت اور آرام کی زندگی کو کہتے ہیں جس میں غم و فکر نہ ہو** - سَلَاهُ عَنْهُ تَسْلِيَةً - اس نے اس کے غم کو بھلا دیا* - اَلَسَّيَالَىٰ - غم و فکر کو بھول جانے والا** - سَلَاهُ - وہ اس کی یاد کو بھول گیا - اس نے اس کے غم کو غلط کر لیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سہولت کی زندگی اور فراخی عیش کے ہوتے ہیں -

اَلَسَّلَوَىٰ - (۲/۵) - سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر کے مشابہ) جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا* - راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو*** - (نیز دیکھئے عنوان - م - ن - ن) -

سليمان عليه السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے۔ آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے (۳۸/۱) اور وارث (جانشین) تھے (۲۴/۱۶)۔ آپ کو علم اور قوت فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی (۲۴/۱۵)۔ اس لئے انہیں سطوتِ داؤدی کی وراثت محض ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مل گئی تھی، اگرچہ بنی اسرائیل میں بادشاہت وراثت میں مل جاتی تھی۔ شہروں کی مہذب آبادیاں اور وحشی قبائل (جن و انس) آپ کے لشکروں میں جمع رہتے تھے اور گھوڑوں کے رسالے ان پر مستزاد تھے (۲۴/۱۷)۔ حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بھی بڑا مشہور تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں (۲۱/۸)۔ یعنی وہ ان سے بادبانی کشتیوں کو چلاتے تھے۔ پہاڑی قبائل کے سرکش افراد مختلف کاموں پر مامور تھے (۲۱/۸۲)۔ وہ آپ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے۔ مجسمے تراشتے اور تصویریں بناتے تھے (۳۳/۱۲ - ۳۳/۱۳)۔ اس زمانے میں یمن کے مشرقی علاقہ پر قوم سبا کی حکومت تھی جو ستارہ پرست تھی۔ ایک ملکہ ان پر حکمران تھی۔ آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ بالآخر مطیع و فرمانبردار ہو گئی (۲۴/۳۳)۔ یہی لشکر وادی نمل میں سے گزرا تھا (۲۴/۱۸ - ۲۴/۱۹)۔ ہڈ ہڈ اسی لشکر میں ایک افسر تھا (۲۴/۳۱ - ۲۴/۳۲)۔ آپ اس شوکت و عظمت کے مالک تھے لیکن آپ کا جانشین کمزور ثابت ہوا (۳۳/۱۳)۔ تورات (سلاطین) میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

یہودیوں نے سحر و کہانت کے بہت سے لغو افسانے تراش کر آپ کی طرف منسوب کر رکھے تھے۔ خود تورات میں بھی اس قسم کی خرافات ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی ہے (۱۰۲)۔

س م د

سَمَدٌ - سَمُوْدًا - تکبر سے سر کو اٹھائے رکھنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رکے بغیر آگے بڑھتے چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ سَمَدَتِ الْاِلَیْلِ فِي سَيْرِهَا کے معنی ہیں اونٹ تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آگے بڑھتے گئے۔ اس سے اس کے معنی تکبر اور سر کشی کئے جاتے ہیں۔ نیز من مانی کرنے کے بھی۔ سَمَدٌ - يَسْمُدُ کے معنی ہیں، بلند ہونا۔ سَامِدٌ - حیرانی میں کھڑا رہ جانے والے کو بھی کہتے ہیں (شاید اس لئے کہ وہ بھی سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس کے معنی لہو و لعب میں مشغول آدمی کے ہیں جو اپنے فرائض سے غافل ہو جائے*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ کبھی فکر و حزن سے چہرے کے بگڑ جانے کو بھی اَلْسَمُوْدُ کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق ہے وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ وَأَنْتُمْ سَامِدُونَ - فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا (۶۲-۶۳)۔ تم ہنستے ہو۔ روتے نہیں ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اس سے بالکل بے خبر ہو کہ تمہارے اعمال کے نتائج کیا سامنے آنے والے ہیں۔ اس اعتبار سے سَامِدُونَ کے معنی غافل اور بے خبر کے آئینگے۔ لیکن اس کے بعد ہے فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سَامِدُونَ کے معنی یہ ہونگے کہ تم بہت متکبر اور سرکش ہو۔ من مانی کاروائیاں کرتے ہو۔ تم اس روش کو چھوڑو اور احکام خداوندی کے سامنے جھکو اور اس کی محکومیت اختیار کرو۔

س م ر

السَّمْرَةُ - گندمی رنگ - السَّمْرَاءُ - گیہوں - السَّمَرُ - رات - رات کی باتیں - رات میں قصے کہانیاں کہنا - السَّمِيرُ - شب میں قصہ گوئی کی محفل - نیز قصہ گو - (یہ جمع کے لئے بھی آجاتا ہے) (۲۳) - السَّمِيرُ - قصہ گو - داستان زن - السَّمِيرُ - رات کی قصہ گوئی کی محفل میں تمہارا شریک - سَمَارَةُ اللَّيْلِ - رات کو باتیں کرنا - سَمِيرٌ کے معنی زمانے کے بھی ہیں***۔

السَّامِرَةُ* - السَّامِرَةُ* - یہودیوں کی ایک قوم جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ نیز یہ چھوٹ چھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ السَّامِرَةُ* فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھو جانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں**۔ (۲۰/۹۷) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا، ایسا ہی کچھ آیا ہے۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا)۔ حضرت مسیحؑ سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سامیری کہہ کر پکارا ہے - ۲۰/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی (۲۰/۹۷)۔

لیکن اگر السَّامِرَةُ کی اصل سَمَرٌ ہے تو اس کے معنی داستان گو، یعنی قصے کہانیاں کہنے والے کے ہیں۔ ”کہانیاں کہنے والے“ جس طرح قوموں کو گمراہ اور برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر، قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو قعر مذلت میں گرتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری خیالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے نسامانوس شے قرار پا چکے ہیں۔

س م ع

السَّمْعُ - کان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان آوازوں کو محسوس کرتا ہے۔ سننے کو بھی، اور کبھی کبھی خود کان کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ نیز جو چیز سنی جائے اسے بھی سَمْعٌ کہہ دیتے ہیں۔ سَمِيعٌ کے معنی سننے والا اور سنانے والا دونوں آتے ہیں (اگرچہ بعض علمائے لغت نے دوسرے معنوں کی تردید کی ہے)۔ اِسْتَمَعَ إِلَيْهِ کے معنی ہیں کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ کان لگانا اور بغور سننا۔ لیکن قرآن کریم میں يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ (۱۲۲) سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایسے دکھائی دیں کہ وہ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں لیکن درحقیقت سن نہ رہے ہوں۔ انہیں وہ بہرا کہتا ہے۔ یعنی عقل سے کام نہ لینے والے۔ (۱۲۲)۔

اِسْمَعْ غَيْرَ مَسْمُوعٍ - (۳۶) اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ہماری بات سن، اگرچہ تیری بات سنی نہیں جائیگی۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ قول طنزاً بہرا ہو جانے کی بددعا کے لئے، اور بصورت دیگر دعا کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی کبھی سَمْعٌ کا اطلاق خود فہم و تدبیر پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی اَسْمَعْ کے معنی اَفْهَمْ (کسی کو سمجھا دینا) بھی آتے ہیں۔ نیز اس لفظ کا اطلاق اطاعت پر بھی کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اِسْمَعُونَ کے معنی اَطِيعُونَ ہوتے ہیں *۔ (۹۳)۔ سَمِعَ لَهُ کے معنی ہیں اس کی بات کو قبول کیا *۔

قرآن کریم نے حصول علم کے لئے سمع، بصر اور قلب کا ذکر کیا ہے۔ سماعت و بصارت ان حواس (Senses) کی ترجمان ہیں جنکے ذریعہ محسوس اشیاء کے متعلق معلومات ذہن انسانی تک پہنچتی ہیں۔ یعنی یہ علم محسوسات (Perceptual knowledge) کے ذرائع ہیں۔ ان ذرائع سے جو معلومات (Sense Data) قلب (Mind) تک پہنچتا ہے وہ اس سے تصورات (Concepts) متعین کرتا ہے۔ اس طرح سمع، بصر و قلب سے Conceptual knowledge حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کریم علم محسوسات اور علم تصورات پر بڑا زور دیتا ہے اور جو لوگ سمع و بصر و قلب ** سے کام نہیں لیتے انہیں جہنمی قرار دیتا ہے (۱۹)۔ لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو پھر اس کے ذرائع علم اسے صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچاتے (۱۶-۱۷)۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) غصہ میں انسان کس طرح اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے جذبات کا ہے۔

لالچ میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر ہر ہوشمند ہنستا ہے۔ اور تعصب میں انسان دوسرے کے نقطہ نگاہ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح نشے کی حالت میں حواس صحیح کام نہیں دے سکتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلَی سَمْعِہِمْ وَعَلَی أَبْصَارِہِمْ غِشَاوَةً^(۱) سے تعبیر کرتا ہے۔ آنکھوں پر پردے پڑ جانا۔ کانوں میں ڈاٹ لگ جانا۔ اور دلوں پر مہریں لگ جانا*۔ علم اُسی وقت صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے جب اس سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے۔ کیونکہ وحی کے ذریعہ وہ اصول زندگی ملتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی۔ انسان اپنے عقل و فہم سے جو اصول حیات بھی وضع کریگا وہ اس کے جذبات کی آمیزش سے خالی نہیں رہ سکتے۔

سَمَّاعٌ^(۲)۔ جاسوس کو بھی کہتے ہیں** (۱۰۰/۳)۔

سورۃ کہف میں ہے أَبْصِرْ بِہِمْ وَاسْمِعْ^(۱۸) کیا خوب اسکا دیکھنا اور کیا خوب اسکا سننا ہے۔

مُسْمِعٌ۔ سنانے والا (۳۵/۲۲)۔ مُسْتَمِعٌ^(۳)۔ سننے والا (۵۲/۳۸)۔

اِسْتَمَعَ۔ (چھپ کر) سننا (۴۲/۱)۔ کان لگا کر غور سے سننا (۲۰/۱۳)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلِاسْمَاعُ اور اَلِاسْمَاعُ۔ ذکر جمیل اور شہرت کو بھی کہتے ہیں۔

س م ک

اَلِاسْمَکُ۔ گھر کی بلندی یا چھت۔ قَدْ سَمَّکَہُ۔ اس نے اسکو بلند کر دیا***۔ اَلِاسْمَکُ۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو بلند کیا جائے۔ اَلْمِسمَکُ۔ لکڑی جو خیمہ میں لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اونچا رہے۔ اَلِاسْمَکُ۔ مچھلی کو کہتے ہیں**۔ (کیونکہ وہ درمیان سے سوئی اور اونچی ہوتی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعَ سَمَّکَہَا (۹۹/۲۸) خدا نے (آسمان کی) بلندی یا چھت کو اونچا کر دیا۔ فضائے سماوی کو بہت بلندی تک لے گیا۔ [Space] کی بلندی یا وسعت لامحدود ہے۔]

* دیکھئے عنوان خ - ت - م - ** تاج *** راغب -

س م م

السَّمَّاءُ - تنگ سوراخ - جیسے سوئی کا ناکہ - (سَمَّاءُ) - یا کان اور ناک کا سوراخ - نیز زہر کو بھی کہتے ہیں - سَمَّامٌ - جلد کے باریک سوراخ - السَّمَمُ - ہر ہلکی پھلکی اور تیز چیز - السَّمَمُومُ - تیز گرم ہوا (لُؤ) جو اکثر گرمی کے دنوں میں چلتی ہے * - قرآن کریم میں ہے فی السَّمَمُومِ وَحَمِيمٍ (۵۶/۲۲) - سورۃ حجر میں نَارِ السَّمَمُومِ (۱۵/۲۲) آیا ہے -

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں، کسی چیز میں داخل ہونے کی جگہ - وہ لکھتا ہے کہ زہر کو سَمَمٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدن میں گھس جاتا ہے، اور سَمَمُومُ گرم ہوا کو کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ تیزی کی وجہ سے بدن میں گھس جاتی ہے - راغب نے لکھا ہے کہ سَمَمٌ کے معنی ہیں اس میں گھس گیا، نیز سَمَمُومُ اس گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر کرتی ہے **۔

س م ن

سَمِينٌ - سَمَانَةٌ - وہ فربہ ہوا - موٹا تازہ ہوا - سَامِنٌ - سَمِينٌ - (جمع سیمان) فربہ * - قرآن کریم میں ہے بِقَرَاتٍ سِيمَانٍ (۱۲/۱۲) - موٹی گائیں - یا بَعِجْلٍ سَمِينٍ (۵۱/۳۱) - موٹا بچھڑا آسَمِنُ الْقَرْجُلُ - آدمی موٹا تازہ ہو گیا - سَمَنَّهُ - وآسَمَنَّهُ اسے موٹا کر دیا * - سورۃ غاشیہ میں جہنم کے کھانے کے متعلق ہے لَا يُسْمِنُ (۸۸/۸) - وہ موٹا نہیں کرتا - بدن کو بڑھاتا نہیں - ذلت و رسوائی کی روٹی سے فربہ کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ آلسَمْنُ - گھی کو کہتے ہیں جس کے کھانے سے انسان موٹا ہو جاتا ہے -

س م و

سَمَاءٌ (جمع سَمَوات) آسمان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین پر بلند اور سایہ فگن ہوتا ہے - نیز ہر اس چیز کو جو تمہارے اوپر چھائی ہوئی اور سایہ فگن ہو، سَمَاءٌ کہیں گے - چنانچہ گھر کی ہر چھت بھی سَمَاءٌ کہلاتی ہے - فقہ اللغة میں بھی سَمَاءٌ کی یہی تعریف کی گئی ہے - راغب نے کہا ہے کہ ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سَمَاءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے اَرْضٌ - نیز بادل اور بارش کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں - پودے اور سبزے کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے اونچا ہوتا ہے ***۔

اسْمُ کے معنے ہیں کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔
 پھر نِساَم کو بھی اسْمُ کہتے ہیں، اس کی جمع اَسْمَاءُ ہے۔ اس کا مادہ بھی
 س-م-و ہے۔ اس جہت سے کہ اسم سے مسمیٰ پہچانا جاتا ہے اور اسی سے اسے
 بلندی و عزت حاصل ہوتی ہے۔ سَمِیٌّ کے معنے ہمنام اور نظیر و ہم پلہ کے آتے
 ہیں۔ مَسَامَاةٌ کے معنے باہمی مفاخرت کے آتے ہیں*۔ سَمَتِی تَسْمِیَّةٌ۔
 نام رکھنا۔ اَلْمُسَمَّی کے معنے نام رکھا ہوا، بتایا ہوا، نامزد کیا ہوا۔
 نیز معین، مقرر اور معلوم*۔

صاحب مفردات نے عَلَّمَ اَدَمَ الْاَسْمَاءَ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے
 کہ مَعْرِفَةُ الْاَسْمَاءِ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِمَعْرِفَةِ الْمُسَمَّی۔ جب
 تک مسمی کا علم نہ ہو اس کے اَسْمَاء کا تعارف کچھ فائدہ نہیں دیتا***۔
 اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ہر
 چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کر کے اس کو پہچاننے کے لئے
 نام رکھتا ہے۔

قرآن کریم میں اَرْضٌ و سَمَاءٌ بے شمار مقامات میں آتا ہے۔ اس
 میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی، جس پر ہم رہتے ہیں، اَرْضٌ
 کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر بلندی کو (پستی کی نسبت سے) سَمَاءٌ اور ہر
 پستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) اَرْضٌ کہتے ہیں، اس لئے اَرْضٌ
 و سَمَاءٌ کے معنے کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے۔ اور جب اَرْضٌ کو
 سَمَاءٌ کے مقابل میں لایا جائیگا تو سَمَاءٌ سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا
 نظام بھی ہوگا، اور اَرْضٌ سے مراد انسان کی معاشرتی، معاشی اور تمدنی
 زندگی۔ نیز سَمَاءٌ یا سَمَواتٌ سے مراد محض اجرام فلکی ہی نہیں ہونگے
 بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ
 بھی ہونگے۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اَرْضٌ و سَمَاءٌ کے الفاظ آئے ہیں سیاق
 و سباق پر غور کرنے سے باسانی سمجھ میں آ جائیگا کہ اُس جگہ سَمَاءٌ میں
 بلندی کا پہلو ہے اور اَرْضٌ میں پستی کا۔ خواہ وہ محسوس اشیاء میں ہو۔
 خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان
 کی معاشرتی زندگی ہو جسے اس نے اپنی مفاد پرستیوں کے سانچے میں ڈھال رکھا
 ہے۔ (مزید بحث ارض کے عنوان کے تحت آچکی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کہ **وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا** (۲/۳۱)۔
 آدم کو تمام اشیاء کے اسماء سکھا دئے گئے۔ آدم سے مراد خود آدمی
 ہے۔ یعنی انسان (دیکھئے عنوان ۱-د-م) جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسماء
 کا جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا جب تک آپ کو سمجھائی (جس چیز کا وہ نام ہے)
 اس کا علم نہ ہو۔ لہذا آدم کو جو علم الاسماء دیا گیا تو اس کے معنی یہ
 ہیں کہ انسان میں اشیائے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی استعداد
 رکھ دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملائکہ (کائنات میں کام کرنے
 والی قوتیں) اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ جب انسان اس قانون سے واقف ہو
 جاتا ہے جو کائنات میں کارفرما ہے تو جو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر
 رہی ہیں وہ سب اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ لہذا جس قدر کوئی قوم
 اشیائے فطرت کے متعلق معلومات بہم پہنچا کر انہیں اپنے تابع فرمان کر لے گی
 اسی قدر وہ مسجود ملائکہ بنتی جائے گی۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ان
 قوتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے۔ سو اس کے متعلق فرما دیا کہ **فَمَنْ**
تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)۔ جو
 قوم وحی خداوندی کا اتباع کریگی اسے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اور جو
 قوم انہیں اپنی مرضی کے مطابق (اپنی مفاد پرستیوں کے لئے) صرف کرے گی
 وہ خود بھی ہلاکتوں میں پڑیگی اور دوسروں کے لئے بھی باعثِ مصیبت بن
 جائے گی۔ **أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ** (۲/۳۹)۔ اگر
 تسخیر فطرت کرنے والی قوم کو ”آدم“ (محض آدمی) کہا جائے تو اشیائے
 فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والی قوم کو ”مومن“ کہا
 جائے گا۔ اور جو قوم نہ تسخیر فطرت کرے اور نہ ہی اتباعِ قوانین خداوندی
 تو اسے؟ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن ہم یہ حال کہنا ہی
 پڑتا ہے، کہ اسے دور حاضر کے مسلمان کہا جائے گا! یا للعجب۔

”آدم“ کے علم الاسماء کے ضمن میں ایک مغربی ڈاکٹر نے اپنے نقطہ
 نگاہ سے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری
 عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔
 اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص
 بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام
 رکھے جاتے ہیں، ان سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں*۔

*Dr. M. L. Tyler in "Homeo. Drug Pictures" (Preface).

اس سے بھی مراد ، کائنات کے علوم طبعی کی تحصیل ہے جو ”آدمیت“ کی علامت ہے۔ ”غلط نام“ رکھنے کے ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنہیں تم (خدا کے علاوہ) اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز ایں نیست کہ اَسْمَاءُ سَمَّیْتُمُوْہَا اَنْتُمْ وَاَبَاؤُکُمْ (۱۲/۱)۔ ”یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں“۔ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲/۱)۔ ”اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی“۔ یہ جو ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جائیں تو وہ مٹی اور پتھر کی عمارتوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے خدا کا قانون عطا کرے۔ کائناتی دنیا میں اس کا قانونِ کائنات، اور انسانی دنیا میں ضابطہ وحی (قرآن عظیم)۔ باقی سب بتانِ آزری ہیں۔

س ن ب ل

السَّنْبُلُ۔ بالوں اور خوشوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد السَّنْبُلَةُ ہے (جمع سَنَابِلُ و سَنَابِلَاتٌ) بال۔ خوشہ (۲۶/۱)۔ قَدْ سَنَابِلُ الزَّرْعِ۔ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں*۔ (یہ لفظ غلے کے لئے آتا ہے۔ پھلوں کے لئے نہیں)۔

س ن د

السَّنْدُ۔ وہ چیز جسکے ذریعہ کوئی آدمی سہارا لے۔ سَنْدَ الْیَمَنِ۔ یَسْنُدُ۔ اسنے ٹیک لگائی* سَنْدَ الشَّیْءِ۔ اسنے اس چیز کو سہارا دیکر مضبوط کر دیا۔ السَّنْدُ۔ بلند پہاڑ جو تمہارے سامنے ہو۔ السَّنْدَانُ۔ لوہار کا اھرن جس پر لوہے کو گرم کر کے کوٹا جاتا ہے**۔

السَّنْدُ۔ چادر کی ایک قسم جو یمن میں بنتی تھی۔ سَنْدَ الرَّجُلِ۔ آدمی نے چادر اوڑھ لی*۔ قرآن کریم میں منافقین کو خُشْبُ مَسْنَدَةٍ (۶۳/۳) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور یہ بھی کہ وہ انسان نہیں، لکڑیاں ہیں جنہیں کپڑے پہنا دئے گئے ہوں۔ پہلے معنی زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کیونکہ منافق میں خود اعتمادی نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ آسے

ڈھونڈتا رہتا ہے۔ دوسرے معنی اس جہت سے درست ہیں کہ منافق کے اندر کچھ اور ہوتا ہے اور باہر کچھ اور۔ اور جو کچھ باہر ہوتا ہے اسے وہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ نیز اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ منافق لکڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے سہارے ہی کھڑے رہ سکتے ہیں۔ اور اندر سے وہ کندہ نہا تراش ہوتے ہیں لیکن ان کا ظاہر بڑا مزین اور خوشنما ہوتا ہے۔

س ن ن س

سُنْدُسٌ - باریک اور اعلیٰ قسم کے ریشم کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ معرب ہے *۔

قرآن کریم میں ہے ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ (۱۸۱)۔ ”مبہر ریشمی کپڑے“۔

س ن م

السَّيْنَامُ - اونٹ کا کوہان۔ السَّيْنَمُ مِّنَ النَّبْتِ - بلند پودہ جسکے پھول (یا بالیں) نکل آئے ہوں۔ سَنَمٌ اِلَّا نَاعَ تَسْنِيْمًا - اسنے برتن کو اس طرح بھر دیا کہ جو چیز اس میں ڈالی گئی تھی (مثلاً غلہ وغیرہ) وہ اس کے کناروں سے بھی اونچی ہو گئی۔ تَسْنَهُمُ الْحَائِطَ - وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اَسْنَمَتِ النَّارُ - آگ کے شعلے بلند ہو گئے۔ سَنَامٌ كُلُّ شَيْءٍ - ہر شے کا بلند حصہ یا بہترین حصہ **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رفعت اور بلندی کے ہیں۔

قرآن کریم میں تَسْنِيْمٌ آیا ہے جس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی گئی ہے کہ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ (۲۸)۔ ”ایسا چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں“۔ اس میں بلندیوں کا تصور ہے۔ یعنی زندگی کے ارتقائی مدارج۔ انسانیت کی رفعتیں۔ صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما۔

س ن ن

السِّنُّ - دانت *۔ (۵۳)۔ چونکہ جانوروں کی عمر دانت دیکھ کر بتائی جاتی ہے اس لئے اس کے معنی عمر کے بھی آتے ہیں۔ اَسَنَ الرَّجُلُ - آدمی بڑی عمر کا ہو گیا۔ السِّنَّةُ - چہرہ - صورت - نیز چہرے کا کھلا اور نمایاں حصہ۔ نیز راستہ، طریقہ، دستور، اور قانون۔ اس کی جمع سَنَنٌ ہے۔ اسی

* تاج و محیط - ** تاج و راغب -

سے سَنَّ الطَّيَّرِ يَقُ - (سین کے زیر - زیر اور پیش کے ساتھ - یہ سَنَّۃ کی جمع نہیں - ایک الگ لفظ ہے -) راستے کے کھلے واضح اور نمایاں حصہ کو کہتے ہیں * - یہیں سے اس کے معنی طریقہ ، مسلک ، معمول اور قانون کے ہو گئے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتَيْنَا تَحْوِيلًا (۱/۲۷) - ”تم ہمارے طریقہ (قاعدہ - قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے“ - سورۃ فاطر میں ہے - فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ (۳۵/۳۳) - اب لوگوں کو صرف اس کا انتظار ہے کہ جو کچھ ان جیسی پہلی اقوام کے ساتھ ہوا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہو جائے - سورۃ آل عمران میں ہے - قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ (۱۳۶/۳۳) - تم سے پہلے بہت سے مسلک و مشرب طور طریقے ، نظام ہائے حیات گذر چکے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا جاری رہنا - اور سہولت کے ساتھ اس کا یکے بعد دیگرے آتے رہنا - سَنَّ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کو سہل اور آسان کر دینا ہیں ** - اور سَنَّ التَّرَابَ عَلٰی وَجْهِهِ الْأَرْضِ کے معنی ہیں زمین پر مٹی کو آہستہ اور نرمی سے ڈالا حتّٰی کہ وہ بند کی طرح بن گئی ** -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں مِّنْ حَمَآءٍ مَّسْنُونٍ (۱۵/۲۶) آیا ہے - اس کے معنی عام طور پر سڑے ہوئے گارے کے کٹے جاتے ہیں - لین نے (مختلف اسناد کے ساتھ) لکھا ہے کہ سَنَّتُ الْحَجَرِ عَلٰی الْحَجَرِ کے معنی ہیں ”میں نے پتھر پر پتھر رکھ کر گھسا“ - اس طرح پتھر پر پتھر رکھ کر (اور پانی ڈال کر) گھسنے سے جو سڑا ہوا مں کب نکلتا ہے اسے مَسْنُونٌ کہتے ہیں - جب وہ کچھ عرصہ تک پڑا رہے تو سخت ہو جاتا ہے **** - بعض نے کہا ہے کہ مَسْنُونٌ کے معنی تیر اور نرم کے ہیں - ابو الہیثم نے کہا ہے کہ سَنَّ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی متغیر ہو گیا * -

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی تھی - وہ مٹی جس کے ساتھ پانی ملا تھا - یعنی زندگی کی ابتداء جماد (Inorganic Matter) کے ساتھ پانی کی آمیزش سے ہوئی - جب ان دونوں کی آمیزش کے بعد قرن ہا قرن گزر گئے اور اس میں کافی تغیر و تبدل ہوتا گیا تو اس سے زندگی کی نمود ہو گئی - اس کو حَمَآءٍ مَّسْنُونٍ سے تعبیر کیا گیا ہے - یاد رہے کہ اس سے اُس طریق کا بتانا مقصود ہے جس سے زندگی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی - یہ مطلب نہیں کہ زندگی مادہ (Matter) کی پیداوار ہے -

قرآن کریم کا یہ اعلان کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۵)۔ ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے جس پر تمام سائنٹیفک تحقیقات کی عمارت استوار ہے اور جو قانونِ مکافاتِ عمل کی روح ہے۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یہ کہنا کہ ”خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی“ کسی انسان کا کام نہیں تھا۔ انسان تو ابھی کل تک قانون (Law) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ دنیا میں جس قدر سائنٹیفک ایجادات ہوئی ہیں، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں وہ سب اس محکم اصول کی رہینِ منت ہیں کہ قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اصول اس قدر محکم ہے کہ انسان اس پر کامل اعتماد کر سکتا ہے اور یہی وہ اعتماد ہے جس کے سہارے وہ آسمانی کروں تک جست لگانے سے بھی نہیں جھجکتا۔ وہ جب ایک دفعہ قانونِ خداوندی کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ اس یقین کے ماتحت کہ اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، وہ کچھ، بلا خوف و خطر، کرتا چلا جاتا ہے جس کے تصور سے بھی ان لوگوں کی روح کانپتی ہے جو اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے۔

جس طرح اس کا یہ اصول خارجی کائنات میں کارفرما ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہے۔ اس نے قوموں کے عروج و زوال کے لئے قوانین متعین کر دئے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کریگی وہ عروج حاصل کرے گی۔ جو ان کے خلاف جائیگی، تباہ ہو جائیگی۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

اس قانون نے خود خدا کے تصور میں بھی ایسا عظیم انقلاب پیدا کیا ہے جس سے انسانی دنیا بدل گئی ہے۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں خدا کو ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح سمجھتا تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے ناراض ہو جاتا ہے تو گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیتا ہے۔ خوش ہو جاتا ہے تو مجرموں کو جا گیریں بخش دیتا ہے۔ ایسے خدا سے انسان ہر وقت ڈرتا اور کانپتا رہتا تھا کہ نہ جانے وہ کس وقت کیا کر دے۔ اس لئے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے۔

قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ بیشک خدا قادرِ مطلق اور حاکمِ اعلیٰ ہے لیکن اس نے کائنات اور انسانوں کے لئے قوانین مرتب کر دئے ہیں۔ اور، بے انتہا اور لامحدود قدرتوں اور قوتوں کا مالک

ہونے کے باوجود ، اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے ان قوانین میں تبدیلی نہیں کریگا۔ لہذا ، انسانی زندگی کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے۔ یعنی انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا۔ وَلٰكِنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ اور اس کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ”قانون کے مطابق سب کچھ کرنے والا خدا“۔ اور قانون غیر متبدل۔ سوچئے کہ خدا کے اس تصور نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ یہ قرآن ہی کا صدقہ ہے۔

س ن و

سَنِيهِ السَّطْعَامُ وَالشَّرَابُ سَنَهًُا وَتَسَنَّهُ۔ کہانے اور پینے کی چیز خراب ہوگئی۔ بگڑ گئی۔ اَلتَّسَنَّهُ بھس جانا۔ سڑ جانا۔ زمانہ گزرنے سے کسی چیز میں تغیر واقع ہو جانا۔ یہ لفظ روٹی کے بھس جانے اور پینے کی چیزوں کے سڑ جانے پر بولا جاتا ہے۔ طَعَامٌ سَنِيَهُ سڑا ہوا کھانا۔ خُبْزٌ مُتَسَنَّهُ بھسی ہوئی روٹی۔ قرآن کریم میں ہے لَمْ يَتَسَنَّهُ (۲/۴۵۹) وہ خراب نہیں ہوا۔ بگڑا نہیں۔ یعنی اتنی طویل مدت گزرنے کے باوجود وہ متغیر و سالخورده نہیں ہوا*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهُ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔ سَنَهَتْ النَّخْلَةَ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے۔

بیشتر علمائے لغت کا خیال ہے کہ سَنَةً (بمعنی سال) اسی مادہ سے ہے۔ لیکن ہم نے سَنَةً اور اس کے بعض مشتقات (س۔ ن۔ و) کے تحت لکھے ہیں۔ لہذا اس مادہ کی تکمیل کے لئے اس عنوان (س۔ ن۔ و) کو بھی دیکھ لیجئے۔

س ن و

السَّنَةِ کے معنی ہیں سال (اس کی جمع سنَوَاتٌ ، سِنُونٌ اور سِنِينَ ہے)۔ اس کے مادہ کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ سَنَةً کی اصل (س۔ ن۔ و) ہے ، کیونکہ اہل عرب کہتے ہیں سَانَهُتْ فُلَانًا۔ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کر لیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهُ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں۔ سَنَهَتْ النَّخْلَةَ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی

اصل سَنَوٌ ہے جس سے سَنَا - يَسْنُوْا کے معنی ہیں کنویں کے گردا گرد گھومنا - چنانچہ السَّانِيَّةُ - اس جانور کو کہتے ہیں جو پانی نکالنے کیلئے کنویں کے ارد گرد گھمایا جاتا ہے - اسی سے سورج کے ایک دورے کو السَّانِيَّةُ کہتے ہیں - (اسے دَارٌ بھی کہتے ہیں) - اور چونکہ یہ دورہ ایک سال میں پورا ہوتا ہے اس لئے السَّانِيَّةُ کے معنی ہیں ایک سال - السَّانِيَّةُ شمسی سال ہوتا ہے، اور اَلْعَامُ، قمری سال - نیز السَّانِيَّةُ ایسے سال کو کہتے ہیں جس میں قحط اور شدت ہو - اور اَلْعَامُ اس سال کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی اور خوشحالی ہو - اسی بناء پر کہتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹) - تو اس میں عَامًا وہ مدت ہے جس میں مشکلات سامنے نہیں آئی تھیں اور سَنَةٍ وہ مدت جو سختیوں کی تھی - لین نے لکھا ہے کہ سَنَةٍ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں - اس لحاظ سے اَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہونگے اڑھائی سو سال - اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں - تو اس میں سے خَمْسِيْنَ عَامًا نکال دینے سے باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں جو ایک انسان کی عمر ہو سکتی ہے - لیکن یہ بہر حال ان لوگوں کے قیاسات ہیں - جب تاریخ کے مزید شواہد سامنے آئیں گے تو اس وقت یقینی طور پر کہا جاسکے گا کہ قرآن کریم کے اس بیان کا صحیح مفہوم کیا ہے کہ ”حضرت نوحؑ اپنے لوگوں میں پچاس کم ایک ہزار سال رہے“ (۲۹) - بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت ان کے زمانہ تعلیم پر دلالت کرتی ہے - یعنی ان کا زمانہ نبوت اتنا عرصہ رہا - اس کے بعد دوسرے نبی کا زمانہ شروع ہوا - سَنَاهُ - تَسْنِيَّةٌ کے معنی ہیں اس کو کھول دیا - سہل کر دیا -

س ن ی

السَّنَى - روشنی - السَّانَاءُ والسَّنَى - بلندی اور رفعت * - قرآن کریم میں ہے يَكَادُ سَنًا بَرْقِہٖ يَذْهَبُ بَا لَا بُصَارَ (۲۳) - ”قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دے“ اس میں سَنًا کے معنی چمک اور خیرگی پیدا کر دینے والی روشنی کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور ارتقاع کے ہیں -

س ۵ ر

سَهَرٌ - يَسْهَرُ - سَهَرًا - (رات کو) جاگنا - سَاهِرٌ - (رات کو) جاگنے والا * - السَّاهِرَةُ - زمین کا بالائی حصہ، روئے زمین - دراصل یہ ایسی

* تاج - محیط - راغب -

زمین کے لئے بولا جائیگا جس پر لوگ بکثرت چلتے پھرتے رہیں۔ گویا وہ انکی وجہ سے بیدار ہے۔**

قرآن کریم میں ہے فَادْأَاهُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱۵) اُس (نشاءۃ ثانیہ) کے بعد زندگی ہی زندگی ہوگی۔ اور بیداری ہی بیداری۔ یا نشوونما میں تیزی۔ کیونکہ اَرْضٌ سَاهِرَةٌ اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو بہت جلد پودے اگانے والی ہو*۔ چونکہ حیات اُخروی کی کیفیات، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس لئے قرآن کریم انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ نگہ بصیرت ان تشبیہات و استعارات کے پردوں میں حقیقت کا خفیف سا پر تو دیکھ لیتی ہے۔ اس سے زیادہ اس زندگی میں ممکن ہی نہیں۔

سریانی زبان میں اَلْسَاهُورُ چاند (اَلْقَمَرُ) کو کہتے ہیں***۔ اور عربی میں چاند گہن کو بھی۔ (لین)۔

س ھ ل

اَلْسَهْلُ۔ اَلْسَهْلُ۔ نرم چیز۔ اَلْسَهْلُ مِّنْ اَلْاَرْضِ۔ نرم زمین۔ اسکی جمع سُهُولٌ آتی ہے*۔ قرآن کریم میں ہے تَتَّخِذُوْنَ مِّنْ سُهُولِهَا قُصُورًا (۲۴)۔ ”تم ہموار اور نرم زمینوں میں محلات تعمیر کرتے ہو“۔

س ھ م

سَهْمٌ۔ حصہ۔ دراصل سَهْمٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس سے قرعہ ڈال کر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ نیز گھر کا گزرنے کا راستہ السَّهْمُ۔ لاغر ہونا اور رنگ کا متغیر ہو جانا۔ اصل میں یہ اونٹوں کی ایک بیماری ہوتی ہے جس میں انہیں گرمی اور پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ اَلْسَهْمُ۔ کسی غم یا فکر کی وجہ سے ترشرو ہونا۔ سَاهَمَ الْقَوْمُ۔ اسنے قوم کے ساتھ قرعہ اندازی کی****۔ تیر اندازی میں مقابلہ کیا نیز باہم ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کی۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت یونسؑ میں ہے فَسَاهَمَ (۳۱)۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں۔ اس نے باقیوں کے ساتھ قرعہ ڈالا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ فَسَاهَمَ میں کشتی والوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

* تاج۔ ** راغب۔*** (کتاب الاشتقاق) نیز ابن فارس۔**** تاج و محیط و راغب

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ (حضرت) یونسؑ نے ہمارے قانون کا مقابلہ کیا۔
فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ (۱۳۱)۔ وہ لغزش کھا گیا۔ اس کا پاؤں پھسل
گیا۔ حضرت یونسؑ سے ہجرت کا وقت متعین کرنے میں اجتہادی غلطی
ہو گئی تھی۔

س ه و

سَهَا فِي الْأَمْرِ۔ کسی چیز کو بھول جانا۔ اہل لغت نے تصریح
کی ہے کہ سَهُوٌ، غَفْلَةٌ اور نِسْيَانٌ، تینوں لفظ ہم معنی ہیں۔ لیکن
بعض نے تخصیص یہ کی ہے کہ سَهُوٌ ان باتوں سے معمولی سی غفلت کو
کہتے ہیں جو حافظہ میں موجود ہوتی ہیں۔ اور نِسْيَانٌ کسی چیز کا حافظہ
سے بالکل محو ہو جانا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ سَهَا فِي الشَّيْءِ کے
معنی ہیں لاعلمی کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ اور سَهَا عَنْهُ کے
معنی ہیں جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینا*۔ أَلْسَهُوٌ کے معنی ہیں
ماکن اور نرم ہونا۔ أَلْسَهُوَةٌ۔ آسانی سے کھنچنے والی نرم کمان کو کہتے
ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر معانی کا تعلق غفلت اور
سکون سے ہے۔ جَاءَ سَهُوًا رَهُوًا وہ بڑے سکون کے ساتھ آیا۔

قرآن کریم میں ہے هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ (۵۱)۔ ”وہ اپنے
اشغال میں منہمک، حقیقت سے بے خبر ہیں“۔ دوسری جگہ ہے الَّذِينَ هُمْ
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (۱۵)۔ وہ اپنی صلوٰۃ (فرائض منصبی) کی طرف
سے یکسر غافل ہیں۔ یا انکی تکمیل میں بہت مست اور ڈھیلے ڈھالے رہتے
ہیں (۹)۔ یا، وہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور صرف اس کے محسوس
و مرئی حصہ (تعدیلِ ارکان۔ قیام، رکوع۔ سجود وغیرہ) ہی کو اصل صلوٰۃ
سمجھتے ہیں (۱۶) کیونکہ یہ بڑی آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں اور دیکھنے
والوں میں عزت بھی ہو جاتی ہے۔

س و ا

سَاءَہُ۔ يَسُوْءُہُ۔ کسی سے ایسی بات کرنا جو اسے ناگوار ہو۔
سَاءَ الشَّيْءُ۔ کوئی چیز بری ہوئی۔ أَسَاءَ يُسِيْ۔ برا کرنا، ناہمواری پیدا
کرنا۔ بگاڑ اور ابتری رونما کرنا (یہ أَحْسَنَ کا ضد ہے) أَلْسَيَّةُ۔ زندگی کی
ناخوشگواریاں**۔ یہ حَسَنَةٌ کی ضد ہے۔ اسکا مفہوم سمجھنے کیلئے (ح۔ س۔ ن)

کا عنوان دیکھئے۔ چونکہ حسن نام ہوتا ہے کسی چیز کے پورے پورے توازن قائم کر دینے کا اس لئے سَيِّئَةٌ توازن کے بگاڑ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ سَوُءٌ کے معنی فساد، ہلاکت اور ضرر کے ہوتے ہیں*۔ نیز حَسَنَةٌ درمیانہ روی کو کہتے ہیں۔ اس لئے سَيِّئَةٌ کے معنی ہیں افراط و تفریط**۔ مَسَاوِیٌ۔ ناخوشگوار امور، عیوب، نقائص**۔

السَّوْءَةُ۔ بری خصلت، معیوب بات یا کام۔ ہر وہ قول و فعل جس کے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو۔ بنا بریں مرد اور عورت کی شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں**۔ اسکی جمع سَوَاتٌ ہے (۳۰؛ ۳۶)۔

قرآن کریم میں سَيِّئَةٌ بمقابلہ حَسَنَةٌ۔ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۱۱۹؛ ۱۳۱)۔ نیز اِقْتِصَادٌ (میانہ روی) کے مقابلہ میں سَاءٌ (۶۶)۔

مغموم یا متردد ہونے کے معنی میں (۱۱) میں مِیْسِیٌ بَیْهِمُ آیا ہے۔

صحیح روش زندگی کا نتیجہ انسان کی ذات اور معاشرہ میں حسن کی افزائش ہے۔ یعنی اس سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ دونوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی ساری خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ اسکے خلاف زندگی بسر کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی متضاد زندگیاں بسر کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے (۵۸)۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کا توازن بگڑا ہوا ہو تو اسکی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم حسن پیدا کرنے والے کام کرتے جاؤ۔ بگاڑ خود بخود رفع ہو جائیگا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةِ (۲۳۶)۔ اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کرو گے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائیں گی۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۳)۔ سورۃ رعد میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ يَدْءُرُّوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ (۱۳۲)۔ نیز (۲۸)۔ وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مفہوم نہیں کہ قرآن کریم ”ایک گل پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گل کر دینے“۔ یا ”جو کوٹ اتار لے اسے کرتا خود اتار کر دینے“ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم مجرمین کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کے لئے اُس نے قانونِ عدل کی تلقین کی ہے۔ یعنی جرم

کی سزا دینا تا کہ مجرمین کی جرأتیں بے باک نہ ہونے پائیں۔ لیکن اس کے لئے بھی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ جَزَاؤُا سَيِّئَةٍ مَّيْسَرَةً مِّثْلُهَا (۳۲)۔ نیز (۱۰)۔ سزا ہمیشہ جرم کی نوعیت اور مقدار کے مناسب اور مطابق ہونی چاہئے۔ یہ نہیں کہ ذرا سے جرم کی سنگین ترین سزا دیدی جائے۔ (نیز جہاں اصلاح کا امکان نظر آئے وہاں معاف بھی کر دینا چاہئیے۔ (۳۲) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں کہ جو تم سے برائی کرے تم بھی اس سے اسی طرح کی برائی کرو۔ اس میں جرم اور اس کی پاداش (تعزیر) کا اصول بیان کیا گیا ہے جو خدا کے قانون مکافات پر مبنی ہے۔ یعنی سزا، جرم کی مناسبت سے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَثْمَارَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۱) ”یقیناً ہم انہیں ان کے اس قسم کے اعمال پر جو وہ کرتے رہے ہیں بدترین سزا دینگے“۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم انسان کو ایسی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (ہمواری اور خوشگواری) پیدا ہو اور معاشرہ میں بھی۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے قرآنی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات میں بھی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور معاشرہ میں بھی۔ نیکی یا بدی، بھلائی یا برائی کا قرآنی تصور یہی ہے۔

۶۹

س و ا ع

قوم نوح کا بت تھا (۶۱)۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے اچھی طرح متعارف تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنوہذیل کے لوگ اسی نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے۔

س و د

اَلَا سُّودٌ۔ اَبْيَضٌ کی ضد ہے۔ یعنی سیاہ۔ اسکی جمع سُّودٌ ہے۔ (۳۵) اِسُّودٌ یَسُّودٌ۔ سیاہ ہوا۔ اَلَسُّوَادُ۔ سیاہی۔ تاریکی۔ مال کثیر۔ شہر کے ارد گرد کے دیہات۔ بہت بڑی تعداد۔ عام لوگ۔ قوم کا بڑا حصہ۔ اَلْسَّائِدُ۔ سردار یا سَیِّدٌ سے نیچے کا سردار*۔ اَلْسَّيِّدُ۔ رئیس*۔ (صاحب سواد۔ جسکے ساتھ بہت سی جماعت ہو)۔ بادشاہ۔ آقا۔ شوہر۔

السِّيَادَةُ - سرداری - اَلَا سُوْدٌ مِّنَ الْقَوْمِ - قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی - بزرگ قوم * - اَلَا يَسَامُ الْمُسْوَدَةُ - بدحالی اور تکلیف کے دن ** - راغب نے لکھا ہے کہ اَبْيَضَاضُ الْوُجُوْهِ سے مراد مسرت و شادمانی ہوتی ہے اور اِسْوَدَادُ الْوُجُوْهِ سے مراد تکلیف اور غم و حزن *** - (نیز دیکھئے عنوان ب - ی - ض)۔

سَيِّدًا - بمعنی سردار (۳۸) میں آیا ہے - مراد اس سے صاحب عزت و تکریم ہے - اور شوہر کے معنوں میں (۱۲) میں - لیکن وہاں یہ لفظ عزیز مصر کے لئے آیا ہے جو اپنی بیوی کے شوہر ہونے کے ساتھ وہاں کا سردار بھی تھا - عام شوہر کے لئے قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا - سورة نحل میں ہے وَجْهَهُ مُسْوَدًّا - (۱۶) کالا ، سیاہ - یعنی مغموم - سورة آل عمران میں ہے تَسْوَدُّ وُجُوْهُ (۳۵) - چہروں کا کالا ہونا یعنی ذلیل ہونا - گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے چہروں کا رنگ سیاہ پڑ جانا - (بمقابلہ تَبْيَضُّ - سفید ہونا - باعزت ہونا)۔

س و ر

سَارَ - يَسُوْرُ - سَوْرَةٌ کے معنی ہیں کسی پر چڑھ جانا - حملہ کرنا - سُرَّتُ الْحَائِطُ وَتَسَوَّرْتُہ کے معنی ہیں میں دیوار پر چڑھ گیا - اَلْسُوْرُ - شہر پناہ کو کہتے ہیں - اسی سے اس کے معنی بلندی ہیں - رفعت - شرف و فضیلت - بلندی و برتری - سَوْرَةٌ السُّلْطَانِ - بادشاہ کی سطوت و شوکت ، جاہ و جلال ، اور زور و دبدبہ کے لئے آتا ہے - اَلْسِوَارُ - کنگن کو کہتے ہیں جو سرداری اور مدارج کی بلندی کا نشان ہوتا تھا - (اَسَاوِرُ اسکی جمع ہے) - اَلَا سُوَارُ یا اَلَا سُوَارُ - سوار فوج کے کمانڈر کو کہتے ہیں - نیز بہترین تیر انداز اور عمدہ شہسوار کو * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلَا سُوَارُ عربی لفظ نہیں ہے - اَلْسُوْرَةُ - درجہ و مرتبہ ، قدر و منزلت ، بلندی - نیز اس عمارت کو کہتے ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی اٹھ گئی ہو **۔

قرآن کریم کی سَوْرَةٌ کو سَوْرَةٌ کہنے کی بہت سی توجیہات بیان کی گئی ہیں - بعض کا خیال ہے کہ ان کی بلند مرتبگی کی وجہ سے انہیں سَوْرَةٌ کہا جاتا ہے - بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلی سورة بعد میں آنے والی سورة کے لئے سیڑھی کا کام دیتی ہے اس لئے اسے سَوْرَةٌ کہتے ہیں - بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ منزل بمنزل آتی ہیں اور ان سب کے مجموعہ

سے قرآن کریم کی عمارت کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے انہیں سُورۃ^۵ کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ان میں قرآن کریم کے احکام محفوظ ہوتے ہیں، جس طرح شہر پناہ سے شہر کی حفاظت ہوتی ہے، اس لئے انہیں سُورۃ^۵ کہا جاتا ہے*۔ نیز علامت کو بھی سُورۃ^۵ کہتے ہیں**۔

سُورۃ^۵۔ مضبوط قوی اور شریف النسل اونٹوں کو بھی کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں یہ مادہ قرآنی سورۃ کے لئے (۲۳) میں آیا ہے۔ اور (۲۴) میں بھی۔ دیوار کے معنوں میں (۵۴) میں۔ اور سرداری (کی علامت یعنی کنگن) کے لئے (۱۸ و ۳۵ و ۳۶) میں۔ سورۃ ص میں ہے اِذْ تَسْوَرُّوۡا الْمِحْرَابَ (۳۸)۔ جب وہ دیوار پھاند کر محراب کے اندر آگئے۔

جنت میں سونے کے کنگنوں کا جو ذکر آیا ہے (۱۸) تو اس کا مطلب وہ قوت و حشمت اور سرفرازی و سربلندی ہے جو جماعت مومنین کو اس دنیا کی جنتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے۔ باقی رہیں اسکے بعد کی زندگی کی سرداریاں اور سرفرازیاں، تو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ حقیقت کا تمثیلی بیان ہے۔ تم اپنے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے ان چیزوں کی کنہ و حقیقت کو نہیں پا سکتے۔ (دیکھئے عنوان ج۔ ن۔ ن)۔

س و ط

السَّوْطُ۔ بعض چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملانا۔ خلط ملط کر دینا۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں۔ السَّوْطُ۔ چابک (کوڑا) کیونکہ وہ گوشت کو خون کے ساتھ مخلوط کر دیتا ہے۔ یا بقول ابن فارس کھال میں گھس جاتا ہے۔ یا پھر اس لئے کہ وہ خود مختلف تسموں کو ملا کر بٹا جاتا ہے۔ جمع اسوَاطٌ۔ اگرچہ اس کے معنی کوڑوں سے مارنے کے ہیں لیکن عربوں کے ہاں ہر شدید اور درد انگیز سزا کو سَوْطٌ عَذَابٍ کہہ دیتے تھے۔ یعنی سزا کا کوڑا۔ لیکن صاحب محیط اور راغب کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جو سَوْطٌ عَذَابٍ (۸۹) آیا ہے تو اس سے مفہوم انواع و اقسام (طرح طرح) کے عذاب ہیں***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سَوْطٌ عَذَابٍ سے مراد ہے عذاب کا ایک حصہ و مقدار۔

س و ع (سی ع)

سَاعٌ۔ یَسْوَعُ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ میں اعلیٰ معنی ہلاکت اور زوال کے ہوتے ہیں*۔ چنانچہ کہتے ہیں سَاعٌ الشَّيْءُ۔

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج راغب و محیط۔

چیز ضائع ہوئی *۔ هُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ۔ وہ ضائع اور ہلاک ہونے والا ہے۔
 نَاقَةٌ مِيسِيَا عٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کو جنگل میں چھوڑ
 دے کہ اسے درندے ہلاک کر دیں۔ آسَاعَةٌ۔ اسے بیکار چھوڑ دیا اور ضائع کر دیا۔
 رَجُلٌ مُسَيِّعٌ وَمِيسِيَا عٌ لِلْمَالِ۔ مال کو ضائع کر دینے والا آدمی۔ أَلْسَائِعٌ۔
 زمین کے اوپر بہنے والا پانی۔ سَاعٌ الْمَاءِ وَالشَّرَابِ۔ پانی اور شراب
 زمین پر گر کر بہنے لگی۔ تَسَيِّعُ الْبَقْلِ۔ سبزیاں خشک ہونے لگیں *۔

أَسْوَعٌ۔ وہ ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں منتقل ہوا۔ یا ایک
 گھڑی پیچھے ہوا *۔ سَوْعٌ مِّنَ اللَّيْلِ۔ رات کا ایک (پرسکون) حصہ۔
 السَّاعَةُ۔ (واوی ہے، یا ئی نہیں) وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں (چونکہ
 وہ گزر جاتا ہے اور وقت میں ہر لمحہ کمی ہوتی جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا
 ہے کہ اس کے بنیادی معنی مسلسل گزرتے رہنے کے ہیں۔ نیز مشقت، بُعد
 اور دوری کو بھی السَّاعَةُ کہتے ہیں۔ السَّاعَةُ۔ ہلاک ہو جانے والوں
 کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں السَّاعَةُ کا لفظ کثرت سے آیا ہے۔ قرآن کریم غلط
 روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ ہلاکت
 و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباہی
 آ جائے گی۔ تمہارے سعی و عمل ضائع ہو جائیں گے۔ تم ہلاک اور برباد
 ہو جاؤ گے (اسی کو اِنْذَارٌ کہتے ہیں)۔ وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے
 اور اپنی روش پر جمے رہتے ہیں۔ ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب
 کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب یہ اندر ہی اندر مرتب
 ہونے والے اثرات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ہو جاتے
 ہیں۔ اسے السَّاعَةُ، یا انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ
 یہ انقلاب دفعۃً واقع نہیں ہو جاتا بلکہ آہستہ آہستہ ترتیب پا رہا ہوتا
 ہے۔ البتہ اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جنہیں حقیقت کا علم نہ ہو وہ
 یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دفعۃً نمودار ہو گیا ہے۔ چونکہ اکثر اوقات یہ انقلاب
 اُس جماعت کے ہاتھوں نمودار ہوتا ہے جو حق کی حمایت کے لئے اٹھتی ہے،
 اس لئے السَّاعَةُ سے مراد حق اور باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس میں
 باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ السَّاعَةُ۔
 ظہور نتائج کا نام ہے، جسے ہلاکت انگیز انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے۔

یا حق و باطل کا فیصلہ کن تصادم - چنانچہ سورۃ طہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تفصیل سے بتایا کہ فرعون کی سرکشی کس حد تک بڑھ چکی ہے ، اور اس کے بعد ان سے کہا کہ اس کے لئے تمہیں کیا کچھ کرنا ہے - اس کے بعد فرمایا اِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَّةٌ (۲۰) - اس کا یقین رکھو کہ حق و باطل کی آخری کشمکش کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے - یہ آ کر ہی رہے گا - فرعون کو اس طرح کھلا نہیں چھوڑا جاسکتا - اب یہ انقلاب ضرور آئے گا - اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ سے بھی بار بار کہا گیا کہ تم اپنی جماعت کی پوری پوری تیاری کرو - اِنَّ السَّاعَةَ اَتِيَّةٌ (۱۵) - آخری انقلاب کا وقت آنے والا ہے - وہ ضرور آکر رہے گا - یہ مخالفین ضرور تباہ ہو کر رہیں گے -

حق و باطل کی کشمکش چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی چلی آ رہی ہے - لیکن قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جب زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے ، تنوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے تصور اور مفاد پرستیوں میں ایک عالمگیر ٹکراؤ ہوگا جسکے بعد زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی - یہ وہ عظیم السَّاعَةُ ہے جس کا ذکر بڑے ہیبت انگیز انداز سے قرآن کریم میں آتا ہے -

چونکہ نہ تو انسانی زندگی موت سے ختم ہو جاتی ہے اور نہ ہی اعمال کے نتائج کا سلسلہ یہیں منقطع ہو جاتا ہے ، اس لئے اس زندگی کے بعد ظہورِ نتائج کو بھی السَّاعَةُ سے تعبیر کیا گیا ہے - قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں کونسا انقلاب مراد ہے - یعنی اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کا وقت (حق و باطل کی کشمکش کا انقلاب) یا آخرت کی زندگی میں ظہورِ نتائج کا وقت -

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قوموں کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن اثرات ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا مجموعی نتیجہ (Accumulative Effect) ایک وقت پر جا کر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے لئے انقلاب کی گھڑی (السَّاعَةُ) ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا کہ یہ گھڑی کب آئے گی - سورۃ اعراف میں ہے يَسْأَلُوْكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسِلُهَا - قُلْ اِنَّمَا عَلِمُهَا عِنْدَ رَبِّي - لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ (۱۸) - ”یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب کی

گھڑی (جس سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے ہو) کب آئے گی۔ کہو کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے۔ اُسے اس کے وقت پر خدا کے سوا کوئی اور ظاہر نہیں کرے گا“ (نیز ۳۳: ۳۲)۔ دوسری جگہ ہے یَسْأَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ - قُلْ اِنَّمَا عَلِمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ - وَمَا يَدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۳۳)۔ ”لوگ تجھ سے السَّاعَةِ کی بابت پوچھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اور تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو“۔ (نیز ۳۲: ۳۱)۔ دیگر مقامات پر بھی یہی کہا ہے کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ (دیکھئے ۳۱: ۳۳ و ۳۳: ۸۵ و ۳۱: ۳۲)۔

بنی اسرائیل کے گھرانے میں نبوت اور حکومت قریب ڈیڑھ ہزار سال تک رہی۔ شروع شروع میں تو وہ قوانین خداوندی کے پابند رہے لیکن بعد میں انہوں نے ہر قسم کی سرکشی اور فساد انگیزی شروع کر دی۔ انہیں بار بار سمجھایا گیا کہ اس روش زندگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور یہ برکات تمہارے گھرانے سے چھن کر دوسری شاخ کی طرف چلی جائیں گی۔ لیکن انہوں نے کسی کی نہ مانی۔ آخری مرتبہ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں خاص طور پر تنبیہ کی اور ان سے برملا کہہ دیا کہ یاد رکھو۔

خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائے گی۔ (متی باب ۲۱ - آیات ۴۵ - ۳۳)

لیکن انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ کے اوراق سے ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ آخری انقلاب کی گھڑی آ گئی اور اس قوم کی شوکت و حشمت سب چھن گئی۔ اسی لئے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنْتَبَہْ لَعَلَّكُمْ ۚ لِّلْاِسْـََٔاعَةِ ۚ (۳۳: ۲۱)۔ ”اس کی آمد اس انقلاب عظیم کا علم (دینے کے لئے) تھی۔“ (نیز دیکھئے ۳۳: ۶۶ و ۳۳: ۵۵) اور اگر اِنْتَبَہْ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ قرآن کریم اس انقلاب کا علم دیتا ہے جو اب آنے والا ہے۔

س و غ

سَاغَ الشَّرَابُ - يَسْؤُغُ - مَسَّوْغًا - پینے کی چیز کا آسانی سے حلق کے نیچے اتر جانا۔ سَاغَ الطَّعَامُ - کھانا آسانی سے حلق سے نیچے اتر گیا۔

السَّيِّوَاغُ - جس چیز سے گلے میں اٹکی ہوئی چیز کو نیچے اتارا جائے۔
 شَرَابٌ سَائِغٌ - خوشگوار مشروب جو آسانی سے حلق سے نیچے اتر جائے۔
 طَعَامٌ سَائِغٌ - خوشگوار کھانا۔ اسی سے میجازاً سَاغَ النَّهَارُ بولتے ہیں
 یعنی دن آسانی سے گزر گیا *۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے يَتَجَرَّرُّوْهُ 'وَلَا يَكَادُ
 يَسِيْغُهُ' (۱۳/۱)۔ وہ اسے گلے سے اتار تولے گا لیکن بڑی ہی ناخوشگواری سے۔
 (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج۔ ر۔ ع)۔ سورۃ نحل میں دودھ کے
 متعلق ہے سَائِغًا لِلشَّيْرِ بَيْنَ (۱۶/۱)۔ وہ پینے والوں کے لئے بڑا خوشگوار ہے۔
 یا بآسانی حلق سے اتر جاتا ہے۔

سَوْفَ (حرف)

سَوْفَ - یہ بھی س کی طرح مضارع پر آتا ہے اور س ہی کے معنی
 پیدا کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک س مستقبل قریب کے لئے آتا ہے (یعنی وہ
 عنقریب یا جلدی ہی ایسا کریگا) اور سَوْفَ مستقبل بعید کے لئے۔ لیکن یہ
 کوئی کلیہ نہیں۔ سَوْفَ سے پہلے تاکید کے لئے بعض اوقات ل بھی آ جاتا
 ہے جیسے وَلَسَوْفَ يَعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی (۹۳/۵)۔ اور تیرا رب تجھے
 (اتنا) دے گا کہ تیرا راضی ہو جائے گا۔ (وہ تیری آرزو کے عین مطابق
 ہوگا)

س و ق

السَّاقُ - پنڈلی۔ اسکی جمع سَوَقٌ ہے۔ (۳۸/۳۳)۔ السَّاقُ کے معنی
 درخت کا تنا بھی ہیں۔ اسکی جمع بھی سَوَقٌ آتی ہے (۲۹/۲)۔ لیکن عرب جب
 کسی معاملہ کی شدت کو بیان کرتے تو اسے سَاقٌ سے تشبیہ دیتے *۔ (اسے
 ک۔ ش۔ ف کے عنوان میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں دیکھئے)۔
 قرآن کریم میں یَوْمَ يَكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۲)۔ اور وَالتَّافَّتِ السَّاقُ
 بِالسَّاقِ (۴۹/۲)۔ اور كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (۲۴/۲) میں شدت ہی کا
 مفہوم ہے۔

سَاقٌ - مویشیوں کو پیچھے سے ہانکنا *۔ (۵۷/۵)۔ (جسطرح قَاد کے
 معنی جانوروں کو آگے سے کھینچ کر چلانا ہوتا ہے)۔ سَائِقٌ ہانکنے والا *

(۲۱/۵) - مَسَاقٌ - ہانکنا (۲۵/۵) - اَلشُّوقُ - (جمع اسْوَاقٌ - (۲۵/۲) - بازار - کیونکہ لوگ اس جگہ اپنے مویشی وغیرہ ہانک کر بیچنے کیلئے لاتے ہیں * - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س - و - ق شدت اور اجتماع کو ظاہر کرتے ہیں ** -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنے کے ہوتے ہیں - پنڈلی کو بھی اَلسَّاقُ اس لئے کہتے ہیں کہ چلنے والا اس پر چلتا ہے -

س و ل

تَسْوِيلٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو حسین اور خوشنما بنا کر دکھانا تاکہ انسان اس کے کرنے کی طرف راغب ہو جائے - کسی ایسی چیز کو جسے نفس چاہے، یا کسی بری شے کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا *** - سورة يوسف میں ہے بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا (۱۸/۱) - اور یہ ایک ایسی بات ہے جسے تمہاری اپنی خواہشات نے تمہارے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا ہے - بعض نے کہا ہے کہ یہ سَوَّلٌ سے ہے جس کے معنی تمنا کے ہوتے ہیں جو انسان کو باطل اور پر فریب چیزیں بھی پسندیدہ بنا کر بتاتی ہے *** - سورة محمد میں ہے اَلشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ (۲۵/۳) - شیطان نے اسے ان لوگوں کے سامنے مزین کر کے پیش کیا - اور اس طرح انہیں گمراہ کر دیا - سورة طہ میں سامری کا یہ قول ہے کہ وَكَذَّابِكُمْ سَوَّلَتْ لِي أَنْفُسِي (۹۶/۲) - اسی طرح میرے دل نے یہ بات مجھے اچھی بنا کر دکھائی -

س و م

سَوْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کی تلاش و جستجو میں جانا - یعنی یہ معنی مرکب ہیں - جانا اور تلاش و جستجو کرنا - لہذا کہیں صرف پہلے معنی مراد لئے جاتے ہیں - جیسے سَامَ اَلْاِبِلُ کے معنی ہیں اونٹ چرنے کے لئے گئے - یا انہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا - اور کہیں دوسرے معنی جیسے يَسْؤُونَكَ سَوَاءَ الْعَذَابِ (۲۹/۲) - وہ تمہارے لئے بدترین عذاب کی تلاش میں رہتے تھے - طرح طرح کی مصیبتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا کرتے تھے - کسی کو مشکل اور دوپہر کام کی تکلیف دینا، اس سے ظلم و زیادتی اور برائی کا سلوک کرنا - سَامَتِ الطَّيْرُ عَلَيَّ الشَّيْءِ -

* تاج و محیط - ** العلم الخفاق *** تاج و راغب

پرنڈے اس چیز پر منڈلاتے رہے*۔ سَامَ فَلَانًا اَلَا مُرَّ : اسے کسی بات کی تکلیف دی ، اور کوئی بات اس پر لازم کی*۔ اَسَامَ الْاِبْرَیْلَ - اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

تلاش کے اعتبار سے اَلَسَّوْمَةُ - اَلَسَّيْمَةُ - اَلَسَّيْمَاءُ - کے معنے ہیں علامت - نشان - سَوَّامَ الْفَرَسِ تَسْوِيْمًا - گھوڑے پر نشان لگا دیا۔ لیکن سَوَّامَ فَلَانًا کے معنے ہیں فلاں کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس لئے سورۃ الذُّرِّيَّتِ میں جہاں ہے لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ مُّسَوِّمَةً - (۱۳۳-۱۳۴) تو اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ وہ پتھر خدا کے قانون مکافات کی رو سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ (Earmarked) کر دئے گئے تھے۔ یا یہ کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ (انہیں چلایا گیا تھا)۔

سورۃ آل عمران میں عذاب دینے والے ملائکہ کو مُسَوِّمِیْنَ (۱۳۳) کہا گیا ہے۔ اسی سورۃ میں اَلْخَيْلِ الْمُسَوِّمَةِ (۱۳۳) آیا ہے۔ اس کے معنے بھی نشان زدہ گھوڑے یا ایسے گھوڑے ہیں جنہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ سورۃ نحل میں فِیْہِ تَسْمِیْمُوْنَ (۱۶۱) آیا ہے۔ یعنی جن میں تم اپنے مویشی چراتے ہو۔ سِیْمًا (۲۹۸) کے معنے نشان اور علامت کے ہیں۔

س و ی

اِسْتَوَاعٌ کے معنے ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اعتدال پر ہونا۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس چیز کا اپنی انتہائی نشو و نما تک پہنچے ہوئے ہونا*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں استقامت اور دو چیزوں کے درمیان اعتدال لکھے ہیں۔ اِسْتَوَى الرَّجُلُ کے معنے ہیں وہ شخص اپنی پوری طاقت پر پہنچ گیا۔ اس کا شباب انتہا پر پہنچ گیا۔ قرآن کریم نے اِسْتَوَى کی تشریح بَلَّغَ اَشْدَدَّہُ سے کی ہے (۲۸۱)۔ اسی طرح اِسْتَوَى عَلٰی سُوْقِیْہِ (۲۹۸) میں اِسْتَوَى کے معنے واضح ہیں۔ یعنی پودوں کا مضبوط ہو کر اپنے تنوں پر سیدھا کھڑا ہو جانا۔ اَلَسَّوٰی - اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اسی سے اَلصِّرَاطُ السَّوٰی ہے (۲۸۵)۔ یعنی اعتدال کی راہ۔ رَجُلٌ سَوٰی اس شخص کو کہتے ہیں جس کی خلقت اور اخلاق و اطوار، افراط و تفریط سے پاک ہوں۔

یعنی وہ متناسب الاعضاء بھی ہو اور سیرت کے اعتبار سے بھی اعتدال پر*۔
سورۃ مریم میں فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹) کے یہی معنی ہیں۔ سَوِيًّا
عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ بمقابلہ مُكِبًّا عَلٰی وُجُوهِہِمْ (۶۴) میں آیا ہے۔

سَوَاہُ تَسْوِيَّةٌ اور آسُوَاہُ کے معنی ہیں اس کو معتدل کر دیا،
ہموار برابر اور یکساں کر دیا*۔ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ (۲۹) کے
معنی ہیں ان میں ٹھیک ٹھیک اعتدال پیدا کر دیا۔ راغب نے کہا ہے کہ
اس کے معنی ”حکمت کے تقاضوں کے مطابق بنانا“ بھی ہیں۔ چنانچہ الَّذِي
خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ (۸۲) کے معنی ہیں خدا وہ ہے جس نے
تجھے (مختلف عناصر کی ترکیبِ نو سے) پیدا کیا اور ایسا بنا دیا جیسا کہ
تناسب و توازن اور حکمت و اعتدال کا تقاضہ ہے*۔

اِسْتَوَىٰ اِلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز تک ذاقی طور پر یا
تدبیر کے ذریعہ پہنچ جانا*۔ یا کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا۔ یا اس کی
طرف متوجہ ہونا**۔ اور اِسْتَوَىٰ عَلٰی میں غلبہ و تسلط کا مفہوم ہوتا
ہے***۔ قرآن کریم میں ہے لِيَسْتَوِيَ اَعْلٰی ظُهُورِہِمْ (۳۳)۔ نیز اِسْتَوَيْتَ
... عَلٰی الْفُلْکِ (۲۸)۔ (سواری کے جانور یا) کشتی پر جم کر بیٹھ جانا۔
غالب اور مسلط ہو جانا۔ (خدا کے عرش پر اِسْتَوَىٰ کے لئے ع۔ ر۔ ش کا
عنوان دیکھئے)۔

سَوَاءٌ کے معنی ہیں دو چیزوں کا باہم دگر برابر ہونا۔ جیسے سَوَاءٌ
زَيْدٌ وَعَمْرٌو۔ زید اور عمرو ہم مرتبہ ہیں۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔
اِسْتَوٰیَا اور تَسَاوٰیَا۔ دو چیزیں ایک دوسرے کے مانند یا مثل اور نظیر
ہوئیں۔ سَاوَيْتُ بَيْنَهُمَا مُسَاوَاةً۔ میں نے ایک کو دوسرے کے برابر
کر دیا۔ اس لئے سَوَاءٌ کے معنی عدل کے آتے ہیں۔ سَوَّيْتُهُ بِہِمْ۔ یا
سَوَّيْتُ بَيْنَهُمَا کے معنی ہیں میں نے ان دونوں میں عدل کیا۔ فَانْبِذْ
اِلَیْہِمْ عَلٰی سَوَاءٍ (۵۸) کے معنی ہیں انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے
(یا برابری کی حالت میں) ان کا معاہدہ ان کی طرف واپس پھینک دو۔ سورۃ
انبیاء میں ہے فَقُلْ اَاَنْتُمْ کُمْ عَلٰی سَوَاءٍ (۲۱)۔ میں نے تم سب کو
ساری بات یکساں طور پر کہہ دی ہے۔ زمین کے متعلق قرآن کریم میں ہے
سَوَاءٌ لِّلرَّسَّاءِ لَیْسَ (۱)۔ یعنی زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں
طور پر کھلی رہنی چاہئے۔ سورۃ طہ میں ہے مَکَانًا سَوًی (۲۸)۔ جس

کے معنی یہ ہیں کہ یہ شرائط ہم پر اور تم پر یکساں طور پر عائد ہوں گی۔ یعنی ہم اور تم یکساں پوزیشن میں ہونگے۔ راغب نے کہا ہے کہ مَكَانٌ سَوًی اس مقام کو کہتے ہیں جس سے دونوں طرف کے فاصلے برابر ہوں۔ لیکن ابن سیدہ نے لکھا ہے کہ سَوًی اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر نشانات لگے ہوں کہ لوگ ان سے اس مقام کا راستہ معلوم کر لیں*۔ نِزَ السَّوَاءُ کسی چیز کے وسط اور درمیان کو بھی کہتے ہیں۔ سَوَاءُ السَّبِيلِ کے معنی ہیں راستہ کا درمیانی حصہ۔ اور سَوَاءُ الْجَحِيمِ (۳۷/۵۳) کے معنی ہیں جہنم کے عین وسط میں*۔ فَسَوَّاهَا (۹۱/۱) کے معنی ہیں خدا نے ان کے شہروں کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ یعنی وہ سب بستیاں تباہ ہو گئیں*۔ سورۃ نساء میں ہے لَوْ تَسَوَّوْا لِبَهِیمٍ اِلَّا رُضً (۳۲/۳)۔ اے کاش ان پر زمین ہموار کر دی جاتی۔ یعنی وہ اس سے قبل ہی ہلاک و برباد ہو چکے ہوتے۔ سورۃ کہف میں سَوَّوْا کے معنی ہموار کر دینے کے ہیں۔ (۹۶/۱)۔

سَوًی اور السَّوَاءُ کے معنی غیر کے بھی آتے ہیں۔ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ سَوَّاكَ وَ سَوَاءَكَ کے معنی ہیں میں تیرے سوا کسی اور آدمی کے ساتھ گزرا۔ یعنی تیرے ساتھ نہیں بلکہ ایک اور شخص کے ساتھ*۔

سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے فَاسْتَوًی (۵۳/۶)۔ اس ایک لفظ میں شرف انسانیت کا انتہائی کمال، معجزانہ طور پر ممٹ کر آگیا ہے۔ یعنی حضورؐ سیرت و کردار اور علم و بصیرت کے اعتبار سے انتہائی اعتدال لئے ہوئے تھے اور آپکی ذات میں یہ خصوصیتیں کمال تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے بعد آپؐ مقام نبوت پر فائز ہونے کے اہل قرار پائے تھے۔ نبوت ہر کس و ناکس کو نہیں مل جایا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ جسے اس موہبتِ کبریٰ کے لئے منتخب کرتا تھا اس کی تربیت خدا کی نگرانی میں ہوتی تھی اور اس کی ذات معراج انسانیت کی مظہر بن جاتی تھی۔

سی ب

سَابَ - یَسِيبُ*۔ وہ تیز چلا*۔ سَابَ الْمَاءُ۔ پانی بہا اور ہر طرف گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوام اور تسلسل کے ساتھ چلتے رہنے کے ہیں۔ جیسے یَسِيبُ الْمَاءُ۔ پانی کے جاری ہونے کو کہتے ہیں۔ سَیَبْتُ*۔ میں نے اس چیز کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہے جائے۔ اسی مادہ سے السَّائِبَةُ ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب بعض جانوروں

کو (مقررہ بچے دے چکنے کے بعد یا کسی کٹھن مرحلہ سے بخیر و خوبی گزار دینے کی وجہ سے یا بطور نذر) دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہے کھاتے پیتے۔ کوئی انہیں روکتا نہیں تھا۔ (جیسے ہندوستان میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) *۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی توہم پرستیوں اور مشرکانہ رسوم کی سند خدا نے کہیں نازل نہیں کی۔ یہ سب تمہارے اسلاف کی خود ساختہ رسوم ہیں۔ اسلئے انہیں چھوڑ دو۔ (۱۰۳/۵)۔

س ی ح

سَاحَ السَّمَاءُ - زمین کے اوپر پانی کا بہنا۔ السَّيْحُ - سطح زمین پر بہتا پانی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بھی مسلسل چلتے رہنے کے ہیں۔ السَّيْحَةُ - زمین میں چلنا پھرنا۔ سیاحت کرنا (۹/۲)۔ بعض کا خیال ہے کہ السَّيْحُ اسی سے ہے۔ لیکن دوسروں نے اسکی تصریح کی ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان م۔ س۔ ح) السَّيْحُ - سیر و سیاحت کرنے والا *۔ قرآن کریم میں مومنین کی صفات میں السَّيْحُونَ (۹۱۲/۱) اور مومن عورتوں کے لئے سَيِّحَاتٌ (۶۱/۱) آیا ہے۔ (اگرچہ بعض کے نزدیک اس سے مراد ”روزہ رکھنے والے“ ہیں لیکن) راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو باقتضائے فرمان خداوندی أَفْلَحَ يَسِيرُونَ فِي الْأَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ بِعَقْلِهِمْ بِيَهُمْ أَوْ أَذَانٌ يَسْمَعُونَ بِيَهُمَا (۲۴/۲) عقل و فہم اور عبرت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں **۔ یہی مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔ السَّيْحَةُ - کھلی جگہ۔ میدان۔ گھروں کے درمیان کی کھلی اور خالی جگہ۔ نیز گھر کے صحن کو سَاحَةُ الدَّارِ کہتے ہیں *۔ (۱۳۷/۱)۔

مومن عورتوں کی صفت سَيِّحَاتٌ (سیاحت کرنے والیاں) کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ نظریہ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس رکھنا چاہیئے کسقدر غیر قرآنی ہے۔

س ی ر

السَّيْرُ - چلنا۔ جانا۔ دن کو ہو یا رات کو۔ [لیکن سَرَى رات کے چلنے کو کہتے ہیں (۱۵/۱؛ ۱۴/۱)۔ اس کے لئے عنوان م۔ ر۔ ی دیکھئے]۔

سَارَ الرَّجُلُ - آدمی چلا - سَيَّرَهُ - اس نے اسے چلایا ، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا - سَيَّرَهُ - روش - رفتار - چال - طور طریق - ہیئت - حالت * - سَنُعِيدُهُمَا سَيَّرَتَهُمَا 'الاولیٰ' (۲۱) ”ہم اسے اسکی پہلی حالت پر لوٹا دینگے“ - راغب نے کہا ہے کہ سَيَّرَهُ ایسی حالت کو کہتے ہیں جو کسی میں طبعی یا اکتسابی طور پر ہو - اَلسَّيَّارَةُ - ساتھ چلنے والوں کی جماعت - قافلہ (۱۲/۱۹) -

قرآن کریم اپنے قوانین کی صداقت کی دلیل میں تاریخی شواہد کو بار بار پیش کرتا ہے - اس کے لئے وہ کہتا ہے کہ سَيَّرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ (۶۱) - زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے ہمارے قوانین کو سچا نہیں سمجھا تھا - اس میں تاریخی استقراء اور حفارت (Archaeology) دونوں آجاتے ہیں - یعنی اگر وہ قومیں (طبعی طور پر) زندہ ہیں تو ان کے احوال و کوائف کے مطالعہ سے ، اور اگر وہ باقی نہیں رہیں تو ان کے آثار قدیمہ پر غور و فکر سے -

س ی ل

سَالِ الْمَاءُ - پانی بہہ گیا - أَسَالَهُ کسی نے اسے بہا دیا - مَاءٌ سَيَّلٌ - بہنے والا پانی - السَّيَّلُ - بہت زیادہ بہتا ہوا پانی - سیلاب - اَلِسَّيْلَةُ - پانی کے بہنے کا انداز -

سورة رعد میں ہے فَسَالَتْ أَوْدِيَّتُهُ (۱۳) - وادیاں بہ نکلتی ہیں - فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا (۱۳) - پس سیلاب جھاگ کو بہا لے جاتا ہے -

سورة سبا میں سَيَّلَ الْعَرَمَ (۳۳/۱۶) آیا ہے - زور کا سیلاب - اسی سورة میں ہے وَأَسَلْنَاهُ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۳/۱۲) - ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا -

سین

اَلِسْتَيْنِ - ویسے تو ایک حرف (س) ہے جس کے لئے (س) دیکھئے - لیکن اِسْ (۳۶/۱) کے معنی ”اے انسان“ - یا ”اے سردار“ کے ہوتے ہیں - لغت طے میں اِسْ - يٰۤاِنْسَانُ! کو کہتے ہیں - یہ دراصل انسان ہی کی مخفف شکل ہے اور عربی زبان میں الفاظ کو اسطرح مخفف کر لینے کا عام

* تاج و محیط و راغب -

رواج تھا۔ مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کَفَىٰ بِالسَّيْفِ شَا۔ یعنی کَفَا بِالسَّيْفِ شَاهِدًا۔ یا کسی شاعر کا ایک مصرعہ ہے۔ قُلْنَا لَهَا قِيفِي لَنَا قَالَتْ قَافٌ۔ یہاں وَقَفْتُ کی جگہ اس نے صرف ”قَاف“ کہا ہے*۔

السَّيْنُ۔ ستون اور سہارے کو کہتے ہیں۔ (مثلاً چھت کی کوئی کڑی کمزور ہو گئی ہے تو جو دوسری لکڑی اسے سہارا دینے کے لئے لگادی جائے اُسے سَیْنٌ کہا جاتا ہے) کیونکہ فینقی زبان میں اسکی شکل ہی ستون کے مشابہ ہوتی تھی**۔

سَیْنَاءُ۔ ایک قسم کے پتھر کو کہتے ہیں۔ وَطُورِ سَیْنِیْنِ (۶۵)۔ وَمِنْ طُورِ سَیْنَاءَ (۲۳) سینا (پتھروں کا) پہاڑ۔ شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اَلِسَّیْنِیْنَةُ۔ ایک قسم کے درخت کو کہتے ہیں۔

سَیْنَاءُ

طُورِ سَیْنَاءَ (۲۳) یا طُورِ سَیْنِیْنِ (۶۵) شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین)۔

سَیْنِیْنِ

طُورِ سَیْنِیْنِ (۶۵)۔ یا طُورِ سَیْنَاءَ (۲۳)۔ شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین)۔

ش

ش ا م

الشَّوْ مُسِي - بایاں ہاتھ - یہ اَلْيَمْنِي (دایاں ہاتھ) کی ضد ہے - اسی اعتبار سے الشَّوْ مُ (يَمْنٌ کی ضد ہے) - یعنی نحوست - صاحب تاج العروس نے شَوْ مُ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کے انجام کو ناپسند کیا جائے اور اس سے ڈرا جائے - قَدْ شَأْمَهُمْ - اس نے ان پر نحوست مسلط کر دی - رَجُلٌ مَشْشُومٌ - منحوس آدمی * - (نحوست کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان ن - ح - س دیکھئے)۔

قرآن کریم میں اصْحَابُ التَّيْمَنَةِ کے مقابلہ میں اصْحَابُ التَّمَشُّمَةِ (۵۶/۹) آیا ہے - بائیں ہاتھ والے - یعنی بدبختی والے - جن کی شَأْمَةٌ اعمال ان کے لئے عذاب بن کر آجائے -

ملک شام کو شَأْمٌ *** اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قبلہ سے بائیں جانب واقع ہے *** -

ش ا ن

الشَّيْءَانُ - (جمع الشَّيْءُونُ) - امر - معاملہ (بالخصوص اہم اور قابل لحاظ) حالت *** - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسے معاملہ اور حالت کے لئے بولا جاتا ہے جو گرانقدر عظمت کا حامل ہو *** - شَأْنٌ شَأْنُهُ - اس نے اس کا قصد کیا ،) اسی سے اہم معاملہ کو شَأْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا قصد کیا جاتا ہے (نیز اس نے وہ کام کیا جسے وہ اچھی طرح انجام دے سکتا تھا - شَأْنُ الرَّأْسِ - کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ -

* تاج نیز ابن فارس - ** بعض اسے غیر مہموز بھی بتاتے ہیں - *** تاج - *** راغب -

الشَّانُ - ایک رگ کا نام ہے جس سے آنکھ تک خون پہنچتا ہے - نیز وہ راستہ جس کے ذریعہ آنکھوں سے آنسو آتا ہے - شُؤْنُ الْخَمْرِ - شراب کا وہ حصہ جو جسم کے رگ و پے میں سرایت کر جائے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تلاش، طلب اور ارادہ کے ہیں -

سورة رحمن میں ہے یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ - كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۲۹) - کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (انسانوں سمیت) وہ سب اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کے محتاج ہیں - یہ اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے - دوسرے حصے میں هُوَ سے مراد اللہ لیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں کہ وہ ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے - اس لئے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں هُوَ سے مراد مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لیا جائے تو بہتر ہے - اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے، اور ان اشیاء کی نشو و نما کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں - ان کی مختلف حالتوں میں نشو و نما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشو و نما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے - (۱۲) - اور اس طرح اشیاء کائنات کی (Development) کا سلسلہ، قانون ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے -

سورة یونس میں ہے وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ (۱۱) - تو جس حال

میں بھی ہو -

ش ب لا

تَشَابَهَ کے معنی ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے اس طرح ملتا جلتا اور مانند اور مشابہ ہونا کہ ان میں التباس ہونے لگے اور امتیاز مشکل ہو جائے - شَبَّهَهُ اَيْتَاهُ کے معنی ہیں اسنے فلاں چیز کو فلاں چیز کی مثل بنا دیا - دونوں کو ایک دوسری سے ملتا جلتا ہوا بنا دیا - اَلِشَّبَّهُ وَالشَّبَّهُ وَالشَّبَّيْهُ کے معنی ہیں مثل اور مانند - اور شَبَّيْهِ عَلَيْهِ اَلَا مَرُّ کے معنی ہیں بات اس پر مشتبہ، غیر واضح (ملتبس) ہو

گئی *۔ تَشْبِيْهٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی ہوئی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا۔ مُشَابَهَةٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا *۔

قرآن کریم میں مُتَشَابِهًا (۲۵) کے معنی ہیں باہم ملتا جلتا۔ اور اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا (۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ وہ گائے کس قسم کی ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے لئے سب گائیں ملتی جلتی ہیں اسلئے التباس (شبہ) واقع ہو رہا ہے۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (۱۱۹) کے معنی ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ باہمی مشابہت اور موافقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مُشْتَبِهًا وَغَيْرُ مُتَشَابِهٍ (۱۰) کے معنی ہیں آپس میں ملتے جلتے، اور ایسے جو ملتے جلتے نہیں۔ انہی کو دوسری جگہ مُتَشَابِهًا وَغَيْرُ مُتَشَابِهٍ (۱۲) کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کو مَحْکَمَاتٌ اور مُتَشَابِهَاتٌ کہا گیا ہے (۱)۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مَحْکَمَاتٌ کے ضمن میں (ح - ک - م) کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ [نیز ث - ن - ی کے عنوان میں مُتَشَابِهًا مَثَانِي بھی دیکھئے ۳۹]

سورة النساء میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں ہے کہ یہودیوں نے نہ تو مسیحؑ کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب دیا وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۱۵۷) ان پر حقیقت مشتبہ ہو گئی۔ (بات کیا ہوئی تھی؟ اس کی تفصیل میری کتاب ”شعلہ مستور“ میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق حصہ میں دیکھئے)۔

ش ت ت

شَتَّه - يَشْتَتُهُ - شَتًّا - شَتَاتًا - اس نے اسے الگ الگ اور متفرق کر دیا۔ دور کر دیا۔ شَتَّ - وہ متفرق اور جدا جدا ہو گیا (لازم و متعدی)۔ اَمْرٌ شَتٌّ - متفرق معاملہ *۔ (اسکی جمع اَشْتَاتٌ ہے)۔ کہتے ہیں جَاءُوا اَشْتَاتًا - وہ الگ الگ متفرق طور پر آئے۔ سورة النور میں ہے جَمِيعًا اَوْ اَشْتَاتًا (۲۳)۔ اکھٹے یا الگ الگ۔ سورة الليل میں ہے اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى (۱۲)۔ تمہاری جد و جہد مختلف اور ایک دوسرے سے جداگانہ (سمتوں میں ہوتی) ہے۔ یعنی ہر فرد کے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ نیز، ایک فرد کی

زندگی میں بھی مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر چند یہ مقاصد مختلف اور متنوع ہوتے ہیں لیکن اگر بہ ہیئت مجموعی ان کی تقسیم کی جائے تو یہ دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک اعطیٰ کی شق (۹۲) اور دوسری بخیل کی شق (۹۱)۔ اعطیٰ سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشوونما کے لئے بھی دے۔ اور بخیل سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنے مفاد تک محدود رکھے۔ پہلی شق وجہ بالیدگی شرف انسانیت ہے اور دوسری شق، باعث تذلیل انسانیت۔

سورة طہ میں ہے نَبَاتٍ شَتَّی (۲۰)۔ انواع و اقسام کی بوٹیاں اور پودے۔ (شَتَّی جمع ہے شَتَّیَّت کی جس کے معنی ہیں جدا کیا ہوا، جداگانہ، الگ۔)

ش ت و

الشَّیْتَاءُ۔ سردی کا موسم۔ عرب والے سال کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک شتاء، دوسرا صیف۔ پھر شتاء کے دو حصے، جن میں سے آخری تین مہینے رَبِیْع کے ہوتے۔ اسی طرح صَیْف میں قَیْظ کے تین مہینے ہوتے۔ یوں سال چار موسموں میں بٹ جاتا تھا۔ چونکہ بالعموم سردی کے موسم میں عرب سفر کے لئے کم نکلتے تھے اور روزی تلاش کرنے کے بجائے گھروں ہی میں رہتے تھے لہذا اس زمانہ میں غلہ اور چارہ کی دقت ہوتی تھی۔ اس لئے الشَّیْتَاءُ قَحِطٌ کو بھی کہتے تھے۔ اور صَاحِبُ الشَّتْوَةِ وہ شخص جس کی طرف لوگ سردی اور خشک سالی کے مصائب سے گھبرا کر رجوع کریں۔**

قرآن کریم میں قریش کے قافلوں کے لئے رَحْلَةُ الشَّیْتَاءِ وَالصَّیْفِ (۱۰۶) آیا ہے۔ یعنی ان کے سردی اور گرمی کے موسم کے سفر۔ اس سے درحقیقت مراد سارا سال ہے۔

ش ج ر

شَجَرٌ۔ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہو جائے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں*۔ اسی سے شَجَرٌ بَیْنَهُم کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔ (قرآن کریم میں فِیْہَا شَجَرٌ بَیْنَهُم (۶۵) باہمی اختلافات کے معنوں میں آیا ہے)۔

شَاجِرَ فُلَانٍ* فُلَانًا۔ فلاں نے فلاں سے منازعت و مخاصمت کی۔
 الشَّجَرُ*۔ کے معنی درخت ہیں*۔ (یہ جمع ہے۔ ایک درخت کوشَجَرَةٌ*
 کہیں گے)۔ غالباً اس لئے کہ اس کے تنہ کے ایک ہونے کے باوجود اس کی شاخیں
 منتشر اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی شَجَرُ کے بنیادی معنی ہیں۔ اگرچہ
 تاج العروس میں ہے کہ تَشَاجِرُ کے معنی میدان جنگ میں فوجوں کا باہمی
 گتھم گتھا ہو جانا ہے اور چونکہ درخت کی شاخیں بھی ایک دوسرے میں
 گتھم گتھا ہوتی ہیں اس لئے اسے شَجَرُ کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی مفہوم
 کے اعتبار سے پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ یعنی ایک تنے کے بعد
 شاخوں کا منتشر ہونا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا
 بلند ہونا اور اس کے اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسے رہنا بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ فَلَاحَ
 تَقَرَّبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵)۔ اس شجر کے قریب نہ جانا۔ جیسا کہ آدَمُ
 کے عنوان (دیکھئے ا۔ د۔ م) میں لکھا جا چکا ہے، قصہ آدم در حقیقت نوع انسانی
 کی تمثیلی سرگزشت ہے۔ انسان اپنی تمدنی زندگی سے پہلے ایسی حالت میں رہتا
 تھا کہ اس کی ضروریات بہت قلیل تھیں اور سامانِ خور و نوش بافراط تھا۔
 اس لئے ان میں باہمی افتراق و اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد جب انسانی شعور
 نے ذرا ترقی کی تو اس نے تمدنی اور معاشرتی زندگی شروع کی۔ اس سے مختلف
 افراد (اور اس کے بعد مختلف قبائل) کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests)
 شروع ہوا اور اس تصادم سے باہمی اختلاف و افتراق پیدا ہوا۔ وَمَا كَانَ
 النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۱۹)۔ ”نوع انسانی پہلے ایک
 ہی جماعت تھی لیکن بعد میں انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کر
 دیے“۔ یہ مطلب ہے فَلَا تَقَرَّبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) سے۔ یعنی
 ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ دیکھنا! تم سب کی اصل ایک ہی ہے۔ اس لئے
 تم نے باہمی اختلاف و افتراق پیدا نہ کر لینا۔ لیکن عقل خود ہیں (ابلیس) نے،
 جو ہر فرد کو اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے (برعکس عقل جہاں ہیں
 کے جو پوری نوع انسانی کے تحفظ کی فکر کرتی ہے) انہیں انفرادی مفاد
 پرستیوں کی طرف مائل کر دیا، اور اس طرح یہ آپس میں ایک دوسرے کے
 دشمن ہو گئے (۲/۳۶)۔ لہذا اس مقام پر شَجَرُ سے مفہوم انسانوں کے وہ
 باہمی اختلافات ہیں جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں

* تاج۔ ** (نوع انسانی کو پھر سے ایک ہی جماعت بنکر رہنا ہے لیکن یہ وحدت
 انسانیہ وحی کے ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں)۔ (۲/۱۳)۔

اور جن کا حیل صرف یہ ہے کہ انسان وحی کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرے (۲/۳۸)۔ اسی کو ربوبیت عالمینی کہتے ہیں۔

ش ح ح

الشَّحُّ ۱۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس نقشے کو سامنے لائیں کہ سخت گرمی کا موسم ہو، کسی جگہ تھوڑا سا پانی ہو اور بہت سے پیاسے۔ ایسی حالت میں دو آدمی جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل کر پیچھے ہٹانے اور آگے بڑھ کر اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اسے تَشَاَحَّحًا الْمَاءِ یا تَشَاَحَّاهُ کہتے ہیں*۔ قرآن کریم کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی نشو و نما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے۔ لہذا شَحُّ ۲۔ نَفْسِ اس خصوصیت کی ضد ہوا۔ یہ مفہوم سورۃ حشر کی اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ يُوْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹)۔ وہ خود تنگی ہی میں کیوں نہ ہوں دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يُّوقْ شَحُّ نَفْسِهِ فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۹)۔ یاد رکھو! جو شخص (یا قوم) شَحُّ نَفْسِ سے اپنے آپ کو بچائے انہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔ یعنی دنیا کے عام قاعدے کی رو سے، اُسی کسان کی کھیتی میں فصل اگتی ہے جو اسے سیراب کرے۔ لیکن نظام ربوبیت میں اس کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو دوسرے کے کھیت کی سیرابی کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ تَشَاَحُّ الْقَوْمُ کے معنی ہیں، لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے ہاتھ سے چیز نہ جاتی رہے۔ تَشَاَحَّحًا عَلٰی الْاَمْرِ۔ وہ دونوں اس معاملہ میں جھگڑے اور ان میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ تھا کہ وہ چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روکنے کے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تَشَاَحُّ الْقَوْمُ وغیرہ کے یہی معنی نہیں ہونگے کہ اس قوم نے ایک دوسرے سے بڑھنے میں کوشش کی بلکہ یہ بھی کہ خود آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی۔ اس سے شَحُّ ۳ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ نفسیاتی کیفیت کہ آگے بڑھ کر ہر چیز کو اپنے لئے مختص کر لینا اور دوسروں کو روکنا کہ اس چیز تک پہنچ نہ جائیں۔

اس بنیادی معنی کے اعتبار سے الشُّحُّ - بدترین قسم کی خود غرضی کو کہتے ہیں جس میں بخل اور حرص دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بخل صرف مال میں ہوتا ہے لیکن شُّحُّ مال اور دیگر ہر قسم کی بھلائیوں کو اپنے لئے مخصوص کرنے کے لئے آتا ہے*۔ اپنے لئے مخصوص کرنے اور دوسروں کو ان تک پہنچنے سے روکنے کے لئے۔ راغب نے کہا ہے کہ شُّحُّ اس وقت کہتے ہیں جب انسان میں یہ کیفیت عادتاً پائی جائے۔

ابیل شَحَائِح بہت کم دودھ دینے والی اونٹنیوں کو کہتے ہیں۔ اور زَنْد شَحَاح اس چقماق کو جس سے آگ نہ نکلے۔ مَاء شَحَاح۔ بہت تھوڑا سا پانی**۔ سورة احزاب میں اَشِحَّة کا لفظ آیا ہے (۳۳/۱۹)۔ (اس کا واحد شَحِيح ہے)۔ یعنی سخت بخیل و حریص۔

ش ح م

الشَّحْمُ - چربی (جمع شُحُوم)۔ الشَّحْمَةُ - چربی کا ٹکڑا۔ عرب اونٹ کے کوہان کو بھی الشَّحْمُ کہہ دیتے ہیں***۔

قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَ مَہُمَا (۱۳۷/۱)۔ ان پر (گائے اور بکری کی) چربی حرام کر دی گئی تھی۔

ش خ ص

شَخْصٌ - ہر دور سے نظر آنے والے جسم کو کہتے ہیں جو بلند ہو۔ بلندی کے اعتبار سے کہتے ہیں شَخْصٌ الْجُرُح - زخم اونچا یعنی متورم ہو گیا۔ شَخْصٌ شُخُوصًا وہ بلند ہو گیا۔ شَخْصٌ السَّهْمُ - تیرنشانے سے اونچا ہو گیا***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلندی پائی جاتی ہے۔

شَخْصٌ بَصَرَةً کے معنی ہیں اس نے بغیر جھپکائے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا۔ دہشت کے مارے جب کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں تو اس وقت بولتے ہیں***۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے تَشْخِصُ فِيْہِ الْاَبْصَارُ (۱۴/۱)۔ اس انقلاب عظیم کے وقت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ سورة انبیاء میں ہے فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۲۱/۱)۔ اس نظام سے انکار کرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

* تاج** محیط*** تاج و محیط و راغب۔

ش ح ن

شَحْنُ السَّفِينَةِ يَشْحَنُهَا - کشتی کو بھر دیا اور جو سامان اس میں لادنا تھا لاد دیا * - قرآن کریم میں الْفُلُکِ الْمَشْحُونِ (۲۶/۱۱۹) آیا ہے - یعنی بھری اور لدی ہوئی کشتی - اَلِشَّحْنَةُ - وہ مال و اسباب وغیرہ جس سے کشتی کو بھرا جائے - اَلشَّحْنَةُ - وہ چارہ جو جانوروں کے لئے اکٹھا کر کے رکھ لیا جائے اور ایک رات دن کے لئے کافی ہو - شَحْنٌ - شَحْنًا کے معنی جھڑک دینے، دور کر دینے کے بھی آتے ہیں - (غالباً) اسی سے اَلِشَّحْنَةُ - بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ کے ناظم کو کہتے ہیں - اَلْمُشَّاحِنُ - بغض و کینہ دل میں بھرا رکھنے والا ** -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بھر دینا اور دور کر دینا دونوں آتے ہیں، لیکن یہ دونوں الگ الگ ہیں - یعنی ان میں وجہ جامعیت کوئی نظر نہیں آتی -

ش د د

اَلِشَّدَّةُ - سختی اور صلابت کو کہتے ہیں - شَدَّ - اس نے مضبوط اور محکم کیا - شَيْئٌ شَدِيدٌ مُشْتَدٌّ - بہت مضبوط چیز - اَلشَّدُّ - کسی کو مضبوطی سے باندھ دینا - اَلِشَّدَّةُ - بہادری اور ثبات قلب - اَلشَّدِيدُ شَجَاعٌ - بہادر - قوی - نیز بخیل کو بھی کہتے ہیں - چنانچہ اِنْشَاءً لِيَحْسَبَ الْخَيْرُ لَشَدِيدٍ (۱۰۰/۱) میں شَدِيدٌ کے معنی بخیل ہیں - اَلْاَشَدُّ - من بلوغ - من رشد - وَاَشَدُّ دُعَاً عَلَى قُلُوبِهِمْ (۱۸۸/۱) کے معنی ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دے *** -

قرآن کریم میں من بلوغ و من رشد کے لئے لفظ اَشَدُّ اکثر مقامات پر آیا ہے - (مثلاً ۱۳۳/۱؛ ۱۵۳/۱؛ ۱۶۴/۱) - سورۃ نساء میں (۴/۲) میں یتیموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب تک وہ ”نکاح کی عمر“ کو نہ پہنچیں ان کے مال کی نگرانی کرو - اور دوسرے مقامات (۱۵۳/۱؛ ۱۳۳/۱) میں کہا گیا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ جوانی کو نہ پہنچ جائیں - اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر، جوانی ہے، صغر رسانی نہیں -

(۱۸۸/۱) میں ان یتیموں کے متعلق جن کی دیوار گر رہی تھی اور جسے حضرت موسیٰؑ اور انکے رفیق سفر نے کھڑا کر دیا تھا یہی کہا گیا ہے -

(۲۲) میں عام انسانوں کی جوانی کی حالت کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ (۲۸) میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔

سورۃ یوسف میں شِدَادٌ کا لفظ کٹھن سالوں کے لئے آیا ہے (۱۲/۳۸)۔ یہ شَدِید کی جمع ہے۔ نیز اسکی جمع اَشِدَّاءُ بھی آتی ہے۔ سورۃ الفتح میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے اَشِدَّاءُ عَلٰی الْکُفَّارِ (۲۹/۳۸)۔ اسکی معنی یہ ہیں کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں بہت قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اَشَدُّ - زیادہ سخت اور مضبوط (۲/۲۳)۔ اَشْتَدُّ - سختی سے حملہ کرنا، یا تیزی سے چلنا۔ (۱۳/۱۸)۔

ش ر ب

شَرِبَ - یَشْرَبُ - پینا۔ سیراب ہونا۔ اَلشَّرَابُ - ہر وہ پینے کی چیز جسے چبانا نہ پڑے (۲۹/۲۵)۔ اَلْمَشْرَبُ - پانی۔ پانی پینا۔ پانی پینے کا گھاٹ۔ پینے کا وقت یا پینے کی جگہ۔ وہ طریقہ جس سے پانی پیا جائے*۔ طَعَامٌ ذُوْ مَشْرَبَةٍ وہ کھانا جسکی بعد بہت پیاس لگے**۔

قرآن کریم میں مَشْرَبَہْمُ (۲/۶۰) میں آیا ہے، جسکی معنی پانی پینے کی جگہ، یا خود پانی کے ہیں۔ شَرِبَ (۲۶/۱۵۵)۔ پانی پینے کا حصہ یا باری۔ یا پانی پینے کا وقت۔ پینا۔ شَرِبَ (۵۶/۵۶)۔ پینا۔ شَارِبٌ (۱۵/۲۴)۔ پینے والا۔ (اسکی جمع شَارِبُوْنَ اور شَارِبِیْنَ ہے)

سورۃ بقرہ میں شَرِبَ کے بعد یَطْعَمُوْہُ آیا ہے (۲۹/۲۴)۔ یہاں شَرِبَ کے معنی ہیں سیر ہو کر پینا اور طَعِمَ کے معنی پانی کا چکھنا۔

قصہ بنی اسرائیل میں آیا ہے وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلُ (۹۳/۲)۔ اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ بچھڑا ان کے دلوں میں پلا دیا گیا۔ لیکن استعارۃً مفہوم یہ ہے کہ بچھڑے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس کی محبت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

ش ر ح

شَرَحَ - کھولنا۔ واضح کرنا*۔ رَاغِبٌ نے کہا ہے کہ اسکی معنی گوشت کو پھیلا دینے کے ہیں***۔ کشادہ اور وسیع کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نیز اسکی معنی ہیں سمجھ میں آجانا۔ شَرَحَ اَلْبَابَ - دروازہ کھول دیا۔ شَرَحَ اَلْکَلَامَ - بات کو سمجھ لیا****۔

* تاج و محیط۔ ** اقرب الموارد۔ *** راغب۔ **** محیط۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، یَشْرَحُ صَدْرَهُ لِيَسْلَامَ (۱۲۶)۔ اسلام کیلئے اس کے سینے میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لفظ میں بات کے سمجھنے کی صلاحیت، صحیح بات کو قبول کرنے کی استعداد، اور حق کو اختیار کر لینے کی جرأت، سب خصوصیات آجاتی ہیں۔ اس کے برعکس غلط راستے پر چلنے والوں کے متعلق فرمایا کہ يَجْعَلُ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا (۱۲۶)۔ وہ اس کا سینہ تنگ، بھنچا ہوا کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرح صدر بہت بڑی خصوصیت ہے جسے حاصل ہو جائے۔ تعصب سے ہٹ کر، بات کو دلائل و بصیرت کی بناء پر (On Merits) سمجھنا۔ حق و صداقت اور حسن و خوبی جہاں بھی ہو، اُسے (Appreciate) کرنا، اور پھر تمام مخالفتوں کے علی الرغم اسے اختیار کر لینا۔ نیز اُسے اسی طرح تفصیل و تبیین سے آگے پہنچانا۔ ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ دشمن تک سے فراخ دلی برتنا۔ کہیں تنگ نظری کا ثبوت نہ دینا۔ یہ سب باتیں شرح صدر میں آجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولو العزم انبیائے کرام نے ہمیشہ خدا سے شرح صدر (وسعت قلب و نگاہ اور رفعت عزم و ہمت) کی دعائیں مانگی ہیں (۲۵)۔ اور خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یہ شرح صدر کی بدولت ہے کہ ان کی اس قدر سخت مہم یوں آسان ہو گئی اور اس طرح ان سے ذمہ داریوں کا وہ بوجھ ہلکا ہو گیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ رہی تھی (۱۳۲)۔ ورنہ مخالفین کی کمینہ حرکات ایسی تھیں جن سے انسان کا دم گھٹنے لگ جائے (۱۵)۔

لہذا قرآن کریم کی رو سے معاملات کے آسان ہونے کیلئے شرح صدر نہایت ضروری ہے (۲۵-۲۶ ; ۱۳۲) اور ہر مسلم کا یہی شعار ہونا چاہئے (۱۲۶)۔ جس شخص میں تنگ نظری اور دوں ہمتی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کا سینہ اسلام کی روشنی کے لئے کشادہ نہیں ہوا۔ (۳۹) میں اسے قساوتِ قلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز شَرَحَ بِهِ صَدْرًا کے معنی ہیں کسی چیز کو بطیب خاطر قبول کرنا۔ اس کے لئے اپنا دل کھول دینا۔ (۱۶)۔

ش ر د

شَرَدَ الْبَعِيرُ۔ اونٹ بدک کر بھاگ نکلا۔ التَّشْرِيدُ۔ جھڑک دینا۔ نکال دینا۔ منتشر کر دینا۔ کسی کو بدک کر بھاگ دینا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَرَدْتُ بِهِم کے معنی ہیں، میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام کبھی نہ کریں۔ ویسا کام کرنے سے بدکیں اور

باز رہیں۔ **۔ قرآن کریم میں ہے فَشَرَّ دُ بِيْهِمْ مِّنْ خَلْفَتِهِمْ (۵۷)۔ یعنی انہیں ایسا مزہ چکھاؤ کہ جو لوگ ایسے ہی مقصد کیلئے ان کے پیچھے آرہے ہیں وہ ان کی اس حالت کو دیکھ کر خود بخود بھاگ جائیں۔ متوحش ہو جائیں (اس لئے کہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بد کننا اور دور ہو جانا ہیں)۔

ش ر ذ م

شِرْ ذِمَّةٌ۔ تھوڑی سی جماعت۔ بڑی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانے والی پارٹی۔ ثِيَابٌ شَرَّازِمٌ۔ پرانے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ چیتھڑوں کو کہتے ہیں۔ ***۔ قرآن کریم میں شِرْ ذِمَّةٌ قَلِيلٌ لَّوْنٌ (۲۶) آیا ہے۔ یعنی حقیر اور قلیل سی جماعت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں ذال زائد ہے۔ یہ دراصل شَرَمْتُ الْقَشِيَّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو پارہ پارہ کر دینا ہیں۔ چھوٹی سی جماعت کو اس لئے شِرْ ذِمَّةٌ کہتے ہیں کہ وہ بڑی جماعت سے پھٹ کر الگ ہوتی ہے۔

ش ر ر

شَرٌّ۔ خَيْرٌ کی ضد ہے (۶۸)۔ لسان العرب میں ہے کہ شَرٌّ۔ برائی (سُوْءٌ) کو کہتے ہیں۔ اور مصباح میں ہے کہ اس کے معنی فساد اور ظلم کے ہیں۔ الشَّرَارُ۔ وَالشَّرَرُ۔ آگ کی چنگاریاں (جو آگ میں سے نکل کر اڑتی ہیں)۔ اس کا واحد شَرَارَةٌ اور شَرَرَةٌ ہے *۔ (۷۲)۔ شَرَّ الْمَاءِ مِّنَ الْقِرْبَةِ۔ مشکیزہ سے پانی لگا تار ٹپکتا رہا۔ نیز الشَّرُّ کے معنی تیزی۔ نشاط۔ غصہ۔ طیش۔ حرص۔ فحش اور سفاقت ہوتے ہیں۔ نیز اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کی طبیعت کے مطابق نہ ہو۔ یا وہ اس کی ضروریات کے راستے میں روک بن جائے۔ ****۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ہو جانے، ادھر ادھر اُڑ جانے اور بکھر جانے کے ہیں۔

راغب کے نزدیک خَيْرٌ اور شَرٌّ دونوں اضافی الفاظ ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کیلئے خیر ہو اور دوسرے کے لئے شر۔ *****۔

چونکہ یہ لفظ خَيْرٌ کی ضد ہے اسلئے اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان خ۔ ی۔ ر بھی دیکھنا چاہئے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے جو بنیادی معنی

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و راغب۔ **** محیط۔ ***** راغب۔ عنوان ”خیر“ میں

بتائے ہیں اس اعتبار سے شرّ کے معنی ہوں گے انسان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اس طرح صرف (یا ضائع) ہونا، بکھر جانا اور منتشر ہو جانا کہ ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس کے برعکس خیر کے معنی ہوں گے انسانی توانائیوں کا تعمیری نتائج پیدا کرنا۔ پانی دریا کے ساحلوں کے اندر مقید ہو کر بہے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے لیکن جب وہ سیلاب کی شکل میں ادھر ادھر بکھر جائے تو شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ہوا نرم روی کے ساتھ ایک سمت میں چلے تو موجب خیر ہے لیکن جب جھکڑ اور آندھی بن جائے تو تباہی کا موجب۔ توانائیوں کا بکھر جانا، قوتوں کا بد لگام ہو کر منتشر ہو جانا شر ہے۔ یہی چیز خود انسانی ذات کے متعلق بھی ہے۔ اگر اس کی قوتیں منتشر (Diffused) ہوں تو اس کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ اگر وہ مرتکز (Crystallised) ہو جائیں تو اس میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

سورة الفلق میں مین "شَرِّ مَآخَلَقَ" (۱۱۳) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس کے شر سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (Evil) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو (جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آ جائے تو شر ہو جائیگا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحی خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا، خیر ہے۔ اور اسے انسانیت کی تخریب کے لئے استعمال کرنا شر۔ باقی رہیں ہماری معاشرتی مصیبتیں، سو وہ معاشرہ کے غلط نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر معاشرہ کے نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کر دیا جائے تو یہ تمام مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت اس انفرادی دکھ، درد (Pain) کی ہے جو طبعی طور پر ہوتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے تسخیر فطرت کرتا جاتا ہے ان تکلیفوں میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

اب رہیں وہ پریشانیاں جو جذباتی طور پر وجہ مصیبت بنتی ہیں۔ سو اگر انسان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو وہ ان پریشانیوں پر بھی غالب آ سکتا ہے۔ زاویہ نگاہ کے بدل جانے سے ان چیزوں کا اثر ہی بدل جاتا ہے۔ اس لئے "ابلیس" سے کہا گیا ہے کہ "إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ" (۱۵)۔ یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکیگا۔

خیر اور شر کے ان گوشوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گا جہاں سے وہ حقائق واضح ہو جائیں گے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مسئلہ خیر اور شر (Good and evil) کی بحث فلسفیانہ طور پر نہیں کی۔ اس لئے کہ اس کا موضوع فلسفہ نہیں۔ اس کا مقصود ایسی راہ نمائی دینا ہے جس سے شر، شر ہی نہ رہے۔ یعنی توانائیاں بکھر کر تخریبی نتائج (Disintegration) نہ پیدا کریں، بلکہ نظم و ضبط کے ساتھ مجتمع ہو کر تعمیری نتائج پیدا کریں۔

واضح رہے کہ ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ کوئی شر فی نفسہ نہ خیر ہے نہ شر، اور ان کا طریق استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے، تو یہ چیز اشیا کے کائنات یا کائنات اور انسان کی قوتوں کے متعلق ہے۔ جہاں تک ان مستقل اقدار کا تعلق ہے جن پر شرف انسانیت (یادین) کی عمارت استوار ہے اور جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں، وہ فی نفسہ خیر ہیں۔ مثلاً عدل و احسان فی نفسہ خیر ہیں۔ اور ان کی ضد ذاتی طور پر شر۔ اسی طرح وہ چیزیں جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، شر پیدا کرنے کا موجب ہیں۔

ش ر ط

الشَّرَطُ - علامت یا نشانی جسے لوگ آپس میں مقرر کر لیں۔ (جمع اشْرَاطٌ)۔ ہر چیز کا پہلا حصہ۔ الشَّرْطَةُ - فوج کا پہلا دستہ جو جنگ میں شریک ہو اور موت کے لئے بالکل تیار ہو۔ گورنر کے اعوان و انصار کی جماعت (کیونکہ وہ اپنے اوپر ایسی علامات لگا لیتے ہیں جن سے وہ پہچانے جائیں)۔ اس کا واحد شَرْطِيٌّ ہے۔ قرآن کریم میں السَّيَاحَةُ (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے فَقَدْ جَاءَ اشْرَاطُهَا (۲/۱۸)۔ اس کی ابتدائی علامات تو آچکی ہیں۔ اب اس کے بعد وہ انقلاب کی گھڑی (وہ فیصلہ کن لڑائیاں جن میں مخالفین (قریش) کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد وہ اُٹھ ہی نہ سکے) جلد آ جائیگی۔

ش ر ع

الشَّرَّيْعَةُ - وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو، کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو۔ یعنی اسے

*تاج و محیط و راغب -

حاصل کرنے کے لئے کسی رسمی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعتہ نہیں بلکہہ کَرَعٌ کہلائیگا۔ اسی سے الشَّارِعُ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں۔ الشَّرْعُ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کھلا ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعٌ کے معنی ظہر ہیں۔ یعنی ظاہر ہو گیا۔ کھل گیا۔ شَرِعَتْ الرِّمَاحُ کے معنی ہیں نیزے سیدھے کئے گئے۔ اَشْرَعُ الشَّيْءُ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا۔ الشِّرَاعُ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں۔ الشَّرِيعَةُ۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں۔ الشَّرِيعَةُ وَالشِّرْعَةُ۔ سیدھا اور واضح راستہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا۔ یعنی اس طرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آ جائے۔

سورة شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ (۳۲)۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی (الدِّین) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے۔ سورة جاثیہ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ رِيعَةٍ مِّنَ الْأُمْرِ (۳۵) پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ)۔ یا شَرِّ رِيعَةٍ مِّنَ الْأُمْرِ سے) مفہوم خود الدین ہے۔ یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ۔ سورة مائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ”ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ما آنزل اللہ کے مطابق فیصلہ کر۔ اور جب تمہارے پاس حق آچکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو“۔ اس کے بعد ہے لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهُمَا جَنًّا (۳۸)۔ ”اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شرعہ (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا (تھا)“۔ یہاں شِرْعَةً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دئے گئے تھے (۳۲)۔ یہاں اس سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی

تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں۔ اس مفہوم کی تائید، سورۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَا زِعُونَنَا لِكُلِّ فِی الْاَمْرِ (۲۴)۔ ”ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں۔ (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں۔“

اس آیت (لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ) کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے۔ جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دیدینا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔ اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً (۵/۸)۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا۔ اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ شریعت سے مراد، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر امت کے لئے چلنا ضروری ہے۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دئے ہیں۔ یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی امت اپنے لئے جزئی احکام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشورہ سے خود مرتب کریگی۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہیں گے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہوتے رہیں گے۔ ان احکام کو اگر شریعت کہا جائیگا تو یہ شریعت بدلتی رہیگی اور اصول شریعت غیر متبدل رہیں گے۔

الشَّرَّ يُعْتَهُ کے ان معانی کو سامنے لائیں جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ ان معانی کے لحاظ سے الشَّرَّ يُعْتَهُ (یعنی الدین کے غیر متبادل اصولوں کی روشنی میں، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہئے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو۔ ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں۔ جس تک ہر ایک کی رسائی ہو۔ جو مسلسل آ رہا ہو۔ بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو۔ لہذا شریعت وہ ہوگی جس میں جمود، تعطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی۔ وہ زندگی بخش نہیں رہے گی۔

سورة اعراف میں حَيْثُ تَأْتُهُمْ . . . شُرْعًا (۱۶۳) آیا ہے۔ شُرْعًا جمع ہے شَارِع کی اور اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو اپنے سر کو اونچا کئے نمایاں طور پر سطح آب کے اوپر آجائیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو سر نیچا کئے جا رہی ہوں۔ (ابن فارس کی عبارت میں تَشْرَبُ ہے جس کے معنی پانی پینے کے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ تَسْرَبُ ہے)۔ لیکن جس مقام پر یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اس کے اعتبار سے پہلے معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ بنی اسرائیل، سبت کے روز کام کاج سے ناغہ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے ماہی گیر اس دن مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے۔ مچھلیوں میں (اور دیگر جانداروں میں بھی) یہ طبعی ملکہ ہوتا ہے کہ جب انہیں پیہم تجربہ سے معلوم ہو جائے کہ ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تو وہ چھپنے کی بجائے کھلے طور پر، انسانوں کے قریب پھرتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ وہ مچھلیاں کرتی تھیں۔ لیکن بنی اسرائیل کے لالچی، ان کی اس روش سے فائدہ اٹھاتے اور سبت کے علی الرغم انہیں پکڑ لیتے۔ (تفصیل س۔ ب۔ ت میں دیکھئے)۔

ش ر ق

الشَّرْقُ - شگاف کو کہتے ہیں۔ شَرَقَ الشَّاةَ - بکری کا کان چیر دیا۔ التَّشْرِيقُ - گوشت کو چیرنا پھاڑنا یا کاٹنا۔ أَيَّامُ التَّشْرِيقِ - یہیں سے ہے جس سے مراد عید الاضحیٰ کے تین دن ہیں جن میں قربانی کا

گوشت چیر کاٹ کر دھوپ میں رکھا جاتا ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روشن کر دینے اور کھول دینے کے ہیں۔ شَرَقَتْ الشَّمْسُ۔ سورج نکل آیا۔ وَأَشْرَقَتِ الشَّمْسُ۔ سورج نے روشنی کر دی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ آيَامُ التَّشْرِيقِ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں لوگ قربانی کے گوشت کو پارچے بنا کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلا دیتے تھے۔ الشَّرْقُ کے معنی آفتاب کے بھی ہیں جبکہ وہ طلوع یا روشن ہو گیا ہو۔ چنانچہ طَلَعَتِ الشَّرْقُ آفتاب نکلنے کے لئے بولتے ہیں۔ لیکن غَرَبَتِ الشَّرْقُ کبھی نہیں کہتے۔ الشَّرْقُ۔ آفتاب کا روشن ہونا۔ وہ جگہ جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ یعنی مشرق۔ الشَّرْقُ۔ آفتاب، عین طلوع ہونے کے وقت *۔

شَرَقَ النَّخْلُ وَأَشْرَقَ۔ کھجور کے درخت لمبے ہوئے یا ان میں سفید شگوفے نکلے۔ شَرَقَ الدَّمُ فَيُعَيِّنِيهِ : اس کی آنکھ سرخ ہو گئی *۔
الْمَشْرِقَانِ۔ وہ انتہائی دو نقاط جہاں سے سورج سردی اور گرمی میں طلوع ہوتا ہے *۔

قرآن کریم میں مَشْرِقُ کے مقابلہ میں مَغْرِبُ آیا ہے (۱۱۵/۲) اور سورۃ ص میں بِالْعِشِيِّ وَالْأَشْرَاقِ بھی آیا ہے (۱۸/۳۸)۔ سورۃ رحمن میں رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (۵۵/۱) آیا ہے۔ یعنی سردی اور گرمی میں طلوع اور غروب کے انتہائی نقاط۔ اس سے مراد تمام روئے زمین ہے۔ اس طرح مشرقی اور مغربی زمینوں کے لئے مشارق اور مغارب بھی آیا ہے (۲۰/۳) اور صرف مَشَارِقُ بھی (۳۷/۵)۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو ارض با برکت کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۱۳۷/۱)۔ یعنی اس با برکت زمین کے ان حصوں کا جو اس کے شرق و غرب میں واقع تھے۔ یا اس پرورے کے پرورے خطہ کا۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (۱۱۵/۲) تو اس سے مراد کل کائنات ہے۔

سورۃ نور میں، نور خداوندی کے تمثیلی بیان میں لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ (۲۴/۳۵) آیا ہے۔ یعنی وہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند و بالا ہے۔ اس کی روشنی عالم گیر (Universal) اور تمام کائنات کو محیط ہے۔ جس طرح خدا تمام نوع انسانی کا خدا ہے اسی طرح اس کا ضابطہ، قانون (قرآن کریم) بھی تمام نوع انسانی کی آنکھوں کیلئے روشنی ہے اور اس کا نظام

ربوبیت تمام انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ - یہی وہ نظام ہے جسکی روشنی سے آخر الامر تمام روئے زمین جگمگا اٹھیں گی - وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّيَّهَا (۳۹/۶) -

اَشْرَاقٌ (۳۸/۱۸) طلوع آفتاب (یا دن چڑھنے) کیلئے آیا ہے - (۱۵/۲۳) میں مُشْرِقِينَ آیا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ عذاب نے انہیں اسوقت گرفت میں لے لیا جب ان پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی - یعنی طلوع آفتاب کے وقت -

ش ر ک

اَلِشْرَکُ کے بنیادی معنی ہیں چمٹے رہنا - خلط ملط ہو جانا * - شَارَكْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں فلاں کا ساتھی ہو گیا - اور اِشْتَرَكُ الْأَمْرُ کے معنی ہیں معاملہ گڈ مڈ ہو گیا - مُشَارَكَةٌ کے معنی ہیں ایک کا دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شریک ہو جانا - فُلَانٌ شَرِيْکُ فُلَانٍ - فلاں شخص کسی دوسرے شخص کا شریک کار یا ساجھی ہے - نیز اس کے معنی ہیں کسی کی بہن یا بیٹی سے شادی کر کے اس کے خاندان سے رشتہ داری پیدا کر لینے والا - اسکی جمع شُرَکَاءُ آتی ہے - اَلشَّرَکُ - شکاری کے جال کو کہتے ہیں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے راستے جو بڑے راستے (اُمُّ الطَّارِ یُقِی) سے نکلیں اور آگے جا کر ختم ہو جائیں - ان کا واحد شَرَّکَةٌ ہے ** -

شِرْکٌ - قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے - اسکے معنی ہیں غیر خدائی قوتوں کو خدا کے ہمسر سمجھنا - جو اختیارات صرف خدا کیلئے مخصوص ہیں ان کا حامل دوسروں کو بھی سمجھنا - انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو، قانون خداوندی کے برابر سمجھنا - خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا - قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر شے انسان کیلئے تابع فرمان کر دی گئی ہے اور انسان سب برابر ہیں - کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے سے اپنی اطاعت کرائے - لہذا اس کائنات میں، انسان سے برتر کوئی اور قوت نہیں - (انسان سب برابر اور کائنات کی دیگر اشیا انسان سے فروتر) - بس ایک خدا کی ذات ہے جو انسان سے برتر ہے - لہذا انسان کا خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنے سے برتر سمجھنا خود اسکی

اپنی تذلّیل ہے۔ اسی کو شرک کہتے ہیں۔ شرک سے خدا کی خدائی (خدا ہونے) میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ خود انسان اپنے مقام انسانیت سے گرجاتا ہے۔ اسلئے قرآن کریم کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اسکا صحیح مقام چھین لیتا ہے (۱۳۱)۔ مشرکین وہی ہیں جو مقام انسانیت سے گر جاتے ہیں اور (خدا کے علاوہ اور) قوتوں کو اپنے سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بس ایک خدا کے قانون کی اطاعت (جو اسنے وحی کے ذریعہ قرآن کریم میں عطا کر دیا ہے) اور ساری کائنات کی تسخیر۔ یہ ہے توحید۔ اور اس میں ذرا سی بھی خرابی، شرک۔

أَشْرَكَ - اس نے شرک کیا، اس سے اسم فاعل مُشْرِكٌ ہے یعنی شرک کرنے والا۔ اسکی جمع مُشْرِكُونَ اور مُشْرِكٌ کَیْنٌ ہے۔

نزول قرآن کے وقت ایک گروہ تو ان لوگوں کا تھا جو وحی خداوندی کے اتباع کے مدعی تھے۔ انہیں اہل کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہودی۔ نصرانی وغیرہ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو کسی آسمانی کتاب کے اتباع کے مدعی نہیں تھے۔ وہ اپنے خود ساختہ رسوم و آئین کے متبع تھے۔ وہ اپنے ذہنی تصور کے مطابق خدا کو بھی مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک خیال کرتے تھے۔ انہیں مشرکین کہا گیا ہے۔ (چونکہ یہ دونوں گروہ قرآن کریم کی دعوت سے انکار کرتے تھے اسلئے ان سب کو کَافِرِیْنٌ کہا گیا ہے)۔ یہ اصطلاحی تعبیریں ان گروہوں میں باہمی امتیاز کیلئے تھیں ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خود اہل کتاب بھی قانون خداوندی کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ یعنی اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے مسلک و آئین کا اتباع۔ قانون خداوندی اپنی اصلی شکل میں انکے پاس تھا ہی نہیں۔ اور جتنا کچھ تھا، وہ بھی محض تبرکاً تھا۔ ان کا عمل انکے علماء و مشائخ کی متعین کردہ شریعت پر تھا۔ لہذا عملاً یہ لوگ بھی مشرک تھے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے انہیں بھی مشرک کہا ہے۔ وَقَالُوا کُوْنُوا هُودًا اَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا - قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيفًا - وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِ کَیْنٌ (۱۳۵)۔

دینِ توحید صراطِ مستقیم ہے۔ اور مختلف فرقے وہ چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو انسان کو صراطِ مستقیم سے بہکا کر دوسری طرف لیجاتے ہیں اور تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اسلئے قرآن کریم نے فرقہ بندی کو

شرک قرار دیا ہے۔ (۳۲-۳۱)۔ اس لئے کہ فرقوں میں آخری سند انسان ہوتے ہیں۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوتی ہے۔

لہذا شرک یہی نہیں کہ انسان بتوں کی یا مُردوں کی پرستش کرنے لگ جائے۔ شرک یہ بھی ہے (اور یہ شرک بہت بڑا ہے) کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو خدا کے قانون کا درجہ دیدیا جائے اور اس طرح دین کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت مشرک ہوتے ہیں۔ وَمَا يَتُوءُ مِّنْ أَكْثَرِهِمْ بِإِلَٰهِ إِلَّا وَهْمٌ مُّشْرِكٌ كُفْرٌ (۱۲۶)۔ ان میں سے اکثریت انکی ہے جو خدا پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں کہ ایمان کے باوجود مشرک ہوتے ہیں۔

جس طرح سارے قرآن کریم میں توحید کی تفصیل کا تذکرہ ہے اسی طرح اس میں شرک اور اسکی جزئیات و تضمینات کا ذکر ہے۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم شرک کو مٹانا اور توحید کو قائم کرنا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کے معنی یہی ہیں۔ ہر غیر خداوندی قانون و آئین کی اطاعت سے انکار اور قانون خداوندی کی اطاعت کا عملی اقرار۔ مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۳۳)۔ اور غیر خدائی قوتوں پر بھروسہ کرنے والے اور شیطانی اقتدار کو تسلیم کرنے والے مشرک ہیں (۱۰۰-۹۹)۔

ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم اکثر مقامات میں نظر آئیگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان، تمام دنیا کے مشرکین سے ہر حال میں جنگ کرتے رہیں۔ اُن مقامات میں مشرکین سے مراد زمانہ نزول قرآن کے مشرکین ہیں جنہوں نے جنگ کے حالات پیدا کر دئے تھے۔ اُس کے بعد جنگ صرف انہی سے کی جائیگی جو اُس قسم کے حالات پیدا کر دیں۔ بالفاظ دیگر، کسی مشرک سے محض اس کے مشرک ہونے کی بنا پر جنگ نہیں کی جائیگی۔ جنگ ان قوموں سے کی جائیگی جو جنگ کے حالات پیدا کر دیں۔ اس کے لئے قرآن کریم نے تفصیلی ہدایات دی ہیں۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں مشرکین (یا غیر مسلموں) کی جو پوزیشن قرآن کریم نے متعین کر دی ہے اور ان سے جس قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم دیا ہے، وہ ہر دور کے مشرکین (یا غیر مسلموں) پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) جو خصوصیات اور قوتیں خدا کے لئے مختص ہیں، ان میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا، شرک ہے۔

(۲) اپنے آپ کو خدا کے سوا، کائنات کی کسی قوت یا کسی انسان کا محکوم اور تابع فرمان سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا، شرک ہے۔

(۳) قرآن کریم کے علاوہ، کسی اور کی محکومی اختیار کرنا شرک ہے۔ اس ضابطہ کے علاوہ، کسی اور ضابطہ کو اپنا۔ حکم ماننا، شرک ہے۔

(۴) الدین، ملت میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ فرقوں میں بٹ جانا اور گروہ درگروہ ہو جانا، شرک ہے۔

(۵) ایک خدا۔ اس کا عطا کردہ ایک ضابطہ زندگی۔ اس پر چلنے والی ایک اُمت۔ اس اُمت کا ایک نظام۔ یہ ہے توحید۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے شرک ہے۔

شری

شَرَّی کے معنی بیچنے اور خریدنے دونوں کے آتے ہیں۔ (اور یہی مفہوم بَیْع کا بھی ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خرید و فروخت، جنس کے عوض جنس سے ہوتی تھی جسے (Barter System) کہتے ہیں، تو اس میں ہوتا یہ تھا کہ ایک جنس والا جہاں اپنی جنس دوسرے کو دیتا تھا تو اس کے عوض دوسرے سے اسکی جنس خریدتا بھی تھا۔ اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک خریدتا بھی تھا اور بیچتا بھی تھا۔ لہذا یہ لفظ خریدنے اور بیچنے دونوں کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا*۔ شَرَّی کا اصلی مطلب ہے کسی چیز کا اپنے قبضے سے نکال کر اس کے عوض دوسری چیز کو اپنے قبضے میں لے لینا۔ اس اعتبار سے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری چیز اختیار کر لینے کو بھی اِشْتِرَاعٌ کہہ دیتے ہیں**۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَرَّی بیچنے کے لئے اور اِشْتِرَی خریدنے کے لئے زیادہ مستعمل ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں (۲۰۸) میں یَشْرِی 'نَفْسَہ' کے معنی اپنے آپ کو فروخت کر دینے کے ہیں۔ وَ شَرَّوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲) میں بھی اس کے معنی فروخت کرنے کے ہیں۔ لیکن اِنَّ اللّٰہَ اِشْتَرٰی (۱۱۱) میں اس کے معنی خریدنے کے ہیں۔ اُولَئِکَ الَّذِیْنَ اِشْتَرَوْا الضَّلٰلَۃَ بِالْہٰدِی (۲۶) میں اس کے معنی ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے کے ہیں۔

نوٹ۔ شَرَّ يَانٌ (ش کو زبر اور زیر سے) ایک درخت کو کہتے ہیں جس کی لکڑی سے کمان بناتے تھے۔ نیز جسم کی وہ رگ جو پھڑکتی اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کی جمع شَرَّ آيِيْنٌ ہے۔ شَرَّی کے معنی پھیلانا بھی ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز میں ہیجان پیدا ہو جانا اور اس کا بلند ہونا لکھا ہے۔ نیز شَرَّی البَعِیْرُ فی سَیْرِهِ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا**۔

قرآن کریم میں ہے إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنْ لَّهْمُ الْجَنَّةُ (۱۱۱)۔ ”بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور مال بعوض جنت خرید لئے ہیں“۔ یہ محض ذہنی عقیدہ نہیں بلکہ اسلامی نظام مملکت و معاشرت کی اصل و بنیاد ہے۔ اس میں، وہ نظام معاشرہ (مملکت) جو قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے، افراد مملکت کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے، افراد اپنے جان اور مال کو حکومتِ خداوندی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں، اور وہ حکومت انہیں اس دنیا میں جنتی زندگی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہاں کی زندگی جنتی ہو جائے اسے آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔

ش ط ا

الشَّيْطَانُ۔ کھجور یا کھیتی کی سوئیاں۔ نئے پھوٹنے والے پودے۔ الشَّيْطَانُ مِّنَ الشَّجَرِ۔ درخت کی جڑ کے آس پاس جو شاخیں پھوٹ نکلیں۔ شَطَا الْوَادِي وَالنَّهْرِ۔ وادی یا نہر کا کنارہ۔ ساحل***۔

قرآن کریم میں ہے كَزَّرْعٍ اَخْرَجَ شَطَاہُ (۲۸)۔ کھیتی کی طرح جو اپنی سوئیاں نکالتی ہے۔ مِّنْ شَطَايِ الْوَادِ لَا يَمْنُ (۲۸)۔ اس با برکت وادی کے ایک کنارے سے۔

ش ط ر

الشَّيْطَرُ۔ اُس حصہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے الگ ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کسی چیز کی ایک جانب کو کہنے لگ گئے خواہ وہ اس کے

* تاج و محیط و راغب ** ابن فارس۔ *** تاج و راغب نیز ابن فارس

ساتھ ہی ملی ہو*۔ اور اس طرح اس کے معنی کنارہ ، طرف ، سمت اور جانب ، نیز کسی چیز کا بعض حصہ ہو گئے ۔ الگ ہو جانے کی جہت سے اس میں دور ہو جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا ۔ چنانچہ الشَّطِيرُ کے معنی ہیں پردیسی ، اجنبی ۔ نیز دور ، بعید ۔ مَنَزِلٌ شَطِيرٌ ۔ دور کی منزل ۔ الشَّاطِرُ ۔ ڈاک کا تیز رفتار گھوڑا جو لمبی مسافت کو قلیل عرصہ میں طے کر لے ** ۔ جہت اور سمت کے لئے کہتے ہیں شَطَرَ شَطْرَهُ ۔ اس نے اس کی طرف جانے کا ارادہ کیا ۔ ویسے الشَّطْرُ ۔ کسی چیز کے آدھے حصے کو بھی کہتے ہیں ** ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سمت اور جہت کے معنوں میں آیا ہے ۔ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۳۳) ۔ مسجد الحرام کی سمت ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سمت کے لئے شَطْرٌ کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب اس میں دوری کا مفہوم بھی شامل ہو ۔

ش ط ط

شَطٌّ ۔ يَشُطُّ ۔ شَطًّا ۔ دور ہو جانا ۔ مقدار یا حد مقررہ سے تجاوز کر جانا ۔ حق سے دور نکل جانا ۔ بے انصافی کرنا ۔ موخر الذکر معنوں میں أَشَطُّ بھی مستعمل ہے *** ۔ قرآن کریم میں ہے فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تَشْطِطْ (۳۸/۲۱) ۔ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور نا انصافی نہ کر ۔ یعنی حق سے دور نہ لے جا ۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ قُلْنَا إِذَا شَطَطْنَا (۱۸/۱۳) ۔ ہم ایسی بات کہہینگے جو حق سے دور اور ہٹی ہوئی ہوگی ۔ راغب نے شَطَطٌ کے معنی حد سے زیادہ دور کے لئے ہیں ۔

الرماني نے شَطٌّ شَطْنٌ اور بَعْدٌ کو مرادف المعنی لکھا ہے **** ۔ لہذا اس میں دوری کا مفہوم ہوگا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دوری اور میلان اور جھکاؤ دونوں لکھے ہیں ۔ لہذا وَلَا تَشْطِطْ (۳۸/۲۱) کے معنی ہونگے ، کسی ایک طرف مت جھک جاؤ ۔

ش ط ن

شَطْنٌ مضبوط بٹی ہوئی لمبی رسی کو کہتے ہیں ۔ يَشُورُ شَطْوُنَ ۔ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو ۔ لمبائی کی نسبت سے ہر اس شے کو جو بہت دور ہو ، شَطِينٌ یا شَاطِنٌ کہتے ہیں ۔ الرماني نے شَطْنٌ شَطْنٌ اور بَعْدٌ (دور ہونے) کو مرادف المعنی لکھا ہے **** ۔ ابن فارس نے بھی

اس کے بنیادی معنی دور ہونے کے لکھے ہیں۔ شَطْن کے معنی ہیں وہ بہت دور چلا گیا۔ شَطْن صَاحِبَہ کے معنی ہیں اس نے اپنے ساتھی کے رخ اور قصد کی مخالفت کی، اس کی نیت کے خلاف اپنی نیت رکھی۔ یہیں سے اس کے معنی مخالفت اور سرکشی کے لئے جاتے ہیں*۔ اسی سے لفظ شَيْطَان بنا ہے۔ جس کے معنی ہونگے (۱) خدا کی رحمتوں سے دور۔ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم اور (۲) سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلنے والا۔ سرکش۔

شَيْطَان۔ ایک بدعورت سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ اور رُءُوسُ الشَّيَاطِين۔ ناگ پھنی تھوہر کو کہتے ہیں*۔ (ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی لکھے ہیں)۔

بعض کا خیال ہے کہ شَيْطَان دراصل شَاط۔ یَشِيْطُ سے مشتق ہے۔ شَيْطُ کے معنی ہیں جل جانا۔ ہلاک ہو جانا۔ شَاطُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں وہ چیز جل گئی۔ شَاطُ السَّمْنِ وَالزَّيْتِ۔ گھی یا تیل اس قدر گرم ہوا کہ اس میں آگ سی لگنے لگی۔ اس سے شَيْطَان کے معنی سرکش، شعلہ صفت اور تخریبی نتائج پیدا کرنے والے کے ہونگے**۔

قرآن کریم میں ہے إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا (۱۹)۔ شیطان احکام خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہے۔ سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آکر اس قبطنی کے مُکّا مارا جس سے وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (۲۸)۔ یہ تو شیطانی کام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر جو غلط کام کیا جائے اسے شَيْطَانَت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (نیز ۱۲)۔ جو لوگ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے ان کے سرغنوں کو بھی شَيْطَانِیْن کہا گیا ہے۔ وَ إِذَا خَلَوْا إِلَى شَيْطَانِيْهِمْ (۲۳)۔ کے یہی معنی ہیں کہ جب یہ لوگ اپنی پارٹی کے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں۔

ان وحشی اور سرکش قبائل کے لوگوں کو بھی جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مطیع بنا کر کام میں لگا رکھا تھا شَيْطَانِیْن کہا گیا ہے (۲۱ و ۳۸)۔ سانپ کے لئے یہ لفظ قصہ حضرت ایوبؑ میں آیا ہے (۳۸)۔ غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) میں قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شَيْطَان کے معنی پیاس کی شدت کے بھی ہیں۔ اس لئے حضرت ایوبؑ کے قصے میں اِنْسِيْ مَسْنِيْ الشَّيْطَانِ (۳۸) کے معنی سانپ کا چھو جانا اور پیاس کا غلبہ دونوں ہو سکتے ہیں۔

*تاج و لین۔ **عبرانی زبان میں شیطان کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے کے ہیں۔

نیز (۱۱) میں رَجُزَ الشَّيْطَانِ کے معنی پیاس کی وجہ سے پیدا شدہ کوفت اور نقاہت بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں شَجَرَةٌ الزَّيْتُونِ کے متعلق کہا گیا ہے طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رَءُوسُ الشَّيْطَانِ (۳۷/۶۵) یعنی اس میں سے جو پھوٹ کر نکلتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے سانپوں کے سر (پھن) جس طرح ناگ پھنی تھوہر کے چوڑے چوڑے پتے ہوتے ہیں۔

کاہنوں اور نجومیوں کو بھی شَيْطَانِ کہا گیا ہے (۳۷/۶۵ و ۶۷/۶۵)۔

قرآن کریم کی رو سے ہر وہ قوت جو خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہے شَيْطَانٌ ہے، خواہ وہ انسان کے اپنے بے باک اور سرکش جذبات ہوں اور خواہ نظام خداوندی کی مخالف جماعتیں اور ان کے سرغنے۔ سرکشی اور تخریب ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے، اور صحیح نظام کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کا کام۔ شیطان اور طاغوت ایک ہی ہیں۔ اور طاغوت ہر غیر خداوندی قوت کا نام ہے۔ (۳۷/۶۵ و ۳۷/۶۵)۔

[شَيْطَانٌ کے متعلق مزید بحث ابلیس کے عنوان (ب۔ ل۔ س) اور (ع۔ ب۔ د) میں دیکھئے]۔

ش ع ب

الشَّعْبُ - جمع کرنا اور متفرق کرنا۔ پھاڑنا اور شگاف ڈالنا۔ (اضداد میں سے ہے)۔ راغب نے لکھا ہے کہ الشَّعْبُ کے معنی جمع کرنے اور متفرق کرنے کے اس لئے آتے ہیں کہ الشَّعْبُ مِّنَ الْوَادِي، وادی کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس کا ایک کنارہ ملتا ہو لیکن دوسرا کنارہ اس سے جدا ہوتا ہو۔ جب تم اس مقام کو دیکھو جہاں سے اس کا ایک سرا جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ جیسے ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا سرا اس سے ملتا ہے تو یوں نظر آئے جیسے دو سرے باہم گر مل رہے ہیں۔ اس لئے اس کے معنی اکٹھا کرنے اور جدا کرنے، دونوں کے آتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ یعنی اس میں اجتماع کے ساتھ افتراق اور افتراق کے ساتھ اجتماع پایا جاتا ہے۔

الشَّعْبُ - بڑا قبیلہ - مختلف قبائل کا وہ جدِ اعلیٰ جسکی طرف وہ سب منسوب ہوتے ہیں، اور وہ انہیں ملا دیتا ہے۔ (جمع شُعُوبٌ ۳۹/۱۳)۔

قبیلہ، شُعْبٌ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ شُعْبَةٌ کے معنی ہیں شاخ، کسی چیز

کا الگ ہو جانے والا ڈکڑا، دو سینگوں یا دو شاخوں کے درمیان کا حصہ۔ اسکی جمع شُعَبٌ ہے (۱۳۰)۔ نیز الشَّعْبَةُ مین الشَّجَرِ۔ درخت کی مختلف پھیلی ہوئی شاخیں۔ الشَّعْبُ۔ پہاڑ کے درمیان راستہ۔ دو پہاڑوں کے درمیان جو کھلی ہوئی جگہ ہو۔ شَعْبَانُ۔ رمضان سے پہلا مہینہ۔ اس مہینے میں عرب پانی کی تلاش اور لوٹ مار کے لئے منتشر ہو جاتے تھے*۔ (متفرق ہو جانے کے معنوں میں)۔

شُعَيْبٌ۔ ایک نبی کا نام ہے جو قوم مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے خسر تھے**)۔ [مزید تفصیل ”شعیب“ کے عنوان میں ملے گی]۔

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوع انسان امت واحدہ، ایک عالمگیر برادری ہے (۱۳۱) لیکن باہمی تعارف کی غرض سے یہ مختلف شعوب و قبائل میں بٹ جاتی ہے۔ ان شعوب و قبائل کی تقسیم سے مقصد محض تعارف ہے، جس طرح ہم اپنے بیٹوں کے نام رکھ لیتے ہیں تاکہ ان کے تعارف میں آسانی رہے۔ اس سے کسی قسم کی برتری یا تفوق مقصود نہیں ہوتا۔ اس لئے دنیا کی کوئی نسل، کوئی قبیلہ، کوئی قوم دوسروں سے افضل نہیں۔ تمام انسان پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۳۲)۔ مدارج کا معیار اعمال ہیں۔ اور جو سب سے زیادہ اچھے اعمال و کردار کا حامل ہو وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا جس میں کہا گیا ہے کہ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اتَّقَاكُمْ (۱۳۳)۔ جس طرح کسی شہر کو مختلف محلوں میں بانٹ دینے سے غرض محض تعارف کی آسانی ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کی قبائلی تقسیم بغرض تعارف تھی۔ اگر انسانی تمدن ایسی شکل اختیار کر لے جس میں تعارف کا مقصد قبائلی تقسیم کے بجائے کسی اور طرح حاصل ہو جائے تو پھر اس تفریق کا بغرض تعارف باقی رکھنا بھی ضروری نہیں رہے گا۔ باقی رہا معاشرہ میں مدارج کا تعین، سو اس کا مدار شرف انسانیت ہے۔

ش ع ر

شَعْرٌ اور شَعَرٌ۔ انسان کے جسم پر جو بال پیدا ہوتے ہیں انہیں کہتے ہیں۔ (اونٹ کے بالوں کو وَبَرٌ اور بھیڑ کے بالوں کو صُوفٌ کہتے ہیں۔

یہ تینوں الفاظ $\frac{1}{8}$ میں آئے ہیں)۔ اگرچہ زمخشری کے نزدیک شَعَرٌ کا لفظ انسان اور غیر انسان سب کے بالوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے*۔

الشَّعْرُ اور الشَّعْرُ۔ کسی چیز کو سمجھ لینا، جان لینا، تاڑ لینا، معاملات کی باریکیوں کو جان لینا، حواس کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کر لینا۔ اس سے فعل شَعَرَ۔ يَشْعُرُ و شَعُرَ يَشْعُرُ آتے ہیں۔ اس کے مصادر میں الشَّعْرُ والشَّعْرُ والشَّعْوَرُ والشَّعْرَى بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

أَشْعَرَهُ۔ اسے بتایا، معلوم کرایا۔ بعض نے کسی شے کا حواس کے ذریعہ ادراک کر لینا ہی اس کے بنیادی معنی قرار دئے ہیں*۔ (ذہنی فلسفہ اور تجربی تصورات عربوں کے ہاں شعور نہیں کہلاتے تھے۔ ان تصورات کو شعور سے تعبیر کرنا عجمی اصطلاح ہے جو یونانی طرز فکر سے پیدا ہوئی ہے)۔

پھر الشَّعْرُ کا عام استعمال کلام منظوم پر ہونے لگا۔ اس کی وجہ راغب نے یہ بتائی ہے کہ شاعری عربوں کی نازک خیالیوں، پوشیدہ رازوں اور بذلہ منجیوں کا مجموعہ ہے۔ شَاعِرٌ کو شاعر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطانت و ذہانت سے ان معانی کا ادراک کر لیتا ہے جن کا ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے۔ کبھی شَعْرٌ سے جھوٹ بھی مراد لیتے ہیں۔ اور شَاعِرٌ جھوٹ بولنے والے کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ بیشتر جھوٹ شاعری میں جگہ پاتا تھا اس لئے یہ مثل بن گئی تھی کہ أَحْسَنُ الشَّعْرِ أَكْذَبُهُ۔ یعنی سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ اپنے اندر رکھتی ہو۔ مخالفین رسول اللہؐ کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے تھے*۔

شِعَارٌ۔ جنگ میں جو الفاظ بطور علامت (Code Word) استعمال ہوتے ہیں، یا سفر میں اپنے قافلہ کو پہچاننے کے لئے جو نشان مقرر کیا جاتا ہے، انہیں شِعَارٌ کہتے تھے۔ اسی طرح حج میں لے جائے جانے والے جانور پر نشان لگانے کو اِشْعَارٌ کہتے تھے اور اس جانور کو شَعِيرَةٌ۔ اس کی جمع شَعَائِرٌ ہے۔

شِعَارُ الْحَجِّ۔ حج کے مناسک و علامت اور آثار و اعمال کو بھی کہتے ہیں۔ نیز تمام وہ اعمال حج جو خدا کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے ادا کئے جاتے ہیں۔ ان اعمال و علامات کے مقام کو مَشْعَرٌ کہتے ہیں۔ اس کی جمع مَشَاعِرٌ ہے۔ اس معنی میں شَعَائِرٌ بھی آتا ہے*۔

شِعْرَى۔ ایک ستارہ کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانے میں نکلتا ہے اور بہت روشن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں رَبُّ الشَّعْرَى (۵۳۹) اسی کے لئے

ایسا ہے۔ جاہلیت میں بعض عرب قبائل اس کی پرستش کیا کرتے تھے*۔ لیکن اگر شاعری کو شاعر سے مصدر مانا جائے تو اس کے معنی عقل و شعور ہوں گے۔ قرآن کریم میں عقل، شعور، فکر، تدبیر، تفقہ، وغیرہ الفاظ مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ ہر مقام پر غور کرنے سے ان کا باریک اور لطیف فرق سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ایک قدر مشترک سب میں ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے وہ انہیں حیوانات سے بدتر اور جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔

قرآن کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہے اور نظم میں بیان کردہ مذموم۔ قرآن، اسلوب بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصود بیان سے بحث کرتا ہے۔ شاعری سے اس کی مراد، وہ جذبات پرستی ہے جو حقائق سے بحث نہیں کرتی۔ چنانچہ سورۃ یس میں جہاں اس نے کہا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے رسولؐ کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی شاعری ایک پیغامبر انقلاب کے شایان شان ہوتی ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ (۳۶/۶۹)۔ جو کچھ ہم نے رسولؐ کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۶۹)۔ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے یہ انہیں اس کے ذریعہ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ یعنی قرآن کریم، تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے۔ اور شاعری اس کے خلاف محض جذبات سے کھیلتی ہے۔ چنانچہ اس نے شاعروں کے متعلق کہہ دیا کہ وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح، جسے جھوٹی پیاس (کی بیماری) ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لئے لئے پھر رہی ہو**، جذبات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور انکی ساری عمر ان باتوں میں گزر جاتی ہے جنہیں وہ کر کے کبھی نہیں دکھاتے (۲۳۵/۲۶)۔ یہ روش زندگی ایک رسولؐ (اور اس کے متبعین) کے شایان شان نہیں۔ (کولرج کے الفاظ میں ***) شاعری کی ضد (Antithesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔ قرآن کریم چونکہ سائنٹفک حقائق سے بحث کرتا ہے اس لئے شاعری (جو ان حقائق کی نقیض ہے) اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ دیگر اقوام عالم (مثلاً اہل یونان وغیرہ) کی طرح، عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی الہام ہوتا ہے۔ جس طرح آج بھی انگریزی زبان میں جب (Poet) کہا جاتا ہے تو اس سے مراد (Inspired) ہوتے ہیں۔ یعنی (Poet) وہی ہوتا ہے جسے (Inspiration) ہوتا ہو۔ قرآن، وحی اور انسانی ملکات میں نہایت شد و مد سے تمیز کرتا ہے تا کہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کی طرف سے براہ راست علم اور انکشاف حقیقت صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے جو ایک نبیؐ کو ملتی تھی۔ (اور سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد، اب کسی کو نہیں مل سکتی)۔ وہ نہ کشف والہام وغیرہ کی اصطلاحات کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی انہیں خدا کی طرف سے براہ راست علم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب انسانی جذبات کی پیدا کردہ کرشمہ سازیاں یا نفسیاتی قوت کی افسوں طرازیوں ہیں جنہیں علم و حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ وجہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ رسول شاعر نہیں ہوتا، جس طرح وہ کاہن، ساحر اور نجومی نہیں ہوتا۔ ان کی طرف شیاطین (انسانی سرکش جذبات) ”وحی“ نازل کرتے ہیں (۲۱۰) لیکن رسولؐ کی طرف وحی خدا کی طرف سے ہوتی ہے جس میں اس کے اپنے جذبات و احساسات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی (۵۳-۳)۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں تصوف کی اصطلاح مروج نہیں تھی لیکن جن عناصر سے تصوف ترتیب پاتا ہے وہ انہیں اپنے ہاں کے شاعروں، کاہنوں، ساحروں وغیرہ میں موجود سمجھتے تھے۔ قرآن کریم نے ان تمام کی تردید سے درحقیقت تصوف کے عناصر کی تردید کی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر عرب، تصوف کی اصطلاح سے واقف ہوتے تو وہ یہ کہتا کہ تصوف ایک نبی کے شایان شان نہیں۔ اسکی بجائے اس نے یہ کہا ہے کہ نبی شاعر اور ساحر اور کاہن نہیں ہوتا۔ وہ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل کر کے انسانی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ تصوف یہ کچھ نہیں کر سکتا۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ یُخَدَعُونَ اللّٰہُ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا۔ وَمَا یُخَدَعُونَ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ وَمَا یَشْعُرُونَ (۲)۔ ”یہ لوگ اللہ اور جماعت مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن یہ دھوکا دراصل ان کی اپنی ذات (نفس) کو ہوتا ہے اور یہ اس کا شعور نہیں رکھتے“۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کی تدابیر تو شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر خود اپنی ذات کو دھوکا دیتے ہیں۔

غور کیجئے شعور اور غیر شعوری نفسیاتی کیفیات کا یہ لطیف فرق کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تَحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ (۵)۔ شَعَائِرُ اللہ کی بسے حرمتی مت کرو۔ اسلام ایک دین ہے جو مملکت کی شکل میں متمکن ہوتا ہے۔ ایک مملکت کے کچھ شعائر (یعنی علامات یا Symbols) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا۔ جھنڈا ویسے تو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ انہی علامات کو شَعَائِرُ کہا جاتا ہے۔ لہذا شَعَائِرُ اللہ سے مراد، اس مملکت کی محسوس علامات ہونگے جو قوانین خداوندی (قرآنی نظام) کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہو۔ ان شَعَائِرِ کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔ واضح رہے کہ ان شعائر کی پرستش نہیں کی جائیگی۔ صرف ان کا احترام کیا جائے گا۔ اور وہ بھی اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر (علامات) فی ذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ان کا احترام، قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے۔ اور بس۔

شعل

الشَّعْلَةُ۔ آگ کی لپک۔ لکڑی یا ایندھن جس میں آگ مشتعل ہو۔
الشَّعْیِلَةُ۔ جلتی ہوئی بستی۔ الْمَشْعَلُ۔ قندیل۔ شَعَلَ النَّارَ فِي۔
الْحَطَبِ۔ اسنے لکڑیوں میں آگ بھڑکا دی۔ اِشْتَعَلَتِ النَّارُ۔ آگ
لگ گئی اور بھڑکی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں
کسی چیز کے کناروں کا منتشر (بکھرا ہوا) ہو جانا۔ آگ کے بھڑکنے میں یہی
کیفیت ہوتی ہے۔

اِشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَعِيبًا۔ سر میں سفید بالوں کا بکثرت پھیل جانا اور
اسطرح سر کا سفیدی سے بھڑک اٹھنا**۔ یا سر میں سفید بالوں کا نمودار ہو جانا۔
سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق یہی الفاظ آئے ہیں (۱۹)۔

شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی—قطورا—سے) جو اولاد
پیدا ہوئی ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ یہ حجاز کے شمال میں شام سے

متصل علاقہ میں ، سکونت پذیر ہوا اور اس کی نسل ، تاریخ کے اوراق میں قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی ۔ ان کا زمانہ قریب . . . ۲۰۰ ق۔ م سمجھنا چاہئے ۔ یہ قوم یہیں بڑھی پھولی ۔ قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی ۔ تاآنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ۔ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں ، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے ۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہاں انہوں نے ایک مرد بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کر لی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی ۔ اس مرد بزرگ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا ۔ (دیکھئے (۲۰ : ۲۸-۲۲) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مرد بزرگ کون تھے ۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ تھے ۔ تورات میں ان کا نام کہیں راعوبیل ۔ کہیں یثرو اور کہیں حوباب لکھا ہے ۔ مورخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا (تورات ۔ کتاب گنتی ۱۹ : ۱) ۔ اور باقی نام ان کے القاب تھے ۔ اور یہی حوباب قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں ۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے ۔ یعنی قریب ۱۷۰۰/۱۶۰۰ ق۔ م ۔

تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا ۔ اس کا بیٹا دوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا ۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کی طرف (۲۹ : ۲۶) اور اصحاب الایکہ کی طرف (۲۶ : ۱۷) مبعوث ہوئے تھے ۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ ، بنو دوان ہی تھے ۔ قرآن کریم نے قوم مدین اور اصحاب الایکہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے گویا یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے ۔

حضرت شعیبؑ نے انہیں جو تلقین کی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کس کس قسم کے جرائم پیدا ہو چکے تھے ۔ آپ نے ان سے کہا ۔ یٰقَوْمُ اعْبُدُوا اللَّهَ ۔ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهِ غَيْرُهُ (۸۵) ۔ اے میری قوم ! اللہ کی محکومی اختیار کرو ۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اور الہ نہیں ۔ . . . فَآوُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَهُمْ وَلَا تَفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِہَا . . . (۸۵) ۔ تمہیں چاہئے کہ ماپ تول پورا پورا کرو ۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو ۔ ملک کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پیدا کرو ۔

اس سے واضح ہے کہ اس قوم میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں جنہیں دور کرنے کے لئے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے ۔ آپ نے ان

تک اپنی دعوت پہنچائی اور (حسب معمول) قوم کے سرمایہ دار طبقہ (سردارانِ قوم) نے آپ کی سخت مخالفت کی اور دھمکی دی کہ آپ اور آپ کے ساتھی انہی کا مسلک اختیار کر لیں ورنہ وہ ان سب کو بستی سے نکال دینگے (۸۸)۔

سورۃ ہود میں اسی قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض کیا گیا ہے۔ جو اسلام کی ایک عظیم حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا یٰشُعَیْبُ - اَصْلَاوْتُكَ تَاْمُرُّكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا یَعْبُدُ اَبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَاؤُ (۱۱۱)۔ ”اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ (ہمیں کہے کہ) ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباء و اجداد پوجتے رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہیں نہ کریں؟

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں صلوٰۃ اور معاشیات کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ صلوٰۃ سے مقصود ہے قوانین خداوندی کا اتباع۔ اور قوانین خداوندی معاشیات کو بھی اپنے دائرے کے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

قوم نے اپنی حالت میں اصلاح نہ کی اور ضد اور سرکشی میں آگے بڑھتی گئی، تاآنکہ وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ سورۃ اعراف میں ہے فَاَخَذَ تَهُمُ الرَّجْفَةُ (۹۱)۔ ”انہیں لرزا دینے والی ہولناکی نے آلیا“۔ سورۃ ہود میں الصَّیْحَةُ کا لفظ آیا ہے (۱۱۱)۔ اس کے معنی بھی سخت آواز کے ہیں۔ سورۃ شعراء میں اسے یَوْمَ الظُّلُمَةِ (۲۶۱) کہا گیا ہے۔ ”یعنی سائے والا دن“۔ معلوم ہوتا ہے کہ سخت آواز کے ساتھ زلزلہ آیا جس سے آتش فشاں پہاڑوں سے دھوئیں کے بادل نکلے۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو گئی۔

(طبعی حوادث اور عذاب خداوندی کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں حضرت نوحؑ کا عنوان دیکھئے)۔

ش غ ف

الشَّغَافُ - دل کے غلاف یا پردہ کو کہتے ہیں۔ نیز دل کا اندرونی حصہ۔ سویدائے قلب۔ شَغَفَهُ - اُس کے غلافِ دل تک پہنچ گیا۔ شَغَفَهُ الْحُبُّ - محبت اس کے غلافِ دل تک پہنچ گئی۔ محبت نے اس کے غلافِ دل کو شق کر دیا (بیضاوی) اور اندر داخل ہو گئی*۔ اس لئے انتہائے محبت کو الشَّغَفُ کہتے ہیں**۔

سورة یوسف میں ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (۱۲)۔ ”محبت کی وجہ سے یوسف اس کے دل کے اندر اتر گیا“۔ یعنی یوسف کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی۔

ش غ ل

الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - الشُّغْلُ - مشغله ، مصروفیت ، ایسا کام جس میں مصروف ہو کر انسان دیگر امور پر توجہ نہ دے سکے۔ لَشْتِغَلَ فِيهِ السِّمُّ - زہر اس میں سرایت کر گیا۔ مَالٌ مَشْغُولٌ - وہ مال جو تجارت میں لگا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ فَرَاعٌ (یعنی خالی ہونا) کی ضد ہے۔

قرآن کریم میں ہے شَغَلْتُنَا أَمْوَالُنَا (۳۸)۔ ہمارے اموال نے ہمیں اس طرح اپنے آپ میں جذب کر رکھا ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں۔

سورة یس میں اہل جنت کے متعلق ہے فِي شُغْلٍ فَكِيهُونَ (۳۶)۔ وہ (ہر وقت) کسی نہ کسی کام میں مصروف رہینگے اور وہ مصروفیت ان کے لئے کیف آور اور نشاط بخش ہوگی جس میں وہ بطیب خاطر مشغول ہونگے۔

ش ف ع

شَفَعٌ - اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْجٌ) جوڑا بنا دینا**۔ وَتَرٌ کے معنی ہیں اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور شَفَعٌ کے معنی ہیں زَوْجٌ (جفت) ہونا***۔ راغب نے کہا ہے کہ شَفَعٌ کے معنی کسی چیز کو اُس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں۔ اور شَفَاعَةٌ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں***۔ شَفِيعَةٌ کے معنی ہوتے ہیں کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا***۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائداد کی لگائیں**۔ عَيْنٌ شَفِيعَةٌ۔

وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دو دیکھے - نَاقَاةٌ شَافِعٌ* - وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو - اور دوسرا پیٹ میں ہو - نَاقَاةٌ شَفُوعٌ* - وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوہنے میں دونوں وقت کا دودھ اکٹھا دے دے* - الشَّافِعَاتُ* - مختلف قسم کے گھاس جو دو دو ہو کر اکٹھے اُگیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ الشَّافِعَةُ الشَّافِعُ* اس بکری کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو -

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شَفَعَ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا - اس کے بعد شَفَاعَةٌ کے معنی سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے* - نیز اس کے معنی دعا کرنے کے بھی آتے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ - اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلبگار ہو -

قرآن کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے - اس اعتبار سے جماعتِ مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِيعٌ ہوتا ہے - یعنی اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ - اور اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِيعٌ - وہ افرادِ کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے - یہی باہمگی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے -

اس جماعت کی یہ شَفَاعَةٌ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے - اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے - اس کے لئے ان سے کہا گیا ہے کہ یہ بَرٌّ وَتَقْوٰی (کشادگی اور قوانین خداوندی کے مطابق) کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثْمٌ وَعَدُوٌّ (ان میں تعاون نہ کریں) (۵/۲۱) - اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا (۸۵/۲۸) - جو شخص حسن کارانہ انداز میں (اچھے کام میں) کسی دوسرے کے ساتھ مدد کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے - اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی

اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص، دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائیگا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرام^۴ (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرم^۵) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کرینگے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیگا۔ اور وہ جنت میں چلے جائینگے۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جسکی بنیاد قانون مکافات عمل پر ہے۔ مَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹-۹۸)۔ ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آجاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور انکی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اسکے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہونگے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰ^۴) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اسکے گناہوں کا کفارہ دیکر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسول^۵ گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات وجود میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیج دیئے جائینگے تو نبی اکرم^۵ سجدے میں گر جائینگے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیج دیگا حضور^۶ نہ سجدے سے مڑاٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائینگے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانون مکافات کی رو سے لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲۸)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جا

سکے گی نہ ہی کسی سے اسکے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کرسکیگا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۵/۲)۔ ”وہ کون ہے جو اسکے پاس اسکے اذن کے بغیر شفاعت کرے“۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے اور حضورؐ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کرینگے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اسلئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانون مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہذا اگر قانون مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن کریم میں موجود ہو تو اسکے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دئے گئے ہیں۔ مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت یہ ہے ”اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے (ربوبیت عامہ کیلئے) کھلا رکھو۔ و قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خِلَافٌ وَلَا شَفَاعَةٌ (۲۵/۳)۔ جسمیں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خریدی جاسکے گی۔ نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئیگی۔ اور نہ ہی کسی کی شفاعت۔ اسکے بعد اگلی آیت میں ہے مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۵/۵)۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائیگی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانون مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کیلئے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، ملزم ہوتا ہے۔ مستغیث ہوتا ہے۔ گواہ ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہوگا وہ عدالت کے کٹھرے میں اکیلا کھڑا ہوگا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْا نَا فِرَادٰی وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شَفَعَاءَ كُمْ (۹۵/۶)۔ تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے۔ تمہارے ساتھ

کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور ”پولیس کا سپاہی“، تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائیگا۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ... (۲۱/۵)۔ ”ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا“۔ اس کے علاوہ گواہ بھی ہونگے.... وَشَهِيدٌ (۲۱/۵)۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائیکا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائیگی۔ یہ ہیں وہ شَفِيعٌ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲۵۵/۲)۔ ”وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے“، یہ گواہ رسول بھی ہونگے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقْضُوْنَ مَاذَا أُجِبْتُمْ (۱۰۹/۵)۔ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کریگا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اس طرح بلائی جائیں گی۔ يَوْمَ يَقْضُوْهُمُ الشُّرُوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مِّنْ اٰذْنٍ لَّهِ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۸۸/۳۸)۔ جس دن ”الرُّوْحُ“ اور ملائکہ، صف باندھے کھڑے ہونگے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے،۔ لہذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دیدینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اسکی وضاحت خود قرآن نے کردی ہے جہاں فرمایا وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِّنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالْحَقِّ... (۳۶/۸۶)۔ جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے رسول اللہ کو شَهِيدٌ کہا ہے۔ (۱۰۹/۵)۔ شَفِيعٌ کہیں نہیں کہا۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ (۴۳/۳)۔ انہیں ان کے سفارشوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (۱۶۵/۱)۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے۔ تِلْكَ اَمْثَلُ الْجَنَّةِ اَوْ رِثْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۳/۳۳) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم

ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہیں گے (۸۰)۔ اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کریگا وہ تباہ و برباد ہوگا۔ اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت کا وارث ہوگا۔ (۸۱-۸۲)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

- (۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہونگے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائیگا۔
- (۲) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔
- (۳) مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا، یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کونسا مفہوم متصور ہے۔

سورة الفجر میں ہے وَالشَّفَقُ وَالْوَتَرُ (۸۹)۔ اس کے معنی ہیں وہ ستارے جو ملکر رہتے یا چلتے ہیں اور وہ جو الگ الگ رہتے یا چلتے ہیں۔ یعنی اکٹھے نظر آنے والے اور الگ الگ دکھائی دینے والے ستارے۔

ش ف ق

الشَّفَقُ*۔ وہ سرخی جو غروب آفتاب سے شروع ہو کر کچھ دیر بعد تک رہتی ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَفَقٌ*، غروب آفتاب کے وقت، دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں ملنے کو کہتے ہیں۔ نیز کنارہ کو بھی شَفَقٌ* کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۸۴)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں رقت (کمزوری) کے ہوتے ہیں۔

الشَّفَقُ - الشَّفَقَةُ - کسی کے ساتھ بہت زیادہ خیر خواہی کی بناء پر اس قسم کا ڈر کہ اسے کہیں یہ نہ ہو جائے اور وہ نہ ہو جائے - اشْفَقَ مِنْهُ - اس سے ڈرا - گھبرایا - اشْفَقَ عَلَيْهِ - محبت کی وجہ سے اسکی دیکھ بھال کی اور اس پر کوئی تکلیف آنے سے ڈرتا رہا * - ایسے خیر خواہ کو مُشْفِقٌ اور شَفِیقٌ کہتے ہیں - چونکہ خوف، کمزوری کی علامت ہوتا ہے اس لئے الشَّفَقَةُ کمزوری کو بھی کہتے ہیں - ثَوْبٌ شَفَقٌ - کمزور کپڑا ** - چونکہ اس میں خوف اور کمزوری کا پہلو ہوتا ہے اسلئے اس صفت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے -

راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد مین آئے تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور فی آئے تو خیر خواہی اور مہربانی کا پہلو نمایاں *** - لیکن تاج نے اسی عبارت میں بجائے فی کے علی لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے -

سورة احزاب میں ہے اشْفَقْنِ مِنْهَا (۳۳/۲۳) - انہوں نے اس سے خوف کھایا - وہ حملِ امانت (امانت میں خیانت کرنے) سے ڈر گئے - سورة انبیاء میں ہے وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ (۲۱/۲۸) - وہ اس (کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج) سے ڈرتے ہوئے اس سے خوف کھاتے ہیں - یعنی وہ اپنی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس قانون کا اتباع کرتے رہیں -

ش ف ہ

شَفَّهَهُ عَنْهُ شَفَّهًا - اس نے اسے کسی کام میں لگا کر اس کی توجہ دوسرے کاموں سے ہٹا دی - شَفَّهَهُ - اس کے ہونٹ پر مارا - شَفَّهَهُ - اس سے بالمشافہہ بات کی - شَفَّةٌ ہونٹ - دو ہونٹوں کو شَفَّتَانِ اور شَفَّتَيْنِ کہیں گے - جمع شِفَاهٌ اور شَفَوَاتٌ آتی ہیں * -

قرآن کریم میں شَفَّتَيْنِ (۹۰/۹) - دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ الشَّفَّةُ کے مادہ میں آخری حرف واو بھی ہو سکتا ہے اور ہاء بھی جو محذوف ہے **** -

بعض علمائے لغت نے شَفَّةٌ کی اصل شَفَوٌ قرار دی ہے - اس لئے ہم نے اسے ش - ف - و میں بھی لکھا ہے - وہاں بھی دیکھ لیا جائے -

ش ف و

الشَّفَا - چیز کا کنارہ - ہر چیز کی حد - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ شَفَا (ش - ف - و) سے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں فاء - باء سے بدلی ہوئی ہو - یعنی شبا بدل کر شفا ہو گیا ہو - جب سورج غروب ہو رہا ہو تو کہتے ہیں مَا بَقِيَ مِنْهُ إِلَّا شَفَى - یعنی اس کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے * - اس سے اس کے معنی ہلاکت سے قریب ہونے کے آتے ہیں - شَفَتِ الشَّمْسُ - آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا ** -

قرآن کریم میں ہے عَلٰی شَفَا جُرْفٍ (۱۰۹) گرتے ہوئے ساحل کے کنارے پر - نیز شَفَا حُفْرَةً (۱۰۲) - گڑھے کے کنارے پر -

الشَّفَا - ہونٹ کو کہتے ہیں جس کی جمع شَفَوَاتٌ اور شِفَاهٌ آتی ہے - اس سے مُشَافَهَةٌ منہ در منہ بات کرنے کو کہتے ہیں ** - قرآن کریم میں شَفَتَيْنِ (۹۰) - دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے (الشَّفَا) میں واو محذوف ہو اور یہ بھی کہ ہاء محذوف ہو - (نیز دیکھئے عنوان ش - ف - ہ)

ش ف ی

شَفَاهٌ - يَشْفِيهِ - شِفَاءٌ - اسے شفاء دی ، بیماری سے ٹھیک کیا - الشِّفَاءُ کے معنی بیماری سے اچھا ہونے کے ہیں - پھر اسے دوا اور علاج کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے ** - قرآن کریم میں یہ لفظ مرض کے مقابلہ میں آیا ہے - وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (۲۶) - ”جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے“ - اور دوا کے معنوں میں بھی - فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ (۱۶) - اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کنارے پر آجانے اور اوپر سے جھانکنے کے ہیں - اس کا خیال ہے کہ شفاء مرض پر غالب آنے کی وجہ سے شفاء کہلاتی ہے -

ش ق ق

شَقَّهْ - يَشْقِيْهِ - شَقًّا - کسی چیز کو پھاڑنا - اس میں شکاف کرنا انْشَقَّ - پھٹ گیا - الشَّقُّ - صبح ** - انْشَقَّتِ الْعَصَا - شیرازہ بکھر گیا -

* محیط - ** تاج -

باہمی اختلافات شروع ہو گئے۔ شَقَّ عَصَا الْمُسْلِمِينَ۔ اس نے مسلمانوں کی جماعت اور ان کی وحدت میں افتراق و انتشار پیدا کر دیا۔ الْمُشَاقَّةُ وَالشِّقَاقُ۔ مخالفت۔ عداوت۔ باہمی اختلاف*۔ شَقَّ۔ مشقت۔ صعوبت۔ کوفت۔ پوری قوت لگانے اور تگ و دو کرنے سے تھک جانا۔ تَکَانَ۔ شَقَّ عَلَیْهِ الْأَمْرُ۔ معاملہ اس پر گراں گزرا۔ شَقَّ عَلَیْهِ۔ اسے مشقت میں ڈال دیا*۔

الشَّيْقَاقَةُ۔ مسافت کا بُعد۔ سفر۔ بعید* (۹۳)۔ وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے۔

قرآن کریم میں پتھروں کے پھٹنے کے لئے شَقَّ اور چشموں کے پھوٹنے کے لئے فَجَّرَ کے مادے آئے ہیں (۲۳)۔ سورۃ ص میں شِقَاقِ (۳۸) مخالفت کے معنوں میں آیا ہے۔ اور (۵۹) میں شَاقَّ مخالفت اور اختلاف کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ عبس میں ہے ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقَاقًا (۸۶)۔ ”پھر ہم زمین کو محسوس طور پر پھاڑتے ہیں“۔ سورۃ قصص میں ہے وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلَأَ شُقُوعًا عَلَیْكَ (۲۸)۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی سختی کروں یا کٹھن ذمہ داری ڈالوں۔ سورۃ نحل میں شَقَّ کے معنی مشقت کے آئے ہیں (۱۶)۔

شَاقَّ کے معنی ہیں مخالفت کرنا۔ عداوت کرنا۔ جداگانہ روش اختیار کرنا۔ مَنْ يَشَاقِقِ الرَّسُولَ (۱۱۵)۔ شِقَاقُ۔ اختلاف ایک دوسرے سے جدا ہو جانا (۳)۔ قرآن کریم میں ہے اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ* وَأَنْشَقَ الْقَمَرُ* (۵۳)۔ انقلاب کی گھڑی قریب آئی اور ”القمر“ شق ہو گیا۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق۔ م۔ ر) دیکھئے۔

ش ق ی (و)

الشِّقَاقُ۔ شدت اور تنگی۔ نامرادی اور محرومی۔ شَقِيٌّ۔ يَشْقَى۔ شَقَاوَةٌ۔ شِقْوَةٌ۔ بد بخت اور بد نصیب ہونا۔ شَقَاوَةٌ۔ سعادت کی ضد ہے اور چونکہ شقاوت میں کوفت اور تھکن ہوتی ہے اس لئے کسوفت اور مشقت کو بھی شَقَاوَةٌ کہہ دیتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت و مشقت برداشت کرنا ہیں۔ نیز یہ سہولت، نرمی اور سعادت و خوش بختی کی ضد ہے۔ الْمُشَاقَاةُ۔ مصیبت جھیلنا۔ سختی برداشت کرنا۔ الشَّقَايِي مِنَ الْجِبَالِ۔ ایسا پہاڑ جو اوپر سے باہر کی طرف نکلا اور جھکا ہوا ہو اور جس پر چڑھنا بہت مشکل ہو۔

قرآن کریم میں شَقِیٌّ ۱؎ وَ سَعِیْدٌ ۲؎ آیا ہے۔ یہاں شقاوت، سعادت کی ضد ہے۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کا قول ہے کہہ وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِیْكَ رَبِّ شَقِیًّا ۳؎۔ یہاں محرومی و نامرادی مراد ہے۔ سورۃ طہ میں ہے مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰی ۴؎ ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ تو زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ کر مشقتوں میں پڑھ جائے۔ اس ”تَشْقٰی“ کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوا ہے جہاں آدم سے کہا گیا ہے کہ اس جنت میں تیرے لئے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے موجود ہے ۵؎۔ لیکن اگر تو ابلیس کی باتوں میں آ گیا تو یہ تجھے اس جنت سے نکال دیگا۔ فَتَشْقٰی ۶؎۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو اس تمام سامان سے محروم رہ کر جگر پاش مشقتوں میں پڑ جائیگا۔ سورۃ اللیل میں ہے کہ جہنم میں وہ جاتا ہے جو أَشْقٰی ۷؎ ہوتا ہے۔ بہت ہی نامراد و ناکام، بد نصیب۔ لیکن اس کے مقابلہ میں أَتْقٰی ۸؎ آیا ہے۔ اس لئے أَشْقٰی کے معنی سرکش کے بھی ہو سکتے ہیں سورۃ مریم میں جَبَّارًا شَقِیًّا ۹؎ آیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں جہنمیوں کے متعلق ہے کہ وہ کہیں گے کہ غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا ۱۰؎ ہماری بد بختی ہم پر غالب آ گئی۔ یاد رہے کہ یہ محرومی اور بد بختی، انسان کے اپنے اعمال کے نتیجہ کا نام ہے۔ خوش بختی یا بد بختی انسان کے لئے ”مقدر“، نہیں ہوتی۔

ش ک ر

الشُّكْرُ - اس مادہ میں اصلی معنی بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں۔ ابن فارس نے اس کے مختلف بنیادی معنی بتائے ہیں جن میں سے ایک، کسی چیز کا بھرا ہوا ہونا اور مقدار میں کثیر ہونا بھی ہیں۔ شَكْرَتِ النَّاقَةِ - اونٹنی کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ الشُّكْرُ - اس دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں جسے اگرچہ چارہ کم ہی ملے لیکن اس کے تھن دودھ سے بھرے رہیں۔ ضَرْبَةُ شُكْرٍ - دودھ سے بھرپور تھن۔ الشُّكْرَةُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے تھن دودھ سے بھرے ہوں۔

شَكْرَتِ الشَّجَرَةِ - درخت کے تنہ پر ٹہنیاں نکل آئیں۔ اشْتَكْرَتِ السَّمَاءُ - بارش خوب زور سے برسی۔ اشْتَكْرَ الْحَرُّ وَالْبَرْدُ - سردی اور گرمی بھر پور ہو گئی۔ شَكَرَ فُلَانٌ - اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک انسان کی

طرف سے شُکْر کے معنی اطاعت و ادائے فرائض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار، اور خدا کی طرف سے شُکْر کے معنی پورا پورا بدلہ دینا، یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ہیں۔ (مثلاً کوئی شخص اگر اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ہے تو اس کی یہ قربانی، اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دیدے۔ یہ مطلب ہے ”تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے“ کا)

شُکْر کے بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے ”سعی مشکور“ کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ یعنی ایسی کوشش جسکے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ ایسے بھرپور جیسے بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔ شَاکِرٌ (فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلَیْمٌ - ۱۵۸)۔ وہ ہے جو کسی کی کوشش میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ اور وہ بھی جسکی کوششیں اس طرح بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔ اسی طرح سورۃ زمر میں شُکْر کا لفظ ضبط اعمال (اعمال کے رائیگاں جانے) اور خُسْر کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۶۶-۶۵)۔ اس شخص کو شَاکِرٌ بھی کہا گیا ہے جسکی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں (۱۴)۔ صیغہ کے لحاظ سے شَاکِرٌ میں شَاکِرٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

چونکہ شُکْر کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ہیں اس لئے اس کے مقابلہ میں کُفْر کا لفظ آیا ہے (۱۴) جسکے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَاشْکُرُواْ لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْا (۱۵۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تا کہ اس سے نوع انسانی فائدہ اٹھائے۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو۔

خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے پہلے وہ صلاحیتیں آتی ہیں جو خود انسان کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا (ور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا) ان کا شُکْر ہے۔ اور یہ چیز اعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اعمال صالحہ خدا کی نعمتوں کے شُکْر کا موجب بنتے ہیں۔ سورۃ احقاف میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جب کہا گیا ہے کہ تم دعا مانگا کرو (اسکی آرزو کیا کرو) کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا (۱۵)۔ اے میری نشوونما دینے والے مجھے توفیق عطا کر دے کہ میں تیری دی ہوئی نعمتوں کا ”شکر“ کروں۔ یعنی میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ

مَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۱۱۳)۔ جو خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھتا ہے اس سے خود اسکی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور جو ان پر پردے ڈالتا ہے تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خود اسکا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا اپنی ذات میں قابل حمد و ستائش ہے۔ تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں ہے۔

خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں خدا کے قانون کے مطابق صرف میں لایا جائے۔ یعنی نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائے۔ اس حقیقت کو سورۃ نحل میں ایک بستی کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ اس بستی میں رزق کی بڑی فراوانی تھی لیکن فَكَفَرَتْ بِسَانُعِمْ لِّلّٰہِ (۱۱۳)۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں پر پردے ڈالنے شروع کر دیے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب آگیا۔ ان کی طرف خدا کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ اس کے بعد جماعت مسومین سے کہا گیا ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰہِ (۱۱۳)۔ تم خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنا۔ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۱۳)۔ اگر تم صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرتے ہو تو۔ اس سے ظاہر ہے کہ شکر نعمت کے معنی ہیں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (سامان رزق وغیرہ) کو خدا کے قانون کے مطابق عام رکھنا۔ اور کفر نعمت کے معنی ہیں انہیں اپنے خود ساختہ قوانین و نظریات (بِمَا كَانُوا يَصْنَعُوْنَ) کے مطابق چھپا چھپا کر رکھنا۔ اسی کو سورۃ اعراف میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ شَاكِرٍ يِّنْ وَہیں جو ابلیس کی راہوں پر نہیں چلتے اور اس کے دام فریب میں نہیں آتے (۱۷)۔

سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲)۔ ہم نے تمہیں موت کے بعد نئی زندگی عطا کی تاکہ تم ”شکر کر سکو“۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوموں کو ان کی موت کے بعد حیات نو اس لئے ملتی ہے کہ وہ اپنی مضمحلہ صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر سکیں۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندہ نہیں کھلا سکتیں۔ نہ ہی زندہ رہ سکتی ہیں۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ۔

(۱) مساعی کے مشکور ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان میں بھرپور نتائج

پیدا ہو جائیں۔ وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو جائیں۔

(۲) انسان کی طرف سے شُکْر کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی دی

ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنی

(الف) وہ اپنی مضمحل صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرے اور

(ب) کائنات میں پھیلے ہوئے سامانِ نشوونما کو نوعِ انسانی کی پرورش

کیلئے کھلا رکھے۔ ان پر پردے نہ ڈالے۔

(۳) یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کی پوری پوری

اطاعت کرے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ انسان کی طرف سے شُکْر

ہو گا۔ اور

(۴) خدا کی طرف سے شُکْر کے معنی یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال

میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ یہ قانونِ خداوندی کی خصوصیت ہے کہ جو

اسکے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

سورة الدھر میں ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَا كِرًا وَاِمَّا

كَفُوْرًا (۶۱)۔ ہم نے انسان کو (وحی کے ذریعے) صحیح راستہ دکھا دیا

مے۔ اب اسکی اپنی مرضی ہے کہ چاہے اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے

انکار کر دے۔ یہاں شُکْر سے مراد کسی بہت بڑی نعمت کی قدر کرتے

ہوئے اسے اختیار کر لینا ہیں۔ سورة نساء میں ہے اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ

(۱۳۷)۔ اگر تم اس ہدایت کی قدر کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ (۱۳۳) میں

شُکُوْر بمعنی شاکر استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ غریب القرآن (مرزا

ابوالفضل) نے لکھا ہے کہ اسکے معنی حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ

اٹھانا بھی ہیں۔ مثلاً سورة سبا میں ہے اِعْمَلُوْا اَلْاٰلِ دَاوُدَ شُكْرًا (۱۳۳)۔

اے آلِ داوود تم حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (ہمارے

قانون کے مطابق) عمل کرو۔ یعنی کائنات کی قوتوں اور مختلف اسباب و ذرائع

سے فائدہ اٹھانا، ان کا شکر ادا کرنا ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنوں میں تھوڑی چیز پر

اکتفا کر لینا بھی ہیں۔ چنانچہ فَرَسٌ شُكُوْرٌ اس گھوڑے کو کہتے

ہیں جسے فریبی کی بنا پر تھوڑا سا چارہ بھی کافی ہو جاتا ہو۔ صلاحیتوں کے

نشوونما پا جانے سے خود بخود یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے

خارجی سہارے بھی بھرپور نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔

ش ک س

شَكَاسَةٌ اَلْاَخْلَاقِ - اخلاق کا درشت اور تنگ ہونا۔ شَاكَسَهُ

اس نے اس سے تنگی کا برتاؤ کیا۔ اَللَّيْلُ وَالنَّهَارُ يَتَشَاكَسَانِ - دن

اور رات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ تَشَاكَسُوا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی۔ یا انہوں نے ایک دوسرے سے لین دین اور خرید و فروخت کے معاملہ میں تنگی کا برتاؤ کیا*۔

قرآن کریم میں ہے شَرَّكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ (۳۹/۲۹)۔ کاروبار میں حصے دار جو تند خوئی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں اور معاملات میں تنگ نظری کا ثبوت دیں۔

ش ک ک

الشَّكَّاتُ۔ یقین کی ضد ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ جب دو متضاد چیزیں کسی شخص کی نگاہ میں ایک جیسی اور یکساں ہو جائیں تو اس کیفیت کو شَكَّاتُ کہتے ہیں**۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس طرح عَلِمٌ سے یقین کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح شَكَّاتُ سے رَیْبٌ کی ابتدا ہوتی ہے (دیکھئے عنوان ر۔ ی۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ شَكَّاتُ مُرَرِیْبٌ تو کہتے ہیں لیکن رَیْبٌ مُشَكَّکَاتٌ نہیں کہتے***۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی چیزوں کا ایک دوسری میں گھس جانا اور داخل ہو جانا بتائے ہیں، چنانچہ شَكَّاتُہُ بِالرُّمُحِ کے معنی ہیں میں نے اس کے بدن میں نیزہ گھسا دیا۔ اسی سے شَكَّاتُ ہے کہ اس میں دو چیزیں ایک دوسری میں گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے یقینی شکل، جداگانہ اور واضح نہیں ہوتی****۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَكَّاتُ الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز میں آ رہا سوراخ کر دیا اور جب کسی چیز میں یہ کیفیت ہوگی تو اس میں قرار و ثبات نہیں ہو سکے گا اور اس پر پختگی سے بھروسہ نہیں کیا جاسکے گا۔ یہ خیال بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ یہ شَكَّاتُ سے استعارہ ہو جس کے معنی ہیں بازو کا پہلو سے چمٹ جانا۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ایک دوسرے سے مخالف چیزوں کا باہم دگر مل جانا اور اس طرح عقل و فہم کو ان کے درمیان داخل ہو کر ان میں سے ایک چیز کو جداگانہ دیکھنے کا موقع نہ ملنا*****۔ شَكَّوْا بُیُوتَہُمْ کے معنی ہیں انہوں نے اپنے تمام مکانات ایک جیسے بنائے*۔

ان مثالوں سے شَكَّاتُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی دو متضاد باتوں کا یکساں محسوس ہونا اور اس لئے انسان کا کسی صحیح فیصلہ تک نہ پہنچ سکتا۔

حضرت عیسٰیؑ کے واقعہ صلیب کے ضمن میں کہا ہے کہہ اِنَّ الَّذِیْنَ
اِخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَیْفِیْ شَکِّیْنِ مِّنْهُ (۱۵۷)۔ اس سے شک کے معنی واضح
ہو جاتے ہیں۔ یعنی وَلَکِیْنِ شُبَّہِیْنِ لَہُمْ (۱۵۷)۔ حضرت عیسٰیؑ میں،
اور جس شخص کو انہوں نے گرفتار کیا، اس میں ایسی باہمی مشابہت تھی کہہ ان
پر اصل۔ حال مشتبہ ہو گیا۔ یہ وجہ ہے کہہ وہ اس کی بابت شک میں ہیں کہہ
انہوں نے سمجھا کیا اور دراصل ہوا کیا تھا۔ (تفصیل میری کتاب ”شعلہ“
مستور“۔ ذکر حضرت عیسٰیؑ میں ملیگی)۔

ش ک ل

الشَّیْءُ کُلٌُّ۔ (ش پر زبر اور زیر کے ساتھ) کسی کی مثل۔ اُس جیسا۔
فِیْ فُلَانٍ شَکْلٌ مِّنْ اَبِیْہِ۔ فلاں آدمی میں اپنے باپ سے مشابہت ہے*۔
سورۃ ص میں ہے وَ اٰخِرٌ مِّنْ شَکْلِہِ اَزْوَاجٌ (۳۸/۵۸)۔ اُسی قسم کی، اُس
سے ملتی جلتی رنگا رنگ کی اور سزائیں۔ اس کی جمع اَشْکَالٌ آتی ہے جس کے
معنی مختلف معاملات اور ضرورتیں ہیں۔ شَکْلٌ اِلَا مَرٌ۔ معاملہ گڈ مڈ اور
مشتبہ ہو گیا*۔

الشَّیْءُ کَالٌ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی اگلی اور پچھلی
ٹانگیں باندھی جائیں تاکہ وہ اس حد تک قدم اٹھا سکے جس تک یہ رسی
اجازت دے۔ شَکْلٌ الدَّابَّةُ۔ اس نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں۔
ابن فارس نے لکھا ہے کہہ اس مادہ کے بیشتر الفاظ کے معانی مماثلت اور باہمی
مشابہت سے ماخوذ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہہ شَکَلْتُ الدَّابَّةَ اس لئے کہتے
ہیں کہہ اس میں جانور کی ایک ٹانگ کو اس جیسی دوسری ٹانگ سے باندھا
جاتا ہے۔ الشَّیْءُ کَالٌ فِی الرَّحْلِ۔ وہ رسی جس سے کجاوہ کے اگلے اور پچھلے
بندھنوں کو ملا کر باندھا جاتا ہے*۔ یہ اسم آلہ ہے۔ اسی مادہ سے اسم فاعل
شَاکَلٌ ہے جس کی مؤنث شَاکَلَتْ ہے۔ اس کے معنی ہوئے باندھنے والی۔
یہ وہی چیز ہے جسے شِیْکَالٌ کہتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے قُلْ
کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکَلَتِہِ (۱۸۳)۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس
حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اس کی ممکنات
(Potentialities) رکھ دی گئی ہیں۔ آم کی گٹھلی میں یہ امکانی قوت رکھدی
گئی ہے کہہ وہ مناسب نشو و نما کے بعد آم کا درخت بن جائے جس میں آم
جیسا میٹھا، خوشبودار، رنگین پھل آئے۔ لیکن کیکر (ببول) کا بیج اگرچہ

درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں۔ آم کی گٹھلی کا منتہی (Inner-Destiny) آم کا پھل ہے۔ کیکر کے بیج کا منتہی کانٹے دار درخت۔ ان میں سے کوئی شے اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کا امکان اسکے اندر ہوتا ہے، جس طرح ایک جانور اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس تک اس کی شاکلۃ^۱ اسے پہنچنے دیتی ہے۔ مندرجہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شے اپنی شاکلۃ^۲ کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں جاسکتی۔ فطرت نے اس کا جو منتہی معین کر دیا ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی شاکلۃ^۳ متعین ہوتی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اسکے ممکنات کی بھی ایک انتہا ضرور ہے لیکن زندگی کی موجودہ اسٹیج اسکی آخری حد نہیں۔ یہ اَقْطَارُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۵۵) سے بھی آگے جاسکتا ہے۔ لیکن مسوروثی اثرات، ابتدائی ماحول، تربیت، تعلیم، جذباتی رجحانات وغیرہ وہ رسیاں ہیں جن سے اسکا پاؤں بندھ جاتا ہے۔ لیکن صحیح معاشرہ ان رسیوں میں وسعتیں پیدا کر سکتا ہے۔ قرآن کریم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کی مضمحل صلاحیتیں کامل نشو و نما پا جائیں۔ اس معاشرہ میں جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہ درحقیقت اس کی ذات کی صلاحیتوں کی وسعت کے لئے ہوتی ہیں۔ لَا يَكْفِ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲۸۶) کا یہی مفہوم ہے۔ قرآنی معاشرہ میں ہر فرد پر اس کی شاکلۃ^۴ کے مطابق ذمہ داری عائد کی جائیگی اگرچہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کی حدود کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔ حیوان کے بچے کی نشو و نما کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے باپ جیسا ہو جائے۔ لیکن انسانی بچہ مناسب نشو و نما سے اپنے اسلاف سے کہیں آگے جاسکتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ موجودہ دور کا انسان بہ ہیئتِ مجموعی اپنی سابقہ نسلوں سے کہیں آگے ہے۔ اسی طرح آنے والے دور کے انسان موجودہ زمانے کے انسان سے آگے جاسکتے ہیں، اس طرح، جہاں ایک دور میں مختلف انسانوں کی مضمحل ممکنات مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نسلِ انسانی کی ممکنات مختلف ہوتی ہیں۔ اور علم و شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ممکنات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسکی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ (واضح رہے کہ ان ممکنات سے مراد انسانی ذات کی خصوصیات ہیں جو ہر فرد میں ہمیشہ یکساں ہوتی ہیں۔)

صاحب لطائف اللغہ نے لکھا ہے اَلشَّوْاِکِلُ (جو شاکلۃ^۵ کی جمع ہے) ان راستوں کو کہتے ہیں جو ایک شاہراہ سے پھوٹ نکلیں۔ (نیز تاج)۔ اس سے مراد زندگی کی مختلف راہیں اور انسانوں کے مختلف طور طریق ہیں جن پر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق چلتے ہیں۔

یاد رہے کہ انسانی اختیارات کی ایک حد ضرور ہے (جس طرح وہ ایک پاؤں اٹھا کر تو کھڑا رہ سکتا ہے لیکن دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا)۔ لیکن جس حد تک اسے اختیار دیا گیا ہے اس میں وہ بالکل آزاد ہے۔ اس کے اختیار و ارادہ میں کوئی دخل انداز نہیں ہوتا۔ (مزید تفصیل ق۔ د۔ ر کے عنوان میں دیکھئے)۔

ش ک و (ی)

شَكْوَةٌ^۵۔ مشک یا چمڑے کا تھیلا جو پانی یا دودھ رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور جسکا صرف ایک طرف سے منہ کھلا ہوتا ہے۔ شَكْوٌ^۶ کے معنی ہیں اس مشکیزہ کا منہ کھول دینا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہو وہ باہر آجائے، یا ظاہر ہو جائے۔ اس سے شِکَايَةٌ^۷ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنے دل کی بات کو ظاہر کر دینا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنے پرانگندہ حال کے اظہار کے ہیں*۔ سورة یوسف میں ہے اِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزِّي إِلَى اللَّهِ (۱۲/۸۶)۔ میں اپنی پریشان حالی اور رنج و غم کا اظہار اپنے خدا سے کرتا ہوں۔ دوسری جگہ ہے وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ (۵۸/۱)۔ ”وہ اللہ سے اپنی حالت کا اظہار کر رہی تھی“۔ اسی مادہ سے اَلْمِشْكُوَةُ^۸ ہے جس کے معنی ہیں دیوار میں ایسا موخلہ جو آریار نہ ہو۔ طاق*۔ بعض نے اس کے معنی چراغدان کئے ہیں۔ (۲۳/۳۵)۔ اَلشَّكْوَى^۹۔ شکایت**۔

ش م ت

شَمِيتُ الْعَدُوِّ^{۱۰} وَشَمَاتَةٌ^{۱۱}۔ کسی کے دشمن کا اسکی مصیبت پر خوش ہونا۔ اَشْمَتَهُ^{۱۲} بَعَدُوًّا^{۱۳} وہ۔ اس کے دشمن کو تکلیف پہنچا کر اسے خوش کیا،***۔ جب حضرت موسیٰؑ فرط غضب میں حضرت ہارونؑ کا سر پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچنے لگے تو حضرت ہارونؑ نے ان سے کہا تھا فَلَا تَشْمِتْ بِيْ اِلَّا عِدَاَّاءَ (۱۵۰/۱)۔ تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے اور خوش ہونے کا موقع نہ دے۔ ویسے اَلتَّشْمِيتُ^{۱۴}۔ چھینکنے والے کو دعا دینے کو کہتے ہیں۔ گویا اس دعا سے شماتت کو اس سے دور کرنا مراد ہوتا ہے۔ جیسے تَمَرُّ يُّضْ^{۱۵} کے معنی مرض کو دور کرنا ہوتے ہیں****۔

ش م خ

شَمَخَ الْجَبَلُ^{۱۶}۔ پہاڑ کا بہت بلند اور لمبا ہونا۔ الْجَبَالُ^{۱۷} الشَّوَامِخُ^{۱۸}۔ بہت بلند اور لمبے پہاڑ۔ شَمَخَ الرَّجُلُ^{۱۹} بَيَافِئِهِ^{۲۰}۔ اس

* تاج و راغب۔ ** محیط۔ *** تاج۔ **** راغب۔

آدمی نے اپنی ناک چڑھائی - تکبر کیا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا اور بلند ہونا بتائے ہیں - قرآن کریم میں رَوَّاسِي شَمِخَتْ (۲۷۷) آیا ہے - اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑ -

ش م ز

الشَّمَمُزُ - نفس انسانی کا ناخوش آئند چیزوں سے متنفر ہونا - تَشَمَّزَ وَجْهَهُ - اس کا چہرہ بگڑا، متغیر اور منقبض ہو گیا - اِشْمَازًا - ڈرنا اور گھبرانا - رونگٹے کھڑے ہو جانا، منقبض ہونا، گٹھٹ جانا، تنگی محسوس کرنا - اِشْمَازًا الشَّيْئِي - اسنے اس چیز کو ناپسند کیا - اَلْمُشْمِيزُ - متنفر - ناپسند کرنے والا - دہشت زدہ * -

سورة زمر میں ہے اِذَا ذُكِّرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اِشْمَازًا زَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ (۳۹) - جب ان لوگوں کے سامنے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں - وَ اِذَا ذُكِّرَ الَّذِينَ مِّنْ دُونِهِ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹) اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں - انسان شخصیت پرستی سے خوش ہوتا ہے اور خالص قانون کی اطاعت اس پر شاق گزرتی ہے - اس لئے کہ انسانوں کو جذبات کی رو سے خوش کر لینا آسان ہوتا ہے اور قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا - قرآن کریم نے جو دین نوع انسانی کیلئے تجویز کیا ہے اس میں خالص قانون خداوندی کی اطاعت مقصود تھی - شخصیت پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں - لیکن انسانی آمیزشوں نے اس دین کی حالت یہ کردی ہے کہ کوئی بات لیجئے، اسکی آخری سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے - خدا کا قانون (قرآن کریم) بہ حیثیت آخری سند (Final Authority) کے کہیں نہیں آتا - حتکہ اگر کسی کو ان ارباب من دون اللہ سے الگ کر کے خالص اطاعت خداوندی کی دعوت دی جائے تو وہ اس داعی کا سخت مخالف ہو جاتا ہے - یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت میں) توجہ دلائی ہے -

ش م س

الشَّمَمُسُ - آفتاب (۲۵۸) دھوپ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگ برنگ اور متلون ہونے اور کم قرار پکڑنے کے ہیں - اَلشَّمَمُوسُ مِّنْ الدَّوَابِّ وہ چوپایہ جسے قرار نہ ہو - آفتاب کو بھی اَلشَّمَمُوسُ

اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ دھوپ کی گرمی۔
لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَلَا زَمَهْرًا يَّرَآ (۱۶/۱۳)۔

مَطْلِعُ الشَّمْسِ (۱۶/۱۴) وہ مقام جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا معلوم ہو۔
انتہائی شرقی سمت۔ مَغْرِبُ الشَّمْسِ (۱۶/۱۵)۔ وہ مقام جہاں سورج غروب
ہوتا نظر آئے۔ انتہائی مغربی سمت۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ
تھا جس طرح عرب جاہلیت کا قومی نشان قَمَرٌ تھا **۔ (اس اعتبار سے قَمَرٌ
اور شَمْسٌ کے معنی کیلئے ق۔ م۔ رکا عنوان دیکھئے)۔

ابن کلبی نے کہا ہے کہ الشَّمْسُ پرانے زمانے کے ایک بت کا نام
ہے ***۔ (شاید اسی کی طرف نسبت کر کے عرب عبد شمس نام رکھتے تھے)۔
بعض کا خیال ہے کہ شَمْسٌ ایک مشہور چشمہ کا نام تھا ***۔

ش م ل

الشِّمَالُ - بائیں جانب - (يَمِيْنٌ کی ضد ہے) - (۱۶/۱۷) - يَمِيْنٌ
(دایاں ہاتھ) يُمِيْنٌ و سعادت اور خیر و برکت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے
الشِّمَالُ (بایاں) نحوست کا نشان۔ اسی لئے کہتے ہیں زَجَرْتُ لَهُ
طَيْرَ الشِّمَالِ میں نے اس کے لئے نحوست کے پرندے کو جھڑکا*۔ قرآن
کریم میں اصْحَابُ الشِّمَالِ (۵۶/۳۱) اہل جہنم کے لئے آیا ہے۔ یہی ہیں
جن کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا (۶۹/۲۵)۔ الشِّمَالُ - شمالی
ہوا، جو بالعموم سرد ہوتی ہے۔ مصر میں یہ باد شمال سرد اور خشک ہوتی ہے،
اور اگر یہ سات دن تک متواتر چلتی رہے تو مصری کفن تیار کرنے شروع
کردیتے ہیں کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے*۔

الشِّمَالُ - اس غلاف کو بھی کہتے ہیں جو بکری کے تھن پر چڑھایا
جاتا ہے*۔ اور الشِّمْلَةُ - وہ کملی ہے جس میں انسان لپٹ جائے*۔ راغب
کا کہنا ہے کہ شِمَالٌ اس کپڑے کو کہتے تھے جس سے بائیں جانب ڈھانپ لیجائے۔
نیز الاشْتِمَالُ بِالْثَّوْبِ کسی کپڑے میں اس طرح لپٹنے کے لئے بولا جاتا
ہے کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے****۔ پھر یہ کپڑے میں لپٹنے کے
لئے استعمال ہونے لگا۔ اسی اعتبار سے اِشْتَمَلَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی
ہوتے ہیں کسی چیز پر محیط ہو جانا، اور اسے اپنے اندر شامل کر لینا*****۔

* تاج - ** (میرزا ابوالفضل) - *** ابن فارس - **** راغب - ***** محیط۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔ الرَّحِيمُ تَشْتَمِلُ عَلَى الْوَكْدِ - رحم نے بچہ کو اپنے اندر لے رکھا ہے (۱۳۵) میں ہے آمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأَنْثَى - یا وہ کچھ جو دو ماداؤں کے رحموں میں ہے۔

طبیعت اور عادت کو بھی الشِّمَالُ کہتے ہیں۔ اسکی جمع شَمَائِلُ ہے*۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ (i) عربوں کے ہاں یَمِیْنُ سعادت اور خوش بختی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اور شِمَالُ، نحوست کی نشانی۔ اور (ii) قرآن کریم نے أَصْحَابُ الشِّمَالِ - اہل جہنم کو کہا ہے اور أَصْحَابُ الْيَمِیْنِ اہل جنت کو۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم بھی سعد و نحس کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح عرب (عہد جاہلیہ میں) عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآن کریم، عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے وہ اس زبان کے الفاظ اور محاورات کو انہی معنوں میں استعمال کرتا ہے جن معنوں میں عرب انہیں استعمال کرتے تھے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم اس وجہ یا سبب کو بھی تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر عرب کسی لفظ کا خاص مفہوم لیتے تھے۔ یہ بنیادی نقطہ ہے جسے ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ش ن ا

شَنَّأَہُ - کسی سے سخت بغض رکھنا**۔ محیط نے کہا ہے کہ یہ ایسے بغض کو کہتے ہیں جس میں دشمنی کے ساتھ بد خلقی بھی شامل ہو۔ قرآن کریم میں شَنَّانُ قَوْمٍ (۵۴) آیا ہے۔ یعنی کسی قوم کا شدید بغض یا اس کی بدترین دشمنی۔ دوسری جگہ ہے إِنَّ شَانِيَكُمْ هُوَ الْأَبْتَرُ (۱۰۸) - تجھ سے بغض رکھنے والے کی جڑیں کٹ گئیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں بغض رکھنا اور گریز کرنا پایا جاتا ہے۔

ش ہ ب

الشَّهَبُ - سفید رنگ جس میں سیاہی کی آمیزش ہو*۔ (تقریباً ایسا رنگ جیسے آگ کا شعلہ جب اپنی انتہائی حد کو پہنچ جائے تو اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے اور اس کے مرکز میں کچھ سیاہی مائل سا رنگ نظر آتا

ہے)۔ نیز وہ پہاڑ جو برف سے ڈھکا ہوا ہو۔ سَنَّةٌ شَهْبَاءٌ۔ قحط والا سال جس میں کہیں سبزی نظر نہ آئے اور زمین خشکی کی وجہ سے یکسر سفید ہو چکی ہو۔ شِهَابٌ آگ کا بلند ہونے والا شعلہ۔ وہ شعلہ جو رات کو آسمان میں دور تک جاتا نظر آتا ہے۔ (اسے ٹوٹتا تارا کہتے ہیں)۔**

زمانہ جہالت میں لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ نجومی، ستاروں کی گردش سے انسان کی تقدیر کے زائچے بنایا کرتے تھے۔ (اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے اور علم نجوم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے)۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی باتیں دورِ جہالت میں تو چل سکتی تھیں لیکن جب دنیا میں علم کی روشنی آ جائے تو اس قسم کی ظنی اور قیاسی چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ اگر اس وقت کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو علم و یقین کا ایک ”شہابِ مبین“ اس کے پیچھے آجاتا ہے جو اس ظن اور قیاس کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے۔ (۱۸/۱ و ۳۹/۲ و ۹۲/۱)۔

ش ھ د

شَهِيدٌ يَشْهَدُ کے معنی ہیں حاضر ہونا۔ موجود ہونا۔ شَهِادَةٌ۔ جو کچھ کسی کو معلوم ہو (بصارت یا بصیرت کی بنا پر) اسے ٹھیک ٹھیک طور پر حاضر (بیان) کر دینا۔** ایسا کرنے والے کو شَهِيدٌ اور شَهِيدٌ کہتے ہیں۔ مُشَاهَدَةٌ کے معنی (اہل لغت کے نزدیک) آنکھوں سے دیکھنا ہیں*۔ لیکن اس مفہوم کو وسعت دے دی جائے تو اس کے معنی ہونگے کسی چیز کا حواس کی گرفت میں آ جانا۔

قرآن کریم میں غَيْبٌ کے مقابل میں شَهِادَةٌ کا لفظ آیا ہے (۲۲/۵۹)۔ غَيْبٌ کے معنی ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو (دیکھئے عنوان غ۔ ی۔ ب) اس لئے شَهِادَةٌ سے مراد محسوس اشیاء ہونگی اور غَيْبٌ سے مراد وہ توانائیاں یا نتائج جو مضمحل ہوں۔ لہذا شَهِادَةٌ (یا مَشْهُودٌ) وہ نتائج ہیں جو مرتب ہو کر محسوس صورت میں بے نقاب ہو جائیں۔ غَائِبٌ الْفَرَسُ گھوڑے کی اس قوت کو کہتے ہیں جسے وہ دوڑنے میں محفوظ رکھ لے اور شَهِيدٌ الْفَرَسُ اس قوت کو جسے وہ کام میں لے آئے۔ نیز شَهِيدٌ کے معنی گھر پر موجود ہونا اور غَابٌ کے معنی سفر میں چلے جانا ہیں***۔ چنانچہ روزوں کے احکام کے ضمن میں جو آیا ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (۱۸۵/۲)۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے جو

حالت سفر میں نہ ہو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ (مسافر کے لئے الگ حکم ہے)۔ اِمْرَاۃٌ مُّشْهَدٌ۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند گھر پر موجود ہو*۔ مَشْهَدٌ۔ حاضر ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یا جس مقام پر تمام پوشیدہ امور اور نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں (۱۹/۳)۔ یَوْمٌ مَشْهُودٌ کے معنی ایسے وقت کے ہیں (۱۱/۳)۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا (۱/۸)۔ یہاں مَشْهُودٌ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقائق محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ (فَجْرٌ کے معنی متعلقہ عنوان میں دیکھئے)۔ شَهِدَ اَعْکُمُ (۲/۳)۔ تمہارے مددگار۔

خدا کو شَہِیدٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ ہر چیز اس کی نگاہوں کے سامنے ہے (۲۲/۱)۔ اور رسول اس اعتبار سے شَہِیدٌ (۲۸/۸) ہوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے (اسی کو نبوت کہتے ہیں) انہیں وہ دوسروں کے سامنے پوری قطعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے (اسے رسالت کہتے ہیں)۔ یا اس لئے کہ وہ اپنی جماعت کے اعمال کا نگران (شَہِیدٌ) ہوتا ہے۔ (۲۳/۱)۔

الشَّہِدُ۔ وَالشَّہِدُ۔ شَہِد (عَسَلٌ) کو بھی کہتے ہیں۔ جبکہ ابھی وہ چھتے سے باہر نہ نکالا گیا ہو**۔

شَہِید کے معنی گواہی دینے یا تصدیق کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور قسم کھانے کے بھی۔ شَہِیدٌ عَلَیْہِمُ (۲۱/۱) ان کے خلاف شہادت دینگے۔ شَہِیدٌ عَلَیْکَذَا کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کے متعلق پوری اور قطعی خبر بتا دینا***۔ صاحب غریب القرآن (ابو الفضل) نے (ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ شَہِید کے معنی فیصلہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ (مثلاً ۲۶/۱)۔ اس اعتبار سے اللہ شَہِیدٌ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ (۱۹/۱) کے معنی فیصلہ کرنے والا ہونگے۔ نیز اس کے معنی نگہبان کے بھی ہیں (۲۳/۱)۔

آپنے دیکھا ہے کہ اس لفظ کے استعمال کی صورتیں کتنی ہی متنوع کیوں نہ ہوں ان میں سے ہر ایک میں، موجود ہونا۔ حاضر رہنا۔ نظروں کے سامنے رہنا یا رکھنا، کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شَہِیدٌ کہا جاتا ہے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی۔ یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا۔ ویسے معنوی اعتبار سے دیکھا جائے تو

شہید زندہ انسان بھی ہو سکتا ہے اور (جسمانی طور پر) مردہ بھی۔ جو شخص اپنے مَآمَنَ بَیہ (جس پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی عملی شہادت پیش کر دے وہ شہید ہے۔ خواہ جان سے ہو یا مال سے یا کسی اور مطلوب شے سے۔ اور پھر آخر وقت تک اس روش پر قائم رہے۔ راہ خدا میں جان دینا، اپنے ایمان کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ 'شہداءِ علی النَّاسِ' (۱۳۲/۲) ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی (مختلف اقوام عالم) کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی۔ ان سب پر نگران۔ اور ان کا مرکز (رسولؐ) ان کے اعمال کا نگران (۱۳۲/۲)۔ غور کیجئے کہ ملت اسلامیہ کا دنیا میں فریضہ کیا تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کا مقام کس قدر بلند تھا۔ ایک وہ ملت اسلامیہ تھی اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہیں کہ دوسروں کے اعمال و کردار کے نگران و محاسب ہونا تو ایک طرف، ہم اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ ملت، قرآن کریم کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتی تھی اور ہم افسانوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

ش ہ ر

الشَّهْرَةُ*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی بری بات کا نمایاں اور مشہور ہو جانا۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کا استعمال مطلقاً کسی معاملہ کے واضح ہو جانے اور مشہور ہو جانے کیلئے ہوتا ہے۔ (اردو میں عام طور پر شہرت اچھی باتوں کیلئے بولا جاتا ہے اور تَشْهِيْرُ بری باتوں کے لئے)۔ الشَّهِيْرُ*۔ مشہور و معروف۔ معزز*۔ الشَّهْرُ* چاند کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ظہور سے مہینے کی شہرت ہو جاتی ہے۔ نیز مہینہ کو بھی شَہْرُ* کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔ اسی سے الشَّهْرُ* چاند کو کہتے ہیں۔ شَاہِرَةٌ* مُشَاہِرَةٌ*۔ اس سے ماہانہ اجرت پر معاملہ کیا*۔ قرآن کریم میں شَہْرُ رَمَضَانَ (۱۸۵/۲) مہینے کیلئے آیا ہے جسکی جمع اَشْهُرٌ* (۱۹۷/۲)۔ اور شَہْوَرٌ* ہے (۹/۹)۔

ش ہ ق

شَهَقَ الرَّجُلُ*۔ يَشْهَقُ*۔ شَهِيقًا*۔ اس کے سینہ میں رونے کی آواز متردد ہوئی، بار بار اٹک اٹک کر نکلی۔ شَهِيقُ الْحِمَارِ وَتَشْهَاقُهُ*۔

گدھے کے رینگنے کی آواز۔ الشَّهْوُوقُ - بلند ہونا۔ الشَّهْوَقَةُ - چیخ *۔
 قرآن کریم میں زَفِيرٌ وَشَهِيْقٌ (۱۱۶) آیا ہے۔ اس سے مراد چیخنا چلانا
 ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مصیبت زدہ لوگوں کی آوازوں کے لئے استعمال
 ہوتے ہیں، اور شَهِيْقٌ کے معنی ہیں کسراہنے کی بہت بلند آواز۔ یہ لفظ
 جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ہے جس کے معنی نہایت اونچے اور لمبے پہاڑ کے ہیں
 جس پر چڑھنا دشوار ہو *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند
 ہونے کے ہیں۔ نیز فُلَانٌ ذُو شَاهِقٍ سے مراد ہے وہ سخت غصہ ور ہے۔

قرآن کریم میں جہنم کی آواز کے لئے بھی شَهِيْقٌ کا لفظ آیا ہے۔
 (۶۷)۔ جہنمی معاشرہ میں ہر طرف چیخ پکار ہوتی ہے۔ وہ یہاں کا جہنم ہو
 یا آخرت کا۔

ش ھ و

شَهَاهٌ وَاشْتَهَاهٌ - کسی چیز کی خواہش کرنا۔ اسے چاہنا۔ رغبت
 کرنا۔ طبیعت کا میلان ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَهْوَةٌ نفس کے ان
 چیزوں کی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں جنہیں وہ چاہتا ہے۔ کبھی اس چیز
 کو شَهْوَةٌ کہہ دیا جاتا ہے جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو۔ اور کبھی خود
 اس جذبہ (میلان) کو شَهْوَةٌ کہتے ہیں **۔

شَيْئِي شَهِيٌّ لَذِيذٌ - طَعَامٌ شَهِيٌّ - وہ کھانا جو طبیعت کو
 مرغوب ہو ***۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ (۱۳) - میس، خود
 شَهَوَاتٌ (شَهْوَةٌ کی جمع) کے معنی (راغب کے الفاظ میں) مرغوب اشیاء
 ہیں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس میں الشَّهَوَاتِ بطور مجالغہ بمعنی
 مُشْتَهِيَاتٌ (مرغوب چیزیں) ہے۔ دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔
 یعنی مرغوب اور پسندیدہ چیزیں۔ یا میلانات۔ (۲۷) میں یہ لفظ (باقی الفاظ
 کے ساتھ مل کر) جنسی میلان کیلئے آیا ہے۔

جنتی زندگی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي
 أَنْفُسُكُمْ (۱۳)۔ اس میں ہر مرغوب خاطر شے میسر ہوگی۔ جو کچھ
 تمہارا دل چاہے۔

سورۃ مریم مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد ہے، فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِ هِمْ
 خَلَفٌ أَضَاءٌ وَالصَّلَاةُ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹) ان کے بعد ایسے لوگ آ گئے

جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلیں (دیکھئے عنوان ص - ل - و) وہ اپنے جذبات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اگر انسانی خواہشات کو وحی کی روشنی میں پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ جنتی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے لیکن اگر انہیں وحی کی پابندیوں کو توڑ کر پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹)۔ [نیز دیکھئے عنوان ہ - و - ی]

ش و ب

الشَّوْبُ - خلط ملط کرنا نیز آمیزہ (پانی دودھ وغیرہ کا)۔ شَابُ الشَّقِيِّ شَوْبًا - اس نے اس چیز کو خلط ملط کر دیا۔ ملا دیا۔ اس اعتبار سے الشَّوْبَةُ دھوکے اور فریب کو کہتے ہیں۔ ملاوٹ والی بات۔ الشَّوْأُئِبُ (جمع ہے شَائِبَةٌ) اس کے معنی ہیں کثافتیں اور غلاظتیں نیز نقائص و عیوب اور خطرات۔ شَوْبٌ - شہد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں خود بھی موم ملا ہوا ہوتا ہے اور اسے ہر دوا کے ساتھ ملایا جاتا ہے *۔ قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهِمْ لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ (۳۷)۔ اس کے اوپر سے انہیں گرم آمیزہ دیدیا جائیگا۔ اس سے مراد بے اطمینانی کا جینا، ناگوار مصائب کو برداشت کرنا، نیز کثافت آمیز زندگی ہے، یا زندگی کی کثافتیں۔ پر فریب زندگی کے اثرات۔

ش و ر

شَارَ الْعَسَلُ - شہد کو چھتہ سے نکال لیا اور جمع کر لیا۔ اَلْمَشَارُ - وہ چھتہ جس سے شہد نکالا جائے۔ الشَّوْرُ - چھتہ سے نکالا ہوا شہد۔ اَلْمِشْوَارُ - وہ لکڑی جس سے شہد نکالا جاتا ہے۔ اَلْمِشْوَارَةُ چھتہ کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو ظاہر کرنا۔ پیش کرنا اور (۲) کسی چیز کو لیے لینا۔ شَاوَرَ - مُشَاوَرَةٌ - تَشَاوَرَ - باہمی مشورہ کرنا۔ اصل کے اعتبار سے (یعنی شَارَ الْعَسَلُ - چھتہ کو نیچوڑ کر اس سے شہد نکالنے کے اعتبار سے)، مشورہ کے معنی ہوئے دوسرے کے خیالات کا نیچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا **۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے، تو جس طرح شہد کی

مکھیاں اپنی اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں ، مشاورت کے معنے ہونگے مختلف افرادِ معاشرہ کی اپنی اپنی رائے ، فکر ، خیالات ، اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دینا تا کہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے ۔ روئی دھنسنے والے کی کمان کی تانت کو بھی اَلْمِشْوَارُ کہتے ہیں * ۔ لہذا مشورہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آراء کو دھننا اور انہیں کھول کر نتیجہ نکالنا ۔

اَشَارَ اِلَيْهِ ۔ اسکی طرف اشارہ کیا * (۱۹۱) ۔ اَلشَّوْرَةُ وَالشَّارَةُ ۔ حسن و جمال ۔ وضع قطع ۔ ہئیت ۔ لباس ۔ پوشاک ۔ فر بھی ۔ زینت ۔ آرائش ۔ شَارَ ۔ يَشْوُرُ ۔ گھوڑے کو سدھایا ، یا خریدار کو بتانے کے لئے اس پر سوار ہوا اور اسے دوڑا کر دکھایا * ۔

قرآن کریم نے نوع انسانی کی راہنمائی کے لئے اصولی قوانین دیئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں ۔ قرآنی نظام یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود وضع کریں ۔ یہ چیز باہمی مشورہ سے طے ہوگی ۔ اسی لئے جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۳۸) ۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے ۔ چونکہ سب سے پہلے قرآنی نظام خود نبی اکرمؐ نے قائم کیا تھا اسلئے حضورؐ کو بھی حکم دیا گیا کہ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۱۵۸) ۔ معاملات میں ان (مومنین) سے مشورہ کیا کرو ۔ اس سے ظاہر ہے کہ چونکہ مشورہ کا حکم تمام مومنین کے لئے ہے اس لئے ان کا نظام شریعت کبھی جامد اور متصلب (Rigid and Static) نہیں ہو سکتا ۔ ہر دور کے مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھیں گے ۔ اگر انکے زمانے کا تقاضا ہو تو وہ باہمی مشورہ سے ، کسی سابقہ دور کے فیصلوں میں رد و بدل بھی کر سکتے ہیں ، اور نئے فیصلے بھی کر سکتے ہیں ۔ اس طرح قرآن کریم کے غیر متبدل اصول تو اپنی جگہ قائم رہیں گے لیکن انکی روشنی میں وضع کردہ جزئیات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی ۔ یہ ہے مشاورت کے قرآنی حکم کا عملی مفہوم ۔ یہی خود رسول اللہؐ نے کیا تھا (جس پر قرآن کا حکم شاہد ہے) اس لئے سنت رسول اللہؐ بھی یہی ہے کہ ہر دور کے مسلمان ایسا ہی کریں ۔ یہی وہ سَبِيلُ الْمُؤْمِنِينَ ہے (۱۱۵) جس کے اتباع کا حکم ہے ۔ مغربی انداز حکومت میں ، کوئی شے غیر متبدل نہیں ہوتی ۔ قوم جس قسم کے فیصلے چاہے کر سکتی ہے ۔ ان فیصلوں کے اوپر کوئی ایسی پابندی یا حدود نہیں جن کا

علی حالہ رکھنا ضروری ہو۔ اس طرز حکومت کو سیکولر (Secular) کہتے ہیں۔ دوسری طرف، قدامت پرستی کے مسلک کی رو سے، شریعت میں کوئی چیز قابل تغیر و تبدل نہیں۔ جو فیصلے پہلے ہو چکے ہیں وہ من وعن نافذ ہوتے رہیں گے۔ ان دونوں کے برعکس قرآنی نظام یہ ہے کہ، قرآن میں بیان کردہ احکام و اصول غیر متبدل ہیں۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم اپنے اپنے زمانے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی۔ اس طرح ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے امتزاج سے، انسانی زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جائیگی۔

ش و ظ

الشَّوْظُ - الشَّيْوَظُ - شعلہ جس میں دھواں نہ ہو* - نیز آگ کی گرمی اور دھواں - آفتاب کی گرمی - ویسے چیخنے چلانے کو بھی کہتے ہیں، اور پیاس کی شدت کو بھی* -

قرآن کریم میں ہے یُرْسَلُ عَلَيْكَ مَائِدَاتُ الشَّوْظِ مِّنْ نَّارٍ (۵۵/۳۵) - تم دونوں گروہوں پر آگ کا شعلہ بھیجا جائیگا۔

ش و ک

الشَّوْكَةُ - درخت کا کانٹا - ہتھیار (۱/۸) - اَرْضٌ شَاكَةٌ - بہت کانٹوں والی زمین* -

الشَّوْكَةُ مِّنْ اَلِیْقَتَالِ - جنگ کی شدت - شَوْكَةُ السَّيْلِ - ہتھیار کی تیزی اور دھار* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کھردرا ہونا یا کسی چیز کے کنارے کا دھار دار، تیز اور نوکیلا ہونا۔

ش و ی

شَوَى اللَّحْمَ يَشْوِيهِ شَيْئًا - گوشت بھونا - اَلِشْوَاءُ - بھنا ہوا گوشت - شَوَى اَلْمَاءَ يَشْوِيهِ - اسنے پانی کو گرم کیا - اَشْوَى الْقَمْحُ - گیہوں اتنے سخت ہو گئے کہ انہیں بالوں سے، ہاتھ سے مل کر نکالا جا سکے اور بھونا جا سکے** - سورۃ کہف میں ہے يَشْوِي اَلْجَوْهَ (۱۸/۲۹) جوان کے چہروں کو جھلسا دیگا۔

* تاج - محیط - راغب - ** تاج و محیط -

الشَّوَى - کے معنی چاروں ہاتھ پاؤں اور انسان کی کھوپڑی اور سر کی کھال کے ہیں۔ اس کا واحد شَوَاةٌ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ بدن کے وہ تمام اعضاء جن پر ضرب لگنے سے موت واقع نہ ہو شَوَى ہیں۔ اسی جہت سے بے قدر اور غیر اہم چیز کو بھی شَوَى کہہ دیتے ہیں *۔

سورة المعارج میں جہنم کی آگ کے متعلق ہے نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى (۱۶)۔ وہ ہاتھ پاؤں کو زور سے کھینچ کر نکال لینے والی ہے۔ یعنی بالکل بیکار کر دینے والی۔ یا سر کی کھال کھینچ لینے والی۔ اس کے معنی ذلت اور مصیبت دونوں کے ہونگے۔ نیز قوت چھین لینے اور اپاہج بنا دینے کے بھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معمولی اور بے قدر چیز کے ہوتے ہیں۔

ش ی ا

شَاءَ - يَشَاءُ - شَيْئًا - وَمَشِيئَةً کے معنی ہیں ارادہ کرنا۔ اکثر متکلمین نے مشیت اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں کیا حالانکہ دونوں میں باعتبار لغت فرق یہ ہے کہ مشیت، ایجاد (پیدا کرنے) کو کہتے ہیں اور ارادہ کے معنی طلب (چاہنے) کے ہیں *۔

الشَّيْءُ - راغب کے نزدیک یہ لفظ ہر موجود چیز کے لئے بولا جائے گا خواہ وہ محسوس طور پر موجود ہو۔ مثلاً مختلف اجسام، یا محض ذہنی طور پر موجود ہو مثلاً اقوال **۔ نیز شَيْئٌ کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس کا علم حاصل کیا جاسکے یا جس کے متعلق کچھ خبر دی جاسکے ***۔ متکلمین نے اس پر بہت بحث کی ہے کہ شَيْئٌ کی ماہیت کیا ہے اور اس کا اطلاق کس کس قسم کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ حَتَّىٰ کہ بعض نے یہاں تک کہ دیا ہے کہ معدوم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں ان موشگافیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم ان متکلمانہ بحثوں میں نہیں الجھتا۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ (۲۰)۔ یہاں شے کے معنی چیز، معاملہ یا حقیقت کے ہیں۔ سورة بقرہ میں ہے لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۳۸)۔ (جسدن) کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

اس حقیقت کے سمجھ لینے کی بڑی ضرورت ہے کہ ”خدا کی مشیت“ سے اصل مفہوم کیا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں خدا کے قادر مطلق ہونے کا تصور یہ

ہے کہ اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ۔ وہ ایک خود مختار (اور معاذ اللہ) مطلق العنان حاکم کی طرح جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی خوش ہوا تو جسا گیر بخش دی۔ ناراض ہو گیا تو گاؤں کا گاؤں ہلاک کر دیا۔ (خدا کے قادر ہونے کے مفہوم کے لئے تو ق۔ د۔ ر کا عنوان دیکھئے لیکن یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ) خدا کے قادر ہونے کا وہ مفہوم قطعاً نہیں جو اوپر لکھا گیا ہے۔ اس لئے خدا کی مشیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قانون اور ضابطہ کا کوئی دخل نہیں۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا اور وہاں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آ گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ، خدا کی مرضی، منشا، ارادہ، اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔ اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہاں یہی کہا جائیگا کہ **إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ** (۳۶/۸۲)۔ اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔ ”کہہ دینے“ کے معنی یہ نہیں کہ وہ سچ سچ ”کن“، کا لفظ زبان سے نکالتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھئے تو ہمارے سامنے کائنات کا محسوس سلسلہ آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک خاص قانون اور قاعدے کے مطابق عمل کر رہی ہے۔ اس گوشہ میں خدا نے اپنے امر کو پیمانوں اور اندازوں کے اندر محدود کر دیا ہے۔ **وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا** (۳۳/۳۹)۔ یہاں خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ یعنی اب کائنات کی ہر شے ان قوانین کے تابع چلنے لگی جنہیں خدا نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق (اول الذکر گوشے میں) بنایا تھا۔ اس کے لئے کہا گیا ہے کہ **قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا** (۱۵/۳)۔ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر

کر دیا۔ یہ تمام پیمانے (قوانین فطرت) خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے ہیں لیکن خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان قوانین میں دخل اندازی کی نہیں جائیگی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۱)۔ ”تو سنت اللہ (خدا کے قاعدوں) میں کبھی تبدیلی نہیں پائیگا“۔ اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنے ہوں گے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے۔ کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکے۔ چونکہ اس پہلے گوشے کے متعلق (جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر شے کے لئے قانون مقرر کیا گیا ہے) ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ اس لئے ہم خدا کے متعلق جو کچھ جان سکتے ہیں وہ ان قوانین ہی کی رو سے جان سکتے ہیں جو کائنات میں کار فرما ہیں۔ یعنی مشیت خداوندی کا یہ گوشہ، علم و تجربہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔

اب ایک اور قدم آگے بڑھئے۔ انہی قوانین کی رو سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا نے انسان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۲۹/۱۸)۔ جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ یعنی خارجی کائنات کی چیزوں کے برعکس، انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی پابندی کرے جو اس کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور چاہے تو ان سے سرکشی برت لے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاں روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور فلاں کا نتیجہ کامرانی و کامیابی۔ یعنی اس گوشے میں انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جو نسی روش جی چاہے اختیار کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنے اعمال کے نتائج بھی اپنی مرضی کے مطابق مرتب کر لے۔ اس کا ہر عمل وہی نتیجہ مرتب کریگا جو اس کے لئے قانون خداوندی (مشیت) نے مقرر کر رکھا ہے۔ مثلاً اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو منکھیا کھا لے اور جی چاہے مصری کی ڈلی منہ میں ڈال لے۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ منکھیا کھا کر اسکا نتیجہ مصری کی ڈلی کا سا پیدا کر لے۔ یہ قوانین، کہ فلاں روش کا نتیجہ کیا ہوگا، انسان کو وحی کے ذریعہ عطا کئے گئے ہیں (جو آج قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) لہذا جب انسان، خدا کے متعلق کچھ سمجھنا چاہے گا تو اسے قوانین فطرت کو بھی سمجھنا ہوگا جو خارجی دنیا میں کار فرما ہیں اور وحی کے قوانین کو بھی جو اس کی اپنی دنیا سے متعلق ہیں۔ جب وہ ان دونوں قوانین کو سمجھ لیگا تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے آجائیگی کہ یہ دونوں قوانین درحقیقت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ کے متعلق مَا يَشَاءُ کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ ، متذکرہ صدر تینوں گوشوں میں سے کس گوشے سے متعلق ہے ۔ جس گوشے سے مَا يَشَاءُ متعلق ہوگا اس کے مطابق اس کا مفہوم لیا جائیگا ۔ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنی لینے سے ذہن میں وہ تمام الجھناؤ پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں ۔ تضاد ہماری اپنی کوتاہ نگہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے ۔ (اس جگہ صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ تفصیل ان امور کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی) ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۱۳۲) ۔ اس کے واضح معنی ہیں کہ جو شخص خدا سے راہ نمائی لینا چاہے خدا اسے راہ نمائی دیتا ہے ۔ یعنی مَنْ يَشَاءُ کے معنی ہیں جو شخص چاہے ۔ لیکن اگر اس کے معنی یہ کئے جائیں کہ ”اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے“ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی اس کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے ۔ (یعنی مَنْ يَشَاءُ کے معنی قانون مشیت کے ہونگے) ۔ اس قانون کی تفصیل قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے ۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ (۵) ۔ یعنی اللہ اس (قرآن) کے ذریعے اسی کو راہ نمائی دیتا ہے جو اس کے قانون کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا چاہے ۔ بات بالکل واضح ہے ۔ یعنی اس کے لئے ابتداء (Initiative) ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوگی ۔ اگر یہ قوانین خداوندی کے مطابق چلتا جائیگا تو اسے صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی مل جائے گی ۔ اگر یہ اس سے انحراف برتیگا تو اس کا رخ تباہی کی طرف مڑ جائیگا ۔ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (۶۱) ۔ جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے ۔

سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا گیا ہے ۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک کمانڈر مقرر کر دیجئے ۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا انتخاب کس خصوصیت کی بنا پر ہوا ہے ، حالانکہ وہ صاحبِ مال و دولت نہیں ہے ۔ اس کے جواب میں نبی نے کہا کہ اسے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ زَادَهُ بِسُطَّةٍ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲۴) ۔ اللہ نے اسے جسمانی قوت اور علم فراواں عطا کیا ہے ۔ یعنی انہیں بتا دیا کہ خدا کا انتخاب یونہی اندھا دھند نہیں ہوتا ۔ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا

ہے۔ اس کی طرف سے جسے جو کچھ ملتا ہے اس لئے ملتا ہے کہ اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہے وَاللّٰهُ يُوَفِّيْكَ مَلِكًا مِّنْ يَّشَاءُ (۲۴/۳۵)۔ اللہ کی طرف سے قوت و ملک اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ یہاں مِّنْ يَّشَاءُ کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی قانون کے مطابق، یونہی اندھا دھند نہیں۔ یہاں سے سورۃ آل عمران کی اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تَوْفِيْكَ الْمُلْكَ مِّنْ تَّشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَّشَاءُ... (۳۵/۳۵)۔ قوت و اختیار اور عزت و حکومت کا ملنا اور چھیننا ”مشیت“ پر موقوف ہے۔ یعنی یہ سب اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جسکی بنیاد اس پر ہے کہ جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے اسے اقتدار و اختیار ملتا ہے (۲۱/۵)۔ جس میں صلاحیت نہیں رہتی اس سے یہ چھین جاتا ہے۔ تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ مشیتِ ایزدی (قانونِ خداوندی) کے تین گوشے ہیں:۔

(۱) وہ گوشہ جہاں ہر شے کے لئے قوانین متعین ہوتے ہیں۔ اس گوشے میں خدا کا امر کارفرما ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق طے پاتا ہے۔ ہم اس گوشے کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے۔

(۲) دوسرا گوشہ خارجی کائنات کا ہے جہاں ہر شے ان قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے جو اس کے لئے گوشہ اول میں مقرر ہوتے ہیں۔ ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے۔

(۳) تیسرا گوشہ انسانی دنیا کا ہے۔ اس کے ایک حصہ (انسان کی طبعی زندگی) میں تو وہی قوانین کارفرما ہیں جو خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ لیکن اس کی انسانی سطح پر جن قوانین کی ضرورت ہے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے۔ یہ قوانین (مستقل اقدار) بھی غیر متبدل ہیں۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ وہ جیسی روش اختیار کریگا اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے۔ جتنی صلاحیت پیدا کرے گا اتنی ہی خوبیاں اور بڑائیاں اسے حاصل ہو جائیں گی۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں جو غیر متبدل ہے۔

یہ ہے مشیتِ خداوندی سے مفہوم۔ واضح رہے کہ جس گوشے میں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے، وہ (خدا) اس میں کبھی مداخل نہیں

ہوتا۔ اس میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۳۱)۔ اس گوشے میں تم اپنی مرضی (مشیت) کے مطابق عمل کرو۔ ”جو تم چاہتے ہو کرو۔ ہم مداخل نہیں ہونگے،،۔ البتہ تمہارے اعمال کے نتائج قانونِ مشیتِ خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے۔ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۱)۔

اس ضمن میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے انسان کے ذہن میں عجیب الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ دھر میں ہے اِنَّ ہٰذِہٖ تَذٰکِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِيْلًا (۳۹) ”یہ قرآن کریم یقیناً ایک یاد دہانی ہے، سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف (کا) راستہ اختیار کر لے“۔ یہاں تک بات بالکل صاف ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے وحی مل گئی ہے۔ اس کے بعد انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اس وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے۔ لیکن اس کے آگے ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ (۳۹)۔ اسکا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔ ”اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہے“۔ اس ترجمہ کی رو سے (ظاہر ہے کہ) نہ صرف یہ کہ یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں بلکہ انسانی اختیار و ارادہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ یعنی ایک طرف تو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چاہو تو ایسا کر لو اور چاہو تو ویسا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ نہیں سکتے۔ تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ دراصل تمہارا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے۔ لہذا انسان مجبور محض ہے۔

سورۃ دھر کے علاوہ یہ آیت (قریب قریب انہی الفاظ کے ساتھ) سورۃ مدثر (۵۶-۵۳) اور سورۃ تکویر (۲۸-۲۹) میں بھی آئی ہے۔

”مَا تَشَاءُوْنَ“ نفی مضارع ہے جس کے عام معنی ہیں ”تم نہیں چاہتے“۔ لیکن عربی گرامر کی رو سے اس کے معنی نہیں (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ”تم مت چاہو“۔ گرامر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا۔ مختصر المعانی میں ہے ثُمَّ اَلْخَبَرُ قَدْ یَقَعُ مَوْقِعُ اِلَّا نَشَاءَ۔ اِمَّا لِلتَّفَاوُلِ اَوْ لِظُّہَارِ الْحِرْصِ فِیْ وَقُوعِہٖ کَمَا مَرَّ۔ اَوْ لِاِحْتِرَازِ عَنِ صُوْرَةِ الْاَمْرِ

أَوْ لِيَحْمِلَ الْمُخَاطَبُ عَلَى الْمُطَلُّوبِ بَيَانٌ يَكُونُ الْمُخَاطَبُ مِمَّنْ لَا يُجِيبُ أَنْ يُكَذِّبَ الطَّالِبَ (صفحہ ۲۳۲) یعنی کبھی کبھی خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔ ایسا بطور تفاؤل کے ہوتا ہے۔ یا متکلم چاہتا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ یا متکلم (صاف صاف) امر (حکم) کی صورت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر مخاطب کو اس بات کے لئے ہر انگیکستہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو متکلم کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔

زمخشری نے (اپنی تفسیر کشاف میں) اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَأِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا.... (۲/۸۳)۔ یہاں لَا تَعْبُدُونَ نفی مضارع ہے۔ لیکن اس کے معنی نہیں کے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ تم اللہ کے سوا اور کسی کی محکومی (عبادت) اختیار مت کرنا۔ اور والدین اور رشتہ داروں یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ احسان کرنا“۔ اس کے بعد قُولُوا امر کا صیغہ ہے۔ یعنی ”لوگوں کو اچھی بات کہو“۔ زمخشری نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں اخبار فی معنی النہی ہے۔ یعنی خبر، نہی کے معنوں میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں ”تَذْهَبُ إِلَىٰ فُلَانٍ، تَقُولُ لَهُ كَذَا“۔ اس میں ”تَذْهَبُ“، ”تَقُولُ“، اگرچہ مضارع کے صیغے ہیں لیکن ان سے مراد امر ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ ”وَهُوَ أَبْلَغُ مِنْ صَرَیحٍ وَالنَّهْيُ“۔ یعنی یہ انداز امر و نہی کے صیغوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس انداز بیان کی اور مثالیں بھی ہیں مثلاً (اسی) سورۃ بقرہ میں ہے وَمَا تَنْفِقُونَ إِلَّا لَّابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ (۲/۲۶۴)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ”تم مت خرچ کرو بجز وجہ اللہ“ یعنی مضارع نفی نے نہی کے معنی دئے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہیئے یہ کہ اپنے اختیار و ارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سورۃ زمر

میں ہے اِنْ تَكْفُرُوا فَانَ اللّٰهُ غَنِيٌّ عَنْكُمْ*۔ اگر تم (قوانین خداوندی) سے انکار کرو گے تو (اللہ کا کیا بگاڑ لو گے) اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ وَلَا يَرْضٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ۔ وَاِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ* (۳۹)۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تمہارے لئے شکر ہی کو پسند کرتا ہے۔

لہذا انسان کو چاہئے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے، بطیب خاطر، مشیت خداوندی (قوانین الہیہ) سے ہم آہنگی کی زندگی اختیار کرے۔

ش ی ب

الشَّيْبُ*۔ بڑھا پا۔ سفید بال یا بالوں کی سفیدی*۔ سورۃ مریم میں ہے وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۱۹) اور سر بالوں کی سفیدی کی وجہ سے (شعلے کی طرح) بھڑک رہا ہے۔ یا سر میں سفید بال بکثرت نمودار ہو گئے ہیں۔ سورۃ روم میں شَيْبَةً* (۳۴) بڑھا پسے کیلئے آیا ہے۔ سورۃ مزمل میں ہے يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شَيْبًا (۳۰) جس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مخلوط ہونا اور مل جانا ہیں۔ شَيْبٌ* کو شَيْبٌ* اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بالوں کی سفیدی، سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے۔

ش ی خ

الشَّيْخُ*۔ بوڑھا آدمی۔ نیز اونٹ کو بھی کہتے ہیں۔ استاذ۔ عالم۔ سردار قوم۔ مہر فن کو بھی بزرگی اور فضیلت کی وجہ سے شَيْخٌ* کہہ دیتے ہیں۔ الشَّيْخَةُ*۔ بوڑھی عورت۔ شَيْخُوۡ۟۟۟۟*۔ بڑھا پا*۔ قرآن کریم میں شَيْخٌ* (۱۱) نیز (۱۲)۔ بوڑھے کے لئے آیا ہے۔ الشَّيْخَةُ* کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اور الشَّيْخُ* وَالشَّيْخَةُ* بمعنی بیاہا (مرد) اور بیاہی (عورت) لغت عرب میں کہیں نظر نہیں آیا۔

ش ی د

شَادَ الْبِنَاءَ۔ يَشِيْدُهُ*۔ وَشَيَّدَهُ*۔ عمارت پر چونہ وغیرہ کا پلستر کر کے اسے مضبوط اور بلند کر دینا۔ اَلِشْيَدُ*۔ اس چونہ وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے پلستر کیا جائے۔ اَلْمَشِيْدُ*۔ جو عمارت چونہ وغیرہ سے بنائی

اور بلند کر دی جائے۔ محکم - مضبوط *۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے قَصْرٌ مَشِيدٌ (۲۲/۳۵)۔ اَلَا شَادَّةٌ - آواز بلند کرنا *۔ بَرُوجٌ مَشِيدَةٌ (۲۸/۳۸) کے معنی ہیں اونچے اور محکم قلعے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بلند کرنے کے ہوتے ہیں۔

ش ی ع

شَاعَ الْخَبَرُ فِي النَّاسِ - لوگوں میں خبر پھیل گئی *۔ قرآن کریم میں ہے إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ (۲۴/۱۹)۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ نا پسندیدہ باتیں پھیل جائیں۔

هَذَا شَيْعٌ هَذَا - یہ اس کی مثل ہے *۔ سورۃ سبا میں ہے كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ (۳۳/۵۳)۔ جیسا انہی جیسے لوگوں کے ساتھ ان سے پہلے کیا گیا۔ سورۃ قمر میں ہے وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ (۵۱/۵۱)۔ ہم تمہارے جیسے لوگوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

الشَّيَاعُ - چرواہے کی بانسری یا اس کی آواز (جس سے وہ منتشر جانوروں کو بلاتا ہے)۔ بلانے والے - داعی *۔ نیز اس کے معنی متابعت کرنے - یعنی بلانے والے کے پیچھے پیچھے چلنے کے بھی آتے ہیں۔ شَيْعَهُ عَلِيٌّ رَأْيُهُ - اس نے اس کی رائے کی پیروی کی - اسے تقویت دی - هَذَا شَيْعٌ هَذَا - یہ اس بچہ کی پیٹھ پر پیدا ہونے والا بچہ ہے - یہ ایسے اوپر تلے کے ، دو بچوں کے لئے بولا جاتا ہے جنکے درمیان کوئی اور بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ الْمُشَايِعُ - کسی کے ساتھ ساتھ (ملحق) رہنے والا - شَيْعٌ نِسَاءٍ اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ عورتوں میں گھسا رہے - الشَّاعَةُ - بیوی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شوہر کے ساتھ ساتھ یا اس کے پیچھے رہتی ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی ہیں۔

ان معانی سے شَيْعَةٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو کسی کے پیچھے چل کر ایک پارٹی بن جائیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے کی تقویت اور مدد کا موجب ہوں۔ اگر یہ اتباع قانونِ خداوندی کی ہے جس میں تعاونِ برّ اور تقویٰ میں ہوتا ہے تو اس پارٹی کا نام جماعتِ مومنین ہے، جن کے ساتھ شامل ہونا باعثِ صدِ فخر و سعادت ہے۔ چنانچہ قومِ نوح کے مومنین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا إِنَّ مِّنْ شَيْعَتِهِمْ لَا بُرَّاهِيمَ (۳۴/۸۳)۔ یقیناً ابراہیمؑ ان ہی کے گروہ میں سے تھا۔ لیکن اگر اس قسم کی گروہ بندی انسانوں

کے پیچھے چل کر بنائی جائے تو قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے امت مسلمہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا** (۱۰۳)۔ تم سب کے سب اس کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ**۔ مین الذین فرّقوا دینہم (۱۰۴)۔ (دیکھنا۔ تم مومن بن جانے کے بعد کہیں) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہر فرقہ اس پر اکڑتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر، جبکہ اس کی رو سے خود فرقہ بندی ہی شرک ہے۔ اسی بنا پر اس نے رسول سے کہہ دیا کہ **إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَسْتُ مِنْهُمْ** (۱۰۶)۔ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور گروہ گروہ بن جائیں۔ اے رسول۔ تیرا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان میں وحدت کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ وہی صورت جسے قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے۔ یعنی **إِعْتِصَامَ بِحَبْلِ اللَّهِ**۔ خدا کی کتاب کو مرکز قرار دیکر نظام قائم کر لینا۔ اس سے فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اگر شخصیتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے اور ایک نظام کے ذریعہ اطاعت صرف کتاب اللہ کی کی جائے تو فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ (”نظام کے ذریعے قرآن کریم کی اطاعت“ کی شرط بڑی اہم ہے۔ انفرادی طور پر، اپنے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی اطاعت سے فرقے پیدا ہوتے ہیں۔ نظام کی رو سے اطاعت خداوندی سے وحدت امت برقرار رہتی ہے۔) یہ بھی واضح رہے کہ فرقوں سے مراد صرف مذہبی فرقے ہی نہیں، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں۔ مومنین تو ایک طرف، قرآن کریم نے ہر قوم میں فرقہ بندی، پارٹی بازی اور گروہ سازی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے (۱۰۵)۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا میں ”حکمت فرعونی“ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ یعنی پارٹیاں بناتی اور توڑتی رہتی ہے (۲۸)۔ (مزید تفصیل ف۔ ر۔ ق کے عنوان میں دیکھئے)۔

قرآن کریم میں شیعہ کا لفظ اقوام یا قبائل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (۱۰۵)۔

اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ ”اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی“۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ۔

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں،

دنیا کے مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشیں پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔ بڑی جلد کے ۳۹ صفحات۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

سلیم کے نام خطوط۔ ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے

دل میں، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب۔ انداز بیان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت جلد اول۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم۔ چھ روپے۔ جلد سوم۔ چھ روپے۔

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کی فہرست ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمائیں۔

ملنے کے پتہ

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

